سہ ماہی

العلم

کراچی

جناب عبدالحفیظ پیرزادہ
مہمانِ خصوصی اجلاس جوبلی

جناب مولانا کوثر نیازی
صدرِ اجلاس جوبلی

این۔ ایچ۔ نجمی (علیگ)
سیکرٹری مجلس استقبالیہ

ڈاکٹر فرید الدین اقبالی
صدر مجلس استقبالیہ

رجسٹرڈ نمبر : جی ۳۶۳

فون دفتر ۶۱۱۱۹۶
مکان ۶۱۱۳۶۹

سلور جوبلی نمبر (حصہ اول)

قیمت : دس روپے

(ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی)

عہدہ داران وارکینِ مجلس عاملہ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نواب قدیرالدین احمد (ریٹائرڈ چیف جسٹس سندھ و بلوچستان) — پریسیڈنٹ

مولوی سید حسین امام — وائس پریسیڈنٹ

حسن علی عبدالرحمٰن بار۔ ایٹ لا — آنریری جنرل سیکرٹری

قاضی افتخار علی ایڈووکیٹ (سابق ایم۔ ایل۔ اے) — آنریری [illegible]

سید الطاف علی بریلوی — سیکرٹری کانفرنس۔ ڈائرکٹر اکیڈمی [illegible] ریسرچ و مدیر العلم

———— × ————

پروفیسر عبدالمجید قریشی (علیگ) — چیئرمین بیورو آف ایجوکیشن

سید حامد علی جعفری — ״

———— × ————

علی اطہر بی۔ اے، ایل، ایل۔ بی — چیئرمین اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم۔ اے (علیگ) — ״

———— × ————

مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی — سیکرٹری انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

———— × ————

میجر جنرل محمد اکبر خاں (ریٹائرڈ) — چیئرمین بیورو آف ملٹری اینڈ فزیکل ایجوکیشن

———— × ————

لیڈی غلام حسین ہدایت اللہ — چیئرمین شعبہ تعلیم نسواں

بیگم سید عبدالحفیظ — سیکرٹری ״ ״ ״

اراکین

بیگم لیفٹیننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی، سابق چیئرمین سرسید گرلس کالج گورننگ باڈی

— مسٹر افتخار حسین، ریٹائرڈ اسسٹنٹ جنرل منیجر ایسو اسٹینڈرڈ لمیٹڈ — الحاج غلام محمد صالح، ریٹائرڈ انجینئیر

— الحاج پیرزادہ سید اصغر علی شاہ، ریٹائرڈ جج — عقیل احمد خاں، ایڈووکیٹ

— نواب سید شمس الحسن، ایڈووکیٹ — خواجہ حمیدالدین شاہد ایم اے

— مولانا [illegible] الحق [illegible] ایم اے

کی

سلور جوبلی

سرسید گورنمنٹ گرلس کالج، ناظم آباد، کراچی میں ۲۷، ۲۸، ۲۹ اگست ۱۹۷۵ء کو شایان شان طریقے پر منائی جارہی ہے۔

پہلے روز سات بجے شام عالی جناب پیرزادہ عبدالحفیظ صاحب وفاقی وزیر تعلیم سابق رابطہ و امور آزاد کشمیر، رسم افتتاح اور عزت مآب مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیر مذہبی امور صدارت فرمائیں گے۔

بقیہ سہ روزہ اجلاسوں کی صدارت پاکستان کے دیگر نامور حضرات کریں گے۔ ایک ذی اثر مجلس استقبالیہ جس کے چیئرمین معزز سربراہ، جناب ڈاکٹر فریدالدین بقائی صاحب ہیں۔ تقریب کے ضروری انتظامات کر رہی ہے۔

جملہ اہل علم حضرات سے امید ہے کہ آپ اپنے مخلصانہ تعاون سے ادارہ کو سرفراز فرمائیں گے۔

قدیر الدین احمد
(ریٹائرڈ چیف جسٹس، سندھ و بلوچستان)
صدر
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی

جلد ۲۳	سلور جوبلی نمبر اپریل تا ستمبر ۱۹۷۵ء	شمارہ ۲-۳

فہرست مضامین

جواھر پارے

ادارِیہ

ہمارے گمنام محسن

(از : سید الطاف علی بریلوی)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو سرسید علیہ رحمتہ نے سنہ ۱۸۸۶ء میں قائم کیا تھا اور اسکے ۶۰ سالہ تاریخ ساز کارنامے عام طور پر معروف و معلوم ھیں ۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے دستور العمل میں ترمیم کرکے اپنا تعلق پاکستانی علاقوں سے منقطع کرلیا ۔ جس جلسہ میں یہ فیصلہ ھوا اس کی صدارت نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب مرحوم نے کی کیونکہ وہ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اس حیثیت سے از روئے قانون کانفرنس کے بھی "ایکس آفیشو" صدر تھے ۔

مندرجۂ بالا فیصلہ کی بناء پر مشرقی پاکستان (بنگال) سندھ، بلوچستان، پنجاب، صوبہ سرحد آزاد کشمیر اور ریاستہائے بہاولپور و خیرپور کے کثیر التعداد لوگ نیز مہاجرین کانفرنس کی فیض رسانی اور اس کے ھر طرح کے اثاثوں سے اسی طرح محروم ھوگئے جس طرح وہ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما، دار المصنفین، کتاب خانہ رام پور و حبیب گنج اور خدا بخش لائبریری وغیرہ سے محروم ھوگئے ۔ مسلم اکثریتی صوبوں نے ان اداروں کی تعمیر و ترقی میں دامے درمے، قدمے، سخنے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ کانفرنس کے سالانہ اجلاس بھی جس طرح بھارت کے طول و عرض میں ھوئے اسی طرح کراچی، خیرپور، راولپنڈی اور

ڈھاکہ میں بھی ہوتے۔ غیر منقسم ہندوستان کا آخری اجلاس ۱۹۴۶ء میں بہاولپور میں منعقد ہونا طے ہوگیا تھا اور اس کے انتظامات کے سلسلے میں جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب وزیر تعلیم کی خصوصی دعوت پر میں علی گڑھ سے بہاولپور حاضر بھی ہوا تھا۔ سرکاری مہمان کی حیثیت سے آٹھ روز وہاں مقیم رہا۔ لیکن اس کے بعد ملکی حالات دن بدن بگڑتے چلے گئے۔ مغربی، یو۔پی اور مشرقی پنجاب میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا اور اس طرح مجوزہ اجلاس کی تجویز ختم ہوگئی۔

پاکستان بن جانے کے بعد ہم نے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ جس طرح ممکن ہوا علی گڑھ میں گزارا لیکن ہندو اکثریت کے روز افزوں ظلم و تعدی اور انفرادی و اجتماعی سطح پر مستقل ذہنی غلامی نے زندگی کو اجیرن کر دیا۔ ہم اور ہماری طرح وہ لوگ جو مدت العمر قومی و ملی تحریکات میں زور شور سے حصہ لیتے رہے تھے اور آزادیٔ فکر و عمل کے عادی تھے۔ ایک ایسی جان گسل گھٹن کا شکار ہوگئے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن نظر آنے لگا۔

اس کیفیت کا یوں اندازہ کیجئے کہ ہمارے ایک انتہائی صاحب ثروت مگر صحیح الخیال دوست ایک دن کہنے لگے کہ "بھائی! میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے کل مال و منال کو چھوڑ کر صرف ایک کمبل اور ایک ہزار روپیہ لے کر یہاں سے نکل جاؤں اور سندھ کے ریگستان میں جاکر پڑ جاؤں۔"

بے حس لوگوں کا تو کچھ کہنا نہیں۔ ہمارے خیال میں وطن سے بے وطن ہونا۔ شاید دنیا کی سب سے زیادہ اذیت ناک چیز ہے۔ لیکن آزادی کی خاطر ہر قربانی دینی پڑتی ہے، صدیوں کے رچے بسے دل پسند ماحول کو مجبوراً خیرباد کہنا پڑا۔ اس توقع اور امید پر کہ پاکستان میں مسلمہ صداقتوں کا بول بالا ہوگا اور تعمیر ملی کے کاموں میں مصروف لوگوں کا ہاتھ بٹانے کا ہمیں بھی خاطر خواہ موقع ملے گا۔

اللہ کا احسان ھے کہ گذشتہ پچیس ۲۵ سال کے عرصے میں ھمیں یہ موقع کافی حد تک ھمیں میسر آیا اور اسی کی داستان ھمارے دوستوں اور بزرگوں نے "العلم" کے اس جوبلی نمبر میں قلم بند ... کرنے کی کوشش کی ھے۔ لیکن یہ داستان اس اعتبار سے نامکمل ھے کہ اس میں بکثرت رفقائے کار کا ذکر آنے سے رہ گیا اور اگر آیا بھی ھے تو اس کا پورا پورا حق ادا نہ ھو سکا ھے۔ اس کے لئے ادیبانِ نظر "العلم" کے سابقہ شماروں کو ملاحظہ فرمائیں جو ان کے ذکر جمیل سے بھرے پڑے ھیں ـــــ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جیسی فعال جماعت کی کارکردگی کسی ایک فرد یا چند افراد کی رھینِ منت نہیں ھو سکتی۔ مخلص و ایثار پیشہ کارکنوں کی ایک پوری ٹیم کاموں میں لگتی ھے تو مثبت نتیجہ برآمد ھوتا ھے۔

ھمارے بہت سے معزز ساتھی اور معاونین خاص اللہ کو پیارے ھو گئے۔ ان کی یاد میں ھمارا دل غمناک اور آنکھیں اشکبار ھیں ــ کاش ادارہ کی سلور جوبلی کے موقع پر وہ بقیدِ حیات ھوتے اور ھمارے بجائے ان کی تعریف ھوتی۔

کوئی عمارت بنتی ھے تو وہ کسی بنیاد پر قائم ھوتی ھے ـــــ بغیر بنیاد کی عمارت وجود میں نہیں آسکتی لیکن وہ بنیاد زیر زمین دفن رھتی ھے اسے کوئی نہیں دیکھتا اور نہ اس کی تعریف و توصیف کرتا ھے۔ صرف اوپر کے بام و در کی تعریف ھوتی ھے۔

آیئے ھم اور آپ اپنے ان "گمنام محسنوں" کی خدمات کا اعتراف کریں اور خلوصِ دل سے ان کے لئے دعائے مغفرت کریں۔

نیک کاموں کا دائمی صلہ صرف خدا کی طرف سے ملتا ھے۔ دنیا والوں کا اعتراف عارضی اور فانی ھوتا ھے۔

ہم وفاقی حکومت پاکستان اور حکومت سندھ کے بھی بدل شکر گذار ہیں جن کی گرانٹ ہمارے معنیں کاموں کے جاری رہنے کی مستقل ضمانت بنی رہی اور جس کے بغیر ہم بہت ہی کم کام کر پاتے، پاکستان کے دوسرے معارف پرور اداروں اور اصحاب خیر کی فراخ دلانہ امداد وین بھی ہماری حل مشکلات میں ہمیشہ ممد و معاون رہیں۔

اُن بلند پایہ دانش وروں اور اہل قلم حضرات کا شکریہ بھی بدرجہ اتم واجب ہے۔ جن کی تخلیقات عالیہ نے ہمارے ادارہ کے وقار کو بلند کیا۔ اور اس کی مجالس علمی کو شان و شوکت بخشی۔

معزز ارباب حکومت اور ملّت عزیز پاکستان کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس استقلال و سلامت روی کے ساتھ علمی، تعلیمی اور ثقافتی میدان میں اپنی خدمت گذاری کا سلسلہ جاری رکھے گی۔

آخر میں یہ خوش آیند بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے رفقائے کار میں ایسے با صلاحیت نوجوان بھی شامل ہیں جو ادارہ کے مشن کو آئندہ اسی طرح آگے بڑھائیں گے۔ جس طرح سرسیّد اور علامہ شبلی کے جانشینوں نے ان کے مشنوں کو بیش از بیش کامیابی سے ہمکنار کیا۔
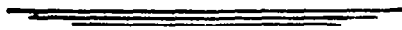
مولوی فضل الحق مرحوم کا ایک یادگار خط[1]

دریا ہاؤس
کراچی
۱۳ دسمبر ۱۹۵۵ء

ڈیئر جناب سید الطاف علی صاحب

آپ نے جو خط مجھے ۹ دسمبر ۱۹۵۵ء کو تحریر کیا تھا اس کا بہت بہت شکریہ ادا کرنے کی مجھے اجازت دیجئے۔ آج سے پہلے آپ کا یہ خط کسی نہ کسی وجہ سے میرے سامنے نہ لایا جا سکا۔ لہذا تاخیر جواب کے لئے بعجلت تمام آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تعلیمی خدمات آپ انجام دے رہے تھے۔ اس میں اپنی شرکت و شمولیت مجھے بخوبی یاد ہے۔ اب جبکہ ہمارے سامنے قومی و اسلامی کام کا ایک متعین منصوبہ ہے۔ یقین ہے کہ آپ جیسے اسلام کے پرانے سپاہی قدم آگے بڑھائیں گے اور پاکستان میں تعلیمی ترقی کا پروگرام تیار کریں گے۔

---

[1] انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی فضل الحق صاحب مرکزی وزیر داخلہ اور وزیر تعلیم تھے۔

آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گا کہ اُن وجوہ کی بنا پر جن کا تذکرہ بالفعل ضروری نہیں ہے۔ میں خود اس سلسلہ میں ابھی تک کچھ نہیں کر سکا لیکن یہ معلوم کر کے میرا دل مسرت سے لبریز ہے کہ آپ اپنی کوشش اس مقصد کے حصول میں بروئے کار لانے کے لئے تیار ہیں جو مجھے دل سے عزیز ہے اور جس کی کامیابی کا میں تہ دل سے خواہاں ہوں تاکہ پاکستان میں اسلامی اقدار فروغ پا سکیں۔

"میں ممنون ہوں گا اگر آپ اوقات کار میں میرے دفتر میں تشریف لائیں اور یا اپنی سہولت کے مطابق آپ میرے مکان پر آ جائیں۔ بس میری اتنی درخواست ہے کہ آپ ملاقات کے ٹھیک وقت اور مقام کے لئے مجھے فون کر لیں۔ میرا فون نمبر ۲۲۳۴ ہے اور مکان کے پتے کے لئے یہ مناسب ہو گا کہ آپ آنریبل وزیر داخلہ کے دفتر میں معلوم کر لیں۔"

بیحد احترام و شکر گزاری کے ساتھ

آپ کا دوست

اے، کے فضل الحق

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خصوصیّت

(مسز آمنہ کمال، پرنسپل سرسید گرلس کالج)

میرے علم میں شہر کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ایک ایسا ادارہ ہے جسے سچے دل سے اسم بامسمٰی کہا جا سکتا ہے۔ اس ادارے نے آل پاکستان کے الفاظ اور اس کے معنے کو پیش نظر رکھ کر ان کا حق ادا کیا اور کبھی اجتماعی مقاصد سے ہٹ کر ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں نہیں بنائیں۔ کبھی کسی قسم کے تعصبات میں شمولیت اختیار نہ کی۔ بڑی فراخدلی سے اپنے بعض نظریاتی مخالفین کی خوبیوں کو بھی سراہا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے سرسید گرلز کالج جیسا معیاری ادارہ قائم کیا اور مسلسل اس کے معیار کو برقرار رکھا اور بلند کیا۔ یہ استقلال بھی کم انجمنوں کو نصیب ہوا۔ ورنہ تھوڑے دن کو بہت سی روشنیاں جل اٹھتی ہیں اور نظر کو خیرہ کر کے غائب ہوجاتی ہیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سب سے بڑی خصوصیّت جس نے مجھے ہمیشہ بے حد متاثر کیا یہ ہے کہ اس ادارے نے کبھی سرمایہ داروں اور اہل زر کے بل بوتے پر اپنے منصوبے نہیں بنائے بلکہ ہمیشہ علمی سرمایہ داروں کی تلاش کی، اس ادارے کے رفقاء

اور کارکن سب کے سب مخلص علمی شخصیتیں ہیں ۔ ادارے کی بلند عمارت کی بنیاد اور ترقی کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی روح رواں قسم کی دو چار شخصیتیں ہی نظر آتی ہیں جن کی کوشش سے بڑے بڑے دانشور اپنا وقت اور اپنی قابلیت خوشی خوشی حوالے کرتے جاتے ہیں ۔

اس ادارے میں ایک شخصیت محترم سیّد الطاف علی صاحب بریلوی کی ہے جن کی علم دوستی، سادگی، وضعداری، استقلال، محنت اور انکسار نے دراصل آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو یہ ترقی اور ناموری عطا کی۔ حق تو یہ ہے کہ دنیا میں یہی صفات ہیں جو مشعل راہ بن کر دور تک راستوں کو جگمگا دیتی ہیں ۔

میری دلی تمنا ہے کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جو اپنی عمر کے ۲۵ سال پورے کرکے سلور جوبلی منا رہی ہے بسیّد الطاف علی صاحب کی موجودگی ہی میں اپنی گولڈن جوبلی بھی منائے اور ہم سب فخر کے ساتھ اس میں شریک ہوں ۔ (آمین)

(آمنہ کمال)

اُردو اور اُردو میں قانون کی تعلیم

(از جناب جسٹس قدیرالدین احمد صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس)

مکرمی جناب الطاف علی صاحب ۔ السلام علیکم

آپ نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ العلم کے جوبلی نمبر کے لئے ایک ایسا مضمون لکھوں جو اردو زبان کے مسائل کی مشکلات کی نشاندہی کرے مقصد اردو زبان کی خدمت اور اس کی درستی ہی تھا چنانچہ میں نے سوچا کہ میں نے جو مقالہ اردو کالج کی قانون کانفرنس میں بطور مہمان خصوصی پڑھا ہے اس میں اردو زبان کو ترقی دینے کا ذکر بھی ہے اس لئے آپ کے پرچے کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے لہذا اس کی ایک نقل اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں ۔ امید ہے آپ اس کو پسند کریں گے ۔

اس میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ نئے بھی ہیں اور کارآمد بھی

خیر طلب

قدیرالدین احمد

---

۲۶ مئی ۱۹۷۵ء کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب پرنسپل اردو کالج نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس کالج میں جو طلباء تعلیم پا رہے ہیں ان میں ایسے بھی ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور یہ کہ کراچی یونیورسٹی کے طلباء میں عام رجحان یہ ہے کہ جو انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم پاتے ہیں وہ بھی امتحانوں میں سوالات کے جوابات اردو میں لکھتے ہیں۔ یہ بات بہت اطمینان بخش ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کالج کے پروفیسروں نے اور اردو زبان کے مصنفین اور مترجمین نے اس زبان میں طلباء کیلئے اس سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچادی ہیں جو ان کو انگریزی میں حاصل ہیں ۔ یہ خدمت نہایت قابلِ قدر ہے ۔

مجھے ایک زمانہ میں اس کا اتفاق ہوا تھا کہ میں ایل ایل بی کے امتحانات کے پرچے دیکھوں ۔ میں نے ایسے پرچے دیکھے ہیں جو ایک ہی امتحان کے تھے سوالات وہی تھے مگر بعض طلباء نے اردو میں جوابات . . . لکھے تھے اور بعض نے انگریزی میں ۔ اردو اور انگریزی کے جوابات کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ جن طلباء نے اردو میں جوابات لکھے تھے انھوں نے مضمون کو زیادہ بہتر سمجھا تھا ۔ ان کے جوابات سلجھے ہوئے تھے ۔ جن طلباء نے انگریزی میں جوابات دیئے تھے انھوں نے بظاہر مضمون کو کم اچھی طرح سمجھا تھا اور

جوابات میں جو زبان استعمال کی تھی اس میں بہت سے زباندانی
کے نقص پائے جاتے تھے اکثر مطلب پورا نہیں ہوتا تھا۔ ان میں
سے جو بہترین جوابات تھے ان میں کتابوں کی زبان استعمال کی
گئی تھی اور بہتر یادداشت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جس طالبعلم
کو سب سے اچھے نمبر ملے اس نے انگریزی میں جوابات لکھے تھے اس
کے پرچے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کو کتابوں کے فقرے
فقرے حفظ ہو گئے تھے۔ جن کو اس نے بیشک سلیقے سے استعمال
کیا تھا۔ مگر کتابوں کے مواد کو اکٹھا کر لینا اصل تعلیم نہیں ہے قانون
کی اصل تعلیم یہ ہے کہ اصول قانون کی گہرائیوں تک ذہن کی رسائی
ہو جائے نیز قانونی طرز فکر پیدا ہو۔

کراچی میں اگر وہ طلبا بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے
اردو میں جوابات دینا آسان سمجھیں تو تعجب نہیں کیونکہ ہمارے
ملک کی ساری زبانوں کی ساخت ملتی جلتی ہے اور انگریزی
زبان سے بہرحال ہمارے طالب علموں کی طبیعت اور طرز فکر
سے قریب تر ہے۔ اگر اردو دانوں نے زبان اردو کی صلاحیتوں
سے فائدہ اٹھا کر اس کو اور سادہ اور آسان بنایا اور
نئے نئے علوم سے بھر دیا تو ہر ایک پاکستانی اردو سیکھ کر
خوش ہوگا اور اس پر فخر کرے گا۔

ان حالات میں اس کالج کے پروفیسر اور اردو زبان میں
کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کرنے والے اصحاب اردو زبان
میں طلبا کے لیے جو آسانیاں مہیا کر رہے ہیں وہ خدمت
طلبا کی بھی ہے اور اردو زبان کی بھی۔

انگریزی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔

مگر یہ بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا قانون
پہلے انگریزی میں مرتب ہوتا ہے اور اسی زبان میں ہماری
پارلیمنٹ اس کو پاس کرتی ہے اس لیے انگریزی زبان کا اچھی طرح
آنا بھی ضروری ہے۔ اگر اس میں کمی اور کسر رہ گئی تو بات شروع
ہی میں الجھ جائے گی۔ میری عمر کا بہت بڑا حصہ ان اصحاب
کے ساتھ گزرا ہے جو کم از کم ڈبل گریجویٹ تھے مگر میں نے دیکھا
ہے کہ ان کی اکثریت قانون کی زبان کی نزاکتوں کی بالکل
پرواہ نہیں کرتی تھی یا اس سے واقف نہیں تھی حالانکہ
قانون میں زبان کی اہمیت بہت ہے۔ بہت سے دیگر علوم
میں تو یہ ہو سکتا ہے کہ مطلب اور مقصد کو سیاق و سباق
سے بات کو سمجھ کر الفاظ کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے مگر
قانون میں ایسے مواقع شاذ و نادر آتے ہیں۔ قانون میں
زبان کی نزاکتیں اور نفاستیں دیگر علوم کی نسبت بہت زیادہ
اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے جب تک اصل قانون انگریزی
میں ہے۔ اس وقت تک انگریزی زبان کے الفاظ کا وزن
ملتے جلتے الفاظ کے معانی کی حدود، ان کے متعلقہ تصورات
جملوں اور فقروں کی ترکیبوں کا اثر خوب اچھی طرح معلوم
ہونا چاہیے۔ اگر یہ نہ ہوا تو مطلب غلط اخذ کیا جائے گا اور
پھر الزام اردو پر آئیگا۔

اردو زبان کی مزید خدمت

پرنسپل صاحب کی تقریر سے ظاہر ہے کہ اس کالج کے
پروفیسروں اور طالب علموں نے اب تک بھی اردو کی بہت کچھ
خدمت کر دی ہے مگر آپ صاحبان کے لیے مزید اور خاص موقع
ہے کہ اردو کی اور زیادہ خدمت کریں۔ آپ حضرات ایک
ایسی خدمت کر سکتے ہیں جو دوسرے اردو داں نہیں
کر سکتے اور وہ یہ ہے کہ آپ اردو زبان میں غیر ضروری فقروں
اور لفاظی کے رجحان کو دور کریں اور بیان کی بنیاد الفاظ

کو بنانے کی بجائے خیالات اور معانی کو بنائیں ۔ تقریر اور تحریر کا محور الفاظ کے حسن کی بجائے خیالات اور معانی کا حسن اور ندرت ہو جائے

بہت سی مشرقی زبانوں کی طرح اردو زبان کی ابتدا بھی شاعری سے ہوئی ۔ اس لئے اس میں خوبصورت الفاظ کا استعمال اور جذباتی طرزِ بیان زیادہ عام ہوا اور یہ طرز اختیار کرنا زیادہ آسان بھی رہا ہے ۔ مولانا حالی ۔ مولانا شبلی اور سرسید احمد خان کے زمانے سے پہلے اردو نثر نگاروں کا طرزِ بیان زیادہ تر شاعرانہ تھا ۔ ایک بات کو کئی کئی دفعہ اور ضرورت سے زیادہ الفاظ میں بیان کرتے تھے ۔ مبالغہ قابلِ تعریف صفت تھی اور مقفٰی مسجع عبارت کی خوب خوب تعریف ہوتی تھی مگر جب مذکورہ بالا اصحاب نے اردو زبان سے علمی کام لینا چاہا تو اپنے مقصد کو صاف صاف سمجھانا پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم طرز کو بھی چھوڑنا پڑا اب اردو زبان کا طرز بالکل اور ہو گیا ہے ۔ اب سادگی عام ہو گئی ہے مگر اب بھی اکثر عبارات ایسی لکھی جاتی ہیں جن کو آپ پڑھ جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کے بل بوتے پر بیان زیادہ ہے اور خیالات پر انحصار کم ہے ۔ آپ لوگ اس طرف جتنی زیادہ توجہ کریں گے اتنا ہی آپ کو فائدہ ہوگا اور اردو زبان کی خدمت ہوگی ۔

الفاظ اور فقروں کو ان کے معانی سے تولیے

اب تک جس قدر خدمت ہو چکی ہے اس کے باوجود اردو زبان میں بلا کم و کاست معانی کو بیان کرنے کا رجحان اس قدر کم ہے کہ ترجمہ کرنے والے بسا اوقات اس کا خیال ہی نہیں کرتے کہ اصل مطلب مکمل صحت کے ساتھ ادا ہو گیا یا نہیں جس فقرے کا ترجمہ کیا گیا اس کا کوئی پہلو دب تو نہیں گیا ۔ اگر دو ملتے جلتے الفاظ کا ترجمہ کیا گیا تو دونوں لفظوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہو گیا یا نہیں میرے پاس ہمارے ملک کے دستور کا ایک اردو ترجمہ ہے اگر اس کو آپ ہمارے انگریزی زبان کے دستور سے ملائیں تو معلوم ہوگا کہ متعدد جگہ پوری بات ہی ترجمہ میں نہیں آئی اس کی ایک وجہ تو جلدی اور بے پرواہی ہو سکتی ہے مگر الفاظ کا ترجمہ بھی احتیاط سے نہیں کیا گیا ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بہت سے اردو دان اصحاب کو ان باریکیوں کی پرواہ ہی نہیں ہوتی یہ عادت اردو دانوں میں خاص نہیں ہے بلکہ مشرقی زبان دانوں کا یہ عام رجحان ہے ۔ میں اردو کا ذکر اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ مجھے دیگر ساری زبانوں سے اس وقت واسطہ نہیں ہے ۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اردو زبان کو صحتِ لفظی صحتِ بیانی اور خیالات کے ابھار سے ایک جاندار اور مثالی زبان بنائیں ۔ آپ توجہ کریں تو اس کام کو کر سکتے ہیں کیونکہ قانون ایسا مضمون ہے جو قدم قدم پر اس ضرورت کو جتاتا رہتا ہے آپ لوگ ان صفات کی قدر و قیمت سے واقف ہیں ۔

صحت کی طرف خاص توجہ اور محنت کی ضرورت

آپ کو شاید تعجب ہو کہ ہماری زبان میں لوگ اس طرف سے اس قدر بے توجہی برتتے ہیں کہ ACCURATE اور PRECISE EXACT کے لئے علیحدہ علیحدہ الفاظ مستعمل نہیں ہیں ۔ اگر آپ بابائے اردو کی مرتب کردہ ENGLISH-URDU-DICTIONARY کو دیکھیں تو یہ بات ثابت ہو جائے گی ۔ اس میں بابائے اردو پر حرف نہیں آتا کیونکہ لغت تو زبان کی اصل کیفیت کا عکس ہوتی ہے یہ کمی ہماری زبان میں ہے ۔ اگر آپ ان تینوں الفاظ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ACCURATE میں

ٹھیک ٹھیک ہونے کے ساتھ احتیاط کا تصور ہے۔ EXACT میں ٹھیک ٹھیک ہونے کے ساتھ ظاہری شکل کا تصور ہے اور PRECISE میں ٹھیک ٹھیک ہونے کے ساتھ مطلب کی ادائی کا تصور ہے مثلاً احتیاط سے بنا یا ہوا زمین کا صحیح نقشہ ACCURATE ہوتا ہے کسی کا صحیح مجسمہ EXACT ہوتا ہے اور بالکل مناسب لفظ PRECISE ہوتا ہے۔ یہ تینوں الفاظ انگریزی زبان میں عام طور پہ استعمال ہوتے ہیں اور جاننے والے ان کے فرق کو پہچانتے ہیں۔ اس فرق کا ہماری زبان میں عام احساس نہ ہونا طبیعت کے رجحان کا نتیجہ ہے۔

یہ مثال تو ادائے مطلب کی صحت کی طرف سے عام بے توجہی کی ہے۔ اب ایک قانونی مثال لیجئے ہمارے دستور کے PREAMBLE یا تمہید میں ایک جگہ درج ہے کہ

" ..... THE PRINCIPLES
OF .... EQUALITY ....
AS ENUNCIATED BY
ISLAM SHALL BE
FULLY OBSERVED "

اس کے بعد درج ہے کہ:-

" .... RESOLVE TO
PROTECT ..... UNITY
AND SOLIDARITY BY
CREATING ON EQUALI-
TARIAN SOCIETY
THROUGH A NEW ORDER."

میں نے ہمارے دستور کے ترجمے اردو اور عربی زبان میں دیکھے ہیں۔ ان دونوں میں EQUALITY اور EGALITARIAN کا ترجمہ "مساوات" پر مبنی اور "المساواۃ" کیا گیا ہے حالانکہ انگریزی کے دونوں الفاظ میں بین فرق ہے۔ یہ فرق ترجموں میں ظاہر نہیں ہوا۔ لفظ EQUALITY میں مساوات کا اقرار پایا جاتا ہے اور لفظ EGALITARIANISM میں مساوات کی طرفداری اور اس کے قائم کرنے کا تہیہ پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں صفات اسلام میں موجود ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ پہلے تو دستور میں یہ لکھا گیا کہ اسلامی مساوات پر عمل کیا جائے گا اس کے بعد یہ لکھا گیا کہ اتحاد اور استقامت کی حفاظت کے لئے EGALITARIAN معاشرے کا ایک جدید نظام قائم کیا جائیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان جاننے والوں کو ایک احساس نہیں دلایا گیا کہ EGALITARIAN معاشرہ قائم کرنے کے لئے جدید نظام قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ معاشرہ خود اسلام کے ذریعہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ خیال کسی کو اس وجہ سے نہیں آیا کہ اسلام کے قانونی تصورات کی صحت کی طرف پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ حالانکہ غیر مسلموں نے اس طرف توجہ دی ہے چنانچہ (ENCYCLOPAEDIA BRITINNICA 1969) میں اسلام کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں لکھا ہے کہ:-

" THE MOST FUNDAMENTAL
DYNAMIC FACTOR OF SOCIAL
ETHIC THAT ISLAM GAVE

NAS EGALITARIANISM

مگر مساوات کی طرفداری اور مساوات کے پیدا کرنے کا تہیہ مسلمانوں کی گفتگو میں ظاہر نہیں ہوتا۔ جب ہم مساوات کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا اقرار اس طرح کرتے ہیں کہ وحدت ربانی سارے انسانوں کی مساوات کا مخرج اور منبع ہے اور یہ دیکھو کہ جب مسلمان نماز پڑھتے ہیں تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ درست ہے مگر یہ اسلامی تصور مساوات کا مکمل بیان نہیں ہے ایسی کمی پورا کرنا مسلمان قانون دانوں کا کام ہے اور وہ قانون دان اس کام کو زیادہ بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں جو اسلامی قانون کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں جانتے ہیں چنانچہ یہ کام کرنا آپ لوگوں کا خاص منصب ہے۔

آپ صاحبان جب کسی فقہ کے مسئلے کا مطالعہ کریں تو دستور اساسی کا جو علم آپ حاصل کرتے ہیں اس کو کام میں لا کر اسلامی تصورات کو سیاست مدنیہ سے منطبق کیجیے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرح جو دستور اساسی کے قانون کو نہیں جانتے فقہ کے مسائل کی مثالوں کو عقائد اور عبادات تک محدود نہ کیجیے تاکہ اس قانون اسلامی کی یہ خاص خدمت کر سکیں

قانون اسلامی کی خدمت

جب آپ اسلامی EGALITARIANISM کی گفتگو کریں تو فقہ اسلامی کے جن اصولوں کا تعلق سیاست مدنیہ سے ہے اس کو بھی ظاہر کرنا نہ بھولیے محض عقائد اور عبادات کی مثالوں سے ان کا اطلاق اور اثر محدود نظر آنے لگتا ہے

اگر کوئی قانون دستور کا ماہر اسلامی EGALITARIANISM کی مثال دے گا تو یہ کہہ سکتا ہے کہ "ہاں! اسلام میں مساوات کے قائم کرنے کا یہی تہیہ بھی ہے چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت قائم ہوئی تو اس وقت وہ ایک نیا ادارہ تھا مگر اس وقت خلفائے راشدین نے نہ کوئی امتیازی مقام و حقوق طلب کیے اور نہ کسی نے ایسے حقوق ان کو دینے کا خیال کیا۔ خلفائے راشدین کی رہائش۔ آمدنی۔ عدالت میں حاضر ہوتے یا کسی اور لحاظ سے باقی مسلمانوں پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی بس ان کو خدمت امت کے لیے اختیارات سونپے گئے تھے تاکہ وہ اپنے منصب کے فرائض ادا کر سکیں اور امت کا فرض یہ تھا کہ خدا اور رسول خدا کے احکام کی بجا آوری میں ان کی فرماں برداری کریں۔

لفظ مساوات کے عام تصور میں ایک طرح کا جمود ہے اور EGALITARIANISM کے تصور میں اس کے فروغ کا تصور ہے۔ اگر اس فروغ اور حرکت کو خیال میں رکھا جائے تو پھر SOCIALISM سے مساوات کے فروغ کا سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی اور نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ صنعتی انقلاب سے مزدوروں اور کارخانوں کے مالکوں میں جو فرق پڑ گیا ہے دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے غریب اور امیر میں جو سفید و سیاہ کا تفاوت ہو گیا ہے۔ زمینداریوں کے وسیع ہونے سے جو مالکان اراضی اور کسانوں میں حاکمیت اور غلامی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس کو مساوات برلانا خود اسلام کی منزلوں میں سے ہے۔ اسلام کے

تصورات میں عمل کے لئے جو وسعت موجود ہے وہ جامد نہیں بلکہ متحرک ہے

دستور میں اسلامی تصورات کی اہمیت

ہمارے دستور کی شق ۲ ہمارے ملک کے دستور کی تاریخ میں پہلی دفعہ اور صاف صاف یہ کہتی ہے کہ حکومت پاکستان کا مذہب اسلام ہے۔ باب نمبر ۹ میں وہ اقدامات گنائے گئے ہیں جن کے ذریعے سے اسلامی قانون نافذ کیا جائیگا۔ ان کے علاوہ تین شقیں اور بھی ہیں یعنی شق نمبر ۲۹۔ نمبر ۳۰ اور ۳۱ جنکے ذریعے ہر عضو ریاست اور حاکم پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے کاموں کی حدود کے اندر اسلام کے بنیادی اصولوں اور اسلام کے جوہری تصورات کے مطابق عمل کرے مگر ان دستوری ہدایات پر عمل نہیں ہو رہا ہے حالانکہ عدلیہ بھی حکومت کا ایک عنصر ہے۔ چنانچہ اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان ہدایات پر عمل کرے جب تک اسلامی قانون نافذ نہیں اس وقت تک عدالتوں پر لازم ہے کہ وہ متبادل قانون پر عمل کرے مگر یہ مشہور بات ہے اور قانون دان اس کو خوب جانتے ہیں کہ کسی قانون میں ہر موقع کے لئے تفصیل نہیں ہوتی چنانچہ بنیادی اصولوں اور جوہری تصورات سے مدد لے کر اس کے وسیع تر معنی سمجھے جاتے ہیں وہ اصول اور تصورات آج تک عدالتوں اور خاص کر اعلیٰ عدالتوں میں مغربی ہیں۔

یہ کام آپ جیسے وکلاء صاحبان کا ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور اسلامی جوہری تصورات کی نشان دہی کریں۔ ان کو خوب سمجھیں اور عدالتوں میں پیش کریں تاکہ عدالتیں ان کو استعمال کر سکیں۔ اس کام کے کرنے کے لئے اس کالج کے طلبہ خاص طور پر موزوں ہیں۔ یہاں خدا کے فضل سے ایسے اساتذہ بھی موجود ہیں جو فقہ اسلامی سے بخوبی واقف ہیں اور اس کام میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔

اعلیٰ معیار

یہ کام بڑے اعلیٰ معیار کا طلبگار ہے۔ اور اس کے کرنے کے اہل آپ لوگ سب سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے اس کام کو اتنا بھی کر دیا کہ رہبری ہو جائے تو سارے ملک کی آنکھیں آپ کی طرف لگ جائیں گی اور اس کالج کا مقام ان قانونی اداروں میں ہو جائیگا جو تاریخ میں یادگاروں کی حیثیت رکھتے ہیں

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ آپ لوگ انگریزی کو اس وقت تک نظر انداز نہ کیجئے جب تک ہمارے اصل قوانین انگریزی میں وضع کئے جاتے ہیں مگر اردو زبان سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھائیے اور خود زبان اردو میں وہ قوت پیدا کیجئے جو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک الفاظ کے استعمال اور فقروں کی ایسی بندش سے نمودار ہوتی ہے جس میں اصل مطلب بلا کم و کاست ادا ہو۔ اس کے علاوہ یہ موقع غنیمت جان کر اسلام کی خدمت کر لیجئے۔ یہ اس طرح کہ اسلام کے بنیادی اصول اور جوہری تصورات کو صحیح وضاحت کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیجئے تاکہ ان کے استعمال کرنے کی راہیں خود بخود نکل آئیں۔ آپ ملک و ملت کی خدمت کر سکتے ہیں۔

علی گڑھ سے جدائی ــــــ! علی گڑھ کی یاد!

از

جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی مدظلہٗ

ہماری علی گڑھ برادری کے فی الوقت سب سے بڑے بزرگ جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی میرے استاد بھی ہیں اور روحانی پیشوا بھی۔ قریب ۴۵ سال سے مجھے ان کی شفقت بے پایاں سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قریشی صاحب کی عمر شریف اب اٹھاسی سال سے متجاوز ہے" اور بقول ایک عزیز اگرچہ میں خود بہتر کے پیٹے میں ہوں اور اس عمر میں آدمی اپنے کو بجا طور پر بوڑھا سمجھنے لگتا ہے۔ اور جب صحت بھی خراب ہو تو محض ضعیفی میں سلام ہی کیا رہ جاتا ہے لیکن ناظرین کرام یہ بات سن کر خوش ہوں گے کہ جب تک حضرت قریشی صاحب زندہ سلامت ہیں۔ میں اپنے آپ کو جوان سال متصور کرتا ہوں۔ میری یہ حقیقی یا مصنوعی جوانی "لغیوائے دل پائدار" رہبیت قریشی صاحب پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکی جس کا ثبوت یہ ہے کہ موصوف نے تعلیم و تعلم کی انتہائی کامیاب سروس کے بعد میری ناچیز تحریک پر ۸۰ سال کی عمر میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک صرف چار سال کے عرصہ میں تین معرکۃ الآرا کتابیں (۱) مقدرِ انسانی ۴۵۰ صفحات (۲) چند عظیم علمائے جراثیم ۴۸۵ صفحات اور (۳) عظیم علمائے نفسیات ۶۰۰ صفحات (کل ۱۵۳۸ صفحات) تیار کر دیں جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے شائع بھی ہو گئیں۔ اپریل ۱۹۶۳ء سے ایک دل آویز سلسلۂ مضامین "علی گڑھ میں میرے چالیس سال" بھی شروع کیا تھا جس کی تین قسطیں "العلم" میں شائع ہوئیں۔ افسوس ہے کہ آنکھوں کی تکلیف بڑھ جانے کے باعث یہ سلسلہ مکمل نہ ہو سکا۔

قریشی صاحب نے زمانۂ طالب علمی سے باسٹھ سال کی عمر تک علی گڑھ میں قیام کیا اور اس شان سے کہ وائس چانسلر کے بعد ان کی پوزیشن تھی بے مثل ہر دلعزیزی کے مالک تھے۔ ظاہر ہے ایسے میں ان کو علی گڑھ سے جس قدر بھی محبت ہو کم ہے۔

ذیل کے دس خطوط جناب قریشی صاحب نے ۱۹۴۹ء میں پاکستان آنے کے بعد راقم کے نام سپردِ قلم

فرماتے تھے۔ جن کو میں نے اپنی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی رسالہ "مصنف" علی گڑھ کے آخری شمارہ بابت ستمبر ۱۹۴۹ء میں یکجائی طور پر شائع کر دیا تھا۔ میں خود جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگیا۔

خطوط مذکورہ کے ایک ایک لفظ سے خلوص اور محبت کی بھرپور غمازی ہوتی ہے۔ اور پھر طرز نگارش ایسا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ خود علی گڑھ کے اکابر مثلاً پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب وغیرہ نے ۱۹۴۹ء میں جب ان خطوط کو پڑھا تو حیرت کا اظہار کیا۔ اور کہا "ہمیں آج تک نہیں معلوم تھا کہ قریشی صاحب ایسی لاجواب اردو بھی لکھ سکتے ہیں۔"

سچ ہے بعض انکشافات جگ بیتنے کے بعد ہوا کرتے ہیں۔ (بریلوی)

کراچی۔ ۱۷ نومبر ۱۹۴۷ء

افسوس ہے کہ علی گڑھ سے روانگی ایسی جلدی میں ہوئی کہ آپ سے ملنا بھی نہ ہو سکا۔ اور بالخصوص جب یہ بھی پتہ نہیں کہ پھر کب ملاقات ہوگی۔ حالات نے جو پلٹا لیا ہے اور آئے دن جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں وہ ایسے نہیں کہ اب دلجمعی جلد واپس آئے لیکن دل غم زدہ ان گلیوں کو اب تک یاد کر کے روتا ہے جہاں جوانی کے حسین افکار و حوادث دفن ہیں۔ خیر! میں ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یکایک علی گڑھ سے چل دیا۔ یہاں تک کچھ طے نہ تھا۔ یکم نومبر کو دہلی میں رہا۔ ۲ر نومبر کو ۹ بجے صبح ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر ۱۱ بجے ملتان پہنچا جہاں مہذب علیہ الرحمۃ ۶۶۲ھ میں پہنچے تھے۔ ۳ر کو ڈیرہ غازی خاں جہاں کچھ دن رہ کر بچوں کو وہاں چھوڑا اور ۱۱ر کو میں یہاں پہنچا۔ سفر کی صعوبتیں سخت جاں گداز ہیں۔ اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ سفر ناممکن ہو گیا ہے۔ ابھی تک وطن نہیں جا سکا۔ یہ بھی نہیں معلوم کب تک جانا ہوگا۔

آپ سب بہت یاد آتے ہیں۔ کانفرنس کے کارکنان حکیم صاحب شریف الزماں شیخ عطاء اللہ صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب سراج الحق قریشی صاحب، مولانا اکرام اللہ ندوی غرضیکہ جو ملے اس سے کہہ دینا کہ مجھے سب یاد آتے ہیں اور اسلام پہنچا دینا۔ یہ دوسرا خط نواب صاحب قبلہ (صدر یار جنگ) کی خدمت میں بھجوا دینا۔ خدا حافظ!

کراچی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء

"محبت نامہ ملا۔ عید کے بعد تمہارے نہ ملنے سے یہ خیال ہوا تھا کہ شاید تم علی گڑھ سے باہر ہو لیکن پریشانی میں معلوم نہ کر سکا۔ علی گڑھ میں ۴۴ سال کی رہائش کو ترک کرنا آسان نہ تھا۔ بھاری پتھر کلیجے پر رکھنا پڑا۔ اب بھی بے خبر نہیں کہہ سکتا۔ کونہ کونہ اور بچہ بچہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ واپسی کے لئے جی تڑپ رہا ہے۔ پاکستان میں ان دنوں ایک تعلیمی کمیٹی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا تھا میں بھی حصہ لوں لیکن رہی خود داری مانع رہی۔ اب تک سوائے حلیم صاحب کے اور دو

بھی ایک دفعہ ان کے دفتر میں، اور کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کراچی کی دنیا میرے لئے نئی اور ایک حد تک غریب الوطنی کی دنیا ہے۔ کام کرنے کے مواقع یہاں اور وہاں بہت ہیں لیکن مجھ میں جرات کی کمی ہے اور دنیا صرف گھسنے والوں کے لئے کشادہ۔ آپ جیسے مخلص رفیقوں نے اب تک مجھ سے کام لیا۔ یہاں کون پوچھتا ہے۔ تم کہتے ہو علی گڑھ آجاؤ۔ علی گڑھ میں نے چھوڑا کب۔ اگر وہاں کام کرنے کے مواقع رہے تو ضرور آؤں گا۔ جو فضا اس وقت ملک میں ہے اس میں صحیح کام ممکن نہیں۔

جو طرزِ عمل ملک اب چاہتا ہے وہ میرے اندر نہیں۔ میں بنی نوعِ انسان اور اس کی حاصلات کو ایک جائداد سمجھتا ہوں۔ اس کا مٹانا مٹتے دیکھنا میرے بس کی چیز نہیں۔ جو تباہی اور بربادی ملک میں ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اس پر دل روتا ہے۔ لیکن رونا یوں ہے کہ میں بے بس ہوں، علی گڑھ چھوٹ نہیں سکتا اور اب تعلیمی پروگرام سے زیادہ اصلاحی پروگرام ضروری ہے۔ حیوانیت سے پھر انسانیت کی طرف رجوع کرنا ہے۔ انسان اپنی بلندی کے خوابوں سے محروم ہو گیا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

پیر الٰہی بخش صاحب سے اب تک میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اور نہ میں کسی گراں مایہ ہستی سے ملا ہوں۔ میں اپنی خو سے مجبور ہوں۔ تمہاری ضرورت ہر قدم پر محسوس کرتا ہوں۔ پرسندگان حال کو سلام اور حال بھی سمجھا دینا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

میں اپنا آئندہ کا پروگرام اس وقت طے کروں گا جب لاہور ہو آؤں۔ سردست سفر مشکل ہے۔ کوئلے کی قلت کی وجہ سے گاڑیاں کم ہیں ریلوں میں وہ بھیڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ابھی تک خانہ بدوشی کی زندگی ہے کوئی مستقل جائے قیام بنے تو کام کروں۔ بچے زیادہ تر ڈیرہ غازی خان، کچھ یہاں ہیں جو وہاں ہیں ان کی تعلیم کا وہاں انتظام کیا ہے۔ بعض کو یہاں داخل کرا رہا ہوں۔ علی گڑھ کیا چھٹا سب نظم ختم ہو گیا ہے۔ اب زندگی کیا ہے! ہاں خدا کا شکر ہے ہزاروں سے اچھی ہے۔ کسی کام کے کرنے کا البتہ ابھی سامان نہیں۔

تو خدا حافظ! گھر میں بچوں کو دعا

کراچی ۔ ۷ دسمبر ۴۸ء

۳ دسمبر کا محبت نامہ پیشِ نظر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کا مضمون "غلط زاویے" بھی بالاستیعاب ہی نہیں غور سے پڑھا۔ تاریخ و سائنس کے مادی نظریوں نے قوموں کی جو گت بنائی ہے۔ اس نے اب تک بھی ہمیں بیدار نہیں کیا۔ عقل جو بیش از یں کچھ نہیں کہ ہماری مادی ضروریات اور جذبات کی فراہمی اور پرورش کے لیئے ایک آلۂ کار ہے۔ اب تک مصیبت سے بچنے کے لیئے کارفرما نظر آتی ہے۔ مادی اور طبعی ضروریاتِ انسانی تسلیم لیکن یہ انسان اور حیوان میں مشترک ہیں

انسان اس سے بہت بالاتر ہستی تھی، یہ حقیقت فراموش ہوگئی۔ پاکستان اور ہندوستان دنیا کے عام رجحانات میں شریک ہیں۔ اخلاقی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیئے وحی کی تعلیم کی طرف جانا کوئی ملک و قوم پسند نہیں کر رہا۔ گو یہاں اور وہاں سب جگہ لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جو گتھیاں انسانی ترقی میں پڑگئی ہیں وہ اکیلے عقل کی بس کی نہیں۔ زاویۂ نگاہ کو یکسر بدلنا ضروری ہے لیکن ابھی خدا سے بھٹکا ہوا انسان راہِ راست پر آہی نہیں رہا۔ تمہارا مضمون بھی اسی راہ پر ہے۔ اعترافِ شکست اس میں نہیں لیکن علاج وہی تحریر ہوا ہے جو مادی نگاہ کو نظر آیا۔ ارے بھائی معاف کرنا! میں نہ معلوم بہک کر کہاں سے کہاں جانکلا۔ مقصود تمہارے مضمون کی تحقیر نہ تھی، سب مفکروں کی تھی۔ خیریہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ علی گڑھ کی فضا امید افزا ہے خدا کرے آپ سب کو پورا اطمینان ہو۔ شریف صاحب وغیرہ واپس آگئے بہت اچھا ہوا۔ تیسری جنگ عظیم اگر آنے والی ہے تو آئے مجھے کیا اندیشہ عمر بھر کے تعلقات اور محبتوں کا اندوختہ تو پہلے ہی ہاتھ سے جا چکا ہے۔ سرمایہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے گھر بار کچھ ایسی چیزیں نہیں جو دلوں کی خوشیوں کا باعث ہوں۔ پہلا محاذ پاکستان ہو یا ہندوستان، مجھے تو جو چیز رلائے گی، وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کی اخلاقی اور روحانی پستی۔ اس سے جی جلا اور اب بھی جلتا ہے جب وطن میں حیوان ہی حیوان نظر آئیں تو تباہی سے کیوں جی ڈرے۔ حیوانوں کے ساتھ مجھے کیا ہمدردی۔

ہاں جو تمدن و تہذیب ورثے میں آئی تھی۔ وہ جب ہمارے ہاتھوں مٹ گئی اور اس کا ذرہ برابر اثر کسی انسان میں باقی نہ رہا تو اب جنگ، آئے یا کوئی اور تباہی، ہم اس کے مستحق ہیں لہٰذا میں اپنے مستقبل کے پروگرام کو خواہ وہ کام کے متعلق ہو یا رہائش کے متعلق جنگ کے محاذ کے پیشِ نظر طے نہیں کروں گا۔ میں انسانوں کی جماعت کا متلاشی ہوں وہ جہاں میسر آجائیں وہاں رہ پڑوں گا۔ سرِدست کچھ طے نہیں۔ آپ نے جس جس طرح سے علی گڑھ واپس آنے کے دلائل دیئے ہیں۔ اس سے آپ کی محبت و خلوص واضح ہیں۔ لیکن یہ کیسے معلوم کہ میں خود وہاں آنے کو کتنا بے تاب ہوں۔ بعض اوقات تو بے اختیار واپس آجانے کو جی چاہتا ہے لیکن نہ میں نے اپنے ارادے سے علی گڑھ چھوڑا اور نہ واپسی اپنے ارادے کے ماتحت ہوتی نظر آتی ہے۔ بہرحال اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیئے اور اپنے کام میں مجھے شریک۔ یہاں ابھی تک یہاں کسی سے نہیں ملا۔ اور وطن کی طرف بھی ابھی جانا نہیں ہوا۔ جن ضرورتوں کے لیئے یہاں آیا تھا، وہ بھی بدستور معلق ہیں۔

کراچی۔ ۲۳ دسمبر ۴۸ء

غریب اللہ یار قریشی کی دعا سلام بھائی کو اور اور بندے کا۔ توبہ کرو تم سید ہو۔ خدا کا سامنا اور شہنشاہ عظام کی صف میں کیسے کرو گے؟

کون کہتا ہے کہ قریشی ناراض ہے۔ اور وہ بھی الطاف علی سے اور وہ بھی علیگڑھ سے باہر غریب الوطنی میں توبہ کرو۔ خدا سے ڈرو اور مجھے دور بیٹھے بیٹھے گنہگار نہ بناؤ۔ نہیں بھائی میں ناراض نہیں۔

تم کام کرنے کو کہتے ہو جس ناکارہ آدمی سے خط بھی ٹھکانے کا نہ لکھا جائے وہ کام کیا کرے گا۔ ویسے تو جب تک سانس چلتی ہے کچھ نہ کچھ کرتا ہوگا لیکن سردست تو یوں سمجھو کہ ایک نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ اپنے دیار کی کیوں کہوں، کسی دیار کی راہ و رسم سے ناآشنا ہوں۔ میری زبان کون سمجھتا ہے اور نہ میں کسی کی زبان جیسا کام لوگ کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے بن نہیں پڑتا۔ اور جو میں کرنا چاہتا ہوں اس سے کسی کو لگاؤ نہیں۔ کام بنے تو کیوں کر۔ میں ابھی تک یہاں اپنے سامان کا جو بمبئی کے راستے بھیجا تھا۔ انتظار کر رہا ہوں۔ قیاس یہ ہے کہ دو ایک روز میں اب یہاں سے نکلوں گا۔ کہاں جاؤں گا۔ ابھی کچھ طے نہیں۔ پتہ میرا یہیں کا رہے گا۔ ڈاک مجھے ملتی رہے گی۔ ابھی تک حالات سندھ ناسازگار ہیں۔ اور مہاجرین کی نقل و حرکت کی وجہ سے امن و چین کی زندگی ممکن نہیں۔ کانفرنس گزٹ ملا۔ آپ کا مضمون یونیورسٹی کے متعلق دیکھ کر اطمینان ہوا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس کا بھی شکریہ۔ میں سمجھا۔ یہ آپ نے کیوں بھیجا۔ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ پایا۔ یہ روشنی عقل کی عطا کردہ ہے۔ اس لیے جنگل کا دیا ہے۔ شمع ہدایت نہیں۔ اس کے لیے اور ہی روشنی درکار ہے۔ میں نہ آسکا تو تمہارا آنا ضروری ہوگا۔ لیکن کب تک ابھی کچھ نہیں معلوم[1]

ڈیرہ غازی خاں
۶ جنوری ۱۹۴۸ء

محبت نامہ مورخہ ۲۷ دسمبر کراچی سے منعطف ہو کر مجھے کل یہاں ملا۔ جس پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ آپ مجھے یاد کرنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ وہ قابلِ قدر ہے۔ میں تو بیکار رہوں خطوط کا انتظار کرتا رہتا ہوں لیکن آپ ایک کام والے آدمی بلکہ کاروبار والے۔ آپ قابلِ تعریف ہیں ڈاکٹر صاحب (سر ضیاء الدین احمد) کو خدا جنت نصیب کرے۔ کام کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہوئے چاہتے تو بہت پہلے کام کا جوا اتار کر رکھ دیتے اور آرام کرتے۔ لیکن قوم کی خدمت ایک دھن تھی جو جان کے ساتھ رخصت ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ کیا۔ کئی زندگیوں پہ بھاری ہے۔ بہتر بس حالت ہیں کیا کہ اپنے پرائے سب مخالف ہے اور بھی قابلِ عزت ہے۔ مسلمانوں نے ان پر حسد کیا۔ رشک کرتے تو قوم کا بیڑا پار ہو جاتا قوم مرثیہ خوانی اچھی کر لیتی ہے۔ محفلیں اور جلسے کرتی ہے۔ لیکن نہ کسی کے کام کی قدر اس کے دل میں ہے اور نہ خود کام کرنے کے لیے آمادہ مرنے والا مر گیا اور کام کر گیا۔ اب شیخ صاحب ہوں یا سید صاحب اپنے گریبان میں منہ ڈالیں اور شرمندہ ہوں۔ میرے دل پر کیا گزری اور گزر رہی ہے۔ اس کو

---

[1] جی ہاں! جون ۱۹۵۰ء میں مجھے بھی پاکستان آنا ہی پڑا۔ (بریلوی)

کیا لکھوں۔ نصف صدی کا ساتھ تو تھا ہی ایسا کہ ایک لمحے کو خلوص میں لغزش نہ آئی۔ میں نے مرحوم کی عقیدت میں پرورش پائی ہے۔ اور ان کی محبت کے لطف اٹھائے۔ کیا کیا خوبیاں تھیں جو وہ ساتھ لے گئے۔ پرانے اخلاص کے نمونے اب کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ خدا مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

تم نے انکے دفن کے سلسلے میں عزیزی قدوائی (امیر الدین) کا تذکرہ کیا۔ میری روانگی سے کچھ عرصہ قبل سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور میں اس خیال میں تھا کہ وہ علی گڑھ سے چلے گئے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ وہیں ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ میرا سلام ان سے کہنا اور یہ بھی پوچھنا کہ وہ اپنے پیر اور استاد سید ظفر الحسن صاحب کا پتہ مجھے لکھیں۔ میں کراچی میں ڈیڑھ ماہ سے زاید رہا۔ لیکن ان کا پتہ نہ چلا

میں ۲۷ر دسمبر سے یہاں ہوں۔ اس نیت سے آیا تھا کہ آگے وطن کی طرف بڑھوں گا۔ لیکن سفر آج کل سخت صعوبت ہے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی، جاؤں گا لیکن کب تک اس کا پتہ نہیں۔ لکھنؤ کانفرنس (مدعو کردہ مولانا ابوالکلام آزاد) کے ساتھ بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن اخباروں سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ کچھ امید افزا نہ نکلے۔ مسلمانوں کو اپنے رہنماؤں سے چھٹکارہ حاصل کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ میں نے کیا غلط بات کہی ہے۔ رہنما تو قوم کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جو صورت قوم کی ہوگی وہی ان میں جھلکے گی۔ میں کب تک واپس کراچی جاؤں گا۔ کچھ پتہ نہیں۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے

لیکن خدا کرے یہ ان آرزوؤں میں سے نہ ہو جو خاک ہونا اپنے مقدر میں رکھتی ہیں۔ سب پرسندگان کو سلام۔ جمال صاحب

ڈیرہ غازی خاں ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء

محبت نامہ مورخہ ۱۲ر ماہ حال پرسوں ملا۔ یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ بستر علالت پر ہیں۔ خدا کرے جب تک یہ عریضہ پہنچے آپ بالکل اچھے ہوں۔ اب آپ کچھ زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ یہ آئے دن کی بیماریاں اچھی نہیں۔ پھر بیماری تو رئیسوں ہی کے لیے کچھ زیبا ہے کہ حکیم ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ دوائیاں تیار ہو رہی ہیں۔ مصاحبین غمگساریاں کر رہے ہیں۔ اور جھینک کو بخار بتا رہے ہیں۔ کام کرنے والے کے پاس اتنا وقت کہاں۔ اس بے کار شغل کو چھوڑئیے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے متعلق وہ کیا تاثرات تھے جو آپ نے کانفرنس گزٹ کے حوالے کیے۔ میری تحریر کب اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اخباروں میں چھپے اس میں تو ہمیشہ "شخص واحد شخص واحد تک" کی ہی لذت ہوتی ہے۔ آپ کے خط کے ساتھ ساتھ ہی یکم جنوری اور ۱۶ر جنوری کے گزٹ اور رسالہ "مصنف" بھی ملے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ گزٹ اور "مصنف" آپ نے بھجوائے۔ شکریہ قبول کیجئے۔ گزٹ میں پہلی مرتبہ پنڈت سندر لال صاحب کی تحریر میں نے پوری دیکھی۔ جستہ جستہ ٹکڑے اس کے پہلے دیکھے تھے۔ خوب لکھا ہے لیکن ہماری بے حسی کے سامنے یہ سب تحریریں بیکار ہیں۔ "مصنف" کو

دیکھ رہا ہوں۔ "بزمِ مصنف" میں آپ کے احباب کے تاثرات دیکھے۔ (اہلیہ زود فرزد)

یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ عبدالباری صاحب علیل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وصال نے کتنوں کو بے حال کر دیا۔ جب وہ زندہ تھے یہ خیال بھی نہ گزرتا تھا کہ یہ کبھی نہ ہوں گے۔ علی گڑھ کی یاد جب تک رہے گی ان کا نام مر نہیں سکتا۔ باری صاحب کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ قدوائی صاحب کے نام الگ خط رہا ہوں۔ وہ ان کو دے دیجئے۔ لکھنؤ کانفرنس میں شرکت نہ کر سکنے کا مجھے بہت رنج ہے۔ میں بالطبع کانفرنسوں سے دور رہتا ہوں مگر یہ ایک اہم کانفرنس تھی۔ خدا کرے اس کی کوششیں بار آور ہوں اور مسلمانانِ ہندوستان کو مکمل رہنمائی مل جائے۔ یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ ایک اچھی جماعت کام کے لئے نکل آئی۔ خدا کامیابی دے۔

ڈیرہ غازی خاں، فروری ۱۹۴۸ء

یکم فروری کا محبت نامہ کل شام کو ملا۔ تمہارا خط آجاتا ہے تو سمجھتا ہوں علی گڑھ میں نصف صدی کا قیام رائگاں نہیں گیا۔ ہر دلعزیزی کا سب یقین دلاتے تھے، میں بدکتا تھا، اب کہ علی گڑھ سے دور ہوں اور آنکھ سے اوجھل "دل سے دور" کا لطف آرہا ہے کسی محبت کرنے والے کا خط آجاتا ہے تو دل بڑھ جاتا ہے۔

یہ قدوائی صاحب کا خط پڑھوا کر جو آپ نے واپس لے لیا، کیوں؟ اس لیئے کہ میں ان کے جواب سے محروم ہوں: یا عقل سے دور، آپ کا یہ ارادہ ہے کہ ہر رطب و یابس کا آپ ذخیرہ کرتے جائیں۔ اگر کاغذوں کے جمع کرنے کا شوق آپ کا اس حد تک بڑھ گیا ہے تو آپ ہندوستان کیا علی گڑھ بھی کبھی نہ چھوڑ سکیں گے۔ اور پس ماندگان کے لیئے ہفتوں نہیں مہینوں کے لپٹے دفینوں میں سے موتی کی تلاش میں گم رہنے کا مشغلہ چھوڑ جائیں گے۔ خدا کرے کوئی اور نیتِ بد اس میں شامل نہ ہو۔ آپ نے یہ نہ لکھا کہ قدوائی صاحب ہیں کہاں اور کس کام میں مصروف ہیں کہ آپ کے خط کے ہم رشتہ ان کا خط نہ آیا مجھے اس موقع پر کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نعش وہاں آکر دفن ہو رہی ہے۔ علی گڑھ سے اپنی غیر حاضری کا سخت صدمہ ہے۔ اتنی مدت ساتھ رہنا اور شفقت سے لطف اٹھانا اور ایسے وقت میں وہاں نہ ہونا بدنصیبی نہیں تو کیا ہے۔ یہی امید اب تسکین کے لئے رہ گئی کہ وہ چلے گئے تو کیا اپنی روانگی میں زیادہ دیر نہیں۔ ناگوارِ خاطر نہ ہو تو میری طرف سے بھی ان کی تربت پر پھول چڑھا دیجئے گا۔

مجھے یاد پڑتا ہے میں نے پچھلے عریضوں میں لکھا تھا۔ اور اب پھر لکھتا ہوں کہ یہ بیماری کا مشغلہ اچھا نہیں۔ کوئی عضوی بیماری تغیر غیر اختیاری چیز ہے۔ لیکن باقی عام بیماری کی تو میں اختیاری چیز سمجھتا ہوں۔ جب مالی حالت اچھی نہ ہو تو اس سے بچنا ہی

اچھا ہے آپ تندرست رہنے کا طے کر لیجئے اور ڈاکٹر حکیم کی دوستی کم کر دیجئے میں دعا کرتا ہوں کہ آپ مع اپنے خاندان کے اچھے رہیں اور رہیں۔ آمین مہاتما گاندھی کا قتل ایک جاں کاہ حادثہ ہے۔ یہ جو کچھ ہوا اس کے آثار بہت پہلے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اب تو ہجرت کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن جائیں کہاں۔ اس بعنتی برصغیر کے رہنے والوں کو تو کوئی ملک بھی قبول نہیں کرتا۔ تم نے اپنی حالت کے مطابق جو شعر لکھا وہ غالباً مذاق کے پیرائے میں ہے۔ ورنہ میں جانتا ہوں تم اس حالت سے مطمئن نہیں ہو۔ تم کو ابھی کام کرنا ہے اور ضرور کرو گے بھائی تم کو مجھ سے محبت ہے اور یہ تم جانتے ہو کہ محبت کی آنکھیں ہمیشہ خوبی کو دیکھتی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر برائیاں بھی اسے خوبی معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو میرے خطوط میں لذت آتی ہے ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ اتنا احساس ضرور ہے کہ خوش نصیب ہوں۔ آج تک محبت کرنے والوں نے اچھالا۔ جب تک علی گڑھ میں رہا محبت والوں کے خلوص کے سہارے بڑھا۔ پاکستان میں آکر معلوم ہوا کہ یوسف بے کارواں کیا ہوتا ہے۔ توبہ۔ توبہ یوسف کیسا ہاں مطلب یہ ہے اپنی قیمت معلوم ہو گئی۔ علی گڑھ کی دنیا بھی بدل چکی ہے لطف زندگی اب وہاں بھی نہ ملے گا۔ لیکن پھر بھی علی گڑھ علی گڑھ ہے۔

نواب صاحب قبلہ کو صدمہ ضرور ہو گا لیکن جس خاندان اور جن روایات میں ان کی پرورش ہوئی تھی وہ انسان کو کوہ وقار صبر و تحمل بنا دیتی ہے۔ یہ صفات ہمارے نواب صاحب میں بدرجہ اولیٰ ہیں خدا ان کو خوش رکھے گا۔ انشاء اللہ میرا سلام کہیئے گا۔

بھیرہ ضلع سرگودھا مغربی پنجاب
۱۴ مارچ ۱۹۴۸ء

محبت نامہ مورخہ ۱۴ فروری اور وہ لفافہ جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا کارڈ ملفوف تھا آج مجھے یہاں ملے۔ میں ۱۴ فروری کو ڈیرہ غازی خاں سے لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں دو ایک روز قیام کے بعد سرگودھا آیا اور پھر یہاں پہنچا۔ آپ کے مکتوب گرامی کو لوں میرا پیچھا کرنا پڑا اور لطاہر ہے اس میں وقت لگتا ہیں ابھی تک اپنے مستقبل کے متعلق کچھ طے نہیں کر پایا کراچی اور ڈیرہ غازی خان والے وہاں مجھے روکتے رہے لاہور والوں نے اپنے جال پھیلائے۔ سرگودھے پہنچا تو وہاں کی پیشہ یاں کافی سخت گیر ثابت ہوئیں، ایک مکان بھی میرے لئے لیا گیا۔ لیکن میں ہر جگہ غیر مطمئن اور تماشہ ہیں بنا رہا۔ یہاں وطن میں اس نیت سے آیا تھا کہ بزرگوں کی قبروں پر آنکھیں بچھاؤں اور فاتحہ پڑھ لوں لیکن یہاں کی بندھنیں بہت سخت نکلیں ایک مکان لے لیا گیا اور رودہ مرمت اور صفائی طلب تھا۔ کام شروع کرایا لیکن بارشیں امسال اس نواح میں بے طرح ہو رہی ہیں۔ کام ہو نہیں سکتا۔ میں تقریباً گھر میں قید ہوں۔ دل گھبراتا ہے لیکن بے بس ہوں۔ آپ دور ہیں ورنہ کوئی صورت نجات کی نکل آتی۔ زمانے کتنے ہیں

دعا رہے پر میری حالت ایک بیکس تنکے کی ہے ۔ یہ قصبہ پہلے کبھی اچھا تھا، اب سخت گندہ ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ پناہ گزینوں کی کثرت اور بارش کے سلسلے نے اس کو اور تباہ حال کر رکھا ہے ۔ علی گڑھ کی یاد کسی وقت دل سے نہیں جاتی ۔ زندگی سمٹ کر محبت کرنے والوں کے خطوط پڑھنے اور جواب لکھنے پر منحصر ہو گئی ہے ۔ کتاب دیکھے مدتیں ہو گئیں ۔ اخبار بھی کبھی کبھار دیکھنے کو مل جاتا ہے ورنہ بیکاری ہے اور پرانے احباب کی دعوتیں اور بھی ایسے وقت میں جب معدہ ضعیف ہو چکا ہے اور دانت گر چکے ہیں ۔ قدوائی صاحب کے خط کے جواب کا اب تک انتظار ہے ۔ ان کو سر سید کے جانشینوں کو آخری ٹھکانے تک پہنچانے سے فرصت ملے تو زندہ محب کی یاد ان کو آئے ۔

ملیں تو میرا اسلام شوق کہہ دیجیے اور کہیے غالب کے بقول "ایک ہیں ستم ہائے روزگار" اب تک ان کی یاد سے دل کو بہلایا کرتا ہے ۔ وہ وائس چانسلر بنیں یا کسی صوبے کے گورنر ہیں کام کے آدمی ہیں وقت ان کو اچھا نہیں ملا ۔

بھائی میں خط کیا لکھتا ہوں ورق سیاہ کرتا ہوں ۔ یہ تمہاری محبت ہے جو میری تحریر میں لذت پیدا کرتی ہے اور یہ بھی اپنی خوش نصیبی کا صدقہ سمجھتا ہوں ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جو ہنگامہ دہلی ہوا نہ ہوتا تو اچھا تھا ۔ دنیا پر کیسی کیسی آفتیں آئیں لیکن واہ رے علی گڑھ ۔ میرے محبوب علی گڑھ تیری اداؤں میں فرق نہ آیا ۔

علامہ کیفی صاحب تو بہت بے کیف ہوں گے ۔ میرا اسلام ان سے کہیے اور عرض کیجیے کہ سندھ کی زمین ان کو راس آئے گی ۔ مردم خیز خطہ ہے ۔ لیکن پیر کو سر کی بازی لگانی پڑتی ہے ۔ بن جاتے تو نعوذ باللہ خدائی کریں ۔ نہ بنے تو قبر سے بھی محروم لیکن اس میں سندھ کو کیا خصوصیت ہے ۔ سدا بہار قدردان البتہ آپ کو علی گڑھ میں ہی میسر آئیں گے ۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ کی صحت اب بہتر ہے گو یہ سن کر افسوس ہوا کہ اس کا مصرف آپ بیکار زندگیوں کا احوال دنیا کے سامنے پیش کرانے میں کر رہے ہیں ۔ آپ سمجھے ۔ لو اب کاغذ جواب دے گیا اور ابھی لکھنے کو بہت کچھ تھا ۔ گھر میں دعا و السلام ۔

کراچی - ۲۰ مئی ۷۳ء

۱۱ مئی کا محبت نامہ ۱۸ مئی کو مل گیا ۔ علی گڑھ سے چلے آنے کے بعد بہت کم لوگ ایسے تھے جن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا ۔ تھوڑی ہی مدت پر سلسلہ سکڑتا گیا ۔ جب ایک مدت سے کسی کا بھی خط نہ پایا تو میں مایوس ہو گیا ۔ اسی عرصے میں آپ کا ارسال کردہ اپریل کا "مسدس" کا پرچہ بھی ملا ۔ "بات اور صرف ایک بات" میں آپ نے جو کچھ لکھا تمہیں یقین آئے یا نہ آئے جی چاہا کہ قلم ہاتھ میں لوں اور داد دوں لیکن پھر وضعداری آڑے آئی ۔

میرے خط کا جواب اگر کوئی نہ دے تو میں اسے خط نہیں لکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خط کا جواب نہ دینا راہ و رسم کو قطع کر دینے کا مترادف ہے۔ بہرحال تو کہ تم نے جو کچھ لکھا، خوب لکھا، حالات ناسازگار ہیں۔ مگر دل سے نکلی ہوئی حق بات رائگاں نہ جائے گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ کانفرنس کے حالات سن کر افسوس ہوا۔ دنیا بدل گئی۔ نہ بدلا تو مسلمان۔ وہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ایک ہی حال میں ہے۔ عملی قوتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ روزی کمانے کے راستے اس پر بند ہیں تو وہ سوائے تخریبی کام کے اور کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ ایک دوسرے پر حسد اور طعن اس کا شعار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کام کر سکتے ہیں اور آپ کو موقع ملے تو آپ قوم کی اچھی خدمت کر لیں گے۔ لیکن نوکری سے آزادی حاصل ہونا لازمی ہے۔ کاروبار سے بڑھ کر عزت کی زندگی کسی چیز میں نہیں۔

میں ابھی تک بے خان و ماں ہوں اور بے دوست و احباب۔ وہ لوگ جو میرے آستانے پر دن رات حاضری دیا کرتے تھے۔ اب سلام کے لیئے ہاتھ اٹھانے کے بھی روادار نہیں۔ یہ ان کا حال ہے جو یہاں آگئے ہیں۔ جو وہاں رہ گئے وہ سلام و پیام کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ دنیا کا یہی حال ہے۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں بھی اپنی روش پر قائم ہوں۔ گدائے متکبر کسی کے آستانے پر حاضری نہ پہلے کبھی دی اور نہ اب دیتا ہوں۔ اپنی گدائی میں مست ہوں۔ ہاں آپ جیسے مخلص دوستوں کو دیکھ کر دل کو مسرور کرنا چاہتا ہوں وہ میسر نہیں تو کیا۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ کی تحریر جنت نظر ہو جاتی ہے۔ جزاک اللہ۔

علی گڑھ آنے کو بہت بے تاب ہوں۔ ان دنوں تو وہاں گرمی کا دور دورہ ہوگا۔ گرمی یہاں کافی پڑتی ہے۔ لیکن ہوا اکثر چلتی رہتی ہے۔ زیادہ ناگوار نہیں ہوتا۔ آم یہاں ملتا ہے۔ لیکن بہت بُرا۔ وہاں کا آم اور بالخصوص اپنے باغ کا بہت یاد آتا ہے۔ دیکھیئے کب تک محروم رہنا پڑتا ہے۔

کراچی ۳۱ مئی ۴۹ء

اب تو ڈاک کی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے۔ اور جو نسل علی گڑھ اور کراچی میں ڈاک کی ابتری کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا وہ کم ہو گیا۔ علی گڑھ سے جب کوئی خط آجاتا ہے تو دل میں ایک خاص مسرت کو محسوس کرتا ہوں اور بعد مکانی جو ہر گھڑی ان احساسات کو مٹانے میں لگا رہتا ہے۔ پھر اپنی ناکامی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ آپ کا افتتاحیہ مجھے پسند آیا۔ غالباً آپ اس کے متمنی ہوں گے کہ وجہ بھی لکھوں۔ تحسین ناشناسی کوئی ایسی وقیع چیز تو ہے نہیں لیکن سن لیجئے مجھے اس میں ایک شانِ قلندرانہ نظر آئی۔ چند کر وہ حکمت عملی کی خاکستر میں دبی ہوئی تھی

لیکن دل کی گرمی کا پتہ دے رہی تھی۔ میں کہ ادب کی خوبیوں
سے قطعاً نا آشنا ہوں، اچھے ادیب کی صرف ایک
خوبی کو پہچانتا ہوں اور وہ وہی ہے جو ایک عرب
ادیب نے لکھی ہے۔ یعنی اس میں طوالت نہ ہو
مگر خلوص ہو۔ ایسا ادب دل کی گہرائیوں سے نکلتا
ہے اور سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ خطیب
اور واعظ بیچارے اسی طوالت کی بدولت انگشت نمائی
ہوتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ عمر کی پختگی کے ساتھ
ساتھ آپ کی تحریر میں بھی پختگی پیدا ہوتی جا رہی
ہے۔ اور یہ خدا کا احسان ہے جو آپ کی مسلسل
کوشش اور مطالعے سے پیدا ہو چلی ہے۔ تم
اپنے دل میں ضرور کہتے ہوگے۔ کہ یہ نا اہل کیا
سمجھے۔ آپ کا خیال غلط نہ ہوگا۔ خیر!

صاحبزادہ آفتاب احمد خان

مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کی سب سے زیادہ خدمت کی

سید مصطفیٰ علی بریلوی

مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے قومی خادموں کی جو جماعت سب سے پہلے تیار ہوئی اس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا نمایاں مقام ہے۔ ان کو علی گڑھ کے بانی دار العلوم اور علی گڑھ تحریک سے عشق تھا۔ ان کی جملہ سیاسی تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں کا محور ہمیشہ مسلم یونیورسٹی رہی اور پھر خاک یونیورسٹی کو ان کی آخری آرام گاہ ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ سید عبداللہ یوسف علی مرحوم کا صاحبزادہ صاحب کے بارے میں یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ علی گڑھ تحریک کی روح یقیناً ——

آفتاب احمد خاں ہی تھے مرحوم نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو بیحد ترقی دی اس کو مالی حیثیت سے مستحکم کیا اور اس کے صدر دفتر کے لئے سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کی اعانت سے 1915ء میں ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی جو آج بھی اپنے بانی کی یادگار ہے۔

اس عمارت کے بارے میں ایک مرتبہ شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم نے سید الطاف علی بریلوی سے فرمایا کہ سید صاحب دفتر تو آپ کا ہے۔ ہمارے مسلم لیگ دریا گنج دہلی کے دفتر میں کیا رکھا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کی کوشش سے ایک زبردست کتب خانہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں قائم کیا گیا جس میں مسلمانان ہند کی تعلیمی جدوجہد اور نشاۃ ثانیہ کی کوششوں کے بارے میں اتنا وافر مواد جمع کیا گیا تھا کہ شاید ہی کہیں اور موجود ہو۔ یہ عظیم ذخیرہ اب آزاد لائبریری علی گڑھ کی زینت ہے صاحبزادہ صاحب نے گورنمنٹ حضور نظام سے قریب دو لاکھ روپے کا عطیہ حاصل کیا جسے سرمایہ محفوظ قرار دیا گیا جس کی آمدنی سے دفتر کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ صاحبزادہ صاحب کو نابینا اور معذورین کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا چنانچہ انھوں نے اپنی کوٹھی کے قریب ملت کے ایسے مظلومین کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں ان کو تعلیم کے علاوہ دست کاری کی تربیت بھی دی جاتی تھی یہ مدرسہ عرصہ دراز تک جاری رہا اور غالباً اب بھی موجود ہے۔ اپنے کام میں قومی کارکنوں کو کچھ سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سر سید مکتبۂ فکر کے قومی کارکن انگریزی کی وفاداری کی آڑ میں زبردست قومی خدمت انجام دیتے تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو بھی تقرب سرکار حاصل تھا۔ وہ برسوں اعلیٰ سرکاری حیثیت میں لندن میں مقیم رہے۔ ان کو وہ اعزاز نصیب ہوئے جو بہت کم ہندوستانیوں کو ملتے تھے لیکن ان کا دل ہمیشہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کے غم میں مبتلا رہا۔ اور وہ اس سلسلے میں مسلسل کچھ نہ کچھ لکھتے بولتے اور عملی پروگرام ترتیب دیتے رہے وہ عمر بھر وکالت کے پیشے سے وابستہ رہے لیکن طبعاً اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ خوش اعتقاداً پختہ کار مسلمان تھے اور آخر میں تو متشرع بھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی ڈائریوں میں انگلستان کی رنگینیوں کا اشارتاً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شیطان انکو زیر نہیں کر سکا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے سلسلہ میں صحیح لکھا ہے کہ

ذاتی غرض مندیوں اور جاہ پسندی سے آشنا نہ تھے۔ والد ماجد کی خدمت گزاری باعث سعادت سمجھتے تھے ماں، بیوی، اولاد، احباب، قوم سب کے حقوق پہچانتے تھے اور فرائض اپنے امکان بھر پوری طرح ادا کرتے رہتے۔ شاعری، طراری لفاظی کے قائل بالکل نہ تھے ہر شے میں مغز ڈھونڈتے تھے ہر جگہ عمل کی تلاش میں رہتے تھے۔

علی گڑھ میں آفتاب ہوسٹل مدرسہ نابینان کی یادگار ہیں جیسا آفتاب، مرتبہ مولوی حبیب اللہ خاں مرحوم پاکستان میں کمیاب ہے۔ مرحوم کے صاحبزادہ جناب آباد احمد خاں صاحب لاہور میں ضیابخش حیات ہیں۔ دوسرے اہل خاندان بھی ہندوستان اور پاکستان میں معزز حیثیت کے مالک ہیں۔

کانفرنس سے میری ۲۵ سالہ وابستگی

از مرزا علی اظہر برلاس

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

"العلم" اور اس کے ہنس مکھ لائق مدیر سید الطاف علی بریلوی سے میری ملاقات تیس برس ہوئے جب پہلی بار ہوئی تھی اور بحمد اللہ اس مدت کے باوجود تعلقات میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ "العلم" کا تذکرہ آتے ہی جذبات کی ایسی رو ابھرتی ہے جس میں مسرت و انبساط کے ساتھ ساتھ تاسف و تالم کے نقوش، جو محض حق ناشناس احباب کی وجہ سے داغِ دیدہ پر مرتسم ہیں، وہ سب ابھرتے ہیں۔ اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تاثرات حوالۂ قلم کروں لیکن آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اپنے تعلقاتِ دیرینہ کی وجہ سے مجبور ہو گیا کہ الطاف صاحب نے جو "غزل چھیڑی" ہے اس کے لیے اپنے ٹوٹے ہوئے ساز کے ساتھ، شاید آخری مرتبہ، ان کی نے سے لے ملاؤں۔

الطاف صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی میں اس وقت ہوئی جب قائدِ اعظم مرحوم کے ایماء سے الطاف حسین مرحوم (سابق ایڈیٹر "ڈان") نے آل انڈیا مسلم ایڈیٹرز کانفرنس منعقد کی۔ غیر منقسم ہندوستان کے چوٹی کے ایڈیٹروں کو مدعو کیا گیا اور اینگلو عربک کالج (دہلی) میں طعام و قیام کا انتظام ہوا۔ الطاف حسین مرحوم نے حسبِ دستورِ قدیم مہمانوں کی رہائش و آسائش کا نگراں مجھ کو مقرر کر دیا جو میرے لیے مصیبت ہو گئی۔ بقول شخصے عزت و آبرو کا معاملہ تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں ہیٹی ہو اور "ہندوستان ٹائمز" وغیرہ میں طنزیہ مضامین نکلیں۔ اور مسلمانوں کا نام بدنام ہو۔ چنانچہ ہر شخص پوٹے ٹیکے ہوئے تھا کہ بارِ الٰہا عزت تیرے ہاتھ ہے۔

مہمانوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں صبح، دوپہر اور شام عربک کالج کے چکر میں لگایا کرتا تھا۔ پہلے ہی روز "خوش آمدید" کے لیے جب میں پہونچا تو بعض "برخود غلط" مدیرانِ جرائد و رسائل سے مڈبھیڑ کے بعد، جس نے طبیعت کو کافی مکدر کر دیا تھا، ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ کھلتا رنگ، چوڑی پیشانی، مناسب قد و قامت، ترکی ٹوپی ذرا ترچھی لگائے اور پان کھلائے ہوئے۔ آگے بڑھے اور میرا نام لے کر کہنے لگے "آپ ہی مرزا صاحب ہیں؟" مجھے حیرت ہوئی کہ "چوتھی دنیا" (Fourth State) کے یہ فرعون صفت جاگیردار (یعنی اخبارات و رسائل کے مدیرانِ کوہ وقار) جو دنیا میں سوائے حکامِ وقت کے جو ان کو نقصان پہنچا سکیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یہ کون بزرگ ہیں جو میرے نام سے بھی واقف ہیں! ان کی ذہانت کا تو میں اسی وقت قائل ہو گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا

"سید الطاف علی صاحب بریلوی" ایڈیٹر "معنف" علیگڑھ آپ ہی ہیں۔ "معنف" کے پُرمغز مضامین پڑھنے کا تو پہلے ہی اتفاق ہو چکا تھا مگر مدیر مسئول کی زیارت کے بعد لطف دوبالا ہو گیا۔ جتنی مرتبہ عربک کالج جاتا آخر میں الطاف صاحب سے اس لیے ملتا تھا کہ گفتگو سے دیر تک لطف اندوز ہو سکوں۔ غرضیکہ کانفرنس کے دوران قیام اور اس کے بعد بھی کافی ملاقاتیں رہیں۔ ازدیاد لطف و محبت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ تاریخ کے مضمون سے ہم دونوں کو یکساں دلچسپی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور ستمبر (۱۹۴۷ء) میں پرانے قلعہ دہلی سے مصیبتیں جھیل کر میں اور میرے لڑکے صفدر بلاس (جو آج کل "ڈان" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں) راولپنڈی پہونچے اور وہاں سے لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں اپنے وطن مالوف لکھنؤ گیا اور واپسی پر لاہور سے کراچی آ گیا۔ ۱۹۵۰ء میں (لاہور سے) بال بچے بھی کراچی آ گئے اور اسی مہاجر نگری میں سکونت اختیار کر لی :

کراچی ۱۹۴۹ء میں

۱۹۴۹ء میں کراچی کی عجیب حالت تھی۔ مہاجروں کی بستیاں خودرو پودوں کی طرح جابجا نمودار ہو گئی تھیں نہ پانی کا انتظام تھا اور نہ صفائی سے واسطہ۔ ۲ ۱/۲ لاکھ آبادی کے شہر میں دفعتاً لاکھوں مہاجروں کی ریل پیل نے میونسپلٹی کا انتظام درہم برہم کر دیا تھا۔ مخدومی سید ہاشم رضا صاحب، ایڈمنسٹریٹر کراچی مہاجروں کی آبادکاری کے لیے منجانب گورنمنٹ بانس اور چٹائیاں بانٹتے تھے۔ اور مصیبت زدہ مہاجر انہیں کو غنیمت سمجھ کر لے جاتے اور جہاں موقع ملتا صبر و شکر کر کے آسمان کے نیچے بانس میں چٹائیاں لگا کر بال بچوں کو لے کر پڑ رہتے۔

کراچی کی حیثیت اس زمانے میں صرف تجارتی منڈی کی تھی۔ نہ علمی محفلیں تھیں اور نہ صاحبانِ علم و فن سے اگر کچھ ہوں گے بھی، تو لوگ اور خاص طور سے مہاجر طبقہ متعارف نہ تھا۔ دوکانوں میں علمی کتابیں تک مفقود تھیں۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے طے کیا کہ مارچ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی پہلی تاریخ کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ سوسائٹی کے لائق سیکریٹری اور مستند مورخ مکرمی ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے مجھ سے "واجد علی شاہ" پر مقالہ پڑھنے کو کہا۔ تو مجھے فکر ہوئی کہ مشہور و ممتاز مورخین کے سامنے بلا مستند حوالوں کے مقالہ کیسے پڑھا جائے۔ غرضیکہ اسی شش و پنج میں کانفرنس کا وقت قریب آ گیا اور میری پریشانی بڑھتی گئی۔

ایک روز ۴/۵ بجے سہ پہر کو میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں بندر روڈ پر (ڈاؤ میڈیکل کالج کے سامنے) جا رہا تھا کہ دفعتاً کوئی صاحب مجھ سے چمٹ گئے۔ سر اٹھا کر جو دیکھا تو الطاف علی صاحب بریلوی تھے! سامنے ہی "ہائی اسکول ریسٹورنٹ" میں بیٹھ کر چائے پی اور باتیں ہونے لگیں۔ کہنے لگے "آجکل میں ٹنڈو آدم میں مقیم ہوں۔ کل ہی آپ کے "واجد علی شاہ" پر مضامین (جو دہلی کے "ڈان" ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے۔ میرے کاغذات میں نکل آئے اور آپ کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ سن کر میری جان میں جان آئی اور هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ سمجھ کر خدا کا

شکر ادا کیا۔ انہوں نے دوسرے پھیرے میں مضامین لاکر
دینے کا وعدہ کیا۔ اسی نشست میں یہ بھی طے ہوا کہ کراچی
میں علمی کساد بازاری دیکھتے ہوئے یہ بہت ضروری ہے
کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جائے۔

تاسیس ایجوکیشنل کانفرنس

دوسرے پھیرے میں الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب
سابق وزیر تعلیم ریاست بہاولپور کی کوٹھی "دارالسلام" واقع
جمشید کوارٹرز میں جنوری ۱۹۵۱ء میں الطاف صاحب نے
جلسہ مشاورت منعقد کیا۔ دوسرا اجلاس (فروری ۱۹۵۱ء)
میں ہوا جسے میں اس لئے نہیں بھول سکتا کہ صحیح معنوں
میں معرکۃ الآرا ہوا۔ اس اجلاس میں الطاف صاحب کے
دو ایسے دیرینہ شناساؤں سے ملاقات ہوئی جو بظاہر تو ان
کے ہمدرد و معاون تھے مگر نزاع لفظی کو ایسا طول دیا
(کانفرنس کے نام میں لفظ "مسلم" شریک کیا جائے یا نہ کیا
جائے) کہ قریب تھا کہ جلسہ درہم برہم ہو جائے۔ مجھے
حیرت تھی کہ یہ کیسے دوست تھے جو بڑی ہما ہمی کے ساتھ
الطاف صاحب کی حمایت کرنے آئے تھے یا جلسے میں آکر
پینترا بدل دیا اور کہنے لگے "یہاں ایسے سر پھرے لوگ
بھی موجود ہیں جو اس کے مقابلے میں دوسری کانفرنس بنا
کر دکھا دیں گے۔ اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینگے۔"
میں ان بزرگ کی صورت دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں
ثاقب لکھنوی کا یہ مصرع دہرا رہا تھا۔

ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!

مجھے پھریری آئی اور جی چاہا کہ ترکی بترکی جواب دوں مگر
الطاف صاحب نے روکا اور خود نہایت بردباری کے ساتھ
مسکرا کر مناسب جواب دے دیا۔ اسی روز مجھے معلوم ہوا
کہ قومی کام کرنے کے لیئے نہ صرف قابلیت و اہلیت کی ضرورت
ہے بلکہ "مرغانِ بے ہنگام" کی چیخ و پکار سے نپٹنے کے لیئے
انتہائی صبر و ضبط اور رپٹے ماری سے کام لینا پڑتا ہے

میجر شمس الدین محمد صاحب مرحوم

اس جلسہ میں میجر شمس الدین محمد صاحب مرحوم
صدر، حسن علی عبدالرحمٰن صاحب بیرسٹر (سابق وائس
چانسلر سندھ یونیورسٹی) آنریری جنرل سیکریٹری، اور
الطاف صاحب آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سیکریٹری
منتخب ہوئے۔ میجر صاحب مرحوم خدا بخشے عجیب خوبیوں کے
بزرگ تھے۔ ان کا صبر و تحمل ہم ایسے جلد بازوں کے لئے نہایت سبق
آموز اور باعث صد رشک تھا۔ کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو مگر میجر صاحب
انتہائی سکون کے ساتھ مسکرا مسکرا کر ہر پہلو پر بحث کر کے دوسروں
کو اپنے موافق کر لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں
کانفرنس کا دفتر میجر شمس الدین صاحب کی کوٹھی سے منتقل ہو کر
سندھ مدرسہ کے بالائی حصہ کے ایک چھوٹے کمرہ میں آگیا۔ یہ
حسن علی عبدالرحمٰن صاحب کی کوشش کا نتیجہ تھا جس کے لیئے
ارکانِ کانفرنس ان کے بے حد ممنون ہوئے، چونکہ سندھ
مدرسہ نافہ شہر میں ہے اس لئے کانفرنس کی ترقی اور ہر دلعزیزی
میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

خان بہادر سید آل علی نقوی صاحب مرحوم

اس زمانے میں الطاف صاحب نے "یارانِ دیرینہ" کا

اچھا خاصہ جھمگھٹا لگا لیا تھا۔ آلِ علی نقوی صاحب مرحوم ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز، خانصاحب عظیم الدین مرحوم ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز، مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم اور مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی وغیرہ کانفرنس میں برابر آتے تھے۔ میں بھی تقریباً روزانہ حاضر ہوتا تھا (اس زمانے میں میرا مکان کشمی بلڈنگ کی پشت پر تھا) آلِ علی نقوی صاحب مرحوم نہایت قابل اور سنجیدہ بزرگ تھے مگر انتہائی کم گو بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ گفتگو کرنا ان کے لیے بارِ خاطر تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مجھ سے کافی بے تکلفی ہو گئی تو ایک روز میں نے ان سے ایک سوال کی اجازت چاہی۔ فرمایا "ارشاد؟" میں نے کہا "آپ کے اسم گرامی میں "آلِ علی" کے الفاظ اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ نجیب الطرفین سید ہیں۔ بعد کو لفظ نقوی کے بڑھانے سے سیادت کی تکرار بھی ہو گئی اور کوئی شبہ خدانخواستہ اگر کسی کو تھا بھی تو وہ دور ہو گیا۔ اس تکرار کے باوجود نام کے آگے لفظ "سید" کے اضافہ سے کیا فائدہ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے نفس کے اطمینان کے لیے آپ مکرر اور سہ کرر اس رشتے کا اعلان فرماتے ہیں؟" تھوڑی دیر سکوت کے بعد انتہائی معصومیت سے فرمانے لگے "میں نہیں جانتا میرے والد نے میرا نام رکھا تھا"۔

خان صاحب عظیم الدین مرحوم

عظیم الدین صاحب مرحوم بھی انسپکٹر آف اسکولز رہ چکے تھے اور اپنے زمانے میں بڑے دبنگ انسپکٹر مشہور تھے۔ انتظامی مادہ بھی بہت خوب تھا۔ چنانچہ علوم مشرقیہ کا شعبہ جب کانفرنس نے قائم کیا تو عظیم الدین صاحب کو موزوں ترین شخصیت سمجھ کر اس کا رجسٹرار مقرر کر دیا۔ اور وہ اس میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ عظیم الدین صاحب تھے تو شیخ مگر ٹھن پٹھن پٹھانوں سے کم نہ تھی بلکہ اکتسابی ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

رسالہ "العلم"

اسی سال یعنی جولائی ۱۹۵۱ء میں الطاف علی صاحب نے اپنی ذمہ داریوں میں ایک اور اضافہ کیا یعنی سہ ماہی رسالہ "العلم" کا اجرا کر دیا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ شخص اس بے سروسامانی کے عالم میں اتنا بوجھ کیسے اٹھائے گا مگر ان کی ہمت کی تعریف کرتا تھا کہ خدا پر بھروسہ کر کے قدم آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ "العلم" کے اجرا کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا اور بفضلہ اس وقت تک اسّی سے زائد معیاری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سر سید گرلز کالج

جولائی ۱۹۵۴ء میں الطاف صاحب نے ضرورتِ وقت کا احساس کر کے سر سید گرلز کالج ایک کرایہ کے مکان ناظم آباد (پہلی چورنگی) میں بسم اللہ کر کے کھلوا دیا۔ اور کانفرنس کی مجلسِ عاملہ نے خان صاحب عظیم الدین صاحب مرحوم کو اس کا سیکریٹری مقرر کر دیا۔ دو سال بعد یعنی جون ۱۹۵۶ء میں کانفرنس کا دفتر بھی سندھ مدرسہ سے اٹھ کر "سعیدہ منزل" (سر سید گرلز کالج کے کرایہ کی عمارت سے ملحق) میں آ گیا۔ اس وقت تک لسبیلہ کے اس پار لڑکیوں کا کوئی کالج نہ تھا۔ شروع میں تو صرف شاید

چالیس پینتالیس (۴۵) طالبوں نے داخلہ لیا مگر رفتہ رفتہ تعلیم کی
عمدگی اور عظیم الدین صاحب کی انتظامی خوبیوں نے اثر
دکھایا اور کالج کی مقبولیت میں ترقی ہونے لگی۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں سرسید گرلز کالج کی موجودہ عمارت
(واقع پہلی چورنگی ناظم آباد) کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس
وقت میں "ادارہ ترقیاتِ کراچی" (کے ڈی اے) سے وابستہ
تھا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ ہو سکا الطاف صاحب کا میں نے
بھی ہاتھ بٹایا اور ثواب کمایا۔ یہاں تک کہ موجودہ عمارت
بن کر مکمل ہو گئی۔ الطاف صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے
زمین حاصل کی اور روپیہ جمع کیا جس کے حصول میں کانفرنس
کے شعبۂ نسواں کی معزز خواتین نے بھی خوب حصہ لیا۔

خاں صاحب مرحوم (عظیم الدین) نے دن دن بھر مزدوروں
کے ساتھ تجّی ہو کر عمارت مکمل کرائی۔ ان دونوں بے لوث
اور مخلص کارکنوں کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ سرسید
گرلز کالج کی موجودہ سہ بفلک شاندار عمارت ہماری نظروں
کے سامنے ہے جس میں قوم و ملّت کے ہزارہا غنچہائے نوشگفتہ
زیورِ تعلیم سے مزیّن ہو کر پاکستان کی عزت و آبرو میں چار چاند
لگاتی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں عظیم الدین خان صاحب کا انتقال
ہو گیا اور ان کے بعد جناب الحاج مولوی عظمت اللہ دہلوی
ایڈووکیٹ کو کالج کا سیکرٹری بنایا گیا۔ انہوں نے بھی نہایت
تندہی اور خلوص سے کام کیا۔

ڈاکٹر صوفی صاحب مرحوم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ابتدائی زمانے
کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ڈاکٹر غلام محی الدین
صوفی صاحب مرحوم کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ڈاکٹر صوفی صاحب
مرحوم (ساربون یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی تھے۔) انتہائی قابل
اور خلیق بزرگ تھے۔ ناگپور یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہ چکے
تھے۔ اور ہندوؤں سے بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے۔
سر ہری سنگھ گور ایسا مقنن اور قابل مصنّف بھی ڈاکٹر صوفی
صاحب کی قابلیت کا معترف تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو آخر
عمر میں بھی تحصیل علم کا انتہائی شوق تھا۔ کوئی علمی لیکچر ایسا نہ
ہوتا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب شریک نہ ہوتے ہوں۔ چاہے
کراچی کے کسی کونے میں اور کسی وقت کیوں نہ ہو۔ کسی نہ کسی
علمی محفل یا لیکچر میں صوفی صاحب سے مڈبھیڑ ہونا لازمی تھا۔
اتفاق سے ایک لیکچر میں ڈاکٹر صاحب نہیں دکھائی دیئے۔
مجھے یقین ہو گیا کہ خدانخواستہ طبیعت علیل ہو گی۔ دو چار
روز کے بعد حسب دستور قدیم ایک صحبت میں ملاقات
ہوئی تو میں نے دریافت کیا "ڈاکٹر صاحب فلاں لیکچر میں
آپ تشریف نہیں رکھتے تھے۔ خدانخواستہ طبیعت ناساز
تھی؟" ہنس کر فرمانے لگے "آپ بالکل صحیح سمجھے۔ اگر اچھا
ہوتا تو ضرور آتا۔" پھر فرمایا کہ "میرے لڑکے اور بہونے
میرے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جہاں کہیں لیکچر ہو،
کوئی ہو نہ ہو تین آدمی ضرور ہوں گے۔ ایک منتظم جلسہ، دوسرے
خود مقرر صاحب اور تیسرے اباجی (یعنی ڈاکٹر صوفی صاحب)"

ڈاکٹر صوفی صاحب مرحوم نے "تاریخ کشمیر" کے
نام سے کشمیر پر بہترین کتاب لکھی ہے جس میں میرے ایک
بزرگ خان علامہ تفضل حسین خاں مشہور ریاضی داں کا
بھی ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو جب سے میرا سلسلۂ
خاندان علامہ سے معلوم ہوا تو مجھ پر بہت زیادہ عنایات

فرماتے تھے۔ اور خان علامہ کے علمی کمالات کا اکثر و بیشتر ذکر
کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صوفی صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ مثل
گل شگفتہ کے، ہر وقت میری نظروں میں پھرا کرتا ہے۔ ان
کے انتقال سے کانفرنس کی انجمن میں جس کے وہ نائب صدر
تھے ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔
خدا ان کو غریق رحمت کرے اور ہم لوگوں کو ان کے اخلاق
حسنہ پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایس۔ ایم۔ یوسف مرحوم

یوسف صاحب تھے تو تاجر (پہلے قالین بافی اور
بعد کو پلاسٹک کے کھلونوں کی تجارت کرتے تھے) اور تجارت
میں کافی شہرت اور ترقی حاصل کی تھی مگر طبیعت بالکل تاجرانہ
نہیں تھی بلکہ مائل بہ علم و ادب تھی اور اسی لئے ہم لوگوں سے
میل جول بڑھا اور کانفرنس میں باقاعدہ شریک ہو گئے۔ اور
تقریباً ہر جلسہ میں ان کا موجود ہونا لازمی تھا۔ ان کی سب
سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوستوں کے دوست اور دردمندوں
کے ہمدرد تھے۔ پرانی شرافت کا نمونہ اور پرانے اقدار کے
حامل۔ عجیب مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ تعجب ہوتا تھا کہ
ان سے تجارت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں ان کو میں اکثر و
بیشتر چھیڑا کرتا تھا کہ آپ سے اور تجارت سے کیا واسطہ۔
یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ خداوند عالم نے آپ کو کامیاب تاجر
بنا دیا۔ جب کبھی ان کی طبیعت گھبراتی تو مجھ پر کرم فرماتے۔
زیادہ تر الطاف صاحب کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا بھی میرے
پاس آجاتے۔ محکمہ اطلاعات (پریس انفارمیشن) سے اٹھ
کر صدر کے کسی قریب ہی ریسٹورنٹ میں جا کر چائے پیتے
اور گپ شپ کے بعد چلے آتے۔ سرسید گرلز کالج کے بیرونی
دروازے کے لئے انہوں نے پانچ ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا
لیکن عظیم الدین صاحب سے ان بن ہو جانے کے باعث یہ
کام نہ ہو سکا۔

یوسف میموریل لائبریری

عرصہ سے الطاف صاحب کو فکر تھی کہ کانفرنس
کے دفتر کی اپنی نجی عمارت ہونی چاہیئے تاکہ کرایہ کی عمارت
"سعیدہ منزل" سے چھٹکارا ملے۔ اور کانفرنس اپنی عمارت
میں براجمان ہو۔ یوسف صاحب نے اس کے لئے مالی امداد
کا وعدہ کیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں جب یوسف صاحب کا دفعتاً
انتقال ہو گیا تو ان کے صاحبزادے مسٹر ایس۔ ایم۔ علیم نے
اپنے والد کے نام کو تازہ رکھنے کے لئے پچیس ہزار روپیہ کا
گرانقدر عطیہ دے کر "یوسف میموریل لائبریری ہال"
بنوانے میں ابتدائی سہولت مہیا کر دی۔ جنوری ۱۹۷۲ء
میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اپنی نئی عمارت میں
جس پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگ چکا ہے منتقل ہو گئی۔ اس
عمارت میں دفتر کانفرنس کے علاوہ ایک اعلیٰ درجہ کی
لائبریری اور دار المطالعہ بھی قائم ہے۔

چیف جسٹس قدیر الدین صاحب (ریٹائرڈ)

ہمارے قابل فخر صدر جناب ممتاز حسن صاحب مرحوم کے
انتقال کے بعد کانفرنس کا ایک وفد جناب قدیر الدین صاحب
بالقابہ سابق چیف جسٹس سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کی
خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے صدارت قبول کرنے کی

درخواست کی، موصوف نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے درخواست کو قبول کیا اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بلا اختلاف رائے صدر منتخب ہو گئے۔ جناب قدیر الدین صاحب دہلی اور لوہارو کے اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے پیشہ میں دہلی ہی میں بہت ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد شہرت میں اضافہ ہوا، اور حکومت پاکستان نے ہائیکورٹ کے جج کے عہدۂ جلیلہ کے لئے منتخب کیا۔ اور بعد کو چیف جسٹس ہو گئے، ریٹائر ہونے کے بعد اپنا پورا وقت علمی مشاغل میں صرف کرتے ہیں۔ ہم سب کو یقین واثق ہے کہ کانفرنس کا انشاء اللہ یہ دور زرّیں ثابت ہوگا۔

المختصر کانفرنس کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک میں نے ہر دور کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے روز اوّل سے جیسا اوپر ذکر کیا گیا، کانفرنس کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنوں سے بھی اور غیروں سے بھی۔ مگر اس بات کا اعتراف نہ کرنا انتہائی ظلم ہوگا کہ ہر موقع اور ہر محل پر الطاف صاحب کا ایسا ثابت قدم آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہر مصیبت کا مقابلہ کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا اصول حسب ذیل شعر سے اخذ کیا ہے:۔

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقتِ ما کافریست رنجیدن!

شفیق انجم

علیگڈھ

٭ حسین رُخ ٭

یہاں رندوں کو ملتے ہیں بقدرِ شوق پیمانے
یہاں تصنیف ہوتے ہیں فقط مخصوص افسانے
یہاں پروردۂ جوشِ جنوں ہوتے ہیں فرزانے
یہاں وابستۂ ہوش و خرد ہوتے ہیں دیوانے
خردمندوں کا مرکز ہے یہ دیوانوں کی بستی ہے
علیگڈھ واقعہ یہ ہے کہ بزمِ ہوش و مستی ہے

یہاں پابندِ آدابِ نظر ہوتے ہیں شیدائی
جبینِ شوق پر ہوتی نہیں قیدِ جبیں سائی
بہت محتاط ہوتی ہے یہاں جلوؤں کی رعنائی
خلافِ رسم و عادت ہے بھری محفل میں انگڑائی
نگاہِ شوق جب محسوس ہوتی ہے تعاقب میں
نگاہِ ناز رہ جاتی ہے حیرت میں تعجب میں

یہاں جو بات شائستگی کے ساتھ ہوتی ہے
شرارت تک یہاں سنجیدگی کے ساتھ ہوتی ہے
بہت معصومیت اور سادگی کے ساتھ ہوتی ہے
محبت واقعی پاکیزگی کے ساتھ ہوتی ہے
کوئی اک دوسرے سے بے تکلف تک نہیں ہوتا
محبت کرنے والوں میں تعارف تک نہیں ہوتا

٭ ٭ ٭

سر سید گرلز کالج ۔۔۔ کچھ یادیں!

مسز ام سلمٰی زمن، سابق پرنسپل سرسید کالج کراچی

"نہ ان کے پاس قلم تھے، نہ کاغذ، نہ میز تھی نہ کرسی اور نہ دفتروں میں کہیں بیٹھنے کی جگہ تھی۔ وہ پیکنگ کے ڈبوں پر بیٹھ کر دفتری کام کیا کرتے تھے" ان الفاظ میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خاں صاحب نے ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کے آن پاکستانی دفاتر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جہاں سرکاری افسر بیٹھ کر کام کیا کرتے تھے، حکومت کے ان اہلکاروں کے پاس ساز و سامان تو نہ تھے لیکن ان کے دلوں میں ایسا مجاہدانہ ولولہ، ایسا آہنی عزم اور جذبۂ شوق تھا جس نے انھیں اور سارے مسلمانان ہند کو چند برسوں کی قلیل مدت میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کیا۔ اور قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک شکست خوردہ اور پسماندہ اقلیت سے ایک جیتی جاگتی، جانباز اور متحد قوم بنا دیا جس نے دنیا کے نقشہ پر دیکھنے کے لیے ایک نئی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی۔

کچھ اسی قسم کا جذبہ ان چند مجاہدین کے دلوں میں بھی موجزن تھا۔ جنھوں نے سرسید گرلس کالج کے قیام کا فیصلہ کیا۔ ۲۵ رجون ۱۹۵۴ء کو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسے میں جناب سید الطاف علی بریلوی کی تحریک پر یہ تجویز پیش کی گئی کہ "چونکہ دار الحکومت کراچی میں لڑکیوں کے صرف دو کالج ہیں جن میں بہت محدود داخلے ہوسکتے ہیں، اور بکثرت طالبات یا تو اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں یا لڑکوں کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور ہوتی ہیں۔ لہٰذا کانفرنس کے شعبۂ نسواں کو اجازت دی جائے کہ وہ جولائی ۱۹۵۴ء سے بالفعل کرائے کے کسی مکان میں زنانہ کالج کے ایف اے فرسٹ ایر کو کھول دے۔" اس تجویز پر تفصیلی غور کرنے کے بعد طے ہوا کہ ۲ رجولائی کو پھر ایک میٹنگ بلائی جائے، اور اس مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے اور اس عرصے میں شعبۂ نسواں کی ممتاز کارکنوں سے بھی تبادلۂ خیال کرلیا جائے۔ چنانچہ تاریخ معینہ پر الحاج میجر شمس الدین صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست بہاولپور کے زیر صدارت ارکان کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا جس میں بیگم کرنل شہاب الدین احمد صدیقی صاحبہ، راحیل بیگم شروانیہ صاحبہ، بیگم سید عبد الحفیظ، بیگم ڈاکٹر الٰہی علوی، بیگم ڈاکٹر زیب عبد اللہ صاحبہ جو شعبۂ نسواں کی خصوصی کارکن تھیں، شریک ہوئیں اور قیام کالج کا فیصلہ کرلیا گیا۔

اس فیصلہ پر عملدرآمد کرنے کے لئے اٹھارہ مرد اور خواتین ارکان کی ایک ایڈ ہاک کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ جس کی کنوینر (CONVENER) ، راحیل بیگم شروانیہ صاحبہ بنائی گئیں۔ کیونکہ انھیں علی گڑھ مسلم گرلز کالج کے کارکن کی حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ تھا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس در اصل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پاکستانی جانشین تھی۔ جس کو سر سید علیہ الرحمۃ نے ۱۸۸۶ء میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لئے قائم کیا تھا۔ اس کا ایک شعبہ نسواں بھی تھا جس کے سکریٹری شیخ عبداللہ صاحب جنھوں نے مسلم گرلز علی گڑھ کالج قائم کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کا سہرا سید الطاف علی بریلوی کے سر ہے۔

اس کانفرنس کا پہلا اجلاس ۴، ۵ اور ۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سندھ مدرسہ کی عمارت میں جناب ممتاز حسن قزلباش کے زیر صدارت ہوا۔ اس کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم جناب فضل الرحمٰن صاحب نے کیا۔ اور اس میں پاکستان کے عام تعلیمی مسائل، تعلیمی پسماندگی، ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں اصلاحات کی ضرورت، مذہبی اور تکنیکی تعلیم کی کمی اور نصاب تعلیم میں ضروری تبدیلیوں پر اظہار خیال کیا گیا۔ اور ان امور کی طرف حکومت کو توجہ دلائی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکیوں کے تعلیمی اداروں کی کمی اور خواتین کی تعلیمی پستی کی بھی نشاندہی کی گئی۔ پرائیویٹ ادارے جو تجارتی اصولوں پر چلائے جاتے تھے۔ ان کی مذمت کی گئی اور فیسوں کو کم کرنے اور تعلیمی وظیفوں کو بڑھانے کا مطالبہ کیا گیا۔

آزادی کے بعد لوگ عام طور پر تعلیمی مسائل سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ چنانچہ جب کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۵۲ء کو ہوا تو اس میں ملک کے نامور ترین علماء اور فضلا اور مشاہیر نے شرکت کی۔ جن میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین خاں، الحاج میجر شمس الدین صاحب، جناب حسن علی عبدالرحمٰن، جناب احمد ای۔ ایچ جعفر صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے اپنے خطبات میں تعلیمی مسائل اور ان کی اصلاح کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ شعبۂ خواتین کا اجلاس بھی ہوا جس کی صدارت بیگم شاہنواز صاحبہ نے کی۔ اس اجلاس میں خواتین کے تعلیمی اور سماجی مسائل پر غور کیا گیا اور اس میں ضروری اصلاحات کی تجاویز پیش کی گئیں۔

اس طرح ملک میں تعلیم کی ترقی اور ترویج کے لئے فضا ہموار ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ جب ۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے محسن قوم سر سید کے نام پر کراچی میں ایک گرلز کالج کے قیام کی تجویز پیش کی تو فوراً منظور کر لی گئی۔

اس کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو پاکستانی لڑکیوں کو نہ صرف زیور تعلیم سے مزین کرے بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح اسلامی اقدار اور کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ بن جائے۔ خیال تو بہت اچھا تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل کام تھا۔ اس تجویز کے محرک

سید الطاف علی بریلوی خود پریشان حال مہاجر
ے، ان کے چند رفقائے کار جو ہندوستان میں تعلیمی
ہدوں پر فائز رہ چکے تھے وہ بھی کچھ زیادہ بہتر
ال میں نہ تھے۔ کالج قائم کرنا جان جوکھوں کا کام
ھا لیکن عزم، ولولہ، ہمت اور بے غرض خدمت
لگن کے سامنے بڑی سے بڑی دشواریاں بھی
ل ہو جاتی ہیں ـــــ تاریخ شاہد ہے کہ ہر بڑے
م کی ابتدا عام طور پر نہایت ہی حقیر اور چھوٹے
یمانے پر ہوئی ہے۔ کانفرنس کے ارکان کے سامنے
سر سید احمد خاں کی شاندار مثال موجود تھی
کس کس طرح انہوں نے شہر شہر کی خاک چھانی،
امتیں سہیں، کفر کے فتوے برداشت کئے۔ لیکن
یکن جس کام کو وہ قوم کی بہتری کے لئے ضروری سمجھتے
ے کرتے رہے اور ذرا بھی بددل نہ ہوئے اور آخرکار
امیاب ہو کر رہے۔

چنانچہ جب اس عظیم المرتبت شخصیت کے نام
ر اس تعلیمی ادارے کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا تو اس
ے لئے ناظم آباد پہلی چورنگی پر ایک چھوٹی سی رہائشی
مارت (سعیدہ منزل) سوا دو سو روپے ماہوار پر کرائے
ر لی گئی۔ اس عمارت کا ماہ بماہ کرایہ ادا کرنے کے
ئے بھی رقم نہ تھی۔ چنانچہ ایڈہاک کمیٹی کے ممبران نے
اپنی اپنی جیبوں سے اور کچھ احباب سے چندہ لے کر
ابتدائی اخراجات پورے کئے۔ فرنیچر اور ضروری سامان
خریدا گیا۔ اس عمارت میں چھوٹے چھوٹے چھ کمرے
ایک تنگ سا برآمدہ، ایک چھوٹا سا صحن اور ایک
نوکروں کا کمرہ تھا۔

کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس وقت جناب
ابوبکر احمد حلیم صاحب تھے۔ اس کالج کے کھولنے کی اجازت
ان سے مانگی گئی۔ کالجوں کی ضرورت تو تھی ہی۔ حلیم
صاحب شاید یہ بھی جانتے تھے کہ اگر یونیورسٹی کے قاعدے
قوانین پر سرد مہری سے زیادہ اصرار کیا گیا تو شاید
کوئی تعلیمی ادارہ کبھی وجود میں نہ آسکے گا۔ اس لئے
۵ر جولائی کو کالج کھولنے کی اجازت دے دی گئی اور
کرایہ کی اس چھوٹی سی عمارت پر ایک بورڈ آویزاں
کیا گیا، جس پر لکھا تھا "سرسید گرلز کالج۔ زیر اہتمام
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، شعبۂ خواتین"۔

اساتذہ کے تقرر کے لئے ایک انتخابی کمیٹی
بنائی گئی جس میں یونیورسٹی کے دو اساتذہ ڈاکٹر
امیر حسن صدیقی اور ڈاکٹر ایم ایم احمد بھی شامل تھے۔
درخواستیں طلب کی گئیں۔ انٹرویو ہوئے۔ اور کالج
کی پہلی پرنسپل بیگم عندلیب شادانی مقرر ہوئیں جو
بہت تجربہ کار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ
آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈپ ایڈ تھیں۔ اور ہندوستان میں
انسپکٹرس آف اسکولز رہ چکی تھی ان کی سربراہی
میں کالج ۲۳ر جولائی ۱۹۵۴ء کو قائم ہو گیا۔ انگریزی
اردو، سوکس، معاشیات اور اسلامی تاریخ کے
اساتذہ کا تقرر بھی ہو گیا۔ اور ۲۴ر جولائی ۱۹۵۴ء
سے باقاعدہ کلاسوں کا آغاز ہو گیا۔

کالج کی پہلی گورننگ باڈی میں یونیورسٹی کے
قوانین کے مطابق ۱۳ ممبران رکھے گئے جن میں

سے تین یونیورسٹی کے نمائندے، ۵ شعبۂ خواتین کے ۲ کانفرنس کے، دو اساتذہ کے اور ایک پرنسپل شامل تھے۔

مولوی عظیم الحسن خان جو یوپی کے محکمۂ تعلیم کے ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ اور شعیبیہ کالج آگرہ کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے اب کراچی میں مقیم تھے وہ کالج گورننگ باڈی کے سکریٹری مقرر کئے گئے سید الطاف علی صاحب ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری اور روح رواں تھے۔ ان دونوں نے اس ادارے کو پروان چڑھانے میں بڑی ہمت اور محنت سے کام کیا۔ وہ روزانہ باقاعدہ کالج کے آفس میں آکر بیٹھتے۔ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے، خط و کتابت کرتے اور چونکہ اس وقت تک نہ کوئی کلرک تھا نہ ٹائپسٹ اور نہ اکاؤنٹنٹ۔ لہٰذا یہ سارے کام بھی یہ اصحاب خود یا دفتر کانفرنس کے اسٹاف سے کراتے۔ ایک نوجوان اور محنتی چپراسی یتن خاں تھے۔ جو پڑھے لکھے تو نہیں تھے لیکن اس نوساختہ کالج کے سبھی کام کرتے تھے۔ چنانچہ کالج کے قیام کو شہر میں مشتہر کرنے کے لئے جو پوسٹر چھپوائے گئے۔ ان کا دیواروں پر چسپاں کرنا، ان کی پہلی ذمہ داری تھی۔ اس اکیلے شخص نے اس ذمہ داری کو اس طرح پورا کیا کہ شہر کراچی کے اسکولوں اور کالجوں، مکانوں، دوکانوں کے باہر کی دیواروں پر جا بجا ایک دو نہیں بلکہ ان پوسٹروں کی لائن کی لائن چپکا دی۔ جو دور ہی سے نظر آجاتی تھی

پہلے سال چونکہ کلاسوں کا آغاز جولائی کے اختتام تک ہوا تھا۔ اس لئے صرف ۴۴ لڑکیوں کا داخلہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے کلاس روم، سات اساتذہ چھوٹا سا آفس لیکن کام بڑے جوش و خروش سے شروع ہوا۔ سوائے ڈاکٹر زبید احمد کے جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے عربی ڈپارٹمنٹ کے ریٹائرڈ چیرمین تھے۔ اور بیگم شادانی کے تمام اساتذہ یونیورسٹی سے تازہ بہ تازہ نکلے ہوئے تھے۔ مس آمنہ مینائی (مسز آمنہ کمال جو اب کالج کی پرنسپل ہیں۔) اس سال اردو میں فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کرکے آئی تھیں مس نیلوفر احمد انگریزی کی لکچرار تھیں وہ بھی اسی سال یونیورسٹی سے انگریزی میں تیسری پوزیشن لے کر کامیاب ہوئی تھیں۔ اسلامی تاریخ کے لئے مس رانا خیری اور معاشیات وسوکس کے لئے مس حسن جہاں کا تقرر ہوا۔ ان نوجوان اساتذہ نے پہلے ہی سال بہت محنت اور لگن سے کام کیا — دوسرے تعلیمی سال کے آغاز میں جب بیگم شادانی چند نجی وجوہات کی بنا پر مشرقی پاکستان چلی گئیں اور ان کی جگہ پر یہ خاکسار جو اس وقت اسلامیہ کالج کراچی میں انگریزی کے لکچرار کے عہدے پر مامور تھی۔ اس کالج میں بطور پرنسپل کے آئی تو مجھے پرنسپلی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور نہ میں پرائیویٹ کالجوں کے حالات اور مسائل سے ہی زیادہ واقف تھی۔ جون ۱۹۵۵ء میں جب میں کالج کے لئے اساتذہ کے انتخاب کے سلسلے میں بطور ممبر سلکشن کمیٹی کے آئی اور مجھ سے مولوی

عظیم الدین خاں صاحب نے اس کالج کی پرنسپلی
کا عہدہ سنبھالنے کو کہا تو میں ذرا شش و پنج میں
مبتلا ہو گئی۔ اور میں نے جواب دیا کہ ابھی تو فیصلہ
کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ میری ایک بچی ہے جو صرف
ایک سال کی ہے۔ اس لئے پرنسپلی کی ذمہ داریاں
قبول کرنا شاید میرے لئے بہت دشوار ہو۔ اس
پر انھوں نے اور دوسرے ممبران کمیٹی نے مجھ
سے کہا کہ جب آپ نے تعلیم وتدریس کا پیشہ
اختیار کیا ہے تو ذمہ داریوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔
اس کالج میں آپ کو ہر طرح کا تعاون ملے گا کیونکہ
جتنا بھی ممکن ہوسکے گا ہم سب آپ کی مدد کرنے کو
تیار رہیں گے۔ میں نے کہا کہ سوچ کر جواب دوں گی۔
اس سے پہلے میں ایڈن گرلز کالج ڈھاکہ میں بھی
کئی سال تک بطور پروفیسر آف انگلش کے کام
کرچکی تھی۔ اور گذشتہ ایک سال اسلامیہ کالج
میں پڑھا رہی تھی۔ لیکن اس کالج میں صرف دو
گھنٹے پڑھا کر گھر واپس چلی جایا کرتی تھی۔ چونکہ
اسلامیہ کالج میں زیادہ تر سرکاری اور نیم سرکاری
دفاتر میں کام کرنے والے طالب علم داخلہ لیتے
تھے۔ اس لئے انگریزی (لازمی مضمون) کے کلاس
دفتروں کے شروع ہونے سے پہلے ساڑھے سات
بجے صبح سے ہوا کرتے تھے۔ اور مجھے وہاں زیادہ
وقت ٹھہرنا نہیں پڑتا تھا۔ بطور پرنسپل کے مجھے
زیادہ ذمہ داریاں سنبھالنا پڑتیں۔ اس لئے میں
شش و پنج میں تھی۔ اسی شام کو جب زمن صاحب
مع اپنے دوست اقبال حسین برنی کے دفتر سے
واپس آئے تو میں نے اس بات کا ان سے ذکر کیا۔
ان دونوں نے میری بہت ہمت افزائی کی اور
رائے دی کہ اس پیش کش کو قبول کرلوں۔ چنانچہ
کچھ دن اور غور کرنے کے بعد میں نے عظیم الدین
صاحب کو اطلاع دی کہ میں کام کرنے کو تیار ہوں۔
چنانچہ ۵ جولائی ۱۹۵۵ء سے میں اس ادارہ سے
منسلک ہو گئی۔ اس سال کالج میں ۱۲۸ طالبات نے
داخلے لئے چونکہ کالج نیا نیا بنا تھا۔ اور اس وقت
تک اس کی کچھ شہرت بھی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے داخلوں
کے لئے اتنی یورش نہ تھی جیسی آجکل ہوتی ہے۔
جہاں تک میرا سوال تھا مجھے پڑھانے کا تجربہ
ضرور تھا۔ لیکن دفتری اور انتظامی کاموں کا نہیں۔
لیکن میرا خیال ہے کہ کسی اچھے معیاری اداروں
میں تعلیم حاصل کرنے کا تجربہ بھی بجائے خود انسان
کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ اور اگر آپ اچھے
اداروں سے منسلک رہے ہوں تو صرف اور لوگوں کو
کام کرتے دیکھنا بھی ایک طرح کا تربیتی تجربہ ہوتا ہے
اور انسان بلاواسطہ بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ اگر ساتھ
ساتھ آپ کو ہمت افزائی اور مدد کرنے والے ساتھی
اور کارکن بھی مل جائیں تو زہے نصیب۔ میری خوش قسمتی
تھی کہ اپنی طالب علمی کے دور میں مجھے اسی قسم کی فضا
ملی اور جب میں اس کالج میں آئی تو یہاں کی انتظامیہ
نے ہر طرح مجھ سے تعاون کیا۔ اور مجھ میں ایک قسم کا جذبۂ
خدمت پیدا کر دیا جس میں بلند حوصلگی، ایثار، قربانی

محنت، عزم، اتحاد و اتفاق سبھی کچھ شامل تھے۔ یہی جذبہ ان تمام اساتذہ میں بھی کار فرما تھا۔ جو ابتدا سے اس کالج سے متعلق رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ قلیل تنخواہوں اور مشکل حالات کے باوجود جو اساتذہ اس میں ایک دفعہ متعین ہو گئے۔ ان میں سے اس کالج کو چھوڑ کر مشکل ہی سے کوئی کسی دوسرے ادارہ میں گیا۔ بلکہ چند درویش منش تو ایسے بھی ہیں جن کا زیادہ تنخواہوں پر دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں تقرر ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اس کالج کو چھوڑ کر نہیں گئے۔ جب اس قسم کا حوصلہ ہو تو ناممکن ہے کہ کوئی ادارہ ترقی نہ کرے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دشواریوں اور سخت کوششوں کے باوجود اس ادارہ میں کام کرنے والوں کا جذبۂ خدمت بڑھتا ہی گیا جس کی وجہ سے ہر طرح کی رکاوٹوں پر قابو پا لیا گیا۔

اس ابتدائی دور میں گورننگ باڈی کی صدر بیگم شہاب الدین احمد صدیقی، ڈاکٹر جمیل بیگم شروانیہ، بیگم عبدالحفیظ، بیگم ڈاکٹر الٰہی علوی، بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ سید الطاف علی بریلوی۔ اور مولوی عظیم الدین خان صاحب نے بڑی محنت اور جانسوزی کے ساتھ کام کیا۔ اور روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے فنڈ جمع کرنے، عوام سے رابطہ قائم کرنے۔ ملک کے سربرآوردہ شہریوں اور تعلیم و تدریس سے دلچسپی لینے والے اصحاب کی مدد اور سرپرستی حاصل کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ۱۹۵۵ء میں کالج میں ڈگری کلاسوں کا بھی آغاز ہو گیا۔ اور اس سلسلے میں یونیورسٹی سے اجازت حاصل کر لی گئی۔ کالج کی لائبریری کے لئے کتابیں فراہم کرنے میں ممبرانِ کانفرنس نے بہت مدد کی۔ یونیورسٹی کی سرپرستی اور مدد کی وجہ سے پہلے ہی سال حکومت سے گرانٹ بھی مل گئی۔ اور ۱۹۵۶ء میں سائنس سیکشن بھی کھول دیا گیا۔ اب طالبات کی تعداد اور کالج کی ضروریات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اس چھوٹی سی عمارت میں گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ اس سے ملحق رضویہ کالونی کے ایک اور رہائشی بنگلے کو بھی ساڑھے پانچسو روپے ماہوار کرائے پر لے لیا گیا۔ یہ مکان ۱۲ سو مربع گز زمین پر بنا ہوا تھا۔ اور اس میں تقریباً ۷ سو گز کا ایک اور کھلا ہوا پلاٹ بھی موجود تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے کل ملا کر ۸ کمرے تھے۔ موٹر گیراج میں آفس اور اس کے اوپر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں عظیم الدین خاں صاحب کا آفس بنا دیا گیا۔ جو کمرے ذرا بڑے تھے۔ اور ڈرائنگ روم اور کھانے کے کمرے کے لئے بنائے گئے ہوں گے۔ وہاں سائنس کی لیبارٹریاں بنائی گئیں۔ برآمدوں اور کارگیلریوں میں کتابوں کی الماریاں رکھی گئیں غسل خانوں میں سائنس کے اسٹور روم بنے۔ اور جب یونیورسٹی کی معائنہ کی ٹیم نے رائے دی کہ کیمسٹری کے لئے نئی لیبارٹری ہونی چاہئے۔ تو میدان میں عارضی شیڈ ڈال کر یہ لیبارٹری بنا دی گئی۔ جیسے جیسے ضروریات بڑھتی تھیں۔ اساتذہ کی تعداد اور ساز و سامان میں بھی اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ سائنس کے لئے اس زمانے میں تربیت یافتہ خواتین نہ ملتی تھیں تو ان شعبوں میں مرد اساتذہ کا تقرر کیا جاتا تھا۔

غرض یہ کہ دو سال کے اندر ہی اندر کالج دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ سائنس سیکشن کا آغاز بہت دلچسپ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حکومت کے ایک اعلیٰ افسر کسی پارٹی میں مجھ سے ملے تو انہوں نے رائے دی کہ جب تک آپ کالج میں سائنس سیکشن کا اضافہ نہیں کریں گی۔ کالج ترقی نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ اس کے لئے فنڈ کہاں سے آئے گا۔ اور لیباریٹریاں وغیرہ کیسے بنائی جائیں گی تو انہوں نے کہا کہ ہمارے دوست سندھ مسلم کالج کے پرنسپل سید غلام مصطفےٰ شاہ صاحب ہیں ان سے مل کر رائے لیجئے۔ چنانچہ میں ان سے ملنے گئی۔ انہوں نے مجھے اپنے کالج کا سائنس سیکشن اور لیباریٹریاں وغیرہ دکھائیں۔ اور کہا کہ آپ گورنمنٹ کالج فریر روڈ بھی جا کر اس کا سائنس سیکشن دیکھ لیں تو میں ڈاکٹر بدر قریشی صاحبہ سے جو اس وقت کالج کی وائس پرنسپل اور شعبۂ سائنس کی سربراہ تھیں، ملی۔ انھوں نے مجھے اپنے کالج کی سائنس کی تجربہ گاہیں دکھائیں۔ چنانچہ یہ سب چیزیں دیکھنے کے بعد میں نے گورننگ باڈی کو رپورٹ دی جس نے فیصلہ کر لیا کہ سائنس کا سامان منگانے کے لئے حکومت سے امپورٹ لائسنس لینے کی درخواست دے دی جائے، جو ہمیں بہت جلد مل گیا۔ ایک امپورٹ کمپنی کے ذریعے ہم نے ضرورت کا سارا سامان منگا لیا۔ اس وعدے پر کہ اس کی قیمت بہ اقساط بعد میں دی جائے گی۔ اس زمانے میں یہ کمپنیاں اپنا نفع بنانے کے لئے کالجوں

کی اس طرح مدد کر دیا کرتی تھیں۔ وہ بھی اس طرح جس طرح آجکل دولتمند ممالک پسماندہ ممالک کو امداد دیتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کی قیمت بازار سے زیادہ وصول کرتیں اور ہمارے لائسنس پر اور بھی بہت سا سامان منگا لیتیں۔ اور ان کو کئی گنا منافع پر فروخت کر دیتیں۔ اس وقت چونکہ ہمیں ان باتوں کا علم اور تجربہ نہ تھا۔ اس لئے پہلی دفعہ سامان منگانے کے بعد ہمیں بھی بہت سے ناخوشگوار مضمرات معلوم ہوئے جن کی وجہ سے ہم بعد میں بہت محتاط ہو گئے۔ بہر حال اس طرح اللہ کا نام لے کر ہم نے سائنس کا سیکشن شروع ہی کر دیا۔

کالج کے اخراجات کے لئے حکومت کی گرانٹ بہت ناکافی ہوتی تھی۔ اور طلبا کی دی ہوئی فیسیں بھی اتنی نہ تھیں کہ کالج آسانی سے چلایا جا سکتا۔ اس کے اخراجات روز بروز بڑھتے جاتے تھے اور گو کہ اساتذہ اور خود پرنسپل کی تنخواہ موجودہ زمانے کے اعتبار سے بیحد قلیل تھی۔ لیکن اول تو جذبۂ خدمت دوسرے اساتذہ اور انجمن انتظامیہ میں کوئی ٹکراؤ کی صورت نہیں تھی۔ اور شروع ہی سے ایثار، محبت اور قربانی کا جذبہ ایسا پیدا ہو گیا تھا کہ یہ ادارہ ایک طرح کا اتحاد باہمی کا ادارہ بن گیا تھا۔ جس میں ایک کو دوسرے پر مکمل اعتماد تھا۔ کیونکہ ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے نہ تھے۔ اور انھیں یقین تھا کہ انتظامیہ کا مقصد پیسے بنانا نہیں ہے۔ اور اگر کوئی مقصد ہے تو صرف یہ کہ کالج کو اچھے طریقے سے چلایا جائے جس سے تعلیمی

معیار بھی بلند ہوا اور طلبا اور اساتذہ بھی خوش
اور مطمئن رہیں۔ حالانکہ مجھے پرنسپلی کا کوئی تجربہ
نہ تھا لیکن چند ہی دنوں میں اس کے اسرار و
رموز سے واقف ہوگئی اور گوننگ باڈی کے
سکریٹری مولوی عظیم الدین خاں مرحوم اور سید
الطاف علی بریلوی کی مدد سے بہت جلدی ہی
انتظامی کاموں سے واقف ہوگئی۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں لڑکوں کے
کالجوں میں کچھ بےچینی کے آثار پیدا ہو گئے تھے،
اور اساتذہ، پرنسپل اور طلبا علیحدہ علیحدہ
کیمپوں میں تقسیم ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ناممکن
تھا کہ اس کا اثر ہمارے کالج پر نہ پڑتا۔ چنانچہ
ایک دن طالبات یونین کی جنرل سکریٹری جو ابھی
نئی نئی منتخب ہوئی تھیں اور بہت ذہین تھیں میرے پاس
آئیں اور کہنے لگیں کہ ہمارے کچھ مطالبات ہیں جنہیں
آپ پورا کریں۔ میں نے پوچھا مثلاً؟ بولیں مثلاً یہ کہ
لائبریری میں کتابیں بہت کم ہیں۔ میں نے کہا کہ صحیح
لیکن جن کتابوں کی فی الحال آپ کو ضرورت ہے وہ
تو سب موجود ہیں جو نہ ہوں ان کے نام بتائیے میں
میں منگا دوں گی۔ بولیں مثلاً ڈکنس اور اسکاٹ
کی کتابوں کے مکمل نسخے نہیں ہیں، میں نے کہا آپ
ٹھیک کہتی ہیں۔ ہماری لائبریری میں تمام مصنفین
کی کتابوں کے مکمل نسخے ہونے ضروری ہیں لیکن
ابھی فی الحال ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں آپ
لوگ پہلے وہ کتابیں جو موجود ہیں انھیں پڑھ لیجئے
اس کے بعد جو کتابیں آپ پڑھنا چاہیں گی ان کی
فہرست ہمیں دیجئے ہم منگا دیں گے۔ یہ صاحبہ جو
"مطالبات" کی روشنی میں شاید ٹکراؤ کی غرض
سے آئی تھیں، خاموشی سے چلی گئیں، معلوم نہیں
انھوں نے بعد میں ڈکنس اور اسکاٹ کی تمام کتابیں
پڑھیں یا نہیں لیکن مکمل نسخوں کی پھر فرمائش نہیں کی۔

اس کالج میں ایک بات شروع ہی سے رہی جو
قابل ذکر ہے وہ یہ کہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل
جل کر کام کرتے تھے اور کالج کو اپنا ادارہ سمجھتے
تھے۔ ایک دوسرے کے حفظ مراتب کا خیال ضرور تھا،
لیکن چاپلوسی نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ کسی سے خواہ مخواہ
مخاصمت یا ٹکراؤ کا جذبہ تھا۔ اچھے حالات ہوئے یا
برے سب ایک دوسرے کے شریک حال اور شریک
کار تھے۔ ہماری تنخواہیں بہت کم تھیں لیکن کالج کے
پاس جو کچھ روپیہ تھا۔ وہ سب کالج کے ضروری
اخراجات ہی پر صرف ہوتا تھا۔ کسی کی جیب میں نہ
جاتا تھا۔ اور نہ ظاہری نمود و نمائش اور فرش فروش
پر صرف ہوتا تھا اس لئے سب کو اطمینان رہتا تھا۔
کہ کوئی کسی کا استحصال نہیں کر رہا ہے۔ اور کالج
کے پاس جو کچھ روپیہ ہے۔ کالج ہی کی بہتری پر
صرف کیا جا رہا ہے۔ معاشرہ میں بے اطمینانی،
بے چینی اور توڑ پھوڑ اسی وقت شروع ہوتی ہے،
جب ایک گروہ کو یہ خیال ہو جائے کہ دوسرا گروہ
اس کا استحصال کر رہا ہے۔ جیسے جیسے ہماری آمدنی
بڑھتی گئی۔ (یہ اضافہ کوئی قابل ذکر نہ تھا) اساتذہ

ں تنخواہوں اور کالجوں کے سازوسامان طلباء کی ضروریات
ور مفاد کے سامان میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ہمیں
اپنی کم مائیگی اور خامیوں کا پورا پورا احساس تھا۔
سنہ ۱۹۶۰ء تک ہم اسی کرائے کی عمارت میں رہے۔ ہم
نے اس کی چھت پر کچھ عارضی شیڈ ڈال کر کلاس
روم اور بنا لئے تھے۔ لیکن ہر سال طلباء کی تعداد میں
اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور ان کی تعداد سنہ ۱۹۶۰ء تک تین سو
ہو گئی تھی۔ اوپر اور نیچے ملا کر لائبریری کے علاوہ
ل۔ ا کلاس روم تھے نیچے کے کمروں میں تو پنکھے
تھے۔ اوپر نہ بجلی کی لائین تھی نہ پنکھے، اور ہوا کے لئے
ہم کھڑکیاں کھول کر صرف قدرت کی مہربانیوں کا
سہارا لیا کرتے تھے۔

سڑک اور کالج کے درمیان جو خالی جگہ پڑی
تھی اس پر بے گھر لوگوں نے جھگیاں ڈال دی
تھیں۔ اس لئے اگر ہم کوئی بڑا جلسہ کرنا چاہتے تو
کوئی کھلی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ ایک دفعہ سنیچر کا دن تھا
کہ بڑا زبردست طوفان آیا۔ خوب تیز بارش اور ساتھ
ساتھ آندھی آئی۔ جھگی والوں کے مکان بہہ گئے۔
میں اس زمانے میں کالج سے بہت قریب رہا کرتی
تھی۔ ان کا حال دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی کیونکہ
ان کے چھوٹے چھوٹے بچے اور عورتیں کھلے آسمان
کے نیچے بھیگ رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے کالج کے
اندر جا کر پناہ لینے کی کوشش کی تو چوکیدار اور
چپراسی میرے پاس پہنچے۔ میں فوراً وہاں گئی اور
ان لوگوں سے باتیں کیں۔ انھوں نے کہا۔ کل اتوار
ہے۔ اور آپ کا کالج بند ہوگا۔ شاید بارش بھی رک
جائے۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ دوشنبہ
تک ہم آپ کی عمارت کو بالکل چھوڑ دیں گے۔
اس زمانے میں ایسا بہت ہوتا تھا کہ بے گھر لوگوں
نے کوئی خالی عمارت دیکھی اور اس پر قبضہ کر لیا اور
پھر اس کو چھوڑنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اس لئے میں
بہت پریشان ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسا نہ
ہو کہ دوشنبہ تک آپ عمارت نہ خالی کریں تو پھر
ہم کلاسیں کس طرح لیں گے۔ انہوں نے مجھے بہت
اطمینان دلایا۔ میں نے اجازت تو دے دی۔ لیکن
دل ہی دل میں پریشان تھی کہ کیا ہوگا۔ دوسرے دن
صبح ہی سے پولیس کا ایک دستہ مع لاٹھیوں کے
ان کو نکالنے کے لئے آ گیا۔ مجھ سے پوچھا کہ سنا ہے
آپ کے کالج پر جھگی والوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ
غریب پولیس کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ میں نے کہا کہ
انھیں چھوڑ دیں یہ ہماری اجازت سے آئے ہیں۔
اور کل صبح تک چلے جائیں گے، دوسرے دن تک
بارش تھم گئی تھی۔ اور یہ غریب بے گھر انسان اپنے
وعدے کے مطابق چلے گئے۔ جب ہمارے کالج
کی لڑکیاں دوشنبہ کو آئیں اور انھوں نے ان
کی ٹوٹی جھگیوں کی حالت زار دیکھی تو اسی دن ان
سب نے مل کر کئی سو روپے جمع کر کے ان لوگوں کو
دئیے کہ اپنی جھگیوں کی مرمت کر لیں۔

اس زمانے میں سب سے زیادہ تکلیف ہمیں
اپنی عمارت کے نہ ہونے اور جگہ کی تنگی سے ہوتی تھی

کالج نے شہر میں نیک نامی حاصل کر لی تھی اور ہر سال داخلوں کے لئے طلباء کی یورش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ہمارے ملک میں نجی تعلیمی اداروں کو مالی امداد دینے والی نہ تو کچھ انجمنیں تھیں، نہ ٹرسٹ اور نہ افراد۔ اگر ہمیں اصحاب اقتدار کی سرپرستی حاصل ہوتی تو شاید سرمایہ دار پرمٹوں اور لائسنسوں کی لالچ میں کچھ مدد کر دیتے (جیسا کہ عام طور پر ہوتا تھا)۔ لیکن اس ادارہ میں ابتدا ہی سے کچھ ایسے سر پھرے کارکن جمع ہوئے تھے۔ جنھوں نے نہ تو دولت کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور نہ اقتدار ہی کے آگے سر جھکایا۔ ایسا کرنے کی وجہ سے ہمیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ چنانچہ جب ہم چند اور نجی اداروں کے یہاں دولت کی ریل پیل دیکھتے تھے۔ تو ہم لوگ سنی اَن سُنی کر کے دوسری سمت دیکھنے لگتے، ہم اصول کی خاطر اپنے سر کو بلند کئے ہوئے مشکلات کے پتھروں سے ٹکراتے دشواریوں کی گھاٹیوں کو پار کرتے ان اعلیٰ اقدار کی مدھم روشنی کے سہارے رواں دواں رہے۔ جسے عام طور پر ہمارے معاشرہ نے فراموش کر دیا تھا۔

لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ ہمارے حساب کتاب کا ریکارڈ ہمیشہ صاف ستھرا رہا۔ اگر ہم اپنے اساتذہ کو زیادہ تنخواہیں نہیں دے سکتے تھے تو ہم نے ان سے کبھی غلط رسید وں پر دستخط بھی نہیں کرائے۔ اخراجات کے اکاؤنٹ میں غلط رسیدیں نہیں رکھیں! اگر ہم اپنی طالبات سے عمارت کے لئے چندہ لیتے تو اس کی باقاعدہ رسیدیں بھی دیتے تھے۔ اگر کوئی مینا بازار یا ورائٹی شو کرتے تو ٹکٹ لگانے کے لئے باضابطہ اجازت لے کر ایک ایک پیسے کا حساب کتاب پیش کر دیتے۔ ہم کالج کی لڑکیوں کو اپنی بچیوں کی طرح تربیت دیتے تھے۔ سادگی سے رہنا اور اعلیٰ اقدار کا خیال رکھنا ہمارا معمول تھا اور ہے۔ ظاہری نمود و نمائش کی ہم نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی، ہماری طالبات میں سے زیادہ تر درمیانی اور غریب طبقے کے خاندانوں کی لڑکیاں تھیں اور اسباب زندگی روز بروز گراں ہوتے جا رہے تھے اس لئے ۱۹۵۶ء میں اساتذہ، طلباء اور انتظامیہ نے مل جل کر طے کیا کہ کالج کی طالبات کے لئے پاکستان کے بنے ہوئے سوتی کپڑے کا یونیفارم ہونا چاہیئے تاکہ لڑکیوں کو روز روز نئے نئے کپڑے بدلنے اور ظاہری ٹیم ٹام کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس کے علاوہ غریب اور امیر میں کم از کم کالج کی حدود کے اندر تفریق نہ کی جا سکے۔ چنانچہ جب ہم نے یونیفارم رائج کیا تو شروع شروع میں ہمارا بہت مذاق اڑایا گیا۔ کچھ لوگوں نے بڑے اونچے انداز میں ناک بھوں چڑھا کر کہا کہ یونیفارم تو اسکول کے بچوں کے لئے ہونا چاہیئے۔ کالج کی طالبات کے لئے نہیں۔ لیکن ہم لوگوں کا خیال یہ تھا کہ کالج ہی میں پڑھنے والی لڑکیوں کی عمریں ایسی ناپختہ ہوتی ہیں۔ جب کہ نمود و نمائش کا جذبہ

یادہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسی وقت اس کی
ع کنی کرنی چاہیئے۔ اور ہم نے ان اعتراضات کی
ھی پرواہ نہ کی اور یونیفارم بدستور رائج رہا۔
۱۹۵۸ء میں جب فیلڈ مارشل ایوب خاں نے پہلی
ارشل لاء کا نفاذ کیا۔ اور شروع شروع میں
ختلف قسم کی اصلاحات کا زور ہوا۔ (جیسا کہ ہمارے
لک میں ہر نئی حکومت کے آنے کے بعد ہو سکتا ہے)
و تمام کالجوں کے طلباء کے لئے یونیفارم کا رواج
لازمی کر دیا گیا۔

بڑی کوششوں کے بعد ۱۹۵۸ء میں کالج
ے لئے تقریباً ساڑھے سات ایکڑ زمین حکومت نے
الاٹ کی ہمیں اس کی قیمت بغیر کسی رو رعایت کے
مروجہ داموں پر ادا کرنی پڑی جو تقریباً اسی ہزار
روپے کے ہوئی تھی۔ یہ قیمت ہم نے کئی سال کی
تگ و دو کے بعد رفتہ رفتہ قسطوں میں ادا کی جب
زمین پر ہمیں قبضہ مل گیا تو ہم نے سوچا کہ اب عمارت
کا نقشہ بنوا کر کم از کم سنگ بنیاد تو رکھ ہی دیا جائے
لیکن اس زمین پر P.W.D. کے نہایت ہی بھاری
بھاری پائپ ہزاروں کی تعداد میں پڑے ہوئے تھے۔
ان پائپوں کو ہٹوانے کے لئے ہم مختلف سرکاری
دفتروں کے چکر لگاتے رہے۔ تاکہ اپنی عمارت
بنوا سکیں۔ اس دوران سرکاری کارکردگی کے ہمیں
بڑے دلچسپ تجربے ہوئے۔ پائپوں کو وہاں سے
نہ ہٹانے کی مختلف وجوہات پیش کی جاتی تھیں۔
جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ان کو رکھوانے کی
کہیں اور جگہ نہ تھی۔ ایک اعلیٰ افسر (جو عہدے میں
بڑے اور قوت فیصلہ میں کمزور تھے) اور جن کو ہم لوگ
ذاتی طور پر بھی جانتے تھے۔ انھوں نے ہمیں بڑی
گراں قدر رائے دی، کہ ہمیں آپ لوگ یہ کریں کہ
متبادل جگہ تو ہم کہیں نہ کہیں نکال لیں گے لیکن آپ
لوگ ان کو ہٹوانے کا خرچ خود ادا کر دیں جو تقریباً
پانچ ہزار کے ہوگا۔ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس تو
اتنے پیسے فالتو نہیں ہیں کس کس مصیبت سے تو ہم نے
زمین کی قیمت ادا کی ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ جناب
عباس خلیلی صاحب کے پاس پہونچے۔ وہ اس زمانے
میں بھی سکریٹری تھے اور K.D.A. کا محکمہ ان کے
تحت تھا۔ انہوں نے سنتے ہی کہا کہ کیا آپ لوگ
دس روز تک انتظار کر سکتے ہیں۔ (محترم کا زمانہ تھا)
جی ہاں کیوں نہیں۔ جہاں ہم نے اتنا انتظار کیا ہے
دس دن اور سہی۔ انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق
سارے پائپ اس زمین پر سے ہٹوا دیے۔ ہمیں یہ
نہیں معلوم ہو سکا کہ اہلکاران حکومت کو یکایک
ان پائپوں کو رکھنے کی جگہ شہر کراچی میں کہاں مل گئی۔
بڑا افسر راضی ہو اور ساتھ ساتھ باصلاحیت بھی ہو۔
تو ہمارے ملک میں ساری مشکلیں کتنی جلدی آسان
ہو جاتی ہیں۔ اور عام لوگ در بدر کی ٹھوکریں کھانے
سے بچ جاتے ہیں۔

جب یہ زمین خالی ہو گئی تو پہلا جلسہ ہم نے
اس پر عید میلاد النبیؐ کا کیا۔ اس کے بعد کالج کے
سالانہ کھیل اس کھلی ہوئی جگہ پر منعقد کئے گئے۔

لیکن کھیل سے پہلے محترمہ راحیل بیگم شروانیہ کے ساتھ سارے اساتذہ اور طلبا، نے دو رکعت نفل بطور شکرانہ پڑھے اور خدا کے حضور میں دعا کی کہ اس کالج کو ترقی دے۔ دل سے نکلی ہوئی شاید انھیں دعاؤں کا اثر اور برکت ہے کہ یہ کالج باوجود بےشمار دشواریوں کے ترقی ہی کرتا جا رہا ہے۔

اب ہماری سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ کالج کی اپنی عمارت بن جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے کئی دفعہ ورائٹی شو، مینا بازار اور مشاعرے کئے جن پر ٹکٹ لگائے کالج کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کے موقعہ پر محترم مس فاطمہ جناح، سابق وزیراعظم جناب چندریگر صاحب بطور مہمان خصوصی کے تشریف لائے۔ ایک سال ہم نے مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ جناب عطاء الرحمٰن صاحب کو بھی مدعو کیا تھا اس وقت ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی ہم سے اس طرح جدا ہو جائیں گے۔ اسی طرح بیگم لیاقت علی خاں صاحبہ سابق وزیر تعلیم جناب فضل الرحمٰن صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بھی کالج کے مختلف جلسوں میں تشریف لائے۔ لیکن اتفاق کہئے یا دانستہ زیادہ تر اکابرین اس وقت مدعو کئے جاتے تھے۔ جب وہ کرسی اقتدار پر نہ ہوں۔ اس میں ہماری مجلس منتظمہ کی درویش منشی کی عادت شامل تھی، ہم کرسی کی نہیں بلکہ انسان کی عزت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ اسی پرانی عمارت میں تھے جہاں جگہ جگہ نہایت ہی بدشکل عارضی شیڈ کھڑے ہوئے تھے۔ اسکندر مرزا صاحب کی صدارت کا زمانہ تھا اور محترمہ بیگم ناہید اسکندر مرزا مختلف اسکولوں اور کالجوں میں بطور مہمان خصوصی کے مدعو کی جایا کرتی تھیں۔ تھوڑے ہی دن پہلے انہوں نے اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے کر سکندر مرزا صاحب سے شادی کی تھی اور معاشرے میں خاصا اسکینڈل ہوا تھا کیونکہ اسکندر مرزا صاحب کی پہلی بیوی حیات تھیں ایک صاحبہ جو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرتی ہیں۔ انھیں اپنے اسکول میں مدعو کر چکی تھیں اور ان کے لئے بڑا شاندار جلسہ بھی منعقد کر چکی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں کہ آپ کو چاہیئے کہ آپ بھی انھیں اپنے کالج میں بلائیں کالج کی شہرت بھی ہو جائے گی اور مالی فائدہ بھی۔ میں نے کہا میرا جی نہیں چاہتا کہ ایسے لوگوں کو لڑکیوں کے کالج میں بطور مہمان خصوصی کے بلایا جائے۔ اور ان کے تعارف کے لئے تعریفی کلمات کہے جائیں جن کا اپنا کردار معاشرے کے اعلیٰ ترین اقدار پر پورا نہ اترتا ہو چھوڑیئے بھی اس خیال کو ہم اپنی گدڑی ہی میں خوش ہیں

۶ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو آخر کار کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس تقریب میں جناب اختر حسین صاحب جو اس وقت مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ اور بڑے سادہ مزاج اور صوفی منش آدمی تھے۔ اور اب انجمن ترقی اردو کے صدر ہیں، بطور مہمان خصوصی کے تشریف لائے۔ اس جلسہ کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور کالج کے منتظمین اور ایجوکیشنل کانفرنس اور شعبۂ خواتین کے ممبران عمارت بنانے کے لئے فنڈ جمع کرنے کی مہم میں دن رات سرگرداں رہتے تھے۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں

اس جلسے کے بعد تقریباً ایک لاکھ اکتیس ہزار روپے کے عطیات کا اعلان کیا گیا۔ حکومت نے بھی ہمیں ایک لاکھ روپے عمارت کے لئے دیئے۔ جناب اسمٰعیل احمد صاحب (مرحوم) جو پاکستان اسلامک شپنگ کارپوریشن کے سربراہ تھے۔ انہوں نے تقریب میں شرکت کرنے سے پہلے، پانچ ہزار کا عطیہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب وہ جلسے میں آئے۔ اور انہوں نے کالج کی کارکردگی اور اعلیٰ معیار و اقدار و کردار کی رپورٹ سنی تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے اسی وقت دس ہزار کا عطیہ دے دیا۔ اس جلسہ میں کالج کی دو طالبات ریحانہ رضی اور شمیم رضی نے (شمیم رضی اب اسی کالج میں اردو کی لکچرار ہیں) بڑے جوش و خروش اور خوش الحانی کے ساتھ اقبال کے ساقی نامے کے کچھ منتخب اشعار اس قدر پر اثر طریقے سے پڑھے کہ سامعین کے دلوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

اس کے کچھ ہی دن بعد کالج کی عمارت بننی شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں مولوی عظیم الدین صاحب نے بڑی محنت کی اور دوران تعمیر عمارت کی مستقل نگرانی اور حساب کتاب کرتے رہے ۱۹۶۳ء میں جب ایک منزل تعمیر ہو گئی تو آرٹس سیکشن کو نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس دوران عہد ایوبی کے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ آ چکی تھی۔ اور اس پر سنہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے تعلیمی سال سے عملدرآمد شروع ہو چکا تھا۔ اس رپورٹ کے مطابق جہاں اور بہت سی تبدیلیاں کی جانے والی تھیں۔ ایک خاص تبدیلی یہ بھی تھی کہ کالج کے انٹرمیڈیٹ اور ڈگری سیکشنوں کو جسمانی طور پر علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ جس کے معنی یہ تھے۔ کہ دو کالج ہو جائیں اور دونوں کی عمارتیں سازوسامان۔ لائبریری۔ اساتذہ۔ مجلس منتظمہ، آفس اسٹاف، ریزرو فنڈ سب فوراً علیحدہ کر دیئے جائیں۔ کمیشن نے تو اس کام کو رفتہ رفتہ پانچ سال کی مدت میں کرنے کی اجازت دی تھی۔ (وہ بھی ہم ایسے بدحالوں کے لئے ایک امر محال تھا۔) لیکن یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب (بی اے ہاشمی مرحوم) اور ان کے رفقائے کار نے کالجوں پر یہ احکامات صادر کئے کہ یہ علیحدگی فوراً بلکہ سنہ ۱۹۶۱-۶۲ء کے تعلیمی سال سے شروع کر دی جائے۔ کہاں تو نجی اداروں کے لئے یہی مشکل تھا۔ کہ ایک ہی ادارہ کی عمارت کس طرح بنائی جائے۔ ایک ہی لائبریری کے لئے کس طرح معیاری کتابیں مہیا کی جائیں۔ ایک ہی کالج کی تجربہ گاہوں کی ضروریات کو کس طرح پورا کیا جائے۔ اور اب کہاں دو دو کالجوں کے علیحدہ علیحدہ انتظامات کرنے کے لئے کسی کے پاس علاؤالدین کا چراغ تو تھا نہیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ عملی طور پر تو یہ تقسیم ممکن نہ تھی۔ چنانچہ کالج کے پاس جو کچھ سامان تھا وہ کتابوں اور رجسٹروں کی حد تک دو جگہ تقسیم کر دیا گیا۔ اساتذہ کو بھی اسی طرح تقسیم کیا گیا۔ لیکن یہ ساری تقسیم اور علیحدگی صرف کاغذی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کیونکہ کالجوں کے پاس نہ ضروری فنڈ تھے اور نہ اتنے کارکن۔ یونیورسٹی بھی صرف کاغذی اور زبانی احکامات صادر کر سکتی تھی۔

ان پر عملدرآمد نہیں کرا سکتی تھی۔ چنانچہ جب ہمارا کالج نئی عمارت میں منتقل ہوا تو اس کا نام ڈگری کالج رکھا گیا۔ گو وہاں انٹرمیڈیٹ کے بھی سارے کلاسس ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۶۶۔۱۹۶۵ء میں جب دوسری منزل بھی مکمل ہوگئی تو سائنس سیکشن جو ابھی پرانی عمارت میں تھا وہ بھی ادھر ہی منتقل ہوگیا۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں کالج میں بی ایس سی کے کلاسیز بھی شروع ہوچکے تھے لیکن اسی سال تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے خلاف ملک بھر میں طلبا، نے اتنے شدید مظاہرے۔ ہڑتالیں اور ہنگامے کئے کہ رپورٹ کے مفید پہلوؤں پر بھی عملدرآمد روک دیا گیا۔ اور تعلیمی اصلاحات جن پر بغیر کسی منصوبہ بندی کے عملدرآمد شروع کردیا گیا تھا۔ دھری کی دھری رہ گئیں۔

۱۹۶۵ء میں ہندوستان سے جنگ کے دوران کالج میں سماجی سرگرمیاں شروع ہوگئیں، اور سول ڈیفنس کی کلاسوں کا انتظام کیا گیا۔ جن میں طلبا، اور اساتذہ دونوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، نئی عمارت میں آنے کے بعد ہمیں سانس لینے کی کچھ مہلت ملی۔ یہاں کی کھلی فضا میں کھیل اور غیر نصابی سرگرمیوں کا اہتمام بھی بہتر طریقے سے کیا جا سکتا تھا، چنانچہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ طلبا، کی کونسل اور انجمن اساتذہ بھی سرگرم عمل ہوگئیں۔ اور اس کالج میں طالبات کی تعداد تقریبًا ۱۷۰۰ (سترہ سو) اور اساتذہ کی تعداد ۶۵ کے لگ بھگ ہوگئی تھی کئی نئے شعبوں کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ کالج کا معیار تعلیم و تدریس بہتر ہوتا جا رہا تھا اور نظم و ضبط اور اتحاد کار کی وجہ سے اس نے نام پیدا کرلیا تھا لیکن مالی وسائل کی اب بھی بہت کمی تھی۔ حکومت کی طرف سے گرانٹ بہت ناکافی ملتی تھی۔ کیونکہ ہمارے کالج کے ارباب حل و عقد وہ مروجہ طریقے استعمال کرنے کو کسی طرح تیار نہ تھے۔ جن کی وجہ سے گرانٹ میں اضافہ ہوتا۔ اس لئے اساتذہ کی تنخواہیں اب بھی بہت کم تھیں، ہر سال جب سالانہ ترقی دینے کا وقت آتا تھا تو انتظامیہ اس شش و پنج میں مبتلا ہوتی تھی کہ یہ اضافی خرچ کہاں سے پورا کیا جائے سنہ ۱۹۶۶ء میں حکومت کے احکامات کے مطابق اساتذہ کی کم سے کم تنخواہوں کا اسکیل ۳۵۰۰۰ ہوگیا تھا لیکن گرانٹ میں اس تناسب سے اضافہ نہیں کیا گیا۔ روزمرہ کے اخراجات کے لئے صرف فیسوں کا سہارا تھا۔ جنگ کے بعد ملک کی معاشی حالت خراب ہوچکی تھی۔ سرمایہ دار اور دولتمند لوگ پہلے ہی سے جزرس تھے، عطیات دینے سے کترانے لگے، ان کی اپنی اولادیں تو زیادہ فیس دے دے کر دوسرے اداروں میں پڑھتیں یا غیر ملکوں میں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ ملک کے درمیانی غریب طبقوں کے بچوں کی تعلیم سے کیوں دلچسپی لیتے۔ ارباب حکومت کراچی سے کئی سو میل کے فاصلہ پر مغربی پاکستان کے دارالخلافہ لاہور میں جلوہ افروز تھے۔ انھیں کراچی کے تعلیمی مسائل کا نہ علم تھا نہ اس سے دلچسپی، انھوں نے تو صرف اتنا سن رکھا تھا کہ کراچی کے تعلیمی ادارے تجارتی اصولوں پر چلائے جاتے ہیں۔ دزیادہ تر ادارے دول

کے لئے یہ کہنا زیادہ بیجا بھی نہ تھا۔ لیکن وہ ہر ادارہ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے تھے۔ حالانکہ اس کالج کی طرح کچھ ادارے اور بھی تھے۔ جو مستقل مالی اور ذہنی پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے لیکن اپنے اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے منحرف نہ ہوتے تھے۔ سائنس کی تجربہ گاہوں کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ تو ۱۹۶۷ء میں کالج کی لیبارٹری فیس میں بہ حالت مجبوری اور بادل ناخواستہ کچھ اضافہ کر دیا گیا کہ حکومت نہیں دیتی تو کم از کم والدین ہی مدد کریں تاکہ معیار تعلیم تو نہ گرے۔ اس کے علاوہ کالج کی زمین کے ایک حصہ پہ چپڑاسی کی عمارت بنی تھی۔ اس میں کچھ ردوبدل کر کے نیشنل بنک آف پاکستان کی ناظم آباد برانچ کو کرائے پر دے دیا گیا جس کے بدلے میں بنک نے کرائے کے علاوہ دس ہزار روپے کالج کو عمارت کے عطئے کے لئے دیئے۔ بنک کے قریب ایک اور کھلے ہوتے قطعۂ آراضی میں پاکستان نیشنل آئل P.S.O. کو پٹرول پمپ نکالنے کی اجازت دے دی گئی اس نے تین سال کا ایڈوانس اور ۲۰۰ روپے ماہوار کرایہ دیا۔ ان طریقوں سے ہم نے کالج کی عمارت کی تیسری منزل بھی مکمل کر لی۔ اور بڑی حد تک ہماری دشواریاں حل ہو گئیں۔

اس دوران میں اپنی مدد آپ کر دکا جو اصول ہم نے اپنایا تھا اس سے ہم عمارت طلباء کے ویلفیر فنڈ اور وظیفوں کے لئے مختلف ذرائع سے روپیہ جمع کرتے تھے۔ چنانچہ غریب طالبات کی مدد کے لئے اساتذہ ہر ماہ اپنی تنخواہوں سے پانچ روپے دیا کرتیں۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ فنڈ اور ڈیوٹی فنڈ بھی جمع کرتے۔ جس سے ضرورت مند طالبات کے لئے نہ صرف فیسوں کا انتظام کرتے بلکہ کتابوں، یونیفارموں اور بسوں کے کرایہ کا بھی انتظام کیا جاتا۔ سرکاری قاعدے کے مطابق کالج کی طالبات کی کل تعداد کے کم از کم دس فی صد کو مکمل فیس کی معافی تھی۔ لیکن اس کالج میں اس تعداد کے علاوہ بھی ہر سال مختلف فنڈوں سے کئی سو لڑکیوں کی فیسیں ادا کی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء اساتذہ اور انتظامیہ اس کالج میں شانہ بشانہ کام کرتی رہی ہیں۔ اور ان میں ایسی یگانگت، محبت اور خلوص کا جذبہ رہا ہے، جس کی مثال زیادہ نہیں مل سکتی۔

ان حالات کے برخلاف یہ صحیح تھا کہ بعض بلکہ زیادہ تر کالجوں کی انتظامیہ اپنے اپنے اداروں کو تجارتی اصول پر چلاتی تھیں۔ جہاں نہ طلباء کے ضروری مسائل کی پرواہ کی جاتی تھی اور نہ اساتذہ کے انتظامیہ کا برتاؤ بدترین قسم کے سرمایہ داروں بلکہ وڈیروں کا سا تھا۔ اساتذہ کی ملازمتیں انھیں حالات میں قائم رہ سکتی تھیں۔ جب وہ انتظامیہ کے ہر اچھے برے اقدام پر بلاکسی چوں وچرا کے صاد کرتے رہیں بلکہ ان کے غیر قانونی کاموں میں بھی برابر کے شریک رہیں۔ جو ایسا نہ کرتے وہ بغیر وجہ بتائے ہوئے ملازمت سے برطرف کر دئے جاتے۔ اس کے علاوہ خود پروپرائٹر جو کہیں کہیں پرنسپل بھی بنے بیٹھے تھے۔ انھوں نے

شعبۂ تعلیمات کے افسروں سے ایسا چھپا ہوا گٹھ جوڑ کر لیا تھا کہ ان کی گرانٹ میں ہر سال اضافہ ہو جاتا تھا اور ان کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کارروائی کا سوال بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان کالج ٹیچرس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن یہ تنظیم کئی سال تک کچھ زیادہ فعال نہ ہو سکی۔ کیونکہ زیادہ تر نجی تعلیمی ادارے اپنے اساتذہ کو اس انجمن کا رکن بننے کی بھی اجازت نہ دیتے۔ اور نہ اس کے جلسے اپنے کالجوں کی عمارتوں میں کرنے دیتے۔ ۱۹۶۵-۶۶ء میں جب ہمارے کالج کی سیاسیات کی لکچرار مس نسیم شاہ اس تنظیم کی وائس پریسیڈنٹ ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے اس ادارے کی میٹنگ کالج میں کرنے کی اجازت مانگی (میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک کالج سے چھٹی لے کر لندن میں بغرض اعلیٰ تعلیم مقیم تھی اور مجھے اس انجمن کے قیام کی تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ اس کالج میں کبھی اساتذہ، پرنسپل اور انتظامیہ میں آپس کے اختلافات نہ ہوئے تھے۔ اور نہ کسی کو ایک دوسرے کے خلاف بداعتمادی تھی۔ انتظامیہ نے کبھی کالج کے انتظامی اور تدریسی معاملات میں دخل اندازی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے آپس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ چنانچہ اساتذہ کے جلسے کی اجازت دینے میں کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ اساتذہ کے مسائل کو تعلیمی مسائل کا ضروری جزو سمجھا گیا۔ اس کے بعد سے اس انجمن کے زیادہ تر جلسے اسی کالج میں ہونے لگے۔ جہاں کراچی کے تمام کالجوں کے اساتذہ جمع ہو کر اپنے مسائل پر بحث و مباحثہ کیا کرتے اور ان کے حل کی تدبیروں پر غور کرتے۔

۱۹۶۸ء کے اواخر میں عہد ایوبی کے دس سال پورے ہونے والے تھے۔ تو حکومت نے فیصلہ کیا کہ دہ سالہ "ترقی اور اصلاحات" کا جشن منایا جائے۔ اس سلسلے میں اخباروں نے ضمیمے نکالنے شروع کئے۔ تعلیمی اداروں اور بورڈ آف سیکنڈری و انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن نے شعبۂ تعلیمات کے احکامات کے مطابق شاندار جلسوں کا اہتمام کیا۔ جس میں صوبائی اور مرکزی وزراء اور افسران بطور مہمانِ خصوصی کے بلائے جاتے۔ اور عہد ایوبی کی اصلاحات اور ترقی پر قصیدہ خوانی ہوتی۔ یہ سلسلہ اکتوبر ۱۹۶۸ء سے شروع ہوا تھا اور پورے سال جاری رہنے والا تھا۔ لیکن چونکہ ملک کے معاشی اور تعلیمی حالات روز بروز دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ اور طلباء عام طور پر حالات سے بہت غیر مطمئن تھے۔ اس لئے یہ جلسے تقریباً ہر جگہ ہوٹنگ اور افراتفری کی نذر ہونے لگے۔ ان میں سے ایک جلسہ میں ڈائرکٹر تعلیمات کراچی نے ایوب خاں صاحب کی تعریف میں بہ زبان انگریزی ایک ایسا قصیدہ پڑھا جس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اور ان کی اس نظم کو اسلامی نقطۂ نظر سے بھی بہت برا بھلا کہا گیا۔ اس کے خلاف پوسٹر چھپے، اخبارات میں بیانات دیئے گئے۔ علماء نے مذمت کی اور عوام نے مطالبہ کیا کہ ایسے ناظم تعلیمات کو اس عہدۂ جلیلہ سے برطرف کیا جائے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اخبارات میں حکومت کے خلاف

صاف صاف الفاظ میں کوئی خبر چھپی ہو۔
۱۷ر اکتوبر کو جب طلبائے کراچی نے اپنا ہفتہ
مطالبات منایا اور اس سلسلے میں جلسے اور جلوس
نکالے تو ان کے جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی۔
اور طلبا اور پولیس کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔
معمول کے مطابق شہر کی کچھ بسیں جلائی گئیں۔
سڑکوں کی کچھ روشنیاں توڑی گئیں، کچھ طلبا گرفتار
ہوئے اور کراچی کے تمام اسکول اور کالج غیر معینہ
مدت کے لئے بند کر دے گئے۔

سرسید کالج بھی بند تھا۔ دو ایک ماہ تک تو اساتذہ کی تنخواہیں
دی جاتی رہیں لیکن نہ طالب علم آتے تھے۔ نہ فیسیں ملتی تھیں اور نہ
اساتذہ کو تنخواہیں، جب تک ممکن ہو سکا کالج کے مختلف فنڈوں سے
قرض لے لے کر تنخواہیں دی گئیں۔ لیکن جیل کے
گھونسلے میں ماس کہاں۔ کچھ دنوں بعد کالج کے
محدود سرمائے سے ان اساتذہ کو جو اپنے خاندان
کے اکیلے کماؤ فرد تھے۔ انھیں کو تنخواہ دی جانے لگی،
باقی کو نہیں۔ ۶ر نومبر کو راولپنڈی میں بھی طلبا اور
پولیس میں جھڑپ ہو گئی جس میں ایک طالب علم
مارا گیا۔ تو ۷ر نومبر سے تمام ملک کے تعلیمی ادارے
بند کر دیئے گئے۔ اور ایسے بند ہوئے کہ مہینے گذر
گئے اور ان کے کھلنے کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اساتذہ
اور طالب علم بار بار مطالبے کرتے تھے۔ افسران تعلیم
سے ملتے تھے کہ خدا کے لئے تعلیمی ادارے کھولو
لیکن کسی کے کانوں پر جوں نہ رینگی، اور تعلیمی ادارے
بند پڑے رہے۔ سندھ میں گورنمنٹ کالج تو گنے
چنے تھے۔ زیادہ تر کالج پرائیویٹ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ اساتذہ جن کی تنخواہیں یوں ہی اتنی قلیل تھیں کہ
ان کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ اب بالکل نہ ملنے
کی وجہ سے اور بھی سخت قسم کی مالی اور ذہنی صعوبتوں
میں مبتلا ہو گئے۔ پرائیویٹ کالجوں کی سب سے بڑی
تعداد کراچی میں تھی اور یہاں اساتذہ کی تنظیم مغربی
پاکستان کالج ٹیچرس ایسوسی ایشن مقابلتہً فعال
بھی زیادہ تھی۔ مزید یہ ہوا کہ اسی سال اس تنظیم
کے کراچی ریجن کی صدر مسز انتیا غلام علی منتخب ہوگئی
تھیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۶۹ء کے مہینے تک جب کالجوں
کے کھلنے کی کوئی امید نہ رہی اور اساتذہ کراچی کے
شہری حکام سے ڈیپوٹیشن کی شکل بھی کئی بار ملے
اور ان سے اپنے مسائل بتائے۔ لیکن کوئی شنوائی
نہ ہوئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ حکومت اور
عوام کی توجہ اس اہم مسئلہ پر مبذول کرانے کے لئے
جلوس کی شکل میں سڑکوں پر نکلیں گے۔ انھوں نے
جھنڈے اور بینر لے کر جلوس نکالے اور تعلیمی اداروں
کو کھولنے کا مطالبہ کیا۔ طلبا نے بھی ان کے اس
مطالبہ کا ساتھ دیا۔ کیونکہ چار مہینے سے وہ سڑکوں
پر مارے مارے پھر رہے تھے اور ان کا وقت ضائع
ہو رہا تھا۔ وکلا نے بھی سیاہ قوانین کی منسوخی
کے لئے جلوس نکالا۔ اخبار نویسوں اور مزدوروں
نے بھی ساتھ دیا۔ غرض سارے ملک میں جلوسوں
اور مظاہروں کی آگ سی لگ گئی۔ اسی دوران
صدر ایوب کے ایک معتمد خاص سرکاری افسر جو

کسی کام سے لندن جا رہے تھے۔ وہ میرے شوہر
مختار زمن صاحب سے ملے۔ حالات حاضرہ پر
تبادلۂ خیال ہوا۔ تعلیمی اداروں کے بند ہونے کی
بات ہوئی تو یہ صاحب بولے کہ مخالف پارٹیاں یہ
نہیں سمجھتیں کہ حکومت کتنی مضبوط ہے۔ اور اس پر
ان جلسوں جلوسوں اور مظاہروں کا قطعی اثر
نہیں ہوگا اور سارے مظاہرے بتاشہ کی طرح بیٹھ
جائیں گے۔ اسی دوران ایک بہت تجربہ کار سیاستدان
جو صدر ایوب کے مشیر اور ناک کے بال سمجھے جاتے
تھے۔ انھوں نے بھی ایک نجی ملاقات میں کچھ لوگوں
سے کہا کہ حزبِ اختلاف کے لوگ احمق ہیں اور انھوں
نے مظاہرے قبل از وقت کردیئے ہیں۔ چنانچہ وہ صدارت
کے انتخابات تک شل ہوکر رہ جائیں گے۔ (صدارتی
انتخاب ۱۹۷۰ء میں ہونے والا تھا۔ جب حکومت
کے معتمد افراد و مشیر اس قسم کے مشورے دیتے ہیں
تو ظاہر ہے کہ صدر ایوب کا عوام سے کوئی براہ راست
رابطہ تو تھا نہیں۔ انھیں صحیح حالات کیسے معلوم
ہوتے۔ چنانچہ تعلیمی ادارے بدستور بند رہے۔
کراچی میں مغربی پاکستان کالج ٹیچرس ایسوسی ایشن
نے طے کیا کہ وہ عوام کی توجہ مبذول کرانے کے لئے
بھوک ہڑتال کریں گے تاکہ حکومت کی بے رحمانہ
بے رخی کا پول کھل جائے۔

اس دوران سرسید کالج کی تیسری منزل
مکمل ہوچکی تھی۔ اس کام میں گورننگ باڈی کے
نئے سکریٹری مولوی عظمت اللہ صاحب (مرحوم)
جون ۱۹۶۶ء میں جناب عظیم الدین خاں صاحب
کی وفات کے بعد منتخب ہوئے تھے۔ بہت محنت
اور کاوش سے کام کرتے رہے۔ اور تعمیر عمارت
کی دشوار ٹکنیکل اور غیر دلچسپ ذمہ داریوں میں
منہمک رہے ان کی کوششوں سے کالج کی عمارت
پایۂ تکمیل کو پہونچی کیونکہ مزدوروں، معماروں
ٹھیکیداروں اور انجنیروں سے کام لینے کے لئے
انھیں کے تجربہ مستقل مزاجی اور دیانت کی
ضرورت تھی ورنہ عمارتی تعمیر کے مصطلحات مثلاً
سیدھی اور الٹی بیم آر سی سی، چھت شٹرنگ
کوٹیا وغیرہ کے الفاظ سے ہم جیسے لوگ قطعی ناآشنا
تھے اور عظمت اللہ صاحب عمارت کے معائنے کے
لئے جب مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے تو میں صرف
کلاس روم، لیباریٹریوں کھڑکیوں اور تختۂ سیاہ
کے سائز اور ضروریات پر تو ضرور رائے دے دیتی
تھی لیکن ان چیزوں کی تعمیر میں کن کن لوازمات
کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے مجھے کوئی دلچسپی
نہ تھی۔ گو وہ ان تکنیکی معاملات پر بڑی صراحت
سے لکچر دیتے لیکن میں اس طالب علم کی طرح جسے
لکچر سے کوئی دلچسپی نہ ہو سن تو ضرور لیتی لیکن
سمجھنے کی قطعی کوشش نہ کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے
کہ وہ دیواروں کے کونے اور زاویئے خود ناپتے
اور تعمیر شدہ حصوں کی اپنے سامنے پیمائش
کرانے اور ایک ایک پیسے کا حساب کرکے ادائگی
کیا کرتے۔

ہم بہت خوش تھے کہ اب عمارت مکمل ہوگئی ہے، تو ہم بڑے اطمینان سے تعلیمی اور تدریسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکیں گے۔ لیکن اکتوبر سے جو کالج بند ہوئے تو تاآج کھلتے تھے نہ کل، چنانچہ جب انجمن اساتذہ نے بھوک ہڑتال کرنے کی ٹھانی تو ہڑتالیوں میں مرد اساتذہ کے علاوہ دو خواتین بھی شامل تھیں، ہمارے کالج کی انگریزی کی لکچرار مسز ذکیہ سرور اور پی ای سی ایچ ایس کالج کی سیاسیات کی لکچرار مسز داؤدی، مس انیتا غلام علی میرے پاس آئیں۔ اور بولیں چونکہ ہڑتالیوں میں خواتین بھی شامل ہیں اس لئے اساتذہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ ہڑتال ہمارے کالج کے پھاٹک کے سامنے شامیانہ لگا کر ہو، ورنہ کسی مردانہ کالج میں ہوئی تو خواتین ہڑتالیوں کو بہت زحمت ہوگی اس کے لئے انہیں کالج کی انتظامیہ کی اجازت کی ضرورت تھی، ہماری انتظامیہ نے ہمیشہ ہی سے اساتذہ کے ہر مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھا تھا۔ انہوں نے میرے کہنے پر فوراً اجازت دے دی۔ اور ۲ مارچ ۱۹۶۹ء سے کالج کے پھاٹک کے سامنے بھوک ہڑتالی اساتذہ نے اپنا کیمپ لگا لیا۔ پھر کیا تھا عوام مزدور طلبہ یونیورسٹی کے اساتذہ سب کی ہمدردیاں نیز سیاسی لیڈران کی ہمدردیاں بھی اساتذہ کے ساتھ ہوگئیں۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت تک حزب اختلاف کے مقبول لیڈر ہو کر ابھر چکے تھے وہ بھی اساتذہ سے ملنے آئے۔ اور انہوں نے ان کے مسائل ہمدردی سے سنے۔ ایک ہجوم تھا جو ہر وقت کالج کے پھاٹک کے سامنے رات کے دو دو تین تین بجے تک لگا رہتا تھا۔ پبلک کے علاوہ یونیورسٹی کے سارے اساتذہ، کالج ٹیچرس سے ہمدردی کے اظہار کے لئے ایک جلوس کی شکل میں قائداعظم کے مزار سے سرسید کالج تک پیدل آئے۔ اس جلوس کی سربراہی ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب مرحوم کر رہے تھے۔ جو اس وقت فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر افضال حسین قادری مرحوم، ڈاکٹر علی اشرف اور دوسرے اساتذہ بھی تھے۔ جس وقت یہ بزرگ ہمارے کالج پر پہنچے ہیں تو دھوپ اور تھکان کی وجہ سے ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ ہم لوگ جو کالج کے اندر تھے ہم نے جلدی جلدی ان کے لئے ٹھنڈے پانی اور چائے کا انتظام کیا اور ہمارے دلوں پر اس بات کا بہت اثر ہوا کہ ڈاکٹر محمود حسین خاں اور یونیورسٹی کے دوسرے عالم و فاضل اساتذہ اس طرح دھوپ میں پیدل چلنے کی تکلیف اٹھا کر کالج کے اساتذہ کے مسائل سے اپنی ہم آہنگی کا اظہار کریں۔

ملک کے ان حالات کا ایک خوش آمیز نتیجہ یہ ہوا کہ اخبارات جو اب تک سنسرشپ کا شکار تھے ایک دم خود بخود آزاد ہوگئے۔ اساتذہ کی ہڑتال کی خبروں اور تصویروں سے اخبارات کے صفحے کے صفحے سیاہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ دس دن کے اندر اندر ناظم تعلیمات (جنہوں نے صدر ایوب خاں کی شان میں قصیدہ لکھا تھا۔ اپنے عہدے سے ہٹا دیئے گئے

اور ان کی جگہ جناب غلام مصطفےٰ شاہ صاحب نئے ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے۔ انہوں نے آتے ہی اساتذہ کے نمائندوں سے مل کر گفت و شنید کی ان کے سارے مطالبات منظور کئے۔ طلباء کو رہا کرانے، ان کی تنخواہیں دلوانے، کالج کھلوانے اور بدعنوانیوں کی تفتیش کرانے کا وعدہ کیا۔ اس یقین دہانی کے بعد بھوک ہڑتال بخیر و خوبی ختم ہوگئی۔ لیکن چونکہ سارے کام ہمارے کالج کے سامنے ہوئے تھے اس لئے کالج کا نام بہت مشتہر ہوا اور چند ناسمجھ لوگ تو یہ سمجھے کہ ساری ہڑتال ہمارے ہی کالج کے اساتذہ نے ہماری انتظامیہ کے خلاف کی ہے۔ چنانچہ مارچ کے آخر میں جب یحییٰ خاں نے دوسرا مارشل لاء نافذ کیا اور فوجی افسران جگہ جگہ معائنہ کرنے جانے لگے تو ایک صاحب ہمارے کالج میں بھی تشریف لائے اور مجھ سے کہنے لگے کہ میں نے آپ کے کالج کا نام اخباروں میں بہت پڑھا ہے۔ آپ کے اساتذہ کو آپ کی انتظامیہ سے کیا شکایت ہے؟ اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی اخبار کس قدر سرسری طور پر پڑھتے ہیں۔ ان صاحب کو اصل واقعات سمجھانے میں مجھے خاصی دشواری ہوئی لیکن شکر ہے کہ جب وہ سمجھے تو اتنی اچھی طرح سمجھے کہ بہت متاثر ہوئے، اور تین چار روز بعد ایک اور اعلیٰ افسر کو مع شہر کے دوسرے حکام کے کالج کے معائنہ کے لئے اپنے ساتھ لے آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اب آپ اپنے کالج کے مسائل انہیں بتائیے۔ میں انہیں سارا کالج دکھانے لے گئی۔ جسے دیکھ کر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ پوچھنے لگے کہ کیا آپ نے کالج کی صفائی ابھی مارشل لاء کے بعد کرائی ہے (واضح ہو کہ مارشل لاء کے فوراً بعد ظاہری صفائی پہ بہت زور دیا جاتا تھا) میں بولی جی نہیں یہ تو بہت پہلے ہی سے ہمارے یہاں تھی۔ بولے آپ کی کینٹین (CANTEEN) اچھی نہیں ہے۔ میں نے کہا میں خود جانتی ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ بہت خراب ہے۔ لیکن ہم فی الحال اس سے بہتر انتظام نہیں کر سکتے کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں.. کیا آپ کو حکومت سے اتنے فنڈز نہیں ملتے؟ جی نہیں ابھی ابھی تو ہم نے بمشکل تمام خود فنڈ جمع کر کے کسی طرح کلاس روم لیبارٹریوں کی عمارت پوری کی ہے۔ اور اس میں ابھی گیس تک نہیں آئی ہے۔ اور اس کے بعد مجھے اپنی مشکلات بیان کرنے کا موقعہ مل گیا برگیڈیر صاحب نے لائبریری، لیباریٹریاں، میوزیم، کلاس روم سبھی دیکھ ڈالے۔ ہر جگہ باقاعدہ کام ہو رہا تھا۔ بڑے متاثر ہوئے (شاید انہوں نے اساتذہ اور طلباء کے متعلق دوسرے ہی قسم کی رپورٹیں سنی ہوں گی) کہ ایم سی کے چیرمین سے بولے کہ آپ اس کالج کی کینٹین canteen تعمیر کرائیے۔ اور بہت اچھی تعمیر کرائیے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بہت منہ بنا کر بولے۔ آپ کے یہاں سبزہ بالکل نہیں۔ میں نے کہا جی ہاں پانی کی جو سخت کمی ہے۔ اس پر انہوں نے فوراً پانی کے وافر انتظام کے لئے حکم دے دیا، اور کے۔ ایم۔ سی کے افسر باغات سے کہا گیا کہ یہاں پودے لگوائے جائیں اور میدان کی صفائی

کی جائے۔ پھاٹک کے دونوں سمت جو کے۔ایم۔سی
کا نہایت ہی بدبو دار اور غلیظ کھلا ہوا نالہ تھا اور
جس کے بیچوں بیچ غریب اساتذہ نے دس دن
اور رات بھوک ہڑتال میں گزارے تھے اس کو
بند کرانے کا حکم دیا گیا، سوئی گیس کمپنی والوں
کو حکم دیا گیا کہ ہمارے کالج کے لئے فوراً نئے پائپ
ڈال کر گیس فراہم کی جائے۔ اور وہی اصحاب
حل و عقد جن سے گیس کی سپلائی کے لئے کہتے
کہتے دو سال ہیں میں عاجز آ چکی تھی اور وہ بار
بار پائپ لائن نہ ہونے کا حیلہ پیش کرتے اور
بڑی میٹھی زبان میں کہتے کہ "بہن آپ اطمینان رکھیں
جیسے ہی پائپ آ جائیں گے میں سب سے پہلے آپ کو
سپلائی کردوں گا۔ آخر کار آپ کا قومی ادارہ ہے۔
لیکن یقین کیجئے۔ ابھی ایک سال تک اور آپ کو انتظار
کرنا پڑے گا۔" انھوں نے فوجی افسروں کے حکم پر
ایک مہینے کے اندر اندر سارے پائپ ڈال کر ہمیں
گیس سپلائی کرنی شروع کردی۔ اور میں ششدر
ہو کر سوچتی رہ گئی کہ کیا ہمارے ارباب اقتدار
صرف ڈنڈے ہی کے ڈر سے حکم بجا لانے کے اہل ہیں؟
اس چکر میں اور جو کچھ بھی مصائب آئے ان
کا ذکر تاریخ میں آئے گا لیکن فوری طور پر ہمارے کالج
کو بڑے فائدے ہو گئے۔ درخت اور لان لگائے
گئے۔ میدان کی صفائی کی گئی۔ نالہ بند کیا گیا کینٹین
بن گئی اور ایسی اچھی بنی کہ شہر کے کسی اور کالج میں
شاید اتنی اچھی کینٹین نہ ہوگی۔

۱۹۶۹ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد
پھر تعلیمی اصلاحات کا دور شروع ہوا۔ انجمن اساتذہ
کے مطالبہ پر پرائیویٹ کالجوں کی تفتیش کے لئے ایک
کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں حکومت اور یونیورسٹی
کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے معاہدہ
کے مطابق ان کے نمائندے بھی رکھے گئے۔ اس کمیٹی
کے سپرد تمام کالجوں کا تفصیلی معائنہ کیا گیا معائنہ
کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حشر کا ساسماں ہے۔
فوج کا ڈر، بدنامی اور رسوائی کی شرم، غرض وہ
لوگ جواب تک بڑے آرام کی زندگی گزار رہے تھے
اور اساتذہ اور طلبا کا استحصال کر کے چین کی بنسی
بجایا کرتے تھے۔ ان کی رات کی نیندیں اور دن کا
چین حرام ہو گیا۔ اس کمیٹی کی تفتیش کے بعد بڑے
بڑوں کے پول کھل گئے۔ اس کے بعد ہمیں پتہ چلا
کہ اور لوگوں کے اللے تللے کس طرح ہوتے تھے اور
کیوں مالی طور پر پریشان حال رہا کرتے تھے لیکن
اب ہمیں احساس ہوا کہ ہم کس قدر بے فکر ہیں اور
چین کی نیند سوتے ہیں۔ گو اتنے برس ہم نے دشواریاں
اٹھائی ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارا سر بلند ہے ہمیں
کسی معائنہ، کسی تفتیش، کسی سوال جواب کا خوف
نہیں۔ ہمارے کالج میں بھی یہ کمیٹی ایک دفعہ نہیں
بلکہ کئی دفعہ آئی اور اس نے بار بار ہمارے حساب
کتاب کی جانچ پڑتال کی۔ لیکن اسے باوجود کوشش
کے کوئی اور شکایت نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ
اساتذہ کی تنخواہیں سرکاری اسکیل سے کم تھیں۔

اور اس کا خود ہمیں بھی احساس تھا۔

دوسرے مارشل کا دور پاکستان کی تاریخ کا سخت ترین دور تھا۔ لیکن اس میں ایر مارشل نور خاں کی سربراہی میں ایک نئی تعلیمی پالیسی مرتب ہوئی جس میں اساتذہ اور طلباء کے سارے مسائل اور مطالبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملک کے تعلیمی نظام کو نئے سرے سے تشکیل دینے کی کوشش کی گئی۔

اس دوران میں پرائیویٹ کالجوں کے اساتذہ کی واحد تنظیم "مغربی پاکستان کالج ٹیچرس ایسوسی ایشن" مس انیتا غلام علی کی سربراہی میں بہت فعال ہو گئی تھی۔ موصوفہ نہایت ہی ذہین، محنتی، بے غرض اور دیانت دار استاد ہیں۔ اور اساتذہ اور طلباء میں بہت مقبول۔ مارشل لاء کے دوران جب عام طور پر لوگ زبان کھولتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ یہ بے خوف و خطر اساتذہ کے مطالبات عوام اور حکومت کے سامنے برملا پیش کیا کرتی تھیں ـــ ان کے پاس صوبے کیا پورے ملک کے کالجوں کے متعلق ہر قسم کی تفصیلات اور اعداد و شمار رہا کرتے۔ یہ تفصیلیں اکثر اوقات حکومت کے افسران کے پاس بھی نہ ہوتیں۔ اپنی بے غرضی، نیک نیتی، ہمت اور صاف گوئی کی وجہ سے لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ اور تعلیمی اصلاحات سے متعلق ہر گفتگو میں ان کی رائے کو وقعت دی جانے لگی۔

اساتذہ اور طلباء کے مطالبہ پر ۱۹۷۰ء میں حکومت نے ایک نیا آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے پرائیویٹ کالجوں کی انتظامیہ میں بہت رد و بدل اور اساتذہ کی تنخواہوں میں خاصے اضافے کئے گئے۔ نور خاں رپورٹ کی روشنی میں طلباء اور اساتذہ کو تعلیمی اداروں کی مجلس انتظامیہ میں اہم عہدے دئے گئے۔ اور ہر قسم کی بے ضابطگیوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یحییٰ خاں کی حکومت "عارضی" تھی۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں ملک بھر میں عام انتخابات ہو چکے تھے اور تعلیمی اصلاحات پر عمل درآمد کرنے کی پوری ذمہ داری نئی نمائندہ حکومت کرنے والی تھی لیکن اس دوران میں مشرقی پاکستان کے سوال پر ہندوستان سے پھر جنگ ہو گئی جس کا نتیجہ پاکستان کی شکست اور ہتھیار ڈالنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شکست کی شرم نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ یحییٰ خاں کی حکومت کو استعفیٰ دینا پڑا اور دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء میں نئی عوامی حکومت مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں برسر اقتدار آئی۔

اس کے تحت نئی تعلیمی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ جن کے مطابق تعلیم کی ساری ذمہ داری حکومت نے اپنے سر لے لی۔ اور سارے کالج اور بیشتر اسکول حکومت کی تحویل میں لے لئے گئے۔ چنانچہ یکم ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء کے بعد سے سرسید گرلس کالج بھی حکومت سندھ کے تحت سرکاری کالج بن گیا۔ اور اس کے اساتذہ سرکاری ملازم ہو گئے۔ نئی حکومت نے وعدہ کیا کہ اساتذہ اور طلباء کے مسائل ان کی مرضی کے

مطابق حل کئے جائیں گے۔ اس وعدہ کے مطابق جہاں اور بہت سے کام ہوئے اساتذہ کی تنخواہوں اور ان کے گریڈ میں اتنا اضافہ ہوا جس کی خود انھیں بھی امید نہ تھی۔ تجربہ اور قابلیت کی بنا پر انھیں قومی اسکیل کے اعلیٰ عہدے دیئے گئے۔ مکان کا کرایہ، مہنگائی الاؤنس، علاج معالجہ کی سہولت، مکان بنوانے کے لئے قطعۂ آراضی اور قرض کی وہ سہولتیں دی گئیں جو اب تک انھیں نہیں ملی تھیں اور صرف بڑے بڑے سرکاری حکام ہی کو دی جایا کرتی تھیں۔

سرسید کالج کے وہ اساتذہ جنھوں نے کبھی اپنی تنخواہوں میں اضافے کے لیے انتظامیہ کو پریشان نہیں کیا تھا۔ اور ہمیشہ خدمت ایثار اور قربانی کے جذبات سے متاثر ہو کر کام کیا تھا۔ بہت فائدے میں رہے ان میں سے چھ کو پروفیسر کا گریڈ ۱۲ کو اسسٹنٹ پروفیسر کا اور باقی کو لکچرار کے گریڈ دیئے گئے۔ اس طرح بعض کی تنخواہوں میں دوگنے اور تگنے سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا۔ مالی منفعت کے علاوہ اس کالج کی نیک نامی بھی اس درمیان میں بہت بڑھ گئی سونا رفتہ رفتہ آگ میں جل جل کر کندن ہو گیا تھا۔ تعلیم و تربیت سماجی شعور۔ ہر اعتبار سے اس کالج نے ایک منفرد حیثیت اختیار کر لی تھی۔

کالج کے ایوان سائنس کے نئے بلاک کی تعمیر ۱۹۷۰ء میں شروع ہوئی۔ اور اس کے لئے جناب افتخار حسین صاحب کی کوششوں سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے نیشنل ریفائنری نے دیئے۔ یہ بلاک ۱۹۷۲ء میں جو ابھی پوری طرح مکمل بھی نہیں ہو سکا تھا کہ سرکاری تحویل میں آجانے کے بعد اس کا کام کچھ مہینوں تک کے لئے رک گیا لیکن سال کے اندر ہی اندر نئے بلاک کے اوپر کی منزل کے چار کمرے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی نگرانی میں مکمل کر دیئے گئے جو بہت کشادہ اور ہوادار ہیں۔ کالج کی لائبریری جس کو اب عظیم الدین خاں لائبریری کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ وہاں منتقل کر دی گئی ہے۔ اتنی بڑی لائبریری اور ریڈنگ روم کراچی کے شاید ہی کسی اور کالج میں ہو، اس میں اب تقریباً ۲۰،۰۰۰ کتابیں ہیں اور دو لائبریرین ہیں جو صبح سے شام تک کالج کی ستائیس سو ۲۷۰۰ طالبات کی خدمت میں منہمک رہتی ہیں۔ اس لائبریری میں مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کی دی ہوئی تقریباً ۵۰۰۰ نادر اور قیمتی کتابوں کا وہ عطیہ بھی شامل ہے جو انھوں نے بڑے ایمان اور خلوص سے رسول کریم کی سیرت اور زندگی کے کارناموں پر جمع کی تھیں اور اپنی وفات کے بعد کالج کی لائبریری کے لئے وقف کرنے کی وصیت کر دی تھی۔

گذشتہ ۱۲ سال کے عرصے میں سرسید کالج کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ اس کے بھلاوت کارکن۔ اساتذہ اور طالبات سب کی ملی جلی محنت اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ اس کی روایات میں یگانگت، سادگی، اعلیٰ ظرفی، اسلامی اقدار کی بلند ترین خصوصیات شامل ہیں یہاں

اساتذہ اور طالبات ملک و ملت سے بیگانگی
کی فضا میں سانس نہیں لیتیں ۔ بلکہ بحران کے
وقت تن من دھن سے خدمتِ خلق میں
مصروف ہو جاتی ہیں ۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ
ہو یا ۱۹۷۱ء کی ۔ ۱۹۷۰ء کا سیلاب ہو یا دسمبر
۱۹۷۴ء کا زلزلہ ۔ ہر قسم کی آفاتِ ارضی و سماوی
کے دوران سب یکجا ہو کر سر دھڑ کی بازی لگا
دیتی ہیں ۔ اپنی مدد آپ کر دکھا جو سبق انھیں
پڑھایا گیا ہے اس کی وجہ سے وہ تعلیم کو کتابوں
کی بے جان جلدوں ہی تک محدود نہیں رکھتیں
بلکہ اپنے عمل سے ان اصولوں کو زندہ رکھنے
کی کوشش کرتی ہیں جو تعلیم کا اصل مقصد ہیں ۔
اور جن کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات
کا درجہ دیا گیا ہے ۔ انھیں اپنے ہاتھ سے کام
کرنے میں کوئی ہتک نہیں محسوس ہوتی ۔ وہ
کالج کے باغ و عمارت کی صفائی میں منہمک رہتی
ہیں ۔ کمروں ، دیواروں چھتوں کی صفائی ،
دروازوں اور شیشوں پر پالش کرنا ۔
جلسوں میں ہوم اکنامکس کے شعبہ کے ذمہ
کھانے پینے کا انتظام کالج کے روزمرہ انتظام
اور ڈسپلن میں طالبات یونین کے ممبران
کی ذمہ داریاں اب ہماری روایات میں
شامل ہو گئی ہیں ۔

لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ ملک
کے ان لوگوں کو علم و عمل کے جذبات سے سرشار
کرنا ہے ، جنھیں وہ مواقع نہیں مل سکے ہیں جو
ہمیں ملے ہیں ۔ ہمیں امیر اور غریب کا فرق مٹانا
ہے ۔ جہالت کے اندھیرے کو دور کرنا ہے اور
ایسی فضا قائم کرنی ہے جس میں ایک دوسرے
سے مغائرت اور منافقت نہ ہو ۔ صوبائیت
اور تعصب نہ ہو ۔ ایمان ، انصاف اور
خود داری کے جذبات پروان چڑھیں ،
انسانیت کا بول بالا ہو اور آدمی آدمی کا
دشمن نہ بنے تاکہ یہ دنیا حسین اور بہتر زندگی
گزارنے کی جگہ بن جائے ۔

شفیق انجم

علیگڑھ

متین رخ

سبق تاروں کو دیتا ہے تجسس کے قرینے کا
مسافر خود یہاں ملاح ہوتا ہے سفینے کا
بقدرِ ظرف مستی ہے یہاں دستور پینے کا
یہاں کا رہنے والا حوصلہ رکھتا ہے جینے کا
مصائب سے نہیں ڈرتے یہاں مقصد کے متوالے
بڑھا دیتے ہیں عزم و جستجو کو پاؤں کے چھالے
یہاں مضبوط کر دیتے ہیں عقل و دل کے رشتوں کو
یہاں تبدیل کر دیتے ہیں قسمت کے نوشتوں کو
تقدس میں بدل دیتے ہیں شیطانی سرشتوں کو
یہاں انسانیت کا درس دیتے ہیں فرشتوں کو
سبق دیتے ہیں ہوش و آگہی عزم و تیقن کا
ہمیشہ سے یہ گہوارہ ہے تہذیب و تمدن کا
یہاں کھولی گئی ہیں سب سے پہلے زیست کی راہیں
نظامِ دہر کو تبدیل کر دیں جب بھی یہ چاہیں
یہاں منہ نوچ لیتے ہیں یہاں بھرتے نہیں آہیں
یہاں موڑی گئی ہیں بارہا تاریخ کی راہیں
یہاں اُس سے بال و پر بھی قابلِ پرواز ہوتا ہے
یہیں سے انقلابِ دہر کا آغاز ہوتا ہے

مطبوعات

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

از جناب ثناء الحق صدیقی ایم اے

۱۹۵۱ء میں جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا احیا آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے کراچی میں کیا گیا تھا اس وقت کسے خبر تھی کہ یہ ننھا سا پودا جو ایک اجنبی ماحول میں لگایا جا رہا ہے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک تناور درخت بن کر اپنی شاخوں کو دور دور تک پھیلا دے گا، رنگین اور پیودوں کو غذا بہم پہنچائے گا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد نہایت بے سروسامانی کے عالم میں رکھی گئی تھی۔ لیکن کچھ عرصے میں اس ادارے کو وہ استحکام حاصل ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک سہ ماہی رسالہ "العلم" کے نام سے جاری کیا جو اس وقت تک نہایت باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ اور اردو زبان و ادب کی گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ کانفرنس نے لڑکیوں کیلئے سر سید گرلس کالج قائم کیا جو اس وقت ایک وسیع اور عالیشان عمارت میں نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کالج نے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تیسرا کام جو کانفرنس نے انجام دیا وہ "اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" کا قیام ہے ادارے کا یہ شعبہ بھی پہلے دو سے کسی طرح فروتر نہیں ہے ... اس شعبے نے تصنیف و تالیف کا کام جس بڑے پیمانے پر کیا ہے اس کو محنت و خلوص کا ایک نادر نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ پچیس سال کی مدت میں اس ادارے نے مختلف مضامین پر (۷۵) سے زیادہ کتابیں چھپوا کر شائع کی ہیں۔ ان میں کچھ ترجمے ہیں کچھ تالیفات اور کچھ تصنیفات ہیں بعض کافی ضخیم ہیں اور بعض مختصر۔ لیکن ان میں سے کسی کو غیر اہم نہیں کہا جا سکتا۔

ان کتابوں کے مصنفین و مترجمین اکثر و بیشتر کہنہ مشق اور آزمودہ کار لوگ ہیں۔ چونکہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا اصل میدان ایجوکیشن یا تعلیم ہے اسلئے اکیڈمی کی مطبوعات میں زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے ایجوکیشن سے متعلق ہیں لیکن دوسرے مضامین بھی چونکہ تعلیم کا جزو ہوتے ہیں اس لئے ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ نفسیات، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات و عمرانیات، ادبیات، لسانیات، انتقادیات اور سیرت، سوانح اور تاریخ پر بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے۔

مختلف مضامین پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی الگ الگ تعداد مندرجہ ذیل گوشوارے سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

مضمون	تعداد
تعلیمات	۲۵
نفسیات و فلسفہ	۶
سائنس	۴
اخلاقیات و عمرانیات	۷
ادبیات لسانیات انتقادیات	۱۱
سیرۃ سوانح تاریخ	۲۲
میزان	۷۵

کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ جیسے مضامین و خطباتِ ممتاز، عہدِ انگلشیہ میں مسلمانوں کی تعلیم، سائنسی مقالات، تعلیمِ نسواں کے مسائل، پاکستان میں صنعتی تعلیم کا جائزہ، پاکستان میں پیشہ ورانہ تعلیم۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن حصہ سوم و چہارم۔ مولانا محمد علی جوہر۔ حیات اور تعلیمی نظریات۔ مقام حیات (سوانح نواب وقار الملک بانی مسلم لیگ)۔

اس طویل فہرست کی ہر کتاب کا تفصیلی جائزہ لینا تو ممکن نہیں۔ صرف مختصر سا تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہر کتاب کی افادیت و اہمیت واضح ہو جائے۔

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں

یہ کتاب برصغیر کے ہندوؤں کی تعلیم کی تحقیق

و مصنف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔ مولف کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ کتاب کس معیار کی ہوگی۔ اس کتاب میں موصوف نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی عصبیت کا جو ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ کس قدر بے بنیاد ہے۔ برصغیر کے اسلامی دور میں ہندوؤں کا ہر طرح خیال رکھا جاتا تھا اور ہر شعبے میں ان کو مسلمانوں کے مساوی درجہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں کو تعلیم سے بھی بہرہ ور ہونے کے پورے مواقع میسر تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس اسلامی دور میں ہمیں بڑے بڑے ہندو فضلا نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد موٴرخوں کی ہے۔ ان لوگوں نے تاریخ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی تھیں ان میں بعض اس وقت اس قدر معیاری سمجھی جاتی ہیں کہ وہ حوالہ کی کتابیں بن گئی ہیں۔ جیسے لب التواریخ مصنفہ رائے بندرابن۔ فتوحاتِ عالمگیری مصنفہ ایسر داس۔ دلکشا (عہدِ عالمگیری کی تاریخ) مصنفہ بھیم سین کائستھ۔ تاریخ کشمیر مصنفہ نرائن کول عاجز۔ خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سوجان رائے کھتری۔ منتخب التواریخ مصنفہ جگ جیون داس (اس تصنیف پر مصنف کو بادشاہ کی طرف سے خطاب، خلعت اور انعام ملا تھا۔ ہمیشہ بہار مصنفہ کشن چند اخلاص (فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جس کو آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ کی تالیف میں اپنا ماخذ قرار دیا ہے اور اس سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے)۔

موٴرخین کے بعد شعرا کا نمبر آتا ہے۔ اس میں بھی ایک فوج ظفر موج ہندو شاعروں کی دکھائی دیتی ہے۔ ان میں برہمن، بہار، لچھمی نرائن شفیق، شاداں، موزوں کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ برہمن عہد شاہجہانی کا مشہور فارسی شاعر اور ادیب تھا۔ ٹیک چند بہار بہارِ عجم کے مصنف کی حیثیت سے نہایت معروف ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق مرزا غالب کے شاگرد رشید تھے۔ اور کائستھ ہونے کے باوجود مرزا کہلاتے تھے۔ پھر ادبا کا ذکر ہے۔ ٹوڈر مل، چندر بھان برہمن، خوشحال وقت رائے شاداب۔ مادھو رام (جن کی کتاب انشاء مادھو رام فارسی کے نصاب میں داخل رہی ہے۔) اس کے بعد ہندو لغت نویس ہیں۔ ان میں ٹیک چند بہار پہلے نمبر پر ہیں۔ آخر میں ہندو مترجمین علومِ عقلیہ، نجوم، طب اور علومِ متفرقہ کے ہندو عالم اور مصنف آتے ہیں۔

غرض اس چھوٹی سی کتاب میں سید صاحب نے اس موضوع پر بڑی اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اور واضح طور پر بتا دیا ہے کہ مسلمانوں کے زمانے میں ہندو کسی طرح بھی محکوم و مقہور بن کر نہیں رہے۔ بلکہ مسلمان فرمانرواؤں نے ان کو ابھرنے اور ترقی کرنے کے پورے مواقع دیئے۔

یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا انگریزی اور بنگالی میں ترجمہ بھی اکیڈمی کو کرا کر شائع کرنا پڑا۔

جمہوریت اور تعلیم (دو حصے)

یہ کتاب جان ڈیوی کی مشہور کتاب Democracy & Education کا ترجمہ ہے۔ جان ڈیوی موجودہ دور میں فلسفۂ تعلیم کا ماہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی رائے اس معاملے میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے تعلیم سے متعلق اپنے نظریات کو کافی پھیلا کر

پیش کیا ہے۔ اور مثالوں سے اپنی باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے
پہلے تعلیم کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔ پھر تعلیم کو مؤثر بنانے
کے طریقے بتلائے ہیں اور اس کے بعد نصاب تعلیم میں مختلف مضامین
کی اہمیت و ضرورت کو بتاکر ان پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ خصوصاً
تاریخ جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم پر کافی زور دیا ہے۔ فکری اور عملی
سطحوں میں تخالف کی نشاندہی کر کے ان کے تعلق کی نوعیت پر وضاحت
سے بحث کی ہے۔ تعلیم کے بیشتر دراز پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔
غرض اس کتاب
میں تعلیم کے ہر پہلو کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قدر قیمتی
تصنیف غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے اس زبان سے پوری طرح واقفیت
نہ رکھنے والوں کے لئے اردو ترجمہ نہایت ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ اکیڈمی
نے اس اہم کام کو انجام دیا۔ اور روزنامہ جنگ کے سابق ایڈیٹر سید محمد تقی
سے اس کا ترجمہ کرایا۔ اصل کتاب کی ضخامت زیادہ تھی اس لئے اردو ترجمہ
دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔

طالب علم کی ڈائری

یہ کتاب ایجوکیشنل کانفرنس کے سیکرٹری اور العلم کے مدیر جناب سید الطاف علی
بریلوی کی تصنیف ہے۔ یہ ایک لحاظ سے مصنف علام کی خود نوشت
سوانح حیات ہے جس میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات اور اپنی
تعلیمی زندگی کے بعض کوائف بیان کئے ہیں۔ خاندانی حالات میں اہم
کردار "بھائی جان" کا ہے۔ جن کے واقعات کو مصنف نے نہایت
پرلطف انداز سے بیان کیا ہے۔ اس ذکر لطیف کا اہم پہلو یہ ہے کہ
بھائی جان مصنف کے والد محترم سید اسحاق علی تھے۔ عجیب شان کے
انسان تھے۔ مصنف کے طرز نگارش نے ان کی پرعظمت شخصیت
کو بیحد دلکش بنادیا ہے۔ اس دلچسپ تذکرے کے بعد طالب علم کی ڈائری
شروع ہوتی ہے۔ جو واقعی ڈائری کے انداز میں تاریخ وار مرتب
کی گئی ہے اس کی ابتدا ۶ اگست ۱۹۲۴ء سے ہوتی ہے۔ اور ۳ دسمبر
۱۹۳۲ء پر خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس دوران میں مصنف موصوف نے
قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے لئے پوری جد و جہد کی لیکن حالات کی نامساعدت
کی وجہ سے تکمیل نہ ہوسکی۔ اس کے باوجود امتحان میں شرکت کی اور
آخری مرتبہ ناکامی کے بعد یہ کہہ کر زندگی کے اس باب کو ختم کردیا: "میں
قانون کے امتحان میں بیٹھا تو پھر فیل ہوگیا۔ اس آخری ناکامی کی بدولت
گویا ع

جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

لیکن اس ناکامی کا ایک اچھا نتیجہ نکلا کہ سید صاحب ملازمت کی
تلاش میں علیگڈھ چلے گئے اور ایجوکیشنل کانفرنس سے منسلک ہوکر
تعلیم اور اردو زبان کی خدمت کرنے لگے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

مصنف کا انداز تحریر بہت سادہ، سلیس اور دلچسپ
ہے اور اس نے اس معمولی سے مضمون کو افسانہ اور ناول سے زیادہ دلچسپ
بنادیا ہے۔

ڈاکٹر عترت حسین زبیری جیسے زبان و ادب کے نباض
اور ماہر بھی کتاب ہذا کے مقدمہ میں مصنف کی نثر نگاری کی تعریف ان
الفاظ میں کرتے ہیں۔

"سید صاحب کی طرز نثر نگاری میں روزمرہ بول چال
کی روانی و سلاست کے ساتھ قدما کی سی شگفتگی پائی جاتی ہے جس
کی مثال ہمارے عصری ادب میں مشکل سے ملے گی۔ سید الطاف علی
کے اسلوب تحریر میں تخیلی حاشیہ آرائی نہیں ہے۔ بلکہ اچھوتا انداز استدلال
پایا جاتا ہے۔ جو ایڈیسن اور اسٹیل کے انداز نگارش کو یاد دلاتا ہے"

تعلیم کے ابتدائی اصول دو حصے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی قابل قدر
کتاب فرسٹ پرنسپلس آف ایجوکیشن کا نہایت شگفتہ ترجمہ ہے۔

بلکہ بتایا نہ جائے تو کسی کو گمان بھی نہ ہو کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ قاری اُسے تالیف سمجھے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ملک کے دانشوروں اور مفکروں میں بہت اُونچا مقام رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دینی فراست عطا فرمائی تھی۔ اور اسی چیز نے ان کے فہم و ذکا پر وہ جلا کی تھی جو فی زمانہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ وہ تعلیم کی ضرورت و اہمیت کو سمجھتے تھے اور اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے پھیلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے دنیا کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم کے نظریات کا مطالعہ کیا تھا لیکن وہ کسی سے مطمئن نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے سب کو مسترد کر کے خود تعلیم کے مقصد پر غور کیا اور اس سے پہلے زندگی کے نصب العین کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک جو زندگی کا نصب العین ہوگا۔ وہی تعلیم کا بھی نصب العین ہوگا۔ پھر انھوں نے نصب العین حیات پر مدلل بحث کی۔ اور آخر میں نہایت قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کر دیا کہ

> "پس تعلیم کا مقصد یہ ہوا کہ طلبہ کو ایسے نصب العین سے روشناس کرائے جو تمام صفات عالیہ کا جامع ہو جس میں حسن، خیر، صداقت بدرجہ اتم موجود ہوں۔ اسی نصب العین کی تمنا اور اسی نصب العین سے عشق نفسیاتی نمو کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچا سکتا ہے یعنی بہترین سیرت و کردار پیدا کر سکتا ہے۔"

کتاب پوری کی پوری اسی حقیقت تک پہنچانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں مصنف نے ترتیب مضامین اس طرح قائم کی ہے۔ (۱) دور حاضر کے ماہرین تعلیم اور ان کے خیالات۔ (۲) تعلیمی نمو کا فطری تقاضہ (۳) تعلیمی تقاضائے نمو کی تاویلیں (۴) تعلیمی طریقہ کار کی نوعیت (۵) مکمل تعلیمی نمو کے شرائط۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے ماہرین تعلیم کے نظریات و خیالات کو اس میں دہرا لینے پر اکتفا کیا گیا ہے بلکہ وہ نظریات پیش کر کے اُن پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُن کی خامیوں اور ان کے مغالطوں کی نشاندہی کر کے ان کو دور کیا گیا ہے۔ اور پھر اپنا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ گویا تقلید و جمود کا شائبہ اس تصنیف کے دامن پر کہیں نظر نہیں آتا۔ پھر کتاب کا انداز جذباتی نہیں ہے۔ بلکہ نہایت رسانیت سے اور منطقی استدلال کو کام میں لا کر سب مرحلوں کو طے کیا گیا ہے۔

کتاب کا ترجمہ مولوی سلطین احمد بہاری نے کیا ہے جو نہایت خاموش طبع، متین اور سنجیدہ انسان تھے۔ ان کی فضیلت علمی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت تام رکھتے تھے انھوں نے ان کا حق ادا کر دیا ہے ترجمے میں ادبی شان پوری طرح جلوہ گر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ایسے اچھے ترجمے بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ مصنف اور مترجم دونوں ہی کی علمیت و فضیلت اس کتاب سے نمایاں ہے۔ بیجا نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے۔ یہ کتاب اکیڈمی کی بہترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔

ارتقائے انسانی | سائنسی تفکر نے کائنات اور انسان کی پیدائش اور ان کی درجہ بدرجہ ترقی کا ایک پُر پیچ سا نظام پیش کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی بنیاد بعض قرائن و مشاہدات پر رکھی گئی ہے۔ لیکن زیادہ تر اس بحث کا انحصار تخیل پر ہے۔ ایک خدا شناس معاشرے میں یہ نظریہ بالکل سیدھا سادہ اور نہایت سلجھا ہوا تھا لیکن اس کی بنیاد تمام تر عقیدے پر تھی۔ اس عقیدے کے مطابق ایک مافوق ہستی کو ہر چیز کا خالق سمجھ لیا گیا تھا اور تخلیق کا سبب اس کی مشیت کو قرار دیا گیا تھا۔ پھر انسانی معاشرے میں بھی روحانی ارتقا کا تصور قائم تھا۔ مادی اعتبار سے جو ترقیاں نظر آتی ہیں ان کا بھی گراف ایک خط مستقیم کی شکل میں

وپر کی جانب جاتا ہوا نہیں دکھائی دیتا تھا۔ بلکہ اخلاقی بنیادوں پر اقوام کے عروج و زوال کی داستان بیان کی جاتی تھی۔ لیکن سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کا انداز فکر بھی بدلا اور اب ہر چیز کو عقل کی روشنی میں جانچا جانے لگا۔ چنانچہ کائنات کی پیدائش انسان کے کرہ ارض پر ظہور اور اس کے مدارج ترقی کو منطقی استدلال کی مدد سے ترتیب دیا گیا۔ اور اسی کو ارتقائے انسانی کا نام دے کر اس پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ انگریزی زبان میں تو اس موضوع پر بے شمار کتابیں ہیں۔ مگر اردو میں ان کی تعداد اکائیوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ ان ہی میں مولوی طفیل، محمد منگلوری کی یہ کتاب شامل ہے۔ یہ تمام مضمون مقالوں کی شکل میں سنہ ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ مصنف نے مجلس مصنفین کے آٹھ جلسوں میں پڑھ کر سنائے تھے۔ گویا کل آٹھ مقالے تھے۔ جن میں سے تین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان مقالوں میں تخلیق کائنات، اور ابتدائی انسان کی زندگی اور معاشرت پر سائنس کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ سر زمین کی پیدائش اس کی عمر، خشکی اور تری کی تقسیم، نباتات حیوانات کی تخلیق برفانی ادوار۔ انسان کی پیدائش۔ پھر اس کی بدلتی ہوئی معاشرت و معیشت۔ قبیلہ داری نظام۔ امراض ان کے علاج کے طریقوں میں ترقی کے مدارج سے گذار کر جس کو مصنف نے عہد قدیم۔ عہد فلاسفہ۔ عہد متوسطا اور عہد جدید میں تقسیم کیا ہے۔ ایک قدیم سادہ سی زندگی سے موجودہ پیچیدہ تہذیب تک پہنچا دیا ہے۔ چھوٹی سی کتاب ہے۔ لیکن زبان سادہ۔ صاف اور رواں اور انداز بیان سلجھا ہوا اور کافی دلچسپ ہے۔

وادی نیل
جغرافیہ، تاریخ اور تہذیب

سچ پوچھیے تو یہ سرتاسر مصر کی تاریخ ہے جس کو بعنوانے ع

گفتہ آید در حدیث دیگراں "دریائے نیل کی وادی کی کہانی کے آئینے میں منعکس کیا گیا ہے۔ تاریخ مصر پر متعدد کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ اردو کا دامن بھی اس متاع بے بہا سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب کا انداز سب سے نرالا ہے۔ اس میں باقاعدہ تاریخی ادوار مقرر کر کے فراعنہ کے مختلف خاندانوں اور فرمانرواؤں کے کارنامے بیان کر کے اور اس سلسلے کے بعد کی تدریج کے واقعات کو تسلسل کے ساتھ دہرا کر موجودہ دور تک نہیں پہنچایا گیا ہے۔ بلکہ اس میں مصر کی عظمت و شوکت کا ایک تاثر دینے کے لیے چیدہ چیدہ واقعات بیان کر دیئے گئے ہیں اور اس شان و عظمت کے پیدا ہونے کا اصل سبب دریائے نیل کو قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس مقولے کی تفسیر بیان کی ہے۔ "مصر نیل کا تحفہ ہے"۔

یہ کتاب مضمون کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ اور زبان میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ کتاب کے مصنف قطب الدین صاحب ہیں۔

اقبال کے تعلیمی نظریات

مسلمانوں کے دور انحطاط میں اقبال نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ جہد مسلسل اور عمل پیہم کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ لیکن یہ جدوجہد بے لگام اور عمل بے مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ بعض مفکرین اچھے برے کی تمیز کو ختم کر کے صرف عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال نے یہ نظریہ خود قائم نہیں کیا بلکہ کلیتاً اسلام سے مستعار لیا ہے۔ اس لیئے اس میں کوئی جھول اور قابل اعتراض بات دکھائی نہیں دیتی۔ تعلیم کا مقصد بھی چونکہ انسان کو زندگی گذارنے کا ایک طریقہ بتانا ہے اس لیے اقبال نے اس کو بھی اپنی توجہ اور اپنی شاعری کا مرکز بنایا ہے۔ لیکن یہاں بھی انھیں اسلامی تعلیمات کے سہارے چلنا پڑا۔ انھوں نے وہی تعلیمی نظریات پیش کیے ہیں۔ جو اسلام کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ان ہی نظریات کا آئینہ ہے۔ کتاب کے

رلف محمد احمد صدیقی نے جو خود تعلیمی دنیا کا پرانا تجربہ رکھتے ہیں شاعر
شرق کے اشعار سے ان کے نظریات تعلیم کو اخذ کیا ہے۔ اور ان
شعار میں جو علامہ کے کلام میں منتشر حالت میں پائے جاتے ہیں یکجا
کے ایک مسلسل و مربوط نظریہ پیش کیا ہے۔ اور یہ واضح کر دیا ہے
۔ علامہ کی شاعری بے مقصد نہیں بلکہ وہاں بھی ایک پیغام اور ایک
علیمی نظام کی نقش آرائی ہے۔

پُراسرار کائنات

موجودہ دور کے ہیئت دانوں میں جیمس جینز
کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ان ماہرین میں سے ایک ہیں
جنھوں نے اس قدیم ترین سائنس کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش
کرکے اس کے دامن سے یبوست کے داغ کو دور کیا ہے۔ انھوں نے
ہیئت کے مختلف مسائل پر بڑے دلچسپ اور عام فہم انداز سے بحث
کی ہے۔ تخلیق کائنات۔ نظام شمسی کی پیدائش۔ اس نظام میں
زمین کا مقام۔ سطح زمین پر نظام حیات اور زندگی کے ان ہنگاموں
کے انجام پر نہایت عجیب و غریب طریقے پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں
نے نظام شمسی کے لیے ایک نیا نظریہ پیش کیا تھا۔ جو مدّی نظریے کے
نام سے موجودہ صدی میں نہایت مقبول رہا۔ اور اگرچہ اب یہ بعض
اعتراضات کی زد میں آکر کچھ کمزور پڑ گیا ہے۔ تاہم کوئی دوسرا نظریہ
اس کے مقابلے میں اپنی جڑیں استوار نہیں کر سکا۔

جیمس جینز نے ہیئت کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔
جن میں یونیورس[1] اراؤنڈ اس اور مسٹیریس[2] یونیورس بہت اہم
ہیں۔ پُراسرار کائنات آخر الذکر کتاب کا ترجمہ ہے جو اکیڈمی نے
سید محمد تقی سابق ایڈیٹر جنگ سے ترجمہ کرا کر کئی سال ہوئے طبع
کرایا تھا۔ جیمس جینز جیسے ماہر فلکیات کی تصنیف کا ترجمہ
ہونے کی وجہ سے اکیڈمی کی مطبوعات میں اس کتاب کو کافی اہمیت

حاصل ہے۔

1. Universe around us.
2. Mysterious Universe.

تاثرات مشاہدات

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مختصر کتاب
میں سیدہ انیس فاطمہ بریلوی نے اپنی زندگی کے بعض واقعات اور
تقسیم ملک کے بعد معاشرے کی زبوں حالی۔ مفلوک الحال لوگوں کی
تکالیف اور پریشانیوں اور زندگی کے مختلف مسائل جو ان کے مشاہدے
میں آئے ان کو نمبر ڈال کر الگ الگ واقعات کی شکل میں پیش کیا ہے
ان واقعات سے جو تاثرات ان کے قلب پر مرتسم ہوئے وہ بیان کردیے
اور پھر پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر بھی
ان کے اثرات قائم ہونا ضروری تھا۔ اگرچہ واقعات الگ الگ بیان
کیے گئے ہیں لیکن سب کو ملانے سے موجودہ معاشرے اور زندگی
کی ایک مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ تہذیب
کے نام پر انسان کس طرف جا رہا ہے۔ یہ وہ منزل معلوم ہوتی ہے
جو انسانی خصائص سے قطعاً عاری ہے۔ جہاں ہمدردی، محبت
اخوت، فرض شناسی اور انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ مصنفہ
کتاب نے اپنے تاثرات قلب کا اظہار اس جملے میں کر کے اثر و تاثیر
کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا ہے۔

"اے میرے اللہ! اس سنہرے دور کا آغاز کب ہوگا جب
انسان تمام انسانی صفات سے متصف ہو کر تیری کائنات کے حسن
میں مزید اضافہ کریں گے"

یہ انسانیت اور انسان کیلئے محبت سے بھرے ہوئے
قلب کی ایک صدائے دردناک ہے۔ جو اس دنیا کی فضاؤں میں
تحلیل ہو رہی ہے جس کا نقشہ جگر مرحوم نے اپنے اس شعر میں پیش

کیا ہے۔

؎ جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

کتاب کا خاتمہ حرفِ آخر پر ہوا ہے۔ جس میں کلچر و ثقافت پر بعض مفکرین کی تعریفیں پیش کی ہیں۔ لیکن یہ مسائل فکر اور رائے زنی سے طے نہیں ہوتے بلکہ یہاں دل گداز کی ضرورت ہے۔ اور وہ پیدا ہوتا ہے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے اور چونکہ یہ تعلق اگر منقطع نہیں ہوا تو کمزور ضرور پڑ گیا ہے اسی لئے یہ سب کرشمے دکھائی دے رہے ہیں۔

کتاب نہایت دردمندی سے لکھی گئی ہے۔ اور از دل خیزد بر دل ریزد کی اچھی مثال ہے۔ پیرائیہ بیان نہایت سلجھا ہوا اور ہلکا پھلکا ہے۔ جیسے مسائل تمام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، دلچسپی ہی زبان نہایت عام فہم ہے۔

پاکستان کا معاشی پس منظر یہ بھی سیدہ انیس فاطمہ کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے معاشی پس منظر کو بحث کا نقطۂ آغاز بنایا گیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے نقطۂ نظر سے اس پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ اور زراعتی اور ایک صنعتی معاشرے کے فرق کو واضح کیا ہے۔ پھر معاشی پس منظر کے لئے تاریخی پس منظر پیش کرکے اس بگاڑ کے اسباب تلاش کیے ہیں۔ تقسیم کے بعد کی حالت کا جائزہ لیا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ اور انفرادی سرمائے پر بحث کی ہے۔ حکومت کی صنعتی پالیسی پر روشنی ڈالی ہے۔ ملکیت زمین اور فلاکت کے اسباب کی تلاش کی ہے۔ آبادکاری کے مسئلہ زمینداری و جاگیرداری کے خاتمے اور پاکستان کے اقتصادی اور معاشی پہلوؤں پر اظہارِ خیال ہے۔ اور آخر میں معیشت اور کلچر کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ اور یہ سب بحث معاشیات کے مسلمہ اصولوں کو سامنے رکھ کر اور ان کا پاکستان پر انطباق کر کے کی گئی ہے۔ پاکستان کی معاشی حالت کو سمجھنے کے لئے ایک اچھی کتاب ہے۔

مقالات بریلوی اس کتاب میں سید الطاف علی بریلوی نے اپنے وہ مضامین جمع کر دیئے ہیں جو العلم اور بعض دوسرے جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین مختلف نوعیت کے ہیں اس لئے موضوع کے اعتبار سے ان کو چھ حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ان حصوں کی ترتیب انھوں نے یہ رکھی ہے کہ پہلے حصے کا عنوان تاثرات ہے اور دوسرے کا تعلیمات، تیسرے کا سیاسیات، چوتھے کا ادبیات، پانچویں کا انتقادیات اور چھٹے کا شخصیات۔ تاثرات کے تحت جو مضامین دیئے گئے ہیں۔ تعلیمات میں ۱۲ مضامین ہیں۔ سیاسیات میں ۷، ادبیات میں ۲، انتقادیات میں ۹ اور شخصیات کے تحت ۱۴۔ اس طرح کل مضامین کی تعداد ۵۱ ہوتی ہے۔ ان میں بعض بہت مختصر ہیں اور بعض خاصے طویل۔ مثلاً علیگڈھ تحریک ۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور چند محض دو صفحے کا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اصل چیز سید صاحب کی طرزِ نگارش ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد معین الدین دردائی کے الفاظ دہرانا مناسب ہے۔ وہ کتاب ہذا کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"سید صاحب کا اصل میدان تو تاریخ و صحافت ہے اور اس میدان میں انکا قلم خوب سرپٹ دوڑتا ہے۔ لیکن اس مجموعے کے پہلے حصے تاثرات کو پڑھ کر ہمیں ان کے طنز و مزاح کی صلاحیت کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں طنز و مزاح کی ایسی مرغوب چاشنی ملتی ہے کہ پڑھ کر لطف آجاتا ہے۔"

آگے چل کر پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"سید صاحب کے اسلوبِ تحریر کی ایک بڑی خصوصیت اس کا تخیلی حاشیہ آرائی سے پاک ہونا ہے۔ ان کے یہاں اچھوتا اندازِ استدلال تو کافی پایا جاتا ہے۔ لیکن مضمون میں خیال آرائی کا وہ بہت کم سہارا لیتے ہیں۔ سرسید اسکول کے اسلوبِ نگارش سے وہ زیادہ متاثر ہیں۔ سرسید کی طرح انھوں نے بھی اپنی نثر نگاری کیلئے ایڈیسن اور اسٹیل کا اسلوب پیشِ نظر رکھا ہے" یہ تو اسلوبِ تحریر کے بارے میں ایک ادیب کا دوسرے ادیب کے متعلق خیال تھا جو پیش کر دیا گیا ہے۔ رہا پیشِ نظر کتاب کا معاملہ اس سلسلہ میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یوں تو مصنف نے ہر موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے لیکن شخصیات کے سلسلے میں ان کے تاثرات ان کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ سوائے "سرسید ایک عظیم قومی رہنما" کے تمام مضامین ان کے دوستوں، ملنے والوں اور بعض ادیبوں اور شاعروں کے انتقال پر لکھے گئے تھے۔ یوں تو ان رہروانِ ملک عدم میں سے انھوں نے ہر ایک ہی کو خلوصِ دل سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن "روداعِ دوست" کا انداز سب سے نرالا ہے اس میں انھوں نے اپنے ایک رفیق اور ساتھی سیٹھ یوسف کی یاد میں جو کچھ لکھا ہے وہ نرے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لختہائے قلب و جگر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے ہیں۔

ادب منزل بہ منزل

سیدہ انیس فاطمہ جو کئی میدانوں میں اپنے اشہبِ خامہ کی جولانیاں دکھا چکی ہیں۔ انھوں نے ہی اردو ادب کے سلسلے میں بھی یہ ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے جو اردو کی جامع تاریخ نہ ہونے کے باوصف اس کا ایک ایسا جائزہ ہے جو تمام ادوار کی ایک جھلک پیش کر دیتا ہے اور پڑھنے والے کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ملک کے کس حصہ نے زبان اور اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے اس میں کیا کیا اضافے کئے۔ یہ کتاب سترہ ۱۷ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے باب اول میں کشفی اور روحانی ادب ہے باب دوم میں لاف ادب ہے اور باب ہفتدہم میں ترقی پسند ادب سے بحث کی گئی ہے۔ تین ابواب میں دلی، لکھنؤ اور پنجاب کی خدمات کو گنایا گیا۔ ایک باب میں اردو ادب پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے اثرات دکھائے ہیں۔ ایک باب علیگڑھ تحریک کے لئے مختص ہے۔ باقی ابواب میں نذیر احمد۔ حالی شبلی۔ اکبر الہ آبادی۔ مولانا محمد علی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ابوالکلام آزاد۔ اقبال اور طفیل احمد منگلوری کے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے اسالیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

راہی اور راہ نما

سید الطاف علی بریلوی کے اُن تعزیت ناموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بعض مشاہیر کے سانحۂ ارتحال پر لکھ کر معارف علیگڑھ اور العلم کراچی میں شائع کیے تھے۔ ان رہروانِ راہِ عدم میں سیاستداں بھی ہیں۔ ادیب بھی، پروفیسر بھی اور شاعر بھی لیکن ادیبوں کی تعداد زیادہ ہے جس قدر رجال کو اس بزم میں شامل کیا گیا ہے۔ وہ سب ہی قوم کے جگر پارے اور ملک کے لائق فرزند تھے۔ مصنف نے ہر ایک کو مناسب الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان مشاہیر کی درج ذیل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ غالب کا یہ مصرع کس قدر ان کے حسبِ حال ہے۔ ؎

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

(۱) قائدِاعظم (۲) ڈاکٹر ذکی الدین (۳) پروفیسر ستار خیری (۴) شاہد (مصنف کے لائق صاحبزادے) (۵) شہیدِ ملت (۶) علامہ سلیمان ندوی (۷) حکیم شریف الزماں (۸) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۹) علامہ عبداللہ یوسف علی (۱۰) مولوی مسعود عالم ندوی (۱۱) قاضی احمد میاں

تر جوناگڑھی (۱۲) مولانا ظفر علی خاں (۱۳) چودھری محمد اظہر (۱۴) ڈاکٹر
بغفور بسمل (۱۵) بابائے اردو (۱۶) مولانا عبدالمجید سالک (۱۷) محمد عادشی
ا) مولوی شوکت علی خاں (۱۹) سید برکات احمد (علیگ) (۲۰) ڈاکٹر
ا والرحمٰن (۲۱) مقصود حسین خاں (۲۲) جگر مرادآبادی (۲۳) مولوی حبیب
لہ خاں (۲۴) راجہ صاحب سلیم پور (۲۵) مولانا طفیل احمد منگلوری
۲) ڈاکٹر غلام محی الدین (۲۷) ڈاکٹر محمد شفیع (۲۸) ڈاکٹر ہادی حسن (۲۹)
لوی سلیمان بدایونی (۳۰) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد۔

ان میں سے اکثر و بیشتر ہستیاں وہ ہیں جن کے ناموں اور کارنامو
سے تقریباً سب لوگ واقف ہیں۔ مگر بعض ایسی بھی ہیں۔ جن کو مخصوص حضرات
ی جانتے ہیں۔ لیکن ان کی عدم شہرت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کم نہیں
ہیں بلکہ بعض کے عمل کے میدان ایسے تھے کہ ان کو زیادہ لوگوں سے روشناس
ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اور بعض نے نہایت خاموشی سے زندگی بسر کی
جس کی وجہ سے کسی نے ان کو جانا اور کسی نے نہیں جانا۔ مصنف کتب
نے اپنے لائق اور ہونہار فرزند "شاہد علی" کو بھی اس بزم میں شریک
کیا ہے۔ ایسا کرنے میں صرف ان کے ذاتی تعلق خاطر ہی کی کارفرمائی
نہیں ہے۔ بلکہ مرحوم کی بہت سی خوبیاں ایسی تھیں جن کو دیکھ کر اسی
وقت یہ یقین تھا کہ آئندہ چل کر وہ وطن کا ایک مایۂ ناز سپوت ثابت
ہوگا۔ مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس کتاب میں مصنف نے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
کی علمیت و عظمت کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ یقیناً لائق تحسین
و ستائش ہے۔ قاضی صاحب مرحوم واقعیؔ اس پایہ کے انسان تھے۔
کہ ان کو دل کھول کر خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا۔ مصنف نے نہ صرف
ایسا کیا بلکہ مرحوم کے اٹھائیس خطوط بھی جن کی ادبی اور تاریخی حیثیت
مسلم ہے۔ اس کتاب میں شامل کر کے اس گنجِ گرانمایہ کو محفوظ کر دیا۔

علمائے سلف و نابینا علماء

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم
کی کتاب "علمائے سلف" اور اس کا ضمیمہ "نابینا علماء" مسلمانوں کی علمی
سرگرمیوں کا ایک حسین مرقع ہے۔ نواب صاحب نے غالباً سب سے پہلے
مختلف ماخذوں کو سامنے رکھ کر نہایت سلیقے سے مسلمانوں کی حصول
علم کیلئے تگ و دو اور اشاعت علم کیلئے ان کی جدوجہد کا ایک تفصیلی
جائزہ پیش کیا تھا اور بتایا تھا کہ پہلے زمانے کے مسلمانوں نے کس طرح
اپنے اوپر خور و خواب حرام کر کے پیٹ پر پٹی باندھ کر اور سفر کی صعوبتیں
برداشت کر کے علوم و فنون حاصل کیے اور اس لازوال دولت کو
آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ یہاں تک کہ بہت سے وہ حضرات بھی
جن کو قدرت نے ظاہری آنکھوں سے محروم رکھا تھا اس دوڑ میں ان
لوگوں سے پیچھے نہیں رہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بینائی کی دولت عطا کی
تھی۔ ان حضرات نے بینائی سے محرومی کی تلافی اس طرح کی کہ شمعِ علم
سے اپنے دل و دماغ کو روشن و منور کر لیا۔ اس زمانے میں جب سفر
کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو آجکل نصیب ہیں انھوں نے ہزاروں
میل کے فاصلے طے کیے اور علم کو اپنی متاع گم گشتہ سمجھ کر جہاں سے
ممکن ہوا حاصل کیا۔ شمعِ علم کے ان پروانوں کے لئے مشرق و مغرب
کی کوئی قید نہیں تھی۔ بلکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ تینوں براعظم
ان کے قدموں کے نیچے تھے۔ وہ بغداد، مصر اور قرطبہ کے علمی سرچشموں
سے اپنی پیاس بجھاتے اور پھر اس آبِ حیات سے دوسروں کو سیراب
کرتے تھے۔ انھوں نے جملہ علوم پر بے شمار تصانیف چھوڑیں۔ جن
میں سے اکثر کئی کئی مجلدات پر مشتمل ہیں۔ ان لوگوں کی علمی سرگرمیاں
مرتے دم تک قائم رہتی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس
محنت و ریاضت کے باوجود قدرت ان کی عمروں میں برکت
دیتی تھی۔ کتاب ھذا میں خلفاء اور فرمانرواؤں کی عمروں سے مقابلہ

کے بتایا گیا ہے کہ علمائے اسلام کی عمروں کا اوسط حکمرانوں کی
روں کے اوسط سے کہیں زیادہ تھا۔ حالانکہ ان کو زندگی کی وہ
سائشیں نصیب نہیں تھیں جو فرمانرواؤں کو حاصل تھیں۔

یہ کتاب غیر منقسم ہندوستان میں بہت پہلے چھپی تھی
گر پاکستان بننے کے بعد کمیاب ہوگئی تھی۔ اس کی افادیت اور
ہمیت کو دیکھتے ہوئے اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی جانب
سے دوبارہ اسں کو کافی اہتمام سے چھاپا گیا اور اسں کو زیادہ
مفید بنانے کے لئے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم سے اس پر ایک ابتدائیہ
اضافہ کراویا گیا جس میں عہد رسالت سے لیکر ادوار مابعد تک
علوم اسلامی کی ترتیب، تدریس اور تعلیم کا مختصر سا جائزہ لے کر مختلف
علوم پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں مرتب نے
تعلیقات اور حواشی کا اضافہ کر کے کتاب کی افادیت کو کافی بڑھا دیا ہے

حیات حافظ رحمت خاں

یہ کتاب سید الطاف بریلوی کی
سب سے پہلی تصنیف ہے جو انھوں نے اب سے بیالیس تینتالیس
سال پہلے اس وقت لکھی تھی جب وہ طالب علمی کے مرحلے سے
پوری طرح نہیں نکلے تھے۔ بی اے پاس کر چکے تھے لیکن ایل ایل
بی کا امتحان پاس کرنے کی فکر میں تھے۔ اس وقت تک ان کا
تعلق ایجوکیشنل کانفرنس سے نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اس کتاب
کا پہلا ایڈیشن انھوں نے خود نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۳۲ء
میں شائع کرایا تھا۔ سچ پوچھئے تو یہ کتاب ان کی شہرت کا سنگ
بنیاد ثابت ہوئی۔ اسی سے وہ علمی دنیا سے متعارف ہوئے اسی
کتاب نے نواب حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے دل میں ان کی
قابلیت کا سکہ جمایا اور انھوں نے سید صاحب کا تعلق ایجوکیشنل
کانفرنس سے ایسا قائم کردیا کہ وہ نہ صرف ابتک قائم برقرار ہے
بلکہ ان کا اور ایجوکیشنل کانفرنس کا معاملہ کچھ ایسا ہوگیا ہے کہ ایک
کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ الطاف علی صاحب کا تصور
کانفرنس کے بغیر اور کانفرنس کا تصور الطاف علی صاحب کے بغیر
نہیں کیا جا سکتا۔

آئے دن کتابیں لکھی جاتی اور چھپتی رہتی ہیں۔ لیکن
بعض کتابیں کچھ ایسی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ کہ ان کو عہد آفریں
اور تاریخ ساز سمجھا جانے لگتا ہے حیات حافظ رحمت خاں بھی
اسی نوع کی تصنیف ہے۔ اس کتاب نے ایک نئی تحریک کی ابتدا کی۔
روہیلہ قوم جس نے برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔
مگر جو انگریز کی سیاسی شعبدہ بازی سے گوشۂ گمنامی میں جا پڑی
تھی اس کے صحیح خدوخال سے لوگ اسی کتاب کے ذریعے متعارف ہوئے
حافظ رحمت خاں اور روہیلے جن سے تاریخ ہند کی درسی کتابیں
سرسری طور پر صرف اتنا کہہ کر گذر جاتی تھیں کہ جب روہیلکھنڈ
کے علاقے میں انھوں نے سر اٹھایا تو ہندوستانی قوم کے مربی اور
سرپرست انگریز نے نواب شجاع الدولہ کی مدد سے ان کو بری طرح
کچل دیا۔ ان کا سردار حافظ رحمت خاں مارا گیا اور شر پسندوں کا
خاتمہ کر دیا گیا۔ ان کے بارے میں صحیح حالات جمع کرنا اور انگریزی
حکومت کے ہوتے ہوئے ان کو منظر عام پر لانا ایک جرأت مندانہ اقدام
تھا۔ لیکن سید الطاف علی نے نہ صرف اس راہ میں قدم اٹھایا بلکہ
دوسروں کے لئے بھی ایسے نقوش قدم قائم کر دیئے جن پر بعد والوں
نے چل کر ایک صحیح راہ پالی۔ اب وہی قوم اور وہی افراد جن کو انگریز
نے لٹیروں اور شر پسندوں کی شکل میں پیش کیا تھا، مسلمانوں کے
عروج و زوال کے لئے رہبر و رہنما کی شکل میں دکھائی دینے لگی۔ اس تبدیلی
احوال کا سہرا سید الطاف علی بریلوی کے سر ہے۔ انھوں نے حیات
حافظ رحمت خاں میں روہیلوں کی تاریخ ان کے عروج و زوال

ان کے قومی خصائص۔ ان کی شجاعت اور بہادری اور ان کی خوبیوں کا ایک صحیح اور خوشنما مرقع پیش کیا ہے۔ اس جماعت میں حافظ رحمت خاں ایک عظیم ہیرو کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب کی مقبولیت کو دیکھ کر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ نے اسے دوبارہ اپنے اہتمام سے زیور طبع سے آراستہ کرایا۔ اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر شائع کیا۔ یہ تصنیف اکیڈمی کی بہترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔

تعلیمات حضرت شاہ مینا رح

لکھنؤ میں شاہ مینا رح کی درگاہ بے حد مشہور اور مرجع خلائق ہے۔ ان بزرگ کا اصل نام شیخ محمد تھا۔ لیکن عرفیت شاہ مینا کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ اب نام کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور شاہ مینا کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ آپ کا شمار سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ میں ہوتا ہے۔ ۸۸۴ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ ان سے جو سلسلہ چلا وہ چشتیہ نظامیہ صفویہ کہلایا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ تک آپ کا سلسلۂ طریقت اس طرح ہے شاہ مینا نے شیخ سارنگ سے انھوں نے سید راجو میاں سے انھوں نے جہانیان جہاں گشتؒ سے انھوں نے نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے انھوں نے نظام الدین اولیاؒ سے انھوں نے فرید الدین گنج شکر سے انھوں نے قطب الدین بختیار کاکیؒ سے انھوں نے خواجہ معین الدین چشتی سے خرقۂ خلافت پایا۔

ان بزرگ کے حالات اور ان کی تعلیمات کو الحاج محمد خصلت حسین صابری مرحوم نے مرتب کیا ہے۔ حالات مختصر ہیں لیکن تعلیمات پر کافی زور دیا ہے۔ یہ تعلیمات ملفوظات کی شکل میں دیئے گئے ہیں۔ ان ملفوظات کی مجموعی تعداد ۸۲ ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے شریعت کو جگہ دی گئی ہے۔ پہلے ملفوظ میں بتایا گیا ہے کہ شریعت اصل تصوف ہے۔ دوسرے ملفوظ میں توحید کی وضاحت کی گئی ہے۔ سنت رسول پر زور دیا گیا ہے۔ پھر طریقت معرفت وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد توکل، قناعت، رزق کی قسموں (مضمون۔ مقسوم۔ ملوک۔ موعود) کو بتا کر ... ظالم۔ بے ایمان۔ بد دیانت اور فاسق و فاجر کی صحبت سے پرہیز کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ پھر تصوف کی بعض اصطلاحات بتائی گئی ہیں۔ غرض شاہ مینا کی تعلیمات شریعت و طریقت کے اصولوں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور نہایت عام فہم ہے۔

اصول تدریس

کتاب ہٰذا درحقیقت رائبرن اور بورج کی مشہور کتاب پرنسپلس آف ٹیچنگ کا اردو ترجمہ ہے جس کو اخلاق حسین زبیری سہسوانی نے اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے۔ ترجمہ زبان و بیان کی حیثیت سے دلچسپ ہے۔ جہاں تک مضمون اور مواد کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے دونوں مصنف رائبرن اور بورج اعلیٰ پائے کے ماہرین تعلیم تسلیم کر لیے گئے ہیں انھوں نے تدریس کو موثر بنانے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں ہر بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کل کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں تدریس کی نوعیت سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں طریقۂ تدریس کے اصول بتائے گئے ہیں۔ تیسرے حصے میں تدریس کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں تحصیل علم کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں حصے میں تحصیل علم کے قواعد درج متن ہیں۔ چھٹے حصے میں تحصیل علم کے طریقوں کو زیر بحث لایا گیا اور ساتویں حصے میں اسکول اور

نصاب تعلیم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف اس کتاب کا موضوع اور اس کے شائع کرنے کا مقصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"اس کتاب میں ہماری بحث کا موضوع یہ ہے کہ ابتدائی (پرائمری) اور ثانوی اسکولوں میں اساتذہ اور طلبہ کی سرگرمیاں کیا ہونی چاہئیں اور وہاں کس چیز کی تعلیم دی جائے۔

افریقہ اور ہندوستان میں پیش آمدہ تجربات کی بنیاد پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اور تمثیلیں زیادہ تر افریقہ سے لی گئی ہیں۔ لیکن وہ مقاصد تعلیم جن کے تحت یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بچے تعلیم پا کر پیدائش نشوونما حاصل کریں گے اور بڑے ہو کر مرفہ حال اور کارآمد مرد اور عورت بنیں گے۔ تمام دنیا میں یکساں ہی ہوں گے۔ ہر مدرسے میں خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں واقع ہو اصول تعلیم عموماً ایک ہی ہوں گے۔"

مصنف کے اس بیان کی روشنی میں ضروری تھا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا جاتا تاکہ یہاں کے اساتذہ تدریس کے ان اصولوں کو اپنی مادری زبان میں سمجھ کر ان کو کام میں لا سکیں۔

چند محسن، چند دوست سید الطاف علی بریلوی کو شخصیات پر لکھنے میں جو مہارت حاصل ہے، وہ ان کی اس کتاب سے بخوبی واضح ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ۲۷ افراد کو اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان میں سے دو خواتین اور بہ مرد بحمد اللہ بقید حیات ہیں اور باقی ۲۱ وہ ہیں جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں گویا کتاب کا بڑا حصہ وفیات سے متعلق ہے۔ یہ تمام مضامین ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۹ء تک یعنی پانچ سال کے دوران لکھے گئے۔ ان شخصیات میں سے چند سید صاحب کے محسن ہیں اور اکثر سے دوستانہ روابط رہ چکے ہیں۔ نواب وقار الملک مولانا حالی اور سر سید کے کاموں سے وہ متاثر ہیں۔ لیکن دوسروں سے ان کو ذاتی طور پر ملنے اور ان کی خوبیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے، اس لئے انھوں نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد خلوص پر ہے۔ جو باتیں انھوں نے ان ہستیوں میں محسوس کیں، ان کو من و عن بیان کر دیا۔ تکلف و بناوٹ کی پرچھائیں بھی کہیں پڑنے نہیں دی۔ زندہ اشخاص میں مسعود حسن کا تعارف انھوں نے جس انداز سے کیا ہے اس سے پڑھنے والوں کے دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے۔ لیکن مصنف نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے مسعود حسن کی ایک کوتاہی کو بھی اپنی اعلیٰ ظرفی کے پردے میں چھپا دیا ہے۔ اور مضمون کو اس طرح ختم کیا ہے کہ آخری لفظ پر پہنچنے سے پہلے قاری کی بھی کدورت دور ہو جاتی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شخصیت کو نہایت پیارے انداز میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمجید قریشی کے ساتھ اُن کے استادی شاگردی کے تعلق نے ان کے موقلم میں کچھ اور ہی طرح کے رنگ بھروائے ہیں۔ عبدالعزیز خالد کا جائزہ ایک شاعر کی حیثیت سے لیا گیا ہے۔ خواتین میں ڈاکٹر مسز ... اور مسز فاطمہ شاہ بینائی کی نعمت سے محرومی کے باوصف جس طرح خدمت کر رہی ہے اس کی داد سید صاحب کے قلم معجز رقم نے اچھے انداز میں دی ہے۔ غرض سید صاحب کا یہ ایک اچھا مجموعۂ مضامین ہے۔

قدیم شہنشاہیاں تہذیب انسانی کا ارتقا جس طرح ہوا ہے اس کی ابتدائی کڑیاں تو ماضی کے دھندلکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ اور ان کڑیوں کو ظن و قیاس اور قرائن

کے ذریعے ملانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جب سے تہذیب نے استحکام حاصل کیا اور بڑی بڑی حکومتیں وجود میں آئیں۔ اس وقت کے تاریخی واقعات جزوی طور پر پھاؤڑے کی مدد سے اور جزوی طور پر تحریری شہادتوں کی بنیاد پر مرتب و مدّن کیے گئے ہیں۔ ماضی کی تاریخ کا جو حصہ پھاؤڑے کا مرہون منّت ہے۔ وہ بھی بڑی حد تک علم الیقین کے درجہ میں شمار کیا گیا ہے۔ کتاب ہذا میں تاریخ کے اِن ہی ادوار کا ایک دلچسپ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کی تالیف کا سہرا بھی پرانی وضع ایک رہنما مولوی طفیل احمد منگلوری کے سر ہے۔ مرحوم نے اس میں دریاؤں کی وادیوں کی تہذیب سے ابتدا کی ہے۔ اور مصر، میسوپوٹامیہ، چین، ایران اور دیگر قدیم سلطنتوں کا خاکہ پیش کیا ہے۔ چونکہ متواتر سلطنتوں کا عروج و زوال اور حکمرانوں کے تفصیلی کارنامے بیان کرنا طوالت کو دعوت دینا تھا اسلیے ان باتوں کو مجملاً بیان کردیا گیا ہے اور تہذیبی سرگرمیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قدیم تاریخ کو سمجھنے کے لئے ایک اچھا خاکہ ہے انداز بیان سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے جو مصنف کی تحریر کی اہم خوبی ہے۔

علم و عمل
دو حصے

یہ کتاب ایک مشہور فارسی کتاب وقائع عبدالقادر خانی کا ترجمہ ہے۔ جس کو تقسیم سے قبل نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ناظم کتب خانہ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے اردو زبان میں منتقل کیا تھا۔ اس اردو ترجمے کو پروفیسر محمد ایوب قادری نے نہایت قیمتی حواشی سے مزین کر کے مرتب و مدون کیا۔ دوسرے حصے میں عبدالقادر خاں کے پوتے نصیر الدین خاں کی کتاب وقائع نصیر الدین خانی کا اردو میں ترجمہ کر کے شامل کتاب ہے۔ اس طرح کتاب کی ضخامت کافی بڑھ گئی اور اس کو دو ضخیم جلدوں میں چھاپنا پڑا۔

اصل کتاب وقائع عبدالقادر خانی اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کے ایک لائق بزرگ عبدالقادر خاں رامپوری کی تصنیف ہے۔ یہ وہی عبدالقادر خاں ہیں جن کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور کتاب یادگار غالب کے دوسرے حصے "مرزا کے کلام پر ریویو" میں لکھا ہے

"ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

پہلے تو مرزا حیران ہوئے۔ پھر سمجھ گئے کہ یہ دراصل اس پیرائے میں میرے کلام پر اعتراض کیا ہے۔ بہرحال عبدالقادر خاں نہایت ذی علم، ذہین، طباع اور تجربہ کار انسان تھے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں کی سیاحت اور ملک کے اکثر مشاہیر سے ملاقات کی تھی۔ ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے اپنے مشاہدات، تجربات، مشاہیر سے تعلقات اور اس وقت کے برصغیر کے حالات کو اپنی اس کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے اس کتاب کو پڑھ کر اس دور کی تاریخ و معاشرت کا ایک واضح نقشہ نگاہ تصور کے سامنے آجاتا ہے۔ کتاب اپنے مواد اور موضوع کے لحاظ سے بہت، بلند پایہ ہے۔ وقائع نصیر خانی کے شامل ہو جانے سے اس کی افادیت میں گرانقدر اضافہ کردیا ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور الجھاؤ سے قطعاً پاک ہے۔

نواب خان بہادر خاں شہید

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مجاہدین میں ایک نواب خان بہادر خاں شہید تھے۔ وہ روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ گردشِ لیل و نہار نے انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی قابلیت اور کارکردگی کی بنا پر وہ جنگ آزادی کے وقت بریلی کے کلکٹر ہو گئے تھے۔ لیکن تین پشتیں گزرنے کے باوجود ابھی تک ان کے دل سے آزادی کا جذبہ نہیں نکلا تھا۔ چنانچہ جس وقت ملک کے دوسرے حصوں میں علم آزادی بلند کیا گیا تو وہ بھی اپنی ملازمت کی پروا کیے بغیر اور نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر جنگ کے شعلوں میں کود پڑے اور بہت جلد ایک جمعیت اکٹھا کر کے بریلی میں اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ نتیجۃً انگریزی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ شجاعت اور بہادری کا بے نظیر نمونہ پیش کیا لیکن کہاں ہاتھی اور کہاں ایک موزنا تواں۔ آخر میں سپر انداز ہوئے اور انگریز نے جو معاف کرنا تو جانتا ہی نہیں تھا ان کو پھانسی کی سزا دی۔ وہ اس مصرع کے مصداق ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

دنیا میں ایثار و قربانی کی ایک اعلیٰ مثال چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ اس کتاب میں ان ہی واقعات کو سید مصطفیٰ علی بریلوی نے نہایت شرح و بست سے لکھا ہے اور واقعات کو جمع کرنے میں انھوں نے جس محنت و عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ انھوں نے یہ عجیب انکشاف کیا ہے کہ نواب خان بہادر خاں ایک قابل اڈمنسٹریٹر، ایک عظیم مجاہد اور ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی ایک ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ مولف کتاب نے ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور انکی تعلیمات

یہ کتاب ملک کے مشہور اہل قلم مولانا اعجاز الحق قدوسی کی لکھی ہوئی ہے انھوں نے اولیاء اور مشائخ پر جتنا کام کیا ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ موضوع ان کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی اسی قبیل کی تصانیف میں شہ پارے کا درجہ رکھتی ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی چشتیہ صابریہ سلسلے کے مشائخ میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں وہ اس زمانے میں تھے جب تختِ دہلی پر لودھی خاندان متمکن تھا۔ ان ہی کے زمانے میں بابر کا حملہ ہوا۔ پانی پت کی جنگ ہو کر سلطنت مغلیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداً شیخ نے حکومت کی اس تبدیلی کو اچھا نہیں سمجھا لیکن بعد میں وہ سیاسی حالات سے توجہ ہٹا کر رشد و ہدایت کے کاموں میں لگ گئے۔ اور مغلوں کے زمانے میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار گنگوہ ضلع سہارنپور میں مرجع خلائق ہے۔ شیخ توحید وجودی کے نہ صرف ماننے والوں میں سے تھے بلکہ اسی کو اصل و اساس دین و طریقت سمجھتے تھے۔ وہ اس عقیدے میں اس درجہ راسخ تھے کہ ایک موقع پر جب ان کے صاحبزادگان نے اس مسلک پر کسی قدر شبہ کا اظہار کیا تو وہ ان سے ناراض ہو کر اور یہ کہہ کر اودھ طرف کو چل پڑے کہ تم لوگوں کا عقیدہ باطل ہے ہم تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

شیخ نے ہی سب سے پہلے اس خانوادے کے سرخیل علاء الدین احمد صابر کلیری کے مزار کا پتہ چلایا تھا۔ ورنہ اس وقت تک صابر صاحب کی قبر کے آثار تک مٹ مٹا گئے تھے

بہر حال حضرت شیخ عبدالقدوس کو برصغیر کی تصوف کی تاریخ میں ایک بلند درجہ حاصل ہے لیکن اس قدر اہمیت کے حامل ہونے کے باوصف ان کے بہت کم حالات سے لوگوں

تصنیف بھی مولانا اعجاز الحق قدوسی نے خدا انھیں جزائے خیر دے ان کے حالات نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کرکے ایک ایسی ضخیم اور جامع کتاب لکھدی کہ فی الحال اس کو حرفِ آخر کا درجہ دینا مناسب ہوگا۔

گلشن بے خار

جب سے اردو شاعری نے ایک مستقل شکل اختیار کی ہے۔ اسی وقت سے شعرائے اردو کے تذکرے بھی لکھے جارہے ہیں۔ تحقیقات کی روشنی میں معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلے تذکرے میر تقی میر، افضل بیگ قاقشال اور خواجہ خان حمید کے تھے۔ اس کے بعد اور بہت سے تذکرے لکھے گئے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے گلشن بے خار کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔ لیکن اپنی مختلف خوبیوں کی وجہ سے یہ تذکرہ نہایت اہم اور اعلیٰ درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مصنف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں جو خود ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ستھرا اور پاکیزہ شعری مذاق رکھتے تھے۔ اشعار کو پرکھنے میں ان کی حیثیت ایک کسوٹی کی سی تھی۔ ان کی اس خوبی کو غالب جیسے بلند پایہ شاعر نے تسلیم کیا ہے۔ حالی نے بھی ان کے ذوق کی دل کھول کر تعریف کی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود حالی کا مذاق شعری نواب صاحب کی صحبت میں رہ کر ہی نکھرا ہے۔

ان کے اس اعلیٰ مذاق کا اظہار تذکرہ گلشن بے خار میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف شعراء کے کلام پر نہایت جچی تلی رائے دی ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے نہایت قطعیت سے کہا ہے۔ نواب صاحب نے یہ تذکرہ زمانے کی روش کے مطابق فارسی میں لکھا تھا۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے جناب احسان الحق فاروقی سے اس کو اردو میں منتقل کرا کر ڈاکٹر احسن فاروقی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا ہے اردو زبان میں یہ ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

فرحت الناظرین

آخیر دور مغلیہ کے ایک عالم محمد اسلم بن محمد حفیظ الانصاری پسروری نے فرحت الناظرین (تالیف ۱۱۸۴ھ) نام کی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ جس کا آخری حصہ ۱۱۳ شخصیات سے متعلق تھا۔ ان میں سے ۳۳ مشائخ ہیں، ۳۳ علماء اور ۴۵ شعرائے فارسی۔ اس حصے کی اہمیت و افادیت کو دیکھ کر ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے اس کو اردو میں منتقل کرایا گیا۔ اور یہ کام ملک کے ممتاز محقق و مصنف جناب محمد ایوب قادری کو سپرد کیا گیا۔ جنھوں نے ترجمے کے ساتھ ساتھ قیمتی حواشی کا اضافہ کیا۔ اور ہر ترجمے کے بعد مزید حوالے کی کتابوں کے نام مع صفحات درج کئے۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق انتہائی محنت اور جانکاہی سے کام لے کر اصل کتاب کو بالکل بدل دیا ہے اس کو ایسا نکھارا اور سنوارا ہے کہ کتاب کی حیثیت ترجمے سے زیادہ تالیف کی ہو گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں ضمیمے ہیں جن میں دس رجال کا ترجمہ اور آ گیا ہے۔ آخر میں ذکر بلاد کے عنوان سے کچھ شہروں کے حالات ہیں جو کتاب کے مصنف نے فارسی میں لکھے تھے وہ بجنسہٖ اس ترجمے میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ فارسی جاننے والوں کے لئے یہ آسان ہو گیا ہے کہ وہ ان شہروں کے اس زمانے کے حالات خود مصنف کے لکھے ہوئے پڑھ سکیں۔

اکیڈمی کی مطبوعات میں اس کا اضافہ خاصا وقیع ہے۔

مسئلہ علم مسلم مفکرین کی نظر میں

مولانا یعقوب بخش راغبؔ

بدایونی کا یہ گرانقدر مقالہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی ایک کتاب تعلیم و تعلم میں شائع ہوا تھا لیکن اس مقالے کی اہمیت کے پیش نظر پروفیسر سلیم چشتی کے اصرار سے اسکو علیحدہ کتابی شکل میں شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ یہ مختصر کتاب وہی مقالہ ہے جو اہل علم کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا راغب کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ وہ بہ یک وقت عالم دین ادیب۔ شاعر۔ ہیئت داں۔ منجم۔ ماہر جعفر و رمل تھے۔ یونانی مفکرین اور مسلمان مفکرین کے نظریات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ اس چھوٹی سی کتاب میں انھوں نے اپنی اس علمیت کا پوری طرح اظہار کیا ہے۔ انھوں نے ادراک، تعقل کا علم۔ الفاظ معنی وغیرہ پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ اور معلم ثانی ابو نصر فارابی بذریہ سے لگاکر سید قمرالدین اورنگ آبادی تک کی آراء پیش کرکے اپنی بحث کو تقویت پہنچائی ہے۔ مضمون کافی دقیق ہے۔ خواص بلکہ اخص الخواص ہی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

یادیں اور خاکے | سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کی تصانیف میں یہ بھی ایک ہلکی پھلکی تصنیف ہے۔ موضوع اور زبان دونوں اعتبار سے تکلف سے بری ہے۔ ان کے اپنے ذاتی حالات اور بعض ملنے والوں کی روزانہ زندگی کے سیدھے سادے واقعات ہیں۔ ملنے والوں میں کئی معمولی درجے کی عورتیں ہیں۔ جنھوں نے نہ تعلیم میں کوئی بلند مقام حاصل کیا نہ جن کو دنیاوی وجاہت نصیب ہوئی اور نہ حسن صورت میں کوئی نمایاں درجہ ملا۔ لیکن مولفہ نے اپنے بے تکلف انداز بیان سے ان ہی میں کافی دلچسپی پیدا کردی ہے۔ اور یہی معمولی انسان اور ان کے روز مرہ کے کام غیر معمولی اہمیت کے حامل بن گئے اور ان میں دلکشی اور دلچسپی

کا عنصر پیدا ہوگیا۔

چھوٹی سی کتاب ہے جس میں کل آٹھ مضمین ہیں۔ ان مضامین کی ترتیب یہ ہے (۱) بیلا شاہ (میرے آبا) (۲) علیگڈھ کے شب و روز (۳) میاں ایک مثالی شخصیت (۴) سکینہ گاؤں سے شہر تک (۵) منظور بوا (۶) جب ان کی یاد آتی ہے۔ (۷) عظیمت بیاہ کی تلاش میں (۸) منزل ناتمام

ڈاکٹر احسن فاروقی نے مقدمہ میں صحیح لکھا ہے کہ "اس طرح سوانح کی ایک مفید صنف وجود میں آتی ہے جس کا مدار تاریخی صحت پر ہے۔ مگر جس کے موضوع 'بڑے آدمی نہیں بلکہ چھوٹے آدمی ہیں'!

مشہور انگریزی شاعر ٹامس گرے نے اپنی ایک نظم ایلیجی یعنی مرثیہ میں اس جذبے کا اظہار کیا تھا کہ کتنے صاحب کمال لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے کمالات ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں اور کوئی ان کو جانتا نہیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی نمونے پیش کیے گیے ہیں

خط و خطاطی | تمدن انسانی کو بڑھانے میں جن چیزوں نے خاص کردار ادا کیا ہے ان میں ایک خط و خطاطی کا فن ہے۔ جب تک انسان نے لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ اس وقت تک افکار و خیالات کو دوسروں تک پہنچانے اور تجربات و مشاہدات کو آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کرنے میں بڑی دقت محسوس ہوتی تھی۔ انسان کو اپنے حافظے سے زیادہ کام لینا پڑتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے حافظے میں جلا پیدا ہوجاتی تھی۔ اور انسان بہت سی باتوں کو جلد یاد کرلیتا اور دیر تک یاد رکھتا تھا۔ پھر بھی علم میں وسعت نہیں پیدا ہوتی تھی۔ جب خط ایجاد ہوئے تو تمدن نے تیزی سے

قدم بڑھائے اور جو کچھ کسی فرد یا بعض افراد نے دریافت کیا وہ دوسروں کے لئے محفوظ ہو گیا۔ اسی بات کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب کے مصنف شیخ ممتاز حسین صاحب نے صحیح کہا ہے کہ

" تمدن نے بتایا کہ خطاطی اکثر علوم کی محافظ اور بیشتر فنون کے خزانوں کی کنجی ہے یہ خود ایک علم بھی ہے اور ایک مستقل فن بھی۔"

تہذیب و تمدن کی راہ میں آگے بڑھنے کے لئے خط کی ضرورت تو ہر قوم کو پڑی۔ اور اسی لئے دنیا میں طرح طرح کے خط دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اور قوموں کی کوشش صرف یہ رہی کہ اپنے خط کو زیادہ سے زیادہ سہل بنائیں لیکن مسلمانوں نے اس کو بنانے سنوارنے کی طرف بھی توجہ کی۔ چونکہ ان کو تصویر کشی اور بت تراشی کی مذہباً ممانعت تھی اس لئے ان کی جمالیاتی حس تمام تر خطاطی اور تعمیرات کے ضمن میں صرف ہوئی اور انھوں نے اپنی صناعی اور حسن کارانہ صلاحیت کا ان فنون میں پوری طرح اظہار کیا۔ طرح طرح کے خط ایجاد کئے اور نفاست اور خوبصورتی میں بلند سے بلند معیار قائم کرنا چاہا۔ غرض مسلمانوں نے خطاطی کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ جس کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری سمجھا گیا۔ اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن میں فن کی باریکیاں بھی بتائی گئیں اور اس کی تاریخ بھی دہرائی گئی۔

کتاب ہذا ایک ایسی ہی تصنیف ہے جس میں خط و خطاطی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اور مختلف خطوط کی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر کچھ فنکاروں کا تذکرہ ہے۔ چونکہ دو نوعیتوں سے بحث کی گئی ہے اس لئے اس کتاب کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں پہلے حصے میں دنیا کے مختلف خطوں سے بحث کی گئی جس میں تصویری خط کو نقطۂ آغاز بتایا گیا ہے۔ اور ہندوستانی خط پر اس داستان کو ختم کیا گیا ہے۔ یہ حصہ شیخ ممتاز حسین جونپوری نے تحریر کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں اردو خط کے ماہرین کا مختصر سا تذکرہ ہے اور ان کے فن کے بعض نادر نمونوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس حصے کو محمد ایوب قادری نے ترتیب دیا ہے کتاب مختصر ہونے کے باوجود اس فن پر ایک اچھی دستاویز ہے۔

حیات مابعد

حیات مابعد کا تصور دنیا کی تقریباً ہر اس قوم میں رہا جس نے خود کو کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ رکھا۔ دراصل کوئی بھی شخص جو ایک مافوق ہستی پر یقین رکھتا ہے۔ اس خیال پر قانع نہیں رہ سکتا کہ اس زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اور حیات انسانی ایک مہمل شے بن کر رہ جائیگی۔ جو لوگ مابعد الطبیعیاتی تصور کے منکر ہیں ان سے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے البتہ جو لوگ اس کے قائل ہیں وہ اس زندگی کے ماورا کسی اور زندگی کے بھی قائل ہیں۔ وہ اس زندگی کو مبتدا تصور کرتے ہیں۔ جس کے لئے ایک خبر کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر جملہ پورا نہیں ہوتا۔ اور وہ خبر ہے ایک دوسری زندگی۔ وہ زندگی کس قسم کی ہوگی خواہ اس کے بارے میں وہ کچھ نہ بتا سکیں لیکن اس کی ضرورت کا احساس انھیں شدت سے ہوتا ہے۔ اسی کو وہ حیات مابعد سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی کی تیاری کے لئے وہ اس زندگی میں مناسب اعمال کرتے ہیں۔

کتاب ہذا جس کو ضامن علی نقوی مرحوم نے آج سے تقریباً ۱۵ سال پہلے تالیف کیا تھا۔ اسی موضوع پر ہے۔ اور انھوں نے بڑے غور و فکر کے بعد اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے پوری کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول کا موضوع عالم ..... باب دوم میں علم و ادراک سے بحث کی گئی ہے

ب سوئم میں مذاہب اور حیات مابعد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
ب چہارم انسان اور انسانیت سے متعلق ہے۔ باب پنجم میں
ات بعد الممات پر چند اعتراضات ہیں اور باب ششم میں منصب
ت و رسالت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان سب عنوانات کے
ت سے ذیلی عنوانات ہیں۔ باب سوم چونکہ مذہب اور حیاتِ
بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لحاظ سے کتاب ہذا میں خاص اہمیت
ہ۔ اس باب میں ۱۲ ذیلی سرخیاں ہیں جن کی ترتیب یہ ہے۔
عقیدہ تناسخ (۲) روح اور مادہ (۳) نیکی و بدی (۴) معیار
سعید (۵) ضمیر انسانی (۶) جزا و سزا (۷) قرآن پاک اور حیاتِ
لبعد (۸) تجدد امثال (۹) تجدد امثال کی ایک روشن مثال۔
) کائنات و حیات انسانی کوئی عبث شے نہیں ہے (۱۱)
ہر منزل حیات کی آمد و واپسی (۱۲) ربوبیت کی تفسیر یا مسلسل
تقار۔

ان عنوانات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اصل
موضوع پر کس سلیقے اور حکیمانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔
ر اسکی ضرورت و اہمیت کو کیسے واضح کیا گیا ہے۔

علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں

اس کتاب کی اشاعت
لیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس میں
۱۸۸۶ء سے ۱۹۳۲ء تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے
بہت سے سالانہ اجلاسوں کی رودادیں اور ان اجلاسوں میں
پڑھی جانیوالی نظمیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ہر اجلاس کی روداد جس
انداز سے اور جس قدر تفصیل کے ساتھ دی گئی ہے اس کو پڑھ کر
اس اجلاس کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور اس سے یہ بھی پتہ
چل جاتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے سیاسی پلیٹ فارم پر کون
کون سی ہستیاں کام کر رہی تھیں۔ اور کس جوش و ولولے کے ساتھ
لوگ قومی کام انجام دے رہے تھے۔ حصول زر اور جلب منفعت
کی جو دوڑ آج نظر آرہی ہے۔ اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ان
اجلاسوں میں جو نظمیں پڑھی گئیں ان میں بہت سی فارسی میں بھی
تھیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں میں
فارسی کا مذاق بہت عام تھا۔ فارسی میں شاعری کرنیوالوں کی
بھی ایک بڑی جماعت تھی۔ اور اس کو سمجھنے اور سراہنے والے
لوگ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اس کتاب میں جتنی نظمیں دی
گئی ہیں خواہ وہ اردو کی ہیں خواہ فارسی کی ان سب کے لفظ
لفظ سے خلوص اور جوش و جذبے کا اظہار ہو رہا ہے۔ اکیڈیمی نے
یہ کتاب چھاپ کر جہاں اس وقت کے مسلمانوں کے قومی و ملّی
جوش و جذبہ اور ان کے اتحاد و اتفاق کی کیفیت و حالت بتا کر
موجودہ مسلمانی آبادی کو جھنجھوڑا ہے۔ وہاں ان نظموں کو یکجا
کر کے اردو و فارسی زبانوں کی بھی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ان
منظومات سے مخصوص لوگ بھی واقف نہیں تھے۔ اب یہ متاعِ
گرانبہا وقف عام کر دی گئی ہے۔

(پاک) ہند میں تعلیمی ترقی

ڈاکٹر این۔ این۔ لا کی ایک کتاب
کا اردو ترجمہ عہد اسلامی میں علمی ترقی اکیڈیمی آف ایجوکیشنل
ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے ۱۹۶۵ء میں الگ
شائع کی تھی۔ یہ کتاب اسی مصنف کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے۔
جو پاک و ہند میں تعلیمی ترقی کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ ممکن
ہے اس پیشکش کو لوگ بے وقت کی راگنی سمجھیں اور یہ کہہ کر اس سے
اپنا دامن بچانا چاہیں کہ "جب انگریزی حکومت نہیں رہی۔
تو اب اس کے دور میں تعلیمی ترقی کی روداد بیان کرنے سے کیا فائدہ۔

اس خدشہ کا اظہار مترجم نے بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔

"کتاب کے اصل موضوع کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ انگریزی حکومت ختم ہونے اور پاکستان و ہندوستان کی دو الگ الگ آزاد حکومتیں قائم ہو جانے کے بعد اگرچہ — ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

کا مصداق ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماضی ہی سے حال و مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور ہم اپنے کسی بھی موضوع میں قدیم تاریخی واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی لیے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اس کتاب کی اشاعت کا بندوبست کیا ہے۔"

اس کتاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ملک کے ہر حصے اور طبقے کی تعلیم کی کیفیت و حالت صاف ظاہر کی ہے۔

تعلیم و تعلّم

تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر بعض حضرات نے جو مضامین وقتاً فوقتاً لکھے تھے یہ کتاب ایسے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے مرتب سید الطاف علی بریلوی ہیں۔ جو مضامین اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ ان کے موضوع نہایت اہم ہیں۔ اور لکھنے والے بھی عموماً وہ لوگ ہیں جن کو ان موضوعات سے ذاتی طور پر دلچسپی ہے۔ مثلاً فنون لطیفہ کی تعلیم پر پروفیسر مرزا سجاد حسین کا مضمون ہے۔ جن کی پوری زندگی فنون لطیفہ کی تعلیم و تدریس میں گذری ہے۔ تدریس اردو پر شمس العلماء محمد امین عباسی چڑیا کوٹی کا مضمون ہے۔ ظاہر ہے ان سے زیادہ اس موضوع کے ساتھ کون انصاف کر سکتا تھا۔ علم ہیئت پر ایک فلسفیانہ تنقید پروفیسر محمد شریف (آکسن) کا مضمون ہے۔ جو فلسفے کی گہرائیوں میں پہنچے ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے اپنی پوری حیات مستعار فلسفے کی درس و تدریس میں گذار دی۔ آخری مضمون مبادیات علم مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی کا لکھا ہوا ہے ان کا عالمانہ انداز اور زور بیان تحسین و ستائش سے مستغنی ہے۔ غرض پوری کتاب تعلیم و تدریس کے مختلف موضوعات کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اور مرتب سید الطاف علی نے ان کو یکجا کر کے علم و تعلیم کے سلسلے میں ایک قابل قدر کام کیا ہے۔

مادری زبان کی تعلیم

اس بات سے کوئی شخص انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مادری زبان ہر فرد کی تعلیم کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بغیر تعلیم موثر ہو سکتی ہے۔ اور نہ جزو حیات بن سکتی ہے اس ضرورت و اہمیت کی وجہ سے مادری زبان کی تعلیم پر خاص توجہ ہونی چاہئے اور اس کو اس طرح پڑھانا چاہیے کہ اس میں املا اور انشاء کے علاوہ مختلف اسالیب اور ہر طرح کے مضامین کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ایک طرف مادری زبان کی یہ ضرورت ہوئی دوسری طرف پڑھانے اور پڑھنے والوں دونوں کی اس جانب سے غفلت دونوں فریق شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتے ہیں کہ مادری زبان کو تو سب ہی جانتے ہیں لہٰذا اس میں کاوش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبا اپنی زبان کی معمولی معمولی باتوں تک سے بے خبر رہتے ہیں۔ تجربہ کا تو سوال ہی کیا ہے۔ اسی کوتاہی کو دیکھتے ہوئے فروغ احمد علوی نے جو تدریسی زبان کا کافی تجربہ رکھتے تھے یہ کتاب اردو زبان میں لکھ کر ایک ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے آسان اور سادہ زبان اور بڑے موثر انداز زبان کے ہر جزو کو سکھانے کا طریقہ بتایا ہے۔ قواعد زبان، املا انشاء، مضمون نگاری، مکالمہ نگاری، افسانہ نگاری، خطوط

تحریر، تقریر، تشبیہ، استعارہ، نظم و نثر کی تدریس کے قواعد بتائے ہیں اور تشریح کے اصول سمجھا کر زبان کے سلسلے میں ان کو بتایا ہے۔

غرض یہ کتاب مادری زبان کی تعلیم کا ایک اچھا مرقع ہے۔

مسلمانانِ بنگال کی تعلیم

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں حصولِ علم کیلئے جو کاوشیں کیں اور تعلیم ملّی کے ساتھ جو اعتنا کیا۔ اس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں سے بڑھ کر کسی قوم نے کبھی تعلیم و علم کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ برصغیر میں خصوصیت سے انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سے مسلمانوں میں جہالت بڑھتی گئی۔ اور وہ اپنے علوم سے بیگانہ ہو گئے اور جدید علوم میں بھی کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے یہ حالت برصغیر کے ہر حصے میں نظر آتی ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر سید مصطفیٰ علی بریلوی نے اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے ادارہ سے پاکستان کے مختلف حصوں کی تعلیم کی حالت مسلمانوں کے زمانہ سے شروع کر کے برطانوی دور تک بیان کر دی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بنگال کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس وقت برصغیر کا وہ حصہ ایک علیحدہ مملکت کی شکل میں دنیا کے نقشے پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب یہ کتاب مرتب ہوئی تھی اس وقت وہ پاکستان ہی کا ایک حصہ تھا۔ اسلئے اس قسم کی کوشش وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اب بھی ان حقائق کو جاننا علمی نقطۂ نظر سے کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔

اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تعلیمی حالت بتائی گئی ہے۔ دوسرے باب میں محمد بن بختیار خلجی سے دورِ عالمگیر تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بنگال میں انگریزوں کی آمد اور عیسائیت کے فروغ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باقی ابواب میں انگریزی دور کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ آخری باب کا عنوان طلوعِ آفتاب ہے اس میں آزادی کے بعد کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے اور یونیورسٹی کی تعلیم کا حال اور صوبے میں مختلف کالجوں کے قیام کے سلسلے میں بتا کر یہ دکھلایا گیا ہے۔ کہ انگریزی دور کے تقریباً سو سال میں اتنا کام نہیں ہوا تھا جتنا پاکستان بننے کے بعد صرف آٹھ سال کی قلیل مدت میں ہو گیا۔

تاریخی شذرات

مرزا علی اظہر برلاس کے چند مقالوں کا مجموعہ ہے۔ جو موصوف نے انگریزی زبان میں لکھے تھے۔ ان کو اکیڈمی نے اخلاق حسین زبیری سے اردو میں ترجمہ کرا کر اپنے اہتمام سے شائع کرایا ہے۔ ترجمہ نہایت بامحاورہ اور شگفتہ ہے جس سے اس کتاب پر تالیف کا گمان ہونے لگتا ہے۔

کتاب ہذا میں انتساب اور تعارف کے علاوہ کل پندرہ مقالے ہیں۔ جو تقریباً سب کے سب معیاری ہیں لیکن بعض نہایت معرکہ کے ہیں۔ اور مقالہ نگار کی وسعتِ معلومات اور ژرف نگاہی کا آئینہ ہیں۔ مثلاً ہمارا تہذیبی ورثہ، وسطِ ایشیا اور پاکستان کے باہمی رشتے۔ اودھ، ویدوں اور بدھ مت کے عہد میں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال کی صنعتوں کو گلا گھونٹ کر تباہ کرنا۔ سلطنت اودھ اور انگریزی پروپیگنڈہ۔ اودھ کی جدوجہد آزادی۔

یہ کتاب جس محنت سے لکھی گئی ہے اس کو دیکھ کر قارئین مصنف کو داد دیئے بغیر نہیں رہیں گے اور ہر فرد محسوس کریگا کہ اس کتب کے مطالعے سے اس کی معلومات میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے

حقیقت یہ ہے کہ بعض باتیں اس کتاب میں ایسی شامل ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی نہیں مل سکتیں۔

صوفیائے بہار اور اُردو | کتاب ہذا کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے تین باتوں کا بتا دینا ضروری ہے کیونکہ ان سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہو جائیگا۔ پہلی بات یہ کہ مصنف کتاب پروفیسر معین الدین دردائی صوبہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ تصوف کا گہرا ذوق رکھتے ہیں اور تصوف کے ایک مشہور خانوادے سے ان کا تعلق رہا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ اردو زبان و ادب کے ماہر ہیں۔ ان کی تمام عمر اسی زبان اور اسی زبان کے ادب کی خدمت کرتے گذری۔ علیگڑھ سے انھوں نے اس زبان میں ایم اے کیا۔ علیگڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ دن انجمن ترقی اردو ہند سے تعلق رہا۔ پھر ایڈورڈ کالج پٹنہ سے منسلک ہو کر سالہا سال اس زبان و ادب کی تعلیم اور تدریس کا کام انجام دیا اور اس وقت جبکہ کسی بیماری کی وجہ سے تقریباً گوشہ نشین ہیں اپنا بیشتر وقت گیسوئے اردو کی مشاطگی میں صرف کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صوبۂ بہار کے ایک متوطن، تصوف کا ذوق رکھنے والے اور زبان کے کہنہ مشق محقق کی تصنیف "صوفیائے بہار اور اُردو" اپنے اندر کتنی جامعیت اور کس قدر گہرائی و گیرائی رکھتی ہوگی۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اب اکیڈمی نے اسے پھر زیور طبع سے آراستہ کرایا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے بہار میں اردو شاعری کی ابتدا اور اسکی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے صرف صوفیائے بہار کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس مقدس جماعت نے لوگوں کے اخلاق کی تطہیر کے ساتھ ساتھ وہاں اردو کی نقش آرائی میں بھی گرانقدر کام انجام دیا ہے۔ تمہید میں انھوں نے صوفیائے کرام کی کوششوں کا ایک عام جائزہ لیا ہے۔ اور ان کے بعض مقولے، چند عبارتیں اور کچھ اشعار کے نمونے دیکر بتایا ہے کہ یہ کوششیں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱ھ تا ۷۸۲ھ) کے زمانے سے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے انفرادی کوششوں کو تفصیلی طور پر بتایا ہے اور ۲۸ صوفیاء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ جائزہ تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک لیا گیا ہے۔ اور حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے متعلق علمائے صادقپور مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کی اردو زبان کی خدمات پر پہنچ کر ختم کر دیا گیا ہے۔ کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ انداز بیان نہایت سلجھا ہوا اور دل آویز ہے اور اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

صوفیائے سندھ اور اُردو | یہ کتاب بھی پروفیسر معین الدین دردائی نے لکھی ہے۔ اور اس میں بتایا ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں سندھ کا بھی حصہ برصغیر کے دوسرے علاقوں سے کچھ کم نہیں ہے کتاب کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں صوفی شعراء کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں ملا عبدالحکیم ٹھٹھوی سے ابتدا کی گئی ہے۔ پھر شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ میر حیدر الدین۔ سچل سرمست وغیرہ کے حالات زندگی لکھ کر ان کے اُردو کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ حضرت سائیں عبدالرشید اور صاحبزادہ محمد علم الدین علمی قادری کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے حضرت سائیں عبدالرشید کا انتقال ۱۹۷۲ء میں اور صاحبزادہ محمد علم الدین علمی قادری (ولادت ۱۹۲۳ء) بحمد اللہ حیات ہیں۔ اور رشد و ہدایت اور علوم دینی کے درس و تدریس کے ساتھ اُردو

زبان کی بھی خدمت کر رہے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ نثر نگاری سے متعلق ہے۔ اس میں ۱۵ نثر نگاروں کے حالات اور ان کے تصنیفی کارنامے بتائے گئے ہیں۔ اس حصہ میں ان کئی نامور ادیبوں اور مصنفوں کے بھی حالات درج ہیں جو اس وقت بھی گیسوئے سندھ کو سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جیسے پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی، غلام مصطفیٰ قاسمی وغیرہ۔

تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ

تعلیمی نفسیات کا مطالعہ، درس وتدریس کے سلسلے میں قطعاً ناگزیر شئے ہے کیونکہ اس کے بغیر تعلیم کو موثر اور مفید نہیں بنایا جاسکتا۔ جب تک معلم کو انسان کی عموماً اور متعلم کی خصوصاً نفسیات کا علم نہ ہو جائے اور وہ اس کی ذہنی صلاحیتوں رجحانات ومیلانات اور پسندیدگی کو نہ سمجھ جائے اس وقت تک تعلیم کے سلسلے میں اس کی کوئی سعی وکوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ تمام انسانوں میں فطری جبلتیں مشترک ہیں اور ان ہی کی بنیاد پر بنی نوع انسان کو ایک لڑی میں منسلک کیا جاسکتا ہے اس کے باوجود بعض رجحانات ومیلانات مختلف انسانوں میں مختلف ہوتے ہیں جب تک ان کو نہ جان لیا جائے اس وقت تک افراد خصوصاً نوخیز بچوں کے لئے تعلیم میں دلچسپی کا عنصر پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ تعلیم کو جزو حیات نہیں بنا سکتے۔ تعلیم انسانی زندگی کے لئے روحانی غذا کا حکم رکھتی ہے لہٰذا جس طرح عام غذا انسان کے جسم میں جاکر تمام رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے اور اس سے جسم کے تمام اعضا یکساں طور پر پرورش پاتے اور بالیدگی حاصل کرتے ہیں اسی طرح تعلیم کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ انسان کے کردار کے تمام پہلوؤں کو یکساں طور پر نہ صرف متاثر کرے بلکہ ان میں جلا پیدا کر کے اس کو ایک اعلیٰ کردار کا انسان بنا سکے۔ یہ مقصد تعلیمی نفسیات کے مطالعے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے درس وتدریس کے طریقے بتانے کے ساتھ ساتھ تعلیمی نفسیات کے مضمون کو ضروری قرار دیا۔ دیگر علوم وفنون کی طرح تعلیمی نفسیات پر بھی اچھا لٹریچر انگریزی زبان میں پایا جاتا ہے اور اردو کا دامن ابھی تک اس سے خالی ہے لہٰذا براہ راست اردو میں کتابیں لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ انگریزی کی بعض اچھی کتابوں کو اردو میں منتقل کر لیا جائے تاکہ وہ آئندہ تصنیف وتالیف کے لئے نمونے کا کام دے سکیں۔

انگریزی زبان میں تعلیمی نفسیات کے موضوع پر پروفیسر جے ایس راس کی کتابیں نہایت معیاری سمجھی جاتی ہیں خصوصاً اس کی کتاب (GROUND WORK OF EDUCATIONAL PSYCHOLOGY) اپنے اختصار، جامعیت اور طرز بیان کے اعتبار سے اعلیٰ نمونے کی ایک چیز ہے اور اسی لئے جب تک ذریعہ تعلیم انگریزی رہا اس وقت تک تدریس کے تربیتی اداروں میں اس کو ایک درسی کتاب کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ اب کہ ذریعہ تعلیم اردو ہو گیا ضروری ہے کہ زیر تربیت معلمین کو اس کتاب سے اردو کے ذریعہ استفادہ کا موقع دیا جائے۔ اسی غرض سے اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ نے جناب وحید الحق سے جن کا تعلیمی تجربہ کافی طویل رہا اس کتاب کو اردو میں منتقل کرا کر شائع کیا پروفیسر وحید الحق صدیقی نے ایک ایسی دقیق اور فنی کتاب کا ترجمہ جیسا شگفتہ اور رواں کیا ہے وہ ان کے طویل تجربے اور تبحر علم پر دلالت کرتا ہے پوری کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں انسان کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے اس کا رشتہ تعلیم سے قائم کیا گیا ہے۔ اور پھر اس کو درس کاموں میں استعمال کا طریقہ بتایا گیا ہے غرض اس موضوع پر کتاب ہذا کے ترجمے کی وجہ سے اردو زبان میں ایک اچھا اضافہ

ہند اسلامی میں علمی ترقی

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں علم اور تعلیم سے جو اعتنا کیا اس کی مثال شاید کسی قوم میں نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں کا مخالف ترین شخص بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے اس پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے اور سیاسی حالات اور صوفیہ کے کشف و کرامات کے بیان کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کیا گیا ہے چنانچہ حکیم عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی مختصر تالیف یادِ ایام یا تاریخ گجرات میں اس بات کا شکوہ کیا ہے۔

بہرحال جو تھوڑا بہت مواد مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنے دور کی علمی ترقی کے سلسلے میں فراہم کیا تھا اسی کو سامنے رکھ کر ایک بنگالی ہندو ڈاکٹر این۔ این۔ لا نے انگریزی زبان میں ایک کتاب اس موضوع پر لکھی تھی جس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ نے اس کا ترجمہ جناب اخلاص حسین زبیری اور سلطان فاطمہ بلخی سے کرا کر شائع کیا ہے۔ اخلاص صاحب کی ترجمہ کی صلاحیتیں اظہر من الشمس ہیں لہٰذا اس سلسلے میں کچھ کہنا سعی لاحاصل کا مصداق ہے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ترجمے پر تالیف کا گمان ہوتا ہے پھر اس پر بعض مفید حواشی دے کر کتاب کو اخلاص صاحب نے گویا اپنا لیا ہے یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع ہے اس میں نہ صرف دہلی کے سلاطین کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے بلکہ برصغیر کے مختلف حصوں میں علمی ترقیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مغلوں کی آمد سے پہلے کا حال ہے، دوسرے میں مغلیہ سلطنت کے زمانے کی تعلیمی سرگرمیاں ہیں اس موضوع پر اچھی کتاب ہے۔

تجدد امثال

یہ فلسفہ اور تصوف کی ایک اصطلاح ہے جو اشیاء کائنات میں ہر آن تغیر و تبدل کی توجیہہ کے لیے وضع کی گئی ہے فلسفہ اور منطق میں جو محسوسات کو اعراض کہا جاتا ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں ان کو "امثال" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بعض مسلمان صوفیہ اور متکلمین کا یہ نظریہ رہا ہے کہ کائنات کا وجود مستقل طور پر ایک حالت میں نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات ایک لمحہ میں مرتی اور دوسرے لمحے میں زندہ ہوتی رہتی ہے گویا کائنات کی خصوصیت مسلسل عدم اور مسلسل وجود ہے اس نظریے کو "تجدد امثال" کہا جاتا ہے۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ "حیات و ممات کا یہ سلسلہ اس تواتر و سرعت کے ساتھ جاری رہتا ہے کہ اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں اس کی مثال کسی فلم کی بدولت بدلتی ہوئی تصویروں سے دی جا سکتی ہے جو پردۂ سیمیں پر اس سرعت سے آتی اور جاتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ایک تصویر کب غائب ہوئی اور دوسری نے کس وقت اس کی جگہ لی۔ بلکہ برابر یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک ہی تصویر ہے جو مختلف حرکات و سکنات کی مرتکب ہو رہی ہے"

اس مرنے اور جینے کا احساس نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ "چونکہ کائنات کے فنا ہونے کے ساتھ ساتھ انسان خود بھی فنا ہو جاتا ہے اس لیے اس کی آنکھیں اس فنا کا مشاہدہ نہیں کر سکتیں اور اس کو صرف ان لمحوں کا احساس رہتا ہے جن میں انسان خود اور پوری کائنات موجود رہتی ہے۔ جب عدم یا موت کے وقفے غیر محسوس ہوتے تو پھر حیاتِ مسلسل کے سوا کس چیز کا نظارہ ہو سکتا ہے؟"

ہو سکی۔ اس مضمون کو جو کتاب ہٰذا میں شامل ہے وہ
یب انداز سے شروع کرتا ہے مضمون کا آغاز اس جملے
ے ہوتا ہے۔

"اگرچہ ٹرانسکی کی آنکھیں زردی مائل نیلگوں
یں لیکن اخباری نمائندے ہمیشہ ان کو سیاہ ظاہر کرتے تھے"
ر اس بیان کو اس فقرہ سے نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے
مسٹر ٹرانسکی نے خود کہا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ بھید
علوم ہوتا ہے میرے متعلق ہر بیان میں میری سیاہ آنکھو
ذکر ضرور ہوتا ہے حالانکہ قدرت نے جو آنکھیں مجھے
نایت کی ہیں وہ نیلے رنگ کی ہیں"

برٹرینڈرسل کو عام طور پر دورِ حاضر کا عظیم ترین فلسفی
سمجھا جاتا ہے اور اس کی زندگی کا یہی پہلو لوگوں کے سامنے
ہتا ہے لیکن میکس نے اس کے کردار کے دو پہلو دکھا کر
ارئین کو حیران و ششدر کر دیا ہے اس مضمون کا عنوان جس
س نے "دو برٹرینڈرسل" رکھا ہے اس کی زندگی
کا یہ رخ بہت ہی عجیب دکھایا گیا ہے۔

"غالباً اس لیکچر کے بعد ہی یہ ہوا کہ برٹرینڈرسل نے
مجھ سے بیرینڈ اسکول کے ایک بغلی کمرے میں اپنی بے انتہا خراب
مالی حالت کا رازدارانہ طور پر ذکر کیا۔ اس کے انقلاب آفریں
خیالات نے فلسفہ کی پروفیسری کے بے شمار عہدوں کے
دروازے اس پر بند کر دیئے تھے۔"

چارلی چپلن سے میکس کی ملاقات ۱۹۳۱ء میں ہوئی
تھی وہ کہتا ہے کہ "اسی زمانہ میں امریکہ کے صدر ولسن نے
یورپ کا دورہ کیا تھا لیکن چارلی چپلن کو دیکھنے کے لئے زیادہ
خلقت جمع ہو جاتی تھی۔

جان ڈیوی، مصنف کتاب میکس کا استاد تھا۔ وہ کولمبیا
یونیورسٹی میں تین سال تک پروفیسر ڈیوی کا شاگرد رہا تھا بعد میں
ان دونوں کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے غرض اس نے اس
عظیم مفکر و ماہر تعلیم کی کتاب زندگی کے ہر ورق کو نہایت
غور سے پڑھا تھا اور اس کے کاموں اور کارناموں کا
پوری طرح جائزہ لیا تھا۔ وہ اس کے نظریۂ تعلیم کو صرف
اس ایک فقرے سے سراہتا ہے۔

"جان ڈیوی کو ایسا آدمی کہنا بالکل ٹھیک ہے جس
نے ہمارے بچوں کو اکتاہٹ کی مہلک مصیبت سے
بچا لیا جس میں وہ اسکولوں میں مبتلا رہتے تھے"

میکس نے پوری کتاب اسی انداز میں لکھی ہے ان
چند فقروں سے جو اوپر درج کئے گئے ہیں بخوبی اندازہ
ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کس قدر دلچسپ اور
نشاط انگیز ہو سکتا ہے اکیڈمی نے اس کو اردو میں منتقل
کرا کر نہ صرف اس زبان کے ادب میں اچھا اضافہ کر دیا
ہے بلکہ بہت سے لوگوں کے لئے اس کتاب کے مطالعہ کو
آسان بنا دیا ہے۔

اردو زبان اور اسالیب

اردو زبان اور
ادب سے واقفیت
کے دعویدار بہت سے ہیں لیکن صحت زبان اور اسلوب
بیان کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ دراصل یہ چیزیں
آسانی سے حاصل ہو بھی نہیں سکتیں ان کے لئے فطری ذوق
کثرت مطالعہ اور محنت و ریاضت ضروری امور ہیں۔
جب ہی تو داغ مرحوم نے اب سے بہت پہلے نہایت
قطعیت سے کہا تھا۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

اول تو اُس وقت سے اردو داں طبقہ میں اس زبان اور اس کے محاورات اور اسالیب سے بیگانگت سی ہو گئی تھی جب سے عربی اور فارسی زبانوں سے تعلق کمزور ہوا تھا لیکن ماضی قریب میں ماحول کی تبدیلی نے اس جانب سے بالکل ہی بے پرواہ کر دیا ہے۔ اور اچھے اچھے ثقہ لوگ اس مقولے پہ عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ "جو بندھ گیا سو موتی" کس کی زبان اور کیسا اسلوب یہ باتیں ماضی کی ہیں۔ اب تو کام چلنا چاہیئے۔

یہ رجحان نہایت خطرناک ہے اور اسی کو بدلنے یا اُسکی تطہیر کرنے کے لیئے اکیڈیمی نے جناب مخمور اکبرآبادی سے یہ کتاب لکھوائی ہے۔ مخمور صاحب کو اردو زبان و ادب سے گہری واقفیت ہے اور انھیں صحیح اور غلط کا پوری طرح شعور ہے چنانچہ انھوں نے اس کتاب میں زبان کی ان غلطیوں کی۔ جو رواج پاچکی ہیں یا رواج پاتی جا رہی ہیں نشان دہی کر کے اُن کی صحت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے بہت سے الفاظ کے صحیح تلفظ اور معنی بتا کر متعدد الفاظ کی اچھی تشریح کی ہے۔ بہت سے الفاظ کی پوری طرح تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اُن کی اصل کہاں کہاں ہے اور انھوں نے موجودہ شکل کن کن مدارج سے گزر کر حاصل کی ہے۔ بہت سے محاورات کی تشریح کرکے زبان پر انگریزی اور پنجابی کے اثرات پہ بحث کی ہے۔ اور اس زبان کے اصل مراکز کے اسالیب اور پنجاب کے اسلوب کا فرق واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ جہاں جو اسلوب چل نکلتا ہے وہ چل کر رہتا ہے۔ لہٰذا اس پر اعتراض صرف اعتراض کی غرض سے کرنا صحیح نہیں۔ پھر اس فرق کو الفاظ اور محاوروں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً تابع مہمل کی صورت اور بناوٹ پنجاب اور آگرے و دلی میں مختلف ہے جیسے آگرے اور دہلی میں روٹی ووٹی، گاڑی واڑی کہتے ہیں۔ اور پنجاب میں روٹی شوٹی اور احمق شحمق بولتے ہیں۔ بہرحال یہ تمام بحثیں بڑی دلچسپ ہیں اور کتاب ہذا میں ان کو کافی پھیلایا گیا ہے۔ بعض الفاظ کی اصل اور اُن کی تاریخ جس کی طرف مولانا محمد حسین آزاد نے ہلکے ہلکے اشارے کر دیئے تھے۔ اس کتاب میں نہایت شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں غرض یہ کتاب جہاں مصنف کی علمی تبحر، وسیع مطالعہ اور ادبی ذوق کا آئینہ ہے وہاں زبان کی صحت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیئے بھی ایک نادر و نایاب تحفہ ہے زبان نہایت صاف اور پیرایہ بیان دلکش ہے۔

عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب سلطنت مغلیہ میں زوال کے آثار نمودار ہوتے تو بھارت کے موجودہ اتر پردیش میں (یوپی) میں روہیلہ پٹھانوں کی تین حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان میں ایک حکومت بنگش پٹھانوں کی تھی جن کا صدر مقام فرخ آباد تھا۔ اس حکومت کے بانی نواب محمد خاں بنگش تھے۔ جو مالوے کے گورنر رہ چکے تھے۔ بادشاہ فرخ سیر کے زمانہ میں انھیں روہیلکھنڈ میں ایک وسیع علاقہ بطور جاگیر ملا تھا۔ وہاں انھوں نے بادشاہ کے نام پر ایک نیا شہر فرخ آباد بسا کر اُس کو اپنا مستقر بنایا۔ بعد کو اس شہر نے مرکزی حیثیت

اختیار کرلی اور بے حد ترقی کی۔ بنگش خاندان کے یہ چھ فرمانروا ہوئے۔ (۱) نواب محمد خان بنگش (۲) نواب قائم خان بنگش (۳) نواب احمد خان بنگش (۴) نواب مظفر جنگ (۵) نواب ناصر جنگ (۶) نواب شوکت جنگ ان کے بعد نواب تجمل حسین اور نواب تفضل حسین کی حیثیت رئیسوں کی سی رہ گئی۔ یہ ریاست شاہی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی نذر ہو گئی۔ تجمل حسین وہی رئیس ہیں جن کی شان میں غالب کا یہ شعر ہے:

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خان کے لئے

تفضل حسین جنگ آزادی کے بعد حجاز چلے گئے تھے۔ وہاں ان کی زندگی نہایت عسرت سے بسر ہوئی۔

فرخ آباد کی تاریخ نہایت دلچسپ اور بیحد اہمیت کی حامل ہے۔ یہ حکومت عرصۂ دراز تک علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور ادب و شاعری کا مرکز رہی۔ دہلی کی تباہی کے بعد اکثر صاحب کمال لوگوں کو وہیں پہنچ کر امن ملا اور ان کے فضل و کمال کی قدر کی گئی۔ ویسے بھی حکمرانوں کی قابلیت سے ان کے علاقے میں کافی عرصے تک امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ اس زمانے کے حالات و واقعات کو سمجھنے کے لئے اس حکومت کی ایک مکمل تاریخ کی شدید ضرورت تھی۔ محترم سید الطاف علی ایڈیٹر "العلم" نے اس ضرورت کو تقسیم سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ اور وہ حیات حافظ رحمت خان کی قسم کی کوئی جامع کتاب اس ترقی یافتہ حکومت کے بارے میں بھی لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لہٰذا تقسیم کے بعد انھوں نے مناسب سمجھا کہ تاریخ فرخ آباد از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی سنہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء تا سنہ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کرا کر اکیڈمی کی جانب سے شائع کر دیا جائے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے حکیم شریف الزمان شریف اکبر آبادی سے ترجمہ کرایا۔ اور پروفیسر محمد ایوب قادری سے ایڈٹ کرا کر زیر نظر کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ ترجمہ نہایت رواں اور شگفتہ ہے۔ اور ایوب قادری صاحب نے اپنی عادت کے مطابق قیمتی حواشی اور حوالوں سے مزین کرکے کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کتاب میں گیارہ مقالے اور تین ضمیمے ہیں پہلے چھ مقالوں میں چھ حکمرانوں کے عہد حکومت کے تفصیلی حالات دیئے گئے ہیں۔ ساتویں مقالہ میں ملوک و امراء کا آٹھویں مقالہ میں مشائخ و فقراء کا۔ نویں مقالہ میں علماء و حکماء کا۔ دسویں مقالہ میں شعراء و خوشنویسوں کا اور گیارہویں مقالہ میں مؤلف کتاب مفتی ولی اللہ فرخ آبادی کا تذکرہ ہے۔ آخری مقالہ کا ترجمہ ایوب قادری صاحب نے کیا ہے ضمیموں میں حکمرانوں کے شجرے اور ان کے دور حکمرانی دیئے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں نوابان فرخ آباد کا دوسرے میں نوابان و شاہان اودھ کا اور تیسرے ضمیمہ میں شاہان مغلیہ کا شجرہ دیدیا گیا ہے جو حوالہ کے لئے نہایت مفید ہے اور حالات کو سمجھنے میں ان شجروں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ غرض کتاب بڑی جامع ہے۔ اور اس میں پرانے اور نئے طرز کا ایک اچھا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

نقد ادب

پرنسپلس آف لٹریری کریٹیزم مصنفہ پروفیسر لسیل ایبر کرومبی کا ترجمہ ہے۔ مترجم برصغیر کے مشہور ادیب، نقاد اور افسانہ نویس ن۔ل۔ احمد اکبر آبادی ہیں۔ جیسی ادبی کتاب ہے

دلیسا ہی ادبی رنگ لئے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کی ثقالت کا کسی جگہ بھی احساس نہیں ہوتا۔ اصطلاحوں کا ترجمہ کرکے ان کے آگے قوسین میں انگریزی کے اصل الفاظ بھی دیدیئے گئے ہیں تاکہ قارئین کو صحیح مفہوم سمجھنے میں مدد ملے۔ آخر میں فرہنگِ الفاظ پیش کردی گئی ہے۔ جس میں انگریزی اور اردو الفاظ ساتھ ساتھ دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے کل چار باب ہیں۔ پہلے باب میں صناعتِ ادب دوسرے میں شعریات ارسطو ([illegible]) تیسرے میں مابعد ارسطو اور چوتھے میں خاتمہ کلام کے عنوانات کے تحت ادب اور شاعری پر نہایت عمومی انداز سے بحث کی گئی ہے مصنف نے نقد و تبصرہ میں پوری آزادی اور بے باکی سے کام لیا ہے اور کہیں بھی جانبداری اور مرعوبیت سے اپنی رائے کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ارسطو کی کتاب بوطیقا یا شعریات جو مدت مدید سے تمام دنیا کے ادیبوں اور نقادوں کو مرعوب کرتی چلی آرہی ہے۔ مصنف اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

" شعریات" ایک تشنہ و بے ربط مقالہ ہے ناقص طور پر بستہ و مجمل اور موضوع کلام سے متجاوز بھی۔ اس کے اندر مرکزی تصور (ESSENTIAL CONCEPTION) کی تعریف و توضیح نہیں کی گئی ہے اور غیر متعلق باتیں زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ مرکزی خیال (جو باقی تمام بحثوں کا محور ہے) ایک اصطلاحی لفظ سے موسوم کیا گیا ہے اور وہ ایک استعارہ ہی نہیں بلکہ مبہم استعارہ ہے۔ حالانکہ اس کا حوالہ بار بار آتا ہے۔"

اس منفرد انداز نے کتاب ہذا کو خاصہ کی ایک چیز بنا دیا ہے۔ ترجمہ کے لیئے ادیب شہیر جناب مخمور اکبر آبادی کے تعارف نے ایک حسین پیکر پر زیور کا کام کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو تعارف خود ایک ادب پارے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ ذوقِ لطیف کے لیئے اچھا مواد فراہم کرتا ہے۔

تجزیہ کلام غالب

غالب اردو زبان کا وہ عظیم شاعر ہے جس کے کلام کے آئینہ میں بے شمار ادبا، شعرا اور تنقید نگاروں نے اپنے ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کے عکس اور نقوش دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر ایسے شخص نے جو کلام غالب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اپنے خیالات کے مطابق اس کے اشعار کے مطالب و معنی نکالے ہیں۔ اسی لئے کسی نے اس کے کلام کو الہامی قرار دیا اور کسی نے لچر اور پوچ بنایا۔ ان میں کس کا نقطۂ نظر صحیح ہے اور کس کا غلط یہ تو ایک جداگانہ بحث ہے البتہ اس سے کلام غالب کے بارے میں دو باتوں کا ثبوت مل جاتا ہے۔ ایک اس کی عوام و خاص میں مقبولیت اور دوسری اس کی ہمہ گیری اور جامعیت۔

غالب کا کلام نہائیت پہلو دار ہوتا ہے۔ اس نے مسائل حیات اور فطرتِ انسانی پر عجیب عجیب انداز سے غور کیا ہے اور نئے نئے اسلوب سے روشنی ڈالی۔ اسی لئے کلام غالب ہر شخص کے رجحان اور رنگِ طبیعت کے مطابق رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ اور کلام غالب میں خود غالب کے اس شعر کی تفسیر محسوس ہونے لگتی ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غرض غالب کے کلام کا مختلف طریقوں سے جائزہ لیا جا چکا تھا۔ اور اب کوئی صورت ایسی نظر نہیں آتی تھی جس سے اُس میں جدت پیدا کی جاسکے۔ اِلّا یہ کہ دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے الفاظ میں دُہرا دیا جائے۔ لیکن یکایک ایک نئی شعاع "تجزیۂ کلام غالب" کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اور اُس سے کلام غالب کے کچھ اور ہی نقوش دکھائی دینے لگے۔ تجزیۂ کلام غالب" سید رفیع الدین بلخی مرحوم کا غالب کی۔ اردو شاعری پر ایک تفصیلی مقالہ ہے۔ جس کو ان کی وفات کے بعد اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ نے زیور طبع سے آراستہ کرکے کتابی شکل میں شائع کیا ہے اس مقالے میں مصنف نے منطقی استدلال کی روشنی میں کلام غالب کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے غالب کی عظمت و مقبولیت کے اسباب بتائے۔ ہیں۔ اس کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُس کے نظریۂ حیات، فلسفیانہ مضامین، معاملات حسن و عشق، تنوع اور ہمہ گیری پر بحث کی ہے۔ اور کلام غالب سے مثالیں دے کر بتایا ہے کہ غالب کے کلام کی اسی رنگا رنگی نے اُس کو اتنا مقبول بنایا۔ اور اُس کو وہ عظمت عطا کی جس میں بہت کم شاعر اس کے سہیم و شریک نظر آتے ہیں۔

ثقافت و انتشار

میتھیو آرنلڈ کو لوگ انگریزی زبان کے ایک بے بدل نقاد کی حیثیت سے تو بخوبی جانتے پہچانتے ہیں لیکن اُس کی اس خوبی سے بہت کم حضرات کو واقفیت ہے کہ وہ ایک مذہبی آدمی بھی تھا۔ اور اُس نے اسی حیثیت سے معاشرہ کا جائزہ لیا ہے اور اسی معیار پر لوگوں کے اخلاق کو جانچا ہے

زیر نظر کتاب اُس کی معرکہ آرا تصنیف کلچر اینڈ انارکی کا ترجمہ ہے۔ جو جناب اخلاص حسین زبیری اور انعام عظیم برنی مرحوم کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔ اپنی کتاب کلچر اینڈ انارکی میں میتھیو آرنلڈ، لفظ کلچر کی جو توضیح و تشریح کرتا ہے وہ اس لفظ کے موجودہ مفہوم و تصور سے قطعاً مختلف ہے۔ آج کل کلچر کا ترجمہ ثقافت کرکے ہر اُس چیز کو جو کسی سوسائٹی میں رائج ہو گئی ہے۔ ثقافت یا کلچر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ مروجہ چیز سوسائٹی اور افراد کے لئے کتنی ہی ہلک اور ضرر رساں ہو۔ آرنلڈ کے نزدیک کلچر کا مقصد و منتہی تکمیل انسانیت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کلچر جمال و بصیرت (SWEETNESS AND LIGHT) کا دوسرا نام ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے علم و فن فلسفہ تاریخ اور مذہب سے امداد حاصل کی جاتی ہے۔ عظیم صاحبان کلچر وہ ہیں جن کے اندر بہترین علم اور اپنے زمانے کے بہترین خیالات کو سماج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلانے اور اُن کو غالب بنانے کا قوی جذبہ ہوتا ہے۔ جنھوں نے سخت محنت کرکے علم کو تمام ناگوار بھونڈی، ثقیل، پیچیدہ، پیشہ ورانہ، تنہائی پسندانہ چیزوں سے پاک کیا، اس میں دنیا کی فلاح کا عنصر داخل کیا۔ اس کو تعلیم یافتہ اور عالم لوگوں کی جماعت سے باہر بھی کار آمد بنایا۔" آرنلڈ کے نزدیک دنیا کی حکومت "عمل" اور "غور" کی دو طاقتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلی کو وہ "مسیائیت" کا نام دیتا ہے اور دوسری کو "یونانیت" سے تعبیر کرتا ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے انسانیت آگے بڑھتی ہے۔ غرض لفظ کلچر کی وضاحت اور اُس کے حدو

کے تعین پر آرنلڈ نے بڑی طویل بحث کی ہے۔ جس کی تلخیص
بھی چند سطروں میں کرنا ممکن نہیں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے
کہ بحث نہایت مربوط، مدلل اور سلجھی ہوئی ہے۔ اور کسی
جگہ بھی ابہام سے کام نہیں لیا گیا۔ بحث کے دوران ایک دلچسپ
بات یہ بھی بتائی ہے کہ

"اکثریت آبادی، بڑے پیمانے پر صنعت، کاری، عالمگیر
تجارت، جسمانی صحت و طاقت اور مذہبی تنظیمیں انسان کی
اصلی ترقی کے لئے محض ذرائع ہیں۔ ان کو مقصود بالذات
ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔

پھر وہ ان لوگوں کو مخاطب کرتا ہے جو مشینوں کو مقصود بالذات
سمجھتے ہیں اور آزادی کا غلط مفہوم سامنے رکھ کر اس کی
پرستش کرتے ہیں۔ کہتا ہے۔

"ہم مشینوں کے غلام بن گئے ہیں۔ ہم مشینوں کو
مقصود بالذات سمجھنے پر مائل ہیں اور اس سے
آگے اس مقصد پر نگاہ نہیں ڈالتے جس کے
لیئے وہ حقیقتاً کار آمد ہیں۔ اسی طرح
آزادی بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی پرستش
ہم کرنے لگے ہیں۔ مگر ان مقاصد پر پوری
طرح دھیان نہیں دیتے جن کے لیئے آزادی
مطلوب ہوتی ہے۔ ... ہمارے ذہنوں پر
یہ خیال غالب ہے کہ آدمی کے لیئے سب سے
مسرت انگیز اور اہم بات یہ ہے کہ اس کو
حسب مرضی کام کرنے کا موقع ملے۔ ہم اس
بات پر زیادہ زور نہیں دیتے کہ جب اس کو
حسب مرضی کام کرنے کی آزادی مل جاتے تو اس
کو کام کیا کرنے چاہیئں"

حسب خواہش یا حسب مرضی کام کرنے کی آزادی کو وہ انارکی
اور انتشار سے تعبیر کرتا ہے۔ اور چونکہ کلچر کے لئے معاشرہ کی
ضرورت ہے اور معاشرہ بھی ایسا ہونا چاہیئے جو انسانیت
کو پروان چڑھائے اس لئے حسب مرضی کام کرنے کی آزادی کلچر
کے منافی اور انسانیت کے حق میں سم قاتل ہوگی۔

کلچر اور انارکی کا مفہوم سمجھانے کے بعد آرنلڈ اس
بات پر زور دیتا ہے کہ جو حکومت کلچر کو ترقی دینے کی طرف
مائل ہو اس کو موثر اقتدار ملنا چاہیئے۔ کیونکہ طاقتور حکومت
کے بغیر معاشرہ ہرگز صحیح حالت میں برقرار نہیں رہ سکتا۔

"ثقافت و انتشار" غالباً اکیڈیمی کی سب سے پہلی
پیشکش ہے۔ گویا ایک ایسی عمدہ کتاب پیش کر کے شروع
ہی میں اکیڈیمی نے اپنے عزائم کا اظہار کر دیا تھا۔ حقیقت
یہ ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور عام معاشرہ کے لیئے ایک اچھا
تحفہ ہے۔ اگر ہماری تعلیمی اسکیم میں اس کتاب ہی کو
بنیاد بنا لیا جائے تو ملک سے تمام انتشار اور بے چینی ختم
ہو کر ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل ہو جائے لیکن ......

انگریزوں کی لسانی پالیسی

یہ ایک اچھوتا موضوع ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ
ساتھ بے انتہا اہم اور ضروری ہے۔ اس موضوع کی
اہمیت کو دیکھتے ہوئے سید مصطفیٰ علی بریلوی نے
بڑی تحقیق اور تلاش و جستجو کے بعد کافی مواد فراہم کر لیا
اور اس کو ترتیب دے کر ایک مفید اور معلومات افزا
کتاب تیار کر دی۔

برطانوی اقتدار سے پہلے پورے برصغیر میں دفتری کاموں کے لئے صرف ایک زبان رائج تھی۔ اور وہ زبان فارسی تھی۔ اس یکجہتی نے مذاہب کے اختلاف کے باوجود تمام فرقوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ ہندو مسلمان، سکھ، جین وغیرہ سب میں کامل اتحاد تھا۔ اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے نام سے لوگ ناآشنا تھے۔ یہ قومی اتحاد انگریزی سامراج کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہ تھا۔ انگریز کو اپنے نقطۂ نظر سے اس زہر کا تریاق زبانوں کے اختلاف میں نظر آیا۔ لہٰذا اُس نے اپنی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے پہلے علاقائی زبانوں کو فارسی کی جگہ رائج کیا اور جب مختلف علاقوں کے لوگوں کو یہ باور کرا دیا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ سب ان کے مفاد میں ہے تو اُس نے انگریزی زبان کی برتری اور جامعیت کا راگ الاپ کر قوم پر اس بدیسی زبان کو مسلط کر دیا جس کی وجہ سے کچھ ہی عرصے بعد اُس کے یہ تین نتائج حاصل ہو گئے۔ (۱) زبان کی وحدت کے ختم ہوتے ہی قومی وحدت بھی پارہ پارہ ہو گئی۔ (۲) اپنی زبانوں سے نفرت اور انگریزی سے رغبت بڑھنے لگی۔ اور نوبت یہ اینجا رسید کہ انگریزی زبان کے جاننے کو معیارِ قابلیت سمجھا جانے لگا۔ (۳) انگریز کی محبت دل میں جاگزیں ہونے لگی اور پوری قوم جذبۂ مرغوبیت میں مبتلا دکھائی دینے لگی۔ غرض اس ایک پالیسی کے جو تلخ ثمرات برآمد ہوئے وہ سب کے سامنے ہیں۔ سید مصطفےٰ ایدی علی بریلوی نے ان نتائج کو نہایت شدت سے محسوس کیا۔ اور دوسروں کو بھی اسی قدر احساس دلانے کے لئے انھوں نے حقائق کا کھوج لگایا۔ بڑی کوشش و کاوش سے ہر صوبہ اور ریاست کے تاریخی پس منظر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جس قدر اعداد و شمار ممکن تھے جمع کئے اور بڑی دلسوزی اور دردمندی سے یہ غم انگیز داستان مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کی۔ تاکہ آئندہ وہ اس غلطی کا اعادہ نہ کرے جو انگریز اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس سے ایک مرتبہ کرا چکا ہے۔

العلم غالب نمبر

غالب کی صد سالہ برسی پر برصغیر میں اس عظیم شاعر کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے اس موقع پر غالب کی شخصیت اور فکر و فن پر بڑی مقدار میں بیش بہا لٹریچر تخلیق ہوا۔ بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اکثر جرائد اور رسالوں نے اپنے خصوصی نمبر شائع کئے جن میں بڑی بڑی جدتیں کی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس انبار در انبار میں بعض چیزیں ایسی بھی تھیں جنھیں "زرِ کم عیار" سے تعبیر کرنا نامناسب نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کا مال نسبتاً کم تھا۔ کثرت ایسی چیزوں کی تھی جن کو اگر "متاعِ بے بہا" نہ بھی کہا جائے تو کم سے کم حقیر بھی نہیں گردانا جا سکتا۔ بہرحال اس موقع پر "غالبیات" میں جو اضافہ ہوا، اُتنا گذشتہ سو سال میں کبھی نہ ہوا تھا۔

"سہ ماہی العلم" نے بھی اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ۴۳۲ صفحات کا ایک ضخیم غالب نمبر نکال ڈالا۔ اتنا ضخیم نمبر اس رسالہ کا اس سے پہلے کبھی نہیں نکلا تھا۔ گویا یہ نمبر نکال کر مدیرِ "العلم" نے ایک ایسا ریکارڈ قائم کر دیا جس نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ لیکن خود اس کا ریکارڈ ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اس موقع پر جتنے

الوں نے اپنے غالب نمبر پیش کئے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان میں العلم کا یہ نمبر صفِ اوّل میں جگہ پانے کے قابل ہے نبر صرف اپنی ضخامت ہی کے اعتبار سے مرعوب کُن نہیں ہے بلکہ مضامین کے اعتبار سے بھی خاصہ کی چیز ہے۔ چنانچہ اس میں سر چوٹی کے لکھنے والے کی نگارشات شامل ہیں جنہوں نے بہت سوں نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر بالکل نئی چیزیں پیش کی ہیں۔ مثلاً حالات و سوانح کے تحت" غالب کے آبا و اجداد" کیا غالب دلی تھا؟" غالب کا کتب خانہ" شعر و شاعری کے ذیل میں محمود اکبر آبادی کا مضمون" غالب اور گوئٹے" علم و فن کے عنوان کے تحت مولانا سعید انصاری کا مضمون "مرزا غالب کا علم کلام" تلامذہ و احباب کے ذیل مضامین میں غالب کے معاصر، سندھ کے اردو شعراء" وہ چند مضمون ہیں۔ جو یا تو بالکل اچھوتے ہیں یا اُن میں جو مواد دیا گیا ہے وہ بڑا تحقیقی اور قطعاً نیا ہے۔ غرض العلم کا یہ خصوصی نمبر نکال کر مدیر محترم سید الطاف علی بریلوی اور پروفیسر ایوب قادری نے اس میدان میں بھی اپنے لیئے ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔

جان ڈوی کا فلسفہ تعلیم

جان ڈوی کا شمار دنیا کے عظیم مفکرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ سچ پوچھیئے تو آج کل دنیا اسی کے فلسفہ اور نظریات پر عمل کر رہی ہے اور موجودہ دور کے تعلیم کے کئی طریقے اسی کے نظریات سے ماخوذ ہیں۔ جیسے پروجیکٹ میتھڈ اور ڈالٹن پلان ان دونوں طریقوں میں ذاتی تجربات و مشاہدات اور عمل کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

ڈوی کی اسی حیثیت اور اہمیت کے پیش نظر الیسد ملک نے ڈاکٹر رودستھ اسپینس آرٹ کی کتاب جان ڈوییز فلاسفی آف ایجوکیشن کا اردو ترجمہ سید عین الدین علوی سے کرا کر شائع کیا ہے۔ یہ کتاب چھوٹی سی اور نہائت مختصر ہونے کے باوجود جان ڈوی کے افکار و نظریات کا پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور اگرچہ ایک فنی اور اصطلاحوں سے گرانبار تحریر ہے تاہم ترجمہ نہائت رواں دواں ہے اور اس میں کسی طرح کا کوئی الجھاؤ نہیں ہے

ڈوی نے اپنے افکار کی بنیاد دو باتوں پر رکھی ہے (۱) بچے کی مرکزی اہمیت (۲) عمل کے ذریعہ تعلیم۔ اسی کے ذیل میں یہ بحث بھی آجاتی ہے کہ بچہ کے لیئے نصاب پہلے سے مقرر کیا جائے یا اُس کی وقتی ضرورت کے مطابق بنایا جائے ڈوی کہتا ہے کہ" نصاب کوئی جامد یا بنی بنائی چیز نہیں ہو سکتی نصاب تو برابر بنتا ہی رہتا ہے۔ زندگی کی طرح اس میں بھی شکست و ریخت کا عمل برابر جاری رہتا ہے بچہ کسی بنے بنائے نصاب کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ نصاب بچے کا پابند ہے۔ وہ تو بچے کی وقتاً فوقتاً محسوس ہونے رہنے والی ضروریات کے مطابق ڈھلتا رہتا ہے۔ نصاب کا معیار یہی ہے کہ وہ بچے کی دلچسپیوں اور مشغلوں میں مدد دے۔"

علم کے بارے میں ڈوی کا نظریہ یہ ہے کہ" وہ عملی زندگی میں تغیر پیدا کرنے والی قوت ہے" اس نے تعلیم کی تعریف یہ کی ہے کہ" تعلیم وہ عمل ہے جو انسان کے تجربے میں ہر لحظہ کاٹ چھانٹ اور تبدیلیاں کرتا رہتا ہے پچھلے تجربات کی روشنی میں آنے والے اور آئے ہوئے تجربات کو مضبوط اور پختہ تر بنا تا چلا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمام گذشتہ تجربات کو بھی نئی روشنی عطا کرتا جاتا ہے۔" ڈوی نے اس عمل کو" تجربے کی مسلسل تجدید" کہا ہے۔

ڈوی تعلیم کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ نظامِ معاشرت سے مطابقت پیدا کرکے آئندہ صورتحال کا رُخ موڑ سکے"۔ اسی طرح وہ اخلاق میں بھی کسی بندھے ٹکے اصول کا قائل نہیں ہے بلکہ اس میں بھی حالات اور ماحول کے مطابق تبدیلی ضروری سمجھتا ہے۔

ان تمام باتوں کو سمجھانے میں ڈوی نے جو طرزِ استدلال اختیار کیا ہے اُس سے متاثر ہوکر دنیا اسپر گامزن ہوگئی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اِس میں بہت سے ایسے جھول موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے آج دنیا کی حالت زبوں و زار ہے سچ پوچھیے تو بعض جگہ ڈوی نے منطقی مغالطوں سے کام لیا ہے اس نے بچہ کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیدیا ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ انارکی کی شکل میں بھی برآمد ہوسکتا ہے۔ اچھے معاشرے کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ بعض عالمگیر اور ازلی صداقتوں کو ہمیشہ تعلیم کی بنیاد بنایا جائے اور بچے کو ان کا تابع بنانے کی کوشش کی جائے انسانیت اسی طرح پروان چڑھے گی ورنہ تعلیم کے وہ نتائج برآمد ہوں گے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈوی کا نظریہ بڑی حد تک میتھو آرنلڈ کے نظریہ سے متصادم ہے اس میں میتھو آرنلڈ حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔ ڈوی خود بھی منطقی مغالطوں کا شکار ہے اور دوسروں کو بھی ان مغالطوں میں پھنسانا چاہتا ہے۔ تاہم اس کے نظریات کو جاننے کے لئے ایسی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے اور اسی غرض سے اکیڈمی نے اُن کو اردو میں منتقل کرایا ہے۔

حکیم عمر خیام

عمر خیام کو لوگ ایک رُباعی نگار کی حیثیت سے بہت عرصے سے جانتے ہیں، لیکن اب کچھ دنوں سے اُس کی شہرت ایک عظیم ریاضی داں اور ماہرِ ہیئت کی حیثیت سے بھی خاصی ہوگئی ہے۔ اُس کا تعلق سلجوقی خاندان کے عظیم ترین فرمانروا جلال الدین ملک شاہ کے دربار سے تھا۔ خیام کو اُس زمانہ میں شاہی ہیئت دان ہونے کا فخر حاصل تھا۔ اس اعلیٰ منصب پر فائز رہ کر اس نے وہ اہم کارنامہ انجام دیا جو اُس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ یہ کارنامہ تقویم جلالی کی ترتیب کا تھا۔ اب سے تقریباً ۹۰۰ سال پہلے اُس نے شمسی سال کی مدّت معلوم کی جو اس زمانہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ صحیح تھی اور آجکل جس مدّت پر تمام دنیا کا اتفاق ہے اُس سے صرف ۱۱ر۳۰ سیکنڈ زیادہ تھی۔ اپنی اس دریافت کو بنیاد بنا کر اُس نے ایک کیلنڈر مرتب کیا جو صحت کے لحاظ سے موجودہ زمانے کے کیلنڈروں میں سب سے زیادہ بڑھا چڑھا تھا۔ اس کیلنڈر کو اُس نے حکمران کے لقب اور نام سے نسبت دے کر تقویم جلالی یا تقویم ملکی کے نام سے موسوم کیا۔ اس سے پہلے اس نے الجبرا پر ایک کتاب لکھی جس میں اپنی بعض نئی دریافتیں شامل کیں، ان میں اہم ترین مسئلہ ثنائی کی دریافت ہے جس کا سہرا بہت عرصہ سے آئزک نیوٹن کے سر باندھا جارہا ہے۔ غرض عمر خیام کے یہ وہ کارنامے تھے جن کو وہ خود بھی اپنی شاعری کے مقابلہ میں کافی اہمیت دیتا تھا اور دوسرے بھی اُس کی عظمت کا اعتراف انہیں کی بنیاد پر کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی قوت کو زوال ہوا تو خود مسلمان اُس کے حالات اور ان عظیم کارناموں کو بھی بھول گئے۔ یہاں تک کہ ایک انگریزی شاعر فٹز جیرالڈ نے اُس کی رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں کرکے دوبارہ اس کے نام کو

بند کیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے جانا
نہ جانا گیا اور اس کی ہیئت اور ریاضی کی معلومات پر
پھر بھی پردہ پڑا رہا۔ ماضی قریب میں لوگوں کو اس کی
ان حیثیت سے بھی کچھ واقفیت ہو گئی ہے۔ تقریباً نصف
صدی پہلے اُس کے حالات اور کارناموں سے متعلق اردو زبان
میں بہت کم مواد تھا۔ اس کم مائیگی کو دیکھ کر خان بہادر
شمس العلماء ڈاکٹر محمد ہدایت حسین نے اپنے ہونہار شاگرد
جناب سلیم اللہ فہمی کو سر ڈینسن راس کی انگریزی کتاب
کو جو عمر خیام سے متعلق تھی اردو زبان میں منتقل کرنے کی
ہدایت کی۔ لائق شاگرد نے اپنے اُستاذ محترم کا اشارہ
پا کر کتاب کا اردو میں ترجمہ کر ڈالا اور اُس کو کلکتہ سے
نکلنے والے ایک رسالہ آفتاب کے شماروں میں شائع کر دیا
اس کی پہلی اشاعت نومبر ۱۹۲۶ء سے جون ۱۹۲۷ء تک
ہوئی۔ اس کے بعد اگرچہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی ضخیم
تصنیف "خیام" اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت سے
منظرِ عام پر آئی۔ پھر بھی سلیم اللہ فہمی صاحب کے اس ترجمہ
کی اہمیت قائم رہی۔ اوّل تو یہ کتاب خیام سے مقدم ہے۔ دوم
مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع ہے سوم ترجمہ نہ صرف سلیس اور
رواں ہے بلکہ اس میں ادبیت کی پوری شان موجود ہے۔ انہیں
خوبیوں کو دیکھ کر محترم سید الطاف علی بریلوی نے ۱۹۶۱ء
میں اس کو اکیڈمی کی جانب سے شائع کرا کر اپنی مطبوعات
اور اُردو ادب میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا۔

'حکیم عمر خیام' میں نہ صرف اس عظیم مفکر اور سائنس داں
کے حالاتِ زندگی اختصار سے بیان کیے گئے ہیں بلکہ اس
دور کے سیاسی حالات اور سلجوقی خاندان کے کارنامے بھی خاصے
فصاحت سے لکھے گئے ہیں۔ پھر الپ ارسلان۔ ملک شاہ
سلجوق۔ نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح نیز فتنۂ
ملاحدہ و باطنیہ کی تاریخ دُہرائی گئی ہے اور اس ماحول میں رہ
کر عمر خیام نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اُن کی تفصیل دے کر
اُس کی رُباعیات پر کس قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلہ
میں نظام الملک عمر خیام اور حسن بن صباح کی ہم مکتبی کی داستان
جو بہت شہرت پا چکی ہے اُس پر بحث کر کے اُس کو تشکیک کی
منزل تک پہنچا دیا ہے۔ بعد کو سید سلیمان ندوی نے نہایت
وثوق اور ایقان کے ساتھ اس واقعہ کی تغلیط و تردید
کر دی۔

جناب سلیم اللہ فہمی کا زمانۂ طالب علمی کا یہ کارنامہ
لائق ستائش ہے۔ یہ کتاب نہایت معلومات افزا ہونے
کے ساتھ ساتھ ایک ادب کے پارے کی حیثیت رکھتی ہے
اور یہ جاننے کے باوجود کہ اُس کو انگریزی سے اُردو میں
منتقل کیا گیا ہے دل اس بات کو ماننے کے لیئے کسی طرح آمادہ
نہیں ہوتا کہ اس کو ایک ادبی تصنیف نہیں بلکہ صرف ترجمہ
سمجھا جائے۔

رومن رسم الخط اور پاکستان

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس ملک میں وقتاً فوقتاً جو فتنے کھڑے کیے گئے
اُن میں سے ایک فتنہ بلکہ نہایت عظیم فتنہ یہاں کی قومی
زبان کے لیئے رومن رسم الخط کے اختیار کرنے کا مسئلہ تھا
اس ناپاک سازش کا آغاز نہایت معصومیت سے کیا گیا
تھا اور اپنی جمہوریت پسندی کا سکہ جمانے کے لیئے اس
خالص علمی مسئلے کو عوام کے ووٹوں سے حاصل کرنے کی کوشش

کی گئی تھی۔ لیکن قوم و ملک کی خوش قسمتی تھی کہ عوام الناس تک بھی اس جال میں نہ پھنس سکے جو ان کے لئے نہایت چالاکی سے پھیلایا گیا تھا۔ جب اس طرف سے بھی مایوسی ہو گئی تو ملک و قوم کے ان ہمدردوں نے اس تحریک کو زبانِ حال سے یہ مصرع پڑھ کر ختم کر دیا ہے

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس مسئلہ کے علمی پہلو تو بہت سے ہیں، لیکن ان کو بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ صرف چند موٹی موٹی باتیں بتا دینا کافی ہے۔ اول یہ کہ ترکی کو رومن رسم الخط تحریر کرنے سے کیا فوائد حاصل ہوئے۔ جن کے حصول کی توقع ان ہمدردانِ قوم کو پاکستان کے لئے تھی۔ کیا رومن رسم الخط اختیار کرنے سے اردو داں طبقہ کے لئے انگریزی فرانسیسی، لاطینی وغیرہ سیکھنا ممکن ہو جاتا ہے یا ان زبانوں کے جاننے والے صرف رسم الخط کی وجہ سے اردو کو سمجھ سکیں گے۔ تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ فرانسیسی اور انگریزی کا ایک رسم الخط ہونے کے باوجود انگریزی اس وقت تک فرانسیسی زبان کو نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ وہ اس کو باقاعدہ طور پر سیکھیں نہیں اور فرانسیسی لوگ انگریزی زبان کو اس وقت تک بول اور لکھ نہیں سکتے جب تک کہ کسی انگریزی داں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہ کریں۔ پھر اگر رسم الخط کے بدلنے سے اردو زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو دیوناگری رسم الخط کو کیوں گوارا نہ کیا گیا؟ اور کس لئے اسی کی بنیاد پر دو قومی نظریہ وجود میں آیا۔

بہر حال یہ ملک و قوم کے لئے ایک بنیادی مسئلہ تھا۔ اس لئے پوری قوم نے بھی رومن رسم الخط کی مخالفت کی اور بعض پڑھے لکھے لوگوں نے اس کے خلاف مضمون اور مقالے لکھے۔ اکیڈیمی نے موضوع کی اہمیت کو محسوس کرکے مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی سے یہ کتابچہ تیار کرا کر شائع کیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے لیکن مصنف نے اپنی قابلیت سے اس میں موضوع زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں کو سمو دیا ہے۔ پہلے انہوں نے برصغیر میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آمد اور رومن رسم الخط کے استعمال کیئے جانے کی تاریخ مختصر لفظوں میں بیان کر دی۔ پھر چند تنقیحات قائم کیں۔ جن پر علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت بحث کی۔ اور یہ سب کچھ جذباتیت سے بلند ہو کر خالص علمی انداز میں کیا گیا ہے۔ آخر میں تمام بحث کا خلاصہ نمبر وار لکھ دیا گیا ہے اس خلاصہ سے پوری بحث آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور رومن رسم الخط کی قباحتیں پوری طرح عیاں ہو جاتی ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ :-

(۱) رومن حروف میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اردو زبان کی آوازیں ان سے ادا ہو سکیں۔

(۲) رومن حروف ناقص، غیر سائنٹفک اور غلط قسم کی لکیروں کے مرکبات ہیں، ان کے ذریعہ بالغوں اور نابالغوں دونوں کو تعلیم دینا مشکل ہے۔

(۳) رومن حروف ہماری روزمرہ کی تحریری ضروریات کے لئے کارآمد نہیں ہیں۔ یہ مشتبہ تحریریں پیدا کرتے ہیں؛

(۴) رومن حروف سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ لاگت بہت زیادہ آتی ہے۔ لکھنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔

(۵) رومن حروف پاکستانیوں کے مابین قومی اتحاد پیدا کر

میں کسی طرح ممد و معاون نہیں ثابت ہو سکے۔ بین الاقوامی تعلقات میں بھی مفید نہیں۔

(۶) رومن حروف کو رواج دینے سے ہم اب تک کے وسیع، علمی و ادبی سرمایہ سے عموماً اور قرآن و دینیات سے خصوصاً بالکل محروم ہو جائیں گے۔

یہ تمام قباحتیں بتا کر مصنف خود کوئی فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ ناظرین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ خود غور کر کے یا ایسے لوگوں سے پوچھ کر اس بات کی وجہ معلوم کر لیں کہ بعض لوگ کیوں رومن حروف کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔

مشرق و مغربی تہذیب

یہ ایک نہایت پرانا موضوع ہے جس پر صدیوں سے لوگ اظہار خیال کرتے چلے آئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مشرق کو تہذیب و شائستگی کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور اس سے اکتساب فیض کرنے کو مغرب کے لوگ اپنی سعادت سمجھتے تھے چنانچہ علامہ ابن جبیر اندلسی ایک مغربی ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرق کو مغرب پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے اپنے کئی قطعات میں اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ مغرب کسی طرح بھی مشرق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس نکتے کو ذہن نشین کرانے کے لئے انہوں نے کہیں منطقی استدلال سے کام لیا ہے اور کہیں شاعرانہ استدلال سے۔ لیکن ہر موقع پر ان کا خلوص ظاہر و آشکارا ہے۔

یہ حالت صدیوں تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ گردش لیل و نہار نے حالات کو بالکل الٹ دیا۔ اب ہر معاملہ میں مغرب کی برتری کے راگ الاپے جاتے ہیں اور مغرب کی نامعقول سے نامعقول بات کو بھی مستحسن قرار دے کر اس کا اختیار کرنا اپنے لئے موجب سعادت سمجھا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر احسان محمد خان صاحب نے اسی موضوع پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ انھوں نے ہندوستان چین، جاپان، اسلامی اور مغربی تہذیبوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے محاسن اور نقائص پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ آخر میں نہایت قطعیت سے اور بڑے غیر جانبدارانہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ہماری رائے یہ ہے کہ ایک تہذیب کا دوسری تہذیب پر عمل اور رد عمل ہوتا ہے۔ کسی دوسرے ملک کی تہذیب کی تقلید کسی حالت میں مناسب نہیں ہے۔ ملکی حالات، قومی حسیات، جذبات اور اخلاقی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر ہی دوسری تہذیب کے تصورات اور تخیلات کا جذب و تجازب مناسب ہے۔ اس لئے مشرقی اور اسلامی ممالک کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ وہ مغرب سے نیچرل سائنس اور ٹیکنیکل علوم کا درس لیں۔ لیکن اس کی محنت اور سرمایہ کی تنظیم کی تقلید نہ کریں۔۔۔۔۔ اسی طرح مغرب کو مشرق سے بالعموم اور اسلام سے بالخصوص اس کی معاشرت اور اخلاق سے اپنے ملکی حالات اور قومی خصوصیات و روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے استفادہ کرنا مناسب ہوگا۔"

سرسید کا علمی کارنامہ

سرسید کے حالات اور کارناموں کے متعلق مولانا الطاف حسین حالی کی معرکہ آرا تصنیف "حیات جاوید" حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں سرسید کی زندگی کے ہر پہلو کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے لیکن فاضل یگانہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم

نہ ان تمام باتوں کا نہایت فراخدلی سے اعتراف کر کے صرف سرسید کے علمی کارنامہ پر ایک کتابچہ لکھنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ زیر نظر تالیف اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ قاضی صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔

" لیکن اس ضخیم کتاب (حیات جاوید) میں سرسید کی علمی خدمات کا جو ذکر آیا ہے اس میں کہیں اجمال ہے۔ اور کہیں تفصیل کہیں اختصار ہے اور کہیں طوالت، پھر ان میں سوانح نگار کے اپنے ذاتی خیالات، معتقدات اور تاثرات کو بھی بڑی حد تک دخل ہے، نیز ان کی علمی تصانیف کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اُن کی مذہبی حیثیت کو زیادہ نمایاں کر کے ان پر اعتراضات وارد کئے ہیں اور پھر ان کو اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے۔"

" ان حالات میں اگر سرسید کی مختلف حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے کچھ لکھا جائے اور گذشتہ نصف صدی کے اندر اس سلسلہ میں جو نئی معلومات فراہم ہوئی ہیں، یا موجودہ زمانے میں جو تحریرات شائع ہو چکی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھا کر اس عظیم الشان مصلح قوم کی خدمات اور کارناموں پر مقالات لکھے جائیں اور کتابیں تصنیف کی جائیں تو وہ اس محسن اعظم کی یادگار ہونے کے علاوہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بے حد سبق آموز ہوں گے۔"

قاضی صاحب مرحوم نے اپنی اس تحریر کو تجویز کی حد تک ہی نہیں رکھا بلکہ سرسید کی زندگی کے ایک اہم پہلو یعنی علمی کارنامہ پر یہ مقالہ لکھ کر اپنی تجویز کو عملی جامہ بھی پہنایا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے سرسید کے مذہبی خیالات۔ اُن کے عہد کی ایک جھلک، ابتدائی ماحول اور حصول علم کی جد و جہد، زندگی کے آخری لمحہ تک مطالعہ کے جاری رہنے۔ سرسید کے علماء و فضلا کی صحبت سے فیضیاب ہونے، شعر و ادب کے ذوق پر الگ الگ عنوانات کے تحت کسی قدر تفصیل سے لکھنے کے بعد اُن کے تصنیفی کارناموں سے بحث کی ہے اور تصنیف کے ساٹھ سالہ دور کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۶ء، دوسرا دور ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۸ء اور تیسرا دور ۱۸۵۸ء تا ۱۸۹۷ء پھر الگ الگ ان تینوں ادوار کے کارناموں کو بتا کر اُن کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ سرسید کی کل ۴۲ تصانیف بتا کر کتاب کے آخر میں اُن کی مکمل فہرست دیدی ہے۔ لیکن تیسرے دور کے کارناموں پر مجموعی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد تینوں ادوار کی بیس بائیس اہم کتابوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اس کے بعد سرسید کے کتب خانے کا کچھ حال بتایا ہے اور لکھا ہے کہ " سید صاحب کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا جو مختلف علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابوں کا ایک بڑا مخزن تھا۔" آخر میں سرسید پر علماء کے اعتراضات بتا کر اس مقالہ کو ختم کر دیا ہے"

غرض یہ کتابچہ مختصر ہونے کے باوجود "سرسید کے علمی کارنامہ" کے موضوع پر بہت جامع ہے۔

تعلیم بالغان اور اُس کی قومی اہمیت

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب بالغ افراد کی تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور پاکستان میں اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے سے متعلق ہے۔ مصنف کتاب جناب مولوی منظہر الرحمٰن بھرایونی نے تعلیم بالغان کو بچوں کی تعلیم سے بھی زیادہ اہم اور ضروری بتایا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ " چونکہ ملک کی آبادی کے تناسب سے

بچوں کی تعداد بہت تھوڑی اور بالغوں کی بہت زیادہ تعداد ان پڑھ اور جاہل ہے اس لئے تعلیم بالغان کی تحریک و تکمیل کے بغیر محض بچوں کی تعلیم و تربیت سے ناخواندگی اور جہالت کو ملک بدر کرنے کا اہم کام انجام نہیں پا سکتا۔ اپنے ملک کی ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے بعد ہی ہم کو ہمارے ماحول کی عام بے اطمینانی اور خلفشار سے نجات مل سکتی ہے۔ اور نئی بستیاں آباد کر کے ملک کو جنت بنایا جا سکتا ہے۔"

مصنّف کے الفاظ میں کتاب ہذا کے لکھنے کا مقصد اردو داں طبقے اور تعلیمی خدمات انجام دینے والے کارکنوں کو یہ بتانا ہے کہ

(۱) تعلیم بالغان کس اعتبار سے اور کن وجوہ سے ہمارے لئے ازبس ضروری و مفید ہے۔

(۲) ملک و قوم کی رفتار ترقی میں ہماری عام ناخواندگی اور جہالت مانع و حارج ہے۔

(۳) اپنے ملک و قوم کی ناخواندگی اور جہالت سے نجات حاصل کرنے کے لئے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں۔

(۴) بعض رکاوٹوں کے باوجود اپنے ملک میں ناخواندگی اور جہالت کے خاتمہ کے لئے کام شروع کریں تو کن مسائل و ذرائع پر توجہ دینا ضروری ہوگا۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے مصنّف موصوف نے پاکستان اور خواندگی، مسلمانوں کے قدیم نظامِ تعلیم اور اُن کی مذہبی و اخلاقی تعلیم، عالمگیر ناخواندگی، تعلیم بالغان، خواندگی اور قومی دولت، اُستادوں کی ترتیب اور نوسیکھ بالغوں کے ادب پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ پاکستان میں خواندگی کا معیار قطعاً غیر اطمینان بخش ہے۔ اور یہ حالت پچھلے ڈیڑھ سو سالہ دورِ غلامی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جب تک انگریزی حکومت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک مسلمانوں کا نظامِ تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ تعلیم کا انتظام عوام خود کرتے تھے اور اُس کو زندگی کا ایک ضروری جزو سمجھتے تھے۔ تعلیم اور مذہب و اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور تعلیم کا مقصد اعلیٰ کردار پیدا کرنا اور انسانیت کی تکمیل کرنا سمجھا جاتا تھا۔ انگریز نے اس نظام کو یکسر بدل دیا اور ایک ایسا نظام رائج کیا جس سے دفتروں میں کام کرنے کے لئے کچھ کلرک تیار ہو جائیں۔ اس میں اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے بھی تعلیم کو حصول معاش کا ایک ذریعہ سمجھ لیا۔ اور اس کو لازمۂ حیات سمجھنا چھوڑ دیا۔ جب تعلیم کا مقصد وحید ہی یہ رہ گیا کہ اس کے ذریعہ معاش پیدا کی جائے تو پھر اگر تعلیم کے بغیر معاش ملتی نظر آئے تو تعلیم کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا ایک شخص جو بغیر تعلیم کے معاش زیادہ بہتر طریقے پر حاصل کر سکے اُس کا جاہل رہنا کوئی عیب نہ رہا۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی طرف سے توجہ ہٹا کر پوری قوم نے حصول معاش کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور اس طرح ناخواندگی عام ہو گئی۔ اب حالت یہ ہے کہ پاکستان کا شمار ان ملکوں میں ہے۔ جن میں ناخواندگی کا فیصد سب سے زیادہ ہے۔ اس ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر ضروری ہے کہ یہاں خواندگی کا اوسط بڑھانے کے لئے تعلیم بالغان پر کافی زور دیا جائے اور بالغوں کو مذہبی معلومات اور زندگی کے عملی مسائل سے زیادہ سے زیادہ باخبر کیا جائے۔ ان کے لئے کتابیں خاص طور پر تیار کی جائیں۔ زبان نہایت آسان

اور عام فہم استعمال کی جائے اور چارٹوں، تصویروں اور نقشوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ اس کے لئے مصنف موصوف نے مختلف طریقے بتائے ہیں۔ جن پر عمل کیا جائے تو ملک و قوم سے ناخواندگی اور جہالت کا وبال بہت جلد دور ہو جائے۔

مکاشفات کشفی

یہ کتاب، خان بہادر میجر مرزا ابو جعفر کشفی ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز پریسیڈنسی ڈویژن کلکتہ کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل ۳۱۲ رباعیاں شامل ہیں ان رباعیات کی قدر و قیمت کا اندازہ تو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بتا دینا نامناسب نہیں کہ یہ صنف شاعری جس قدر آسان معلوم ہوتی ہے حقیقتاً اتنی ہی دشوار ہے۔ رباعی بظاہر چار مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جس میں تین ہم قافیہ لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کی پابندیوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ چار مصرع موزوں کرنا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں بحر کی پابندی۔ مضمون کا تسلسل و ربط۔ چار مصرعوں میں ایک طویل موضوع کو سمو دینا۔ آخری مصرع کا ایسا جاندار ہونا کہ پوری رباعی کی روح کھینچ کر اس ایک مصرع میں سما جائے یہ وہ دقتیں ہیں جن سے بڑے بڑے شاعر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کا میدان کافی وسیع ہونے کے باوجود اس میں اچھی رباعیاں خال خال دکھائی دیتی ہیں اور ایسے شاعر تو صرف چند ہیں جنہوں نے اس صنف میں کوئی اختصاص پیدا کیا ہو۔ کشفی صاحب اُن ہی چند افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس میدان کو نہایت کامیابی سے طے کیا ہے اور جن کی رباعیاں اردو زبان کا بہترین سرمایہ ہیں۔ سرورق پر یہ رباعی دی گئی ہے اور اس کو نہایت موزوں نقوش سے واضح کیا گیا ہے۔

خلقت ہے ہر اک شے کی علی وجہ کمال
ہے نقش ہمارا کہ سمجھنا ہے محال!
اک شمع کے گرد پھر رہی ہے مخلوق
سارا عالم ہے ایک فانوس خیال

اس ایک رباعی سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس گنج گرانمایہ میں کتنا قیمتی مال بھرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشفی صاحب کو اس صنف سے فطری لگاؤ ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "میری اس طبعی مناسبت کو دیکھ کر ہی حکیم سید ابو العلا سعید احمد ناطق لکھنوی نے مجھے غزل گوئی سے رباعی گوئی کی طرف متوجہ کرایا۔" اُن کی اپنی فطری مناسبت اور کئی اہل کمال کی توجہ نے کشفی کو رباعی کے میدان کا شہسوار بنا کر پیش کیا۔ حکیم صاحب سے زیادہ فیض کشفی صاحب نے رضا علی وحشت سے اٹھایا جن کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کا انھیں شرف حاصل ہے یہ کتاب صرف کشفی کی رباعیات ہی کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس پر انہوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ خود ایک ادب پارہ اور خاصہ کی چیز بن گیا ہے۔ اس مقدمہ میں انہوں نے شاعری، غزل اور رباعی پر نہایت سیر حاصل بحث کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن کی باریکیوں کو کبھی خوب سمجھتے تھے۔

ان کہی کہانیاں

سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کو خاکہ نگاری میں بڑا کمال حاصل ہے "ان کہی کہانیاں" بھی اُن کے تیار کئے ہوئے چند خاکوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے مقدمہ نگار ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم

خاکہ اور کہانی کا بنیادی فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"خاکہ سیرت نگاری کی شاخ ہے اس میں شخصیت
کی عام فطری خصوصیات چمکا کر اس کا ایک
بے رنگ مرقع پیش کیا جاتا ہے۔ خاکے میں
عام فطری خصوصیات کا وہی مقام ہے جو
تصویر میں خطوط و نقوش کا ہے۔ خاکہ نگاری
شخصیت نگاری ہے۔ کہانی اس کے مقابلے میں
واقعہ نگاری ہے۔ خاکہ نگاری تصویر کشی ہے
کہانی اثر آفرینی ہے۔ خاکہ نگاری دریافت ہے
کہانی تخلیق ہے۔ خاکہ نگاری کا موضوع شخصیت
ہے۔ کہانی کا موضوع عام واقعات حیات ہیں"۔

خاکہ اور کہانی کا فرق بتا کر ڈاکٹر سبزواری مرحوم ایک اور صنف ادب کی نشان دہی کرتے ہیں جو ان دونوں کے بین بین ہے۔ اور وہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کے ان ادب پاروں کو اسی صف میں شامل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"چونکہ خاکہ اور افسانہ کی درمیانی صنف میں
دونوں کی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے
اس لئے میں ان خاکوں کو بھی اس نئی بین بین
صنف ادب میں جگہ دوں گا جن کے مطالعے
کے بعد شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آتی"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں

"محترمہ انیس فاطمہ کے خاکے سوانحی سے زیادہ تاثراتی ہیں یہ خاکے بھی ہیں، موثر واقعات بھی، نقوش بھی ہیں اور تاثرات بھی..... محترمہ انیس فاطمہ کو خدا نے ایک حساس دل دیا ہے انہوں نے گرد و پیش کی ستم زدہ شخصیتوں سے گہرا اثر لیا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ رات کی خاموشی میں لوگوں کی دلدوز چیخیں سنی ہیں........ فطری طور پر زندگی کے دلدوز مناظر سے انہوں نے جو اثر لیا ہے وہ چاہتی ہیں کہ دوسرے بھی اس سے وہی اثر لیں۔ خون کے آنسو بہا کر وہ دوسروں کو رلانا چاہتی ہیں"۔

انتساب اور مقدمہ کے علاوہ "ان کہی کہانیوں" کے مشمولات کی تعداد صرف چار ہے (۱) صغریٰ باجی (۲) دیوانہ گر نہیں ہے (۳) چار نسلیں (۴) ان کہی کہانیاں (۵) یہ فہرست جس قدر مختصر ہے اتنی ہی زیادہ اس میں درد و الم کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ یہ اصل میں دکھی انسانوں کی وہ درد بھری کہانیاں ہیں جو اس کرۂ خاکی کی سطح پر ہر آن دہرائی جا رہی ہیں ان دکھی انسانوں کا یہ دکھ درد ان کے ہم جنسوں کا دیا ہوا ہے ان بہائم اور درندہ صفت لوگوں کی ان اذیت رسانیوں اور انسانیت سوز حرکتوں کو دیکھ کر ہی خاکہ نگار کو کہنا پڑا۔

"واقعات اور تجربات کی روشنی میں یہ ثابت
ہو گیا ہے کہ آدمی جبلی طور پر ایک درندہ ہے
بہت چالاک اور خونناک۔ ظالموں اور
قاہروں سے ہمیشہ کترا کترا کر بچ کر نکلے گا
لیکن کمزور اور مظلوم سدا اس کی زد پر
رہتے ہیں۔ تاریخ کا وہ کون سا صفحہ ہے
جو اس حیوان ناطق کی خون آشامیوں سے
خالی ہو"

غرض ان خاکوں میں روزمرہ کی زندگی کے معمولی واقعات کو نہایت ہلکی پھلکی اور سیدھی سادی زبان میں بیان کرکے ایسے ہی نتائج اخذ کئے گئے ہیں جن سے ذہن، انسانی فطرت کی

گہرائیوں تک پہنچ کر اثر و تاثیر کے بحر بیکراں میں غوطے لگانے لگتا ہے

انشائیے

آجکل زبانوں کے امتحانی پرچوں میں کسی دیئے ہوئے عنوان پر مضمون یا ESSAY لکھنے کو کہا جاتا ہے۔ طلبہ جو جو گل افشانیاں کرتے ہیں ان سب کو اکٹھا کر کے اگر ترتیب دیا جائے تو ایک اچھا خاصا مزاحیہ مضمون تیار ہو جائے ان بے ہنگم تحریروں کی وجہ سے بعض لوگ مضمون یا ESSAY کو کوئی قابل توجہ یا وقیع چیز نہیں سمجھتے۔ حالانکہ فی زمانہ ہر ترقی یافتہ زبان کی یہ ایک اہم صنف بن گئی ہے ESSAY فرانسیسی زبان کے لفظ ESSAI سے ماخوذ ہے جس کے معنی آزمائش ہیں۔ اور اردو میں اس کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ جس طرح لفظ ESSAY فرانسیسی الاصل ہے اسی طرح اس کی ابتداء بھی غالباً فرانس ہی میں ہوئی۔ جیسا کہ محترم الطاف علی صاحب نے کتاب زیر نظر کے تعارف میں لکھا ہے یہ صنفِ ادب سب سے پہلے فرانس کے مشہور اہلِ قلم مان ٹین نے "تخلیق کی۔ اُنہی سے اس کو انگریز مصنفین نے لے کر اپنے یہاں رواج دیا اور انگلستان میں کئی اعلیٰ پایہ کے انشائیہ نگار پیدا ہوئے۔ ان میں زیادہ شہرت ایڈیسن اور اسٹیل نے پائی۔ انگریزی کے اثر سے یہ صنفِ اردو میں رائج ہوئی۔ سب سے پہلے سر سید نے اس پر طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کا انداز کسی قدر روکھا پھیکا تھا۔ محمد حسین آزاد نے اس میں رنگینی اور ادبیت کا عنصر شامل کر کے اُس کو خاصا مقبول بنا دیا۔ چنانچہ اُن کے بعد کئی اچھے اچھے انشائیہ نگار پیدا ہوئے۔ ان میں حسن نظامی، سجاد علی انصاری، مہدی حسن افادی، سجاد حیدر یلدرم۔ رشید احمد صدیقی وغیرہ خاصے مقبول ہیں اسی جماعت میں مفضل احمد صدیقی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ کتاب ہذا (انشائیے) ان ہی کے ذوقِ انشائیہ نگاری کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے عجیب عجیب عنوانات لیکر ان پر مشق سخن یا مشق ستم کی ہے۔ اُن کی نظر موضوع کے معمولی جزئیات تک گئی ہے۔ اور اُن سے انہوں نے عجیب نکات پیدا کیے ہیں کہ صاحب ذوق اُن کو پڑھ کر عش عش کرتا اور محظوظ ہوتا ہے اور بدذوق ہکا بکا رہ جاتا اور بغلیں جھانکنے لگتا ہے فضلی صاحب کے انشائیوں کی مجموعی تعداد ۱۵ ہے جنہیں سے چار ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہو چکے ہیں۔ باقی دوسرے موقعوں کے لئے لکھے گئے تھے۔ یوں تو سب ہی انشائیے لکھنے والے کی ذہانت اور اُن کے حسن و مذاق کے آئینہ دار ہیں۔ جا بجا پُر لطف جملے، ڈھلے ہوئے فقرے ضرب الامثال کا برمحل استعمال۔ مختلف لوگوں کے مقولوں اور شعراء کے مصرعوں اور شعروں کا مناسب و موزوں اندراج۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہوں نے ہر انشائیے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ لیکن بعض انشائیے نہایت نرالی شان کے ہیں۔ جیسے یہ بمبئی ہے۔ چھیڑ غالب سے چلی جائے۔ مسروقہ ڈائری کے اوراق، چند لمحے ایرانی ہوٹل میں اور "تعلیم زادہ" یعنی کلرک، آخری دو انشائیوں کے تھوڑے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اب نانِ جویں کا سوال درپیش تھا اور آٹش جو تک کی راشن بندی، شراب کس کی، انگور تک کھٹے نکلنے لگے۔ ترشی نے تمام نشہ ہرن کر دیا...... لیکن منہ سے لگی کب چھوٹتی ہے توبہ کیجیے۔ کچھ نہ سہی تہمت ہی سہی، طبیعتیں جوڑ کیں۔ تو روانی اور بڑھ گئی۔ کسی نے چُنیا بیگم سے جا آنکھ لڑائی اور آسمان پر جا ٹنگے۔ کسی نے چلم سنبھال سارے گھر بار کا سلفہ کر ڈالا۔ کسی نے بھنگ گھونٹ کر اتنی گاڑھی چھائی کہ سینگ

کھڑی ہو گئی اور یہ خود مُنہ کے بل گر پڑے ۔ چند لمحے

ایسانی ہوٹل میں " تعلیم زادہ " یعنی کلرک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

" بابو اور کلرک میں وہی فرق ہے جو جنس
اور نوع یا اصل اور فرع میں ۔ یعنی ہر کلرک
بابو کہلا سکتا ہے ۔ لیکن ہر بابو صرف کلرک
ہی نہیں ہوتا ۔ اس لئے کہ بابو میں آخر ریل کے
وہ بابو لوگ بھی تو شامل ہیں جو محض دوسروں
کو جھنڈیاں دکھاتے دکھاتے ہی اپنی زندگی
کا سفر پورا کر لیتے ہیں ۔"

فضل احمد صاحب کے انشائیے لطف زبان، انداز بیان، شگفتگی اور جزئیات کے استقصا کے لحاظ سے ادب اردو کے اچھے نمونے بن گئے ہیں ۔ کسی دوسرے انشائیہ نگار یا ادیب سے مقابلہ مقصود نہیں، کیونکہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی تحریر میں ایک بات ہے ۔

تعلیمی مسائل پس منظر اور پیش منظر

محترم سید الطاف علی صاحب بریلوی کو تعلیمی مسائل سے جو شغف رہا ہے اور ہے وہ اظہر من الشمس ہے ۔ وہ ایک عرصہ سے ان مسائل پر خود بھی لکھ رہے ہیں اور دوسروں سے بھی مقالے اور کتابیں لکھواتے رہتے ہیں ۔ اسی لئے اکیڈمی کی مطبوعات میں بڑی تعداد ان کتابوں کی دکھائی دیتی ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے تعلیم و تدریس سے متعلق ہیں زیر نظر کتاب بریلوی صاحب کی اُن نگارشات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد تعلیم ملی کے مختلف پہلوؤں پر لکھے تھے یا لکھے ہیں ۔ اس میں سے بعض مضامین تاریخی نوعیت کے ہیں اور بعض موجودہ دور کے مختلف مسائل سے متعلق ہیں لیکن اس فرق کے باوجود ان سب میں تحقیق و تجسس ۔ گہرائی ۔ درد قومی اور خلوص کے جلوے ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں ۔ کتاب ہذا کے مقدمہ نگار پروفیسر محمد ایوب قادری نے ان مضامین کو زمانہ کے لحاظ سے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے

۱۔ دورِ غلامی ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء ۱۴ مضامین
۲۔ دورِ عبوری ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء ۶ مضامین
۳۔ دورِ آزادی ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۸ء ۱۹ مضامین
۴۔ دورِ اصلاحی ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۲ء ۹ مضامین

اس طرح کل مضامین کی تعداد ۴۸ ہوئی ۔ فہرست مضامین میں ہر مضمون کے آگے وہ سنہ بھی دیدیا گیا ہے جس سنہ میں وہ مضمون لکھا گیا تھا ۔ اس سے ایک طرف تو ان حالات کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے جنھوں نے مضمون نگار کو اپنے قلم معجز رقم کو جنبش دینے کی طرف مائل کیا ۔ دوسری طرف خود صاحب مضامین کے ذہنی ارتقا کا بھی کسی حد تک پتہ چل جاتا ہے ۔ اگرچہ اس میں فرق ذرا مشکل ہی سے محسوس ہوتا ہے ۔ کیونکہ بریلوی صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے خیالات اور طرز نگارش میں پختگی شروع ہی سے نظر آتی ہے ۔ اگر کہیں فرق دکھائی دیتا ہے تو وہ ماحول اور واقعات کے عمل اور رد عمل کی شدت اور خفت کی وجہ سے ہے ۔ مضامین کی نوعیت میں اختلاف کا بھی یہی سبب ہے ۔ مثلاً دورِ غلامی کے مضامین زیادہ تر تاریخی ہیں ۔ دورِ عبوری کے مضامین سے اس دور

کی ایک ہیجانی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ دورِ آزادی کے مضامین کی نوعیت تعمیری ہے اور دورِ اصلاح کے مضامین انقلاب و اصلاح پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دورِ غلامی کے مضامین میں عہد حافظ الملک میں ترویج و اشاعتِ علم، انگریزی تعلیم کے اجرا کا مختصر جائزہ۔ ادارۂ تحقیقات اسلامیہ علی گڑھ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تعلیمی جدوجہد اور تحریک سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بے انتہا معلومات افزا اور کافی تحقیقی ہیں۔

دورِ عبوری کے مضامین سے آزادی کے بعد دو سال کے دوران مسلمانوں اور ان کے ملی اداروں خصوصاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جو عجیب یقینی سی حالت رہی اس کا ایک اندازہ مسلم یونیورسٹی کی موجودہ حالت علی گڑھ ـــــ دوراہے پر اور ہندی کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کے عنوانات کے تحت لکھے جانے والے مضامین سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

دورِ آزادی کے مضامین میں "اساس تعلیم" مختصر ہونے کے باوجود نہایت بصیرت افروز ہے۔ تعلیم میں سیاست، حربی تعلیم، تعلیم اور ذہن اور تعلیم اور اخلاق اس دور کے وہ مقالے ہیں جو تعمیر ملی کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں اور تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دورِ اصلاح کے مضمونوں میں علمی ذہنی نشاۃ الثانیہ پاکستان میں ناخواندگی کا مسئلہ اور آج کے تعلیمی مسائل اس مجموعے کے وہ مضامین ہیں جن میں ایک طرف انقلاب و اصلاح پر اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور دوسری جانب مزید اصلاح کے لئے ٹھوس تجاویز پیش کی گئی ہیں

غرض پوری کتاب مختلف ادوار کے تعلیمی مسائل کا ایک اچھا مرقع ہے اور مصنف نے ان مسائل کی صرف نشان دہی ہی نہیں کی ہے بلکہ ہر مسئلہ کے واضح حل پیش کیے ہیں۔ کہیں کہیں وہ نمونے دیئے گئے ہیں جو ان مسائل کو حل کرنے کے لئے بطور بنیاد اور مثال کام آسکیں۔

بچہ کا ذہنی و نفسیاتی ارتقا

اگر علم اور تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور ان کے مقصد و منہاج کو سمجھ لیا جائے تو پھر یہ جاننا ضروری معلوم ہونے لگتا ہے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ موثر کس طرح بنایا جائے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ تعلیم کے لیے دو فریقوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تعلیم دینے والا اور دوسرا تعلیم پانے والا۔ یعنی کوئی فرد ہر وقت اور ہر جگہ سے تعلیم حاصل کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ لیکن تعلیم دینے کے معاملے میں بچے کے والدین اور استاد خاص کردار ادا کرتے ہیں اور تعلیم پانے والا بچہ خود ہوتا ہے۔ بچہ کوئی بے جان شے نہیں کہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہا کر لیا۔ بلکہ وہ جاندار ہوتا ہے۔ ذی شعور ہوتا ہے اس میں احساسات ہوتے ہیں اور فطری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ باتیں ایسی ہیں جو ایک طرف اس کا کردار بنانے میں پوری طرح ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ دوسری طرف انہیں باتوں سے بعض اوقات اسے تعلیم دینے میں سہولت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہی باتیں اس کی تعلیم میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اگر بچے کی نفسیات اس کے رجحانات اور اس کی ذہنی اور قلبی کیفیات کو سمجھ لیا جائے اور اپنی اس معلومات کو بنیاد بنا کر تعلیم دی جائے تو اس سے تعلیم دینے والے کا کام بھی سہل ہو جاتا ہے اور تعلیم پانے والا یعنی بچے پر بھی اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس کی جبلت تجسس میں جلا پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر نئے انکشاف اور تجربہ میں دلچ

گئی ہے۔ نفسیات کی اسی اہمیت و ضرورت کے پیش نظر اساتذہ
تربیتی اداروں میں اس مضمون کو نصاب کا جزو لاینفک بنا
گیا ہے اور معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کے متمنی افراد کے لئے بچے
نفسیات کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ لیکن چونکہ بچے
اولین تعلیم و تربیت گاہ اس کا اپنا گھر ہوتا ہے اور اس
سب سے پہلے معلمین اس کے والدین ہوتے ہیں لہٰذا ہر
د اور ہر عورت کے لئے بچے کی نفسیات کی مبادیات سے واقف
ہونا لازمی ہے۔ اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اکیڈمی
ف ایجوکیشنل ریسرچ کے اراکین نے یہ کتاب چھپوائی ہے۔ جو
م مطالعہ کی ہے، عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے اور فنی اصطلاحوں
گرانبار نہیں ہے۔

"بچے کا ذہنی و نفسیاتی ارتقا" نام کی یہ کتاب جناب اخلاص
حسین زبیری نے "ڈان آف کیریکٹر ان دی مائنڈ آف دی چائلڈ"
مصنفہ ایڈیتھا ای سفورڈ کے اردو ترجمے کو سامنے رکھ کر مرتب
کی ہے۔ اس کتاب کو پروفیسر وحیدالحق صدیقی مرحوم نے اردو
میں منتقل کیا تھا۔ لیکن محترم سید الطاف علی بریلوی نے ترجمے
کو بعینہٖ چھاپ دینا مناسب نہیں سمجھا لہٰذا انھوں نے اخلاص حسین
صاحب زبیری سے پاکستان کی ضرورتوں اور یہاں کے ماحول کو
سامنے رکھ کر مرتب کرایا۔ اخلاص حسین صاحب کے منجھے ہوئے قلم
نے اس ترجمے پر وہ عمل کیا جو ایک حکاک ایک نگینہ پر کر کے اس
کو جلا بخشتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب یہ کتاب اخلاص حسین
صاحب کی ایک عمدہ تالیف بن گئی ہے۔ مولف نے اس میں
کاٹ چھانٹ کر کے اور نہایت سلیقے سے ترتیب دے کر اس کو
ایک دلچسپ کتاب بنا دیا ہے۔

پیش لفظ اور تعارف کے علاوہ اس میں کل چودہ
باب ہیں۔ ان ابواب میں مختلف موضوعات پر مختلف عنوانات
کے تحت بحث کی گئی ہے لیکن یہ تمام عنوانات ایک دوسرے سے
اس طرح مربوط ہیں کہ سب کے مجموعے سے ایک اچھی تصویر
بن گئی ہے۔

سب سے پہلے بچوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کی
ہدایت کی گئی ہے۔ پھر بچے کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کر کے یہ بتایا
گیا ہے کہ شیرخوار بچے کے ذہن میں مبہم احساسات اور کیفیات
کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے حواس سے کام لیتا ہے۔ اس
سے اس کے ذہن پر بے شمار اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن
اس میں امتیاز کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ پھر جب وہ
عالم شیرخوارگی سے نکل کر طفولیت اور نوجوانی کی طرف قدم
بڑھاتا ہے۔ تو یہ کیفیات واضح ہوتی جاتی ہیں۔ بچے کے ذہن
پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں انھیں سے اس کا ذہنی نشوونما
ہوتا ہے۔ اور انھیں سے قوت متخیلہ جلا پاتی ہے۔ بالکل
ابتدائی عمر سے ہی بچے کی عادتیں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔
ان عادات کو صحیح خطوط پر نشوونما دینے میں بڑوں کو
نہایت حکمت اور خوش تدبیری سے کام لینا چاہیئے۔ بڑوں
کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ بچہ اپنی قوت ارادی
صحیح سمت میں استعمال کرے۔ اس کے لئے قوت ارادی
کی تربیت نہایت ضروری ہے بچے کو آزادی دی جائے مگر
قانون کے دائرے میں۔ بچے میں ذوق تجسس بہت ہوتا ہے
لہٰذا اس کے اس ذوق کی تسکین بوجہ احسن کرنی چاہیئے
بچے کے ذہن میں مذہب کی عظمت کا احساس بھی شروع
ہی سے قائم کر دینا چاہیئے۔ اس کے لئے دو باتوں کا
احساس ضروری ہے۔ ۱۔ خدا کے وجود کا احساس۔

(۴)، اطاعت خدا وندی کا شعور۔ یہ سب باتیں بتا کر آخر میں بچوں کی مختلف اقسام گنائی ہیں۔ بچوں پھر بیجا سزا کے خراب نتائج بتلاتے ہیں اور آخر میں بچے کے نقطۂ نظر کی اہمیت بتا کر اس کی تشکیل کے بارے میں بڑوں کی ذمہ داری کو واضح کیا ہے۔

غرض بچہ کی نفسیات کو سمجھنے اور اس کو تعلیم و تربیت کی بنیاد بناتے کے سلسلے میں، کتاب ہٰذا میں پورا لائحہ عمل دیا گیا ہے۔ جس کے مطابق عمل کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو بچے کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہے۔

حاصل مطالعہ

یہ کتاب، مقدمات عبدالحق کی قسم کی ایک چیز ہے۔ اس میں محترم سید الطاف علی بریلوی کے پچاس کتابوں اور چھتیس مقالات پر لکھے ہوئے مقدمات، تعارف اور تبصرے شامل ہیں۔ سید صاحب کا کہنا ہے اور آپ کے اس ادعا میں کوئی مبالغہ بھی نہیں کہ "اپنی زندگی میں مختلف موضوعات پر ہزارہا کتابیں اور مضامین پڑھے۔ لیکن ان سب پر لکھنے کی نہ تو توفیق ہوئی اور نہ ہی یہ ممکن تھا" یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو مطالعۂ کتب کا شوق ہوتا ہے وہ اپنی حیات مستعار میں بہت کچھ پڑھتے ہیں لیکن جن حضرات میں لکھنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے وہ بھی پوری زندگی میں صرف چند ہی کتابوں یا مقالوں پر تحریر کی شکل میں اپنے تاثرات کا اظہار یا نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔ پھر ہر کتاب یا ہر تحریر اس قابل ہوتی بھی نہیں کہ اس پر زبانی طور سے اظہار خیال سے آگے قدم بڑھایا جائے۔ مقدمہ نگاری میں بابائے اردو نے بہت شہرت پائی اور مختلف کتابوں پر اتنے مقدمے لکھے کہ لوگ مزاحاً مرحوم کو مقدمہ باز کہنے لگے تھے۔ لیکن ان تمام مقدموں کی تعداد جو "مقدمات عبدالحق" میں شامل ہیں ۴۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر اس تعداد میں وہ تاثرات اور تبصرے بھی شامل کر لئے جائیں جو اس [illegible] کتاب میں شامل نہیں ہیں تب بھی مجموعی تعداد، اُن کتابوں کی تعداد کی عشر عشیر بھی نہیں ہے جو ان کے زیر مطالعہ آئیں بہرحال تعداد کی کمی یا زیادتی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان تحریروں کی حیثیت اور اہمیت کیا ہے۔

سید صاحب کے یہ تمام تعارف اور تبصرے یا تو متعلقہ کتابوں میں یا مختلف رسالوں اور جرائد میں بکھرے ہوئے مل جائیں گے لیکن اول تو پہلے سے یہ پتہ چلانا مشکل ہوگا کہ کون سا تعارف اور تبصرہ کس کتاب یا رسالہ میں ملے گا۔ دوم یہ کہ اگر کسی طرح یہ پتہ چل بھی جائے تو ان کتب اور رسالوں کی فراہمی ایک دشوار کام ہوگا۔ لہٰذا ان کا یکجا شائع ہو جانا نہایت مفید ہے۔ اس سے دو فائدے ہوئے کہ سید صاحب کی تحریریں جو معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت سے بھی گرانقدر ہیں ایک جگہ جمع ہو گئیں۔ دوسرے ان سب کتابوں اور مقالوں سے بھی ایک ہی وقت میں تعارف ہو گیا جن پر یہ تبصرے تعارف یا مقدمے لکھے گئے ہیں۔ ان تحریروں کا انداز اس قدر دلکش ہے کہ یہ تحریریں پڑھنے والوں کے دامنِ دل کو نہ صرف اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ بلکہ بہت سے قارئین میں اصل کتابوں اور مقالوں کے مطالعہ کا بھی ذوق و شوق پیدا کرتی ہیں۔ وباللہ التوفیق

مسلم خواتین کی تعلیم

انسان کی فضیلت علم کی وجہ سے ہے اور اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ گویا علم انسانی زندگی

کا جزو لاینفک ہے۔ اگر اس دولت سے انسان کو محروم کر دیا جائے تو اس کی زندگی نامکمل رہے گی۔ وہ آدمی تو کہلائے گا لیکن لفظ انسان کا اس پر اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی لئے قرآن و حدیث میں حصول علم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن جس علم کی ترغیب اللہ اور رسول نے دی ہے، وہ نہایت وسعت رکھتا ہے۔ یہ علم ایسا ہونا چاہئے جو جزو حیات بن جائے اور جو تکمیل حیات انسانی میں مدد دے سکے۔ صرف چند کتابیں رٹ کر امتحان پاس کرنے اور سند حاصل کر لینے کا نام علم نہیں ہے، مجازی طور پر ہم اسے علم اور تعلیم کہہ لیں مگر حقیقی معنوں میں اس پر علم یا تعلیم کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

علم اور تعلیم کی اس اہمیت و ضرورت کو دیکھتے ہوئے جہاں مردوں کے لئے اس کا انتظام کرنا ضروری ہے وہاں خواتین کے لئے بھی اس کا انصرام لازمی ہے۔ اسلام جس کا مقصد ہی تکمیل انسانیت ہے اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات میں ایک طرف اس کی طرح طرح سے ترغیب دی گئی ہے دوسری جانب ہر دور میں مسلمانوں نے عورتوں اور مردوں کی تعلیم کا پوری طرح اہتمام کیا۔ یہ کتاب مولوی محمد امین زبیری مرحوم نے خالصتاً مسلم خواتین کی تعلیم کے بارے میں اس طرح لکھی ہے کہ عہد رسالت سے اس وقت تک کی تاریخ کا مختصر خاکہ اس میں آگیا ہے پوری کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں عہد رسالت سے شروع کر کے اس وقت تک کی تعلیمی سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں جب تک مسلمانوں کا دور عروج رہا۔ اس میں ہندوستان سے باہر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ہندوستان کا حال ہے۔ تیسرے باب میں دور جدید کو لیا گیا ہے اور اس میں مسلمان خواتین کا علمی انحطاط دکھایا گیا ہے۔ پھر دو ابواب میں دوبارہ تعلیم نسواں کے لئے جدوجہد اور تعلیمی ترقی کا ایک مجمل خاکہ دے کر آخری باب میں دکن کی قدیم و جدید تعلیم کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک اچھی چیز ہے اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ برصغیر کے ایک مشہور اور کہنہ مشق مصنف و مورخ اور دانشور کے افکار و خیالات کا نتیجہ ہے۔

تعلیم و تربیت

تعلیم کی ضرورت و اہمیت کو ہر زمانہ اور ہر قوم میں محسوس کیا گیا اور تعلیم کے اغراض و مقاصد اور طریقہائے تعلیم پر بہت کچھ لکھا بھی گیا۔ لیکن وہ طریقے بہت کم اختیار کئے گئے جن سے تعلیم جزو حیات بن کر انسانیت کی تکمیل میں مدد دے اور تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اچھے عادات و خصائل فرد کی زندگی کا جزو لاینفک بن جائیں اور غیر ارادی طور پر بھی ان ہی کا اظہار رہے۔ کم از کم اردو زبان میں اس قسم کی کتابوں کی بہت کمی ہے جن میں اس موضوع پر کچھ لکھا گیا ہو۔ ضیاء الدین احمد برنی نے کتاب زیر نظر لکھ کر اس خلا کو پر کیا ہے۔ اور بچہ کی تعلیم و تربیت کا ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے جس کے مطابق تعلیم کا آغاز بچہ کی پیدائش کے وقت سے ہی ہو جاتا ہے۔ اور تربیت اس نہج پر ہوتی ہے کہ فرد کی زندگی کا ہر پہلو اصلاح پاتا ہے اور نتیجۃً وہ ایک اعلیٰ کردار کا انسان بن کر نہ صرف اپنے بلکہ معاشرے اور ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس کتاب

میں کل بارہ ابواب ہیں، جن میں تعلیم و تربیت کی ضرورت و اہمیت بتا کر والدین کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ بچے کی پیدائش کے وقت سے اس کے سامنے کردار کے ایسے نمونے پیش کئے جائیں اور ماحول کو کچھ اس انداز سے ڈھالا جائے کہ بچہ جو پیدا ہوتے ہی سیکھنا شروع کر دیتا ہے اچھے اثرات قبول کرتا چلا جائے۔ اور جب وہ شعور کی منزل پہ پہنچ کر رسمی طور پر تعلیم کا آغاز کرے تو یہی اثرات اس تعلیم کی بنیاد بن جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ ہمارا لڑکا اچھی زندگی بسر کرے تو ضروری ہے کہ ہم بھی اچھی زندگی بسر کریں"۔ پھر چونکہ بچے پر گردوپیش کے حالات اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے والدین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کے لئے ایسا ماحول مہیا کریں جو بچے کے دماغ پر خوشگوار اثر ڈالے۔ عام طور پر والدین کی غفلت سے خراب اور ناخوشگوار اثرات کے ماتحت بچے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی باپ اپنے لڑکے کی آوارگی کی شکایت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنا قصور اپنے بچے کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔

یہ بنیادی باتیں بتانے کے بعد مولف کتاب باقی لائحہ عمل کو اس طور پر ترتیب دیتے ہیں۔

"تعلیم منظم ہونی چاہئے۔ تعلیم کا ایک خاص مقصد ہونا چاہئے۔ گھر کا ماحول اچھا ہونا چاہئے۔ بچے کی جسمانی غور و پرداخت کی جانی چاہئے، اس کو سادہ زندگی کا عادی بنانا چاہئے۔ اس کی قوت ارادی کی نشوونما ہونی چاہئے۔ ذہنی نشوونما کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ بطریق احسن بچے کو اطاعت و فرمانبرداری، نیکی سے محبت کرنے، باہمی اتفاق و رواداری اور رہبادہ بننے کی تعلیم دینی چاہئے جنسی اور اخلاقی تعلیم، جسمانی تعلیم کے لئے اچھے ذرائع پیدا کرنے چاہئیں۔ بصارت کی حفاظت اور نیند کے اصول بتا کر بچے کے لئے ایک ایسا پروگرام مرتب کر دینا چاہئے جو اس کے عمل کی بنیاد بنے اور جس سے وہ رہبری حاصل کر سکے۔ اس تمام بحث کے دوران والدین کے لئے یہ نکتہ بہت اہم بیان کیا گیا ہے۔

"اکثر والدین طلبہ کو اسلئے بورڈنگ میں داخل کر دیا کرتے ہیں کہ گھر میں وہ اس وبال سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ یا بالفاظ دیگر انہیں اپنی مصروفیات اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ وہ خاطر خواہ بچے کی نگرانی نہیں کر سکتے ایسے والدین کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب وہ بچے کو عدم سے وجود میں لانے کا باعث ہوئے ہیں تو ساتھ ہی انہیں اس ذمہ داری کا احساس رکھنا چاہئے جو باپ یا ماں بن جانے سے ان پر عائد ہوتی ہے"۔

تمام والدین کو نہ صرف اس اہم نکتہ پر غور کرنا چاہئے بلکہ اس پر عمل کرنے کے لئے خود کو تیار کر لینا چاہئے اگر والدین کو اپنے فرائض کا احساس ہے اور وہ واقعی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کو ضروری سمجھتے ہیں تو انھیں اس کتاب کا مطالعہ کر کے اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

مفکرین تعلیم یہ کتاب اکیڈیمی کی بہترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔ اس کو مصنف کتاب پروفیسر ضیاء الدین احمد نے بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور مواد کی فراہمی

انہوں نے کس قدر کاوش سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اس میں صرف تین مفکرین تعلیم کے سوانح اور نظریات پر بحث کی ہے جن میں سے دو مسلمان ہیں اور ایک کا تعلق مغربی دنیا سے ہے۔ مسلمان مفکرین امام غزالی اور ابن خلدون ہیں اور مغربی مفکر جان ڈیوی ہے۔ اس انتخاب سے قدیم وجدید اور مشرقی و مغربی فکر کا مقابلہ کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دونوں نظریوں میں کیا کیا باتیں مشترک ہیں اور کہاں کہاں اختلاف ہے۔

پوری کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں مسلمانوں کی علمی ترقی اور مختلف علوم پر روشنی ڈالنے کے بعد تین ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں مسلمانوں کا نظام تعلیم نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس کے مختلف مدارج یعنی ابتدائی صنعتی اور اعلیٰ تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔ پھر طرز تعلیم، تعلیم کے لئے سفر، مجالس مناظرہ، تعلیم بالغان، اندلس میں تعلیمی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں امام غزالی کے سوانح اور نظریات تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ابن خلدون کی سوانح حیات اور اس کے نظریہ تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔ اور سزا کی اہمیت، جسمانی ریاضت، تعلیم کے صحیح طریقے۔ قوت غور و فکر، علم لغت کی تحصیل اور علوم کی قسموں کے بارے میں اس عظیم مفکر تعلیم کے خیالات بتائے گئے ہیں حصہ دوم کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے باب میں تعلیم کی ۔۔۔۔ تعریف۔ تعلیم اور قوم۔ نصاب تخلیقی جمہوریت وغیرہ پر الگ الگ عنوانات کے تحت اظہار خیال کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں جان ڈیوی کی سوانح حیات بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے نظریہ تعلیم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر دکھایا گیا ہے۔ چوتھے باب میں تخلیقی مدنیت کو واضح کیا گیا ہے۔ پانچویں اور چھٹے باب میں بامقصد اور مفید تعلیم کا نظریہ اور جان ڈیوی کے فلسفہ کا ماحصل بیان کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں دو ضمیمے دیئے گئے ہیں۔ ضمیمہ الف میں اسلامی دور کے دارالعلوم کے اعلیٰ عہدیداروں کے نام اور کام بتائے گئے ہیں۔ اور ضمیمہ ب میں مدرسوں اور کالجوں کی جو دنیائے اسلام میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے ایک فہرست دیدی گئی ہے۔

پوری کتاب نہایت معلومات افزا اور بے حد بصیرت افروز ہے۔ جن لوگوں کو علم اور تعلیم سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے ان کے لئے اس کتاب میں دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم

مسلمانوں نے علم اور تعلیم سے جو اعتنا کیا اس کی مثال اقوام عالم میں سے کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی علم کے متعلق ان کے سامنے اللہ اور رسول کے واضح احکام رہے اور انھوں نے ہمیشہ علم اور دین کو لازم و ملزوم جانا۔ وہ جس ملک میں گئے اور جہاں رہے وہاں انہوں نے علم کی شمع کو روشن رکھا۔ اور اشاعت علم میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حکمران بھی حصول علم اور

شاعت علم کو اپنا فریضہ سمجھتے رہے اور عوام میں بھی علم حاصل کرنے کا جذبہ برقرار رہا۔ چنانچہ برصغیر میں بھی جن جن علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا گیا وہیں وہیں علم کی روشنی پھیلتی گئی۔ سب سے پہلے مسلمان سندھ میں آئے۔ یہاں تھوڑے ہی عرصے میں علم اور تعلیم کا سلسلہ بڑی شدت سے جاری ہوا کہ اس سرزمین سے بے شمار علما و فضلا اس معیار کے پیدا ہوئے کہ تمام دنیائے اسلام میں ان کو سند کا درجہ دیدیا گیا۔ پھر محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام سے یہی صورت دوسرے علاقوں میں بھی رونما ہوگئی جو سندھ میں کئی صدیوں سے جاری تھی۔

برصغیر میں اشاعت علم اور نظام تعلیم کی داستان کافی طویل لیکن بے انتہا دلچسپ ہے۔ ہمیں اپنے لئے نظام تعلیم مرتب کرنے کے لئے اس سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کا احساس کرکے جناب پروفیسر سعید احمد رفیق نے یہ کتاب تصنیف کی اور بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ایسے ایسے حقائق اور واقعات یکجا کردیئے جو اکثر لوگوں کے لئے دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل نئے اور بے حد حیران کن ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف نے پہلے باب میں اشاعت تعلیم کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں اور اس کے ذیل میں برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور تعلیمی ترقی۔ تعلیم کے متعلق حکومت کا رویہ اشاعت تعلیم کے مختلف ذرائع۔ کتب خانے۔ تعلیمی مجالس وغیرہ جیسے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے باب میں طریقہ تعلیم سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ اس سلسلے میں معلم اور متعلم دونوں کے کیا طریق کار ہوتے تھے۔ طلبہ یا متعلمین کو نئے سبق کا مطالعہ کرکے آنا پڑتا تھا۔ معلم یا استاد کبھی املا کے ذریعہ تعلیم دیتا تھا۔ کبھی طلبا سے عبارت پڑھواتا اور اصلاح کرتا جاتا کبھی خود عبارت پڑھتا اور تمام مشکلات حل کرتا جاتا۔ چونکہ طالب علم پہلے سے اس سبق کو پڑھے ہوئے ہوتے تھے اس لئے وہ بھی طرح طرح کے سوالات کرکے خود کو مطمئن کرتے جاتے تھے۔ اس طرح جو اسباق دیئے جاتے تھے وہ نہایت موثر ہوتے تھے۔ حصول علم کے لئے کوئی پابندی نہیں تھی لہذا تعلیم کا اوسط آجکل سے کہیں زیادہ تھا۔

اس عام جائزے کے بعد مولف کتاب نے تیسرے، چوتھے اور پانچویں ابواب میں سلاطین دہلی کے عہد سے شروع کرکے عہد مغلیہ کے دور عروج تک کی تعلیمی ترقی پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ پھر سیاسی انحطاط کے زمانے کی تعلیمی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ مرکز کے کمزور ہونے پر جو ریاستیں اور حکومتیں وجود میں آئیں انھوں نے بھی شمع علم کو روشن رکھا۔ خود دہلی میں خانوادہ ولی اللہی نے اشاعت علم کے سلسلے میں جو کام انجام دیئے وہ اسی دور انحطاط کی یادگار ہیں۔ اس زمانے میں بھی قریہ قریہ میں مدرسے اور مکتب تھے اور تعلیم حاصل کرنے کو زندگی کا سب سے اہم مقصد سمجھا جاتا تھا۔ یہی دور انحطاط تھا کہ جب

چھوٹے چھوٹے قصبوں سے ایسے ایسے عالم پیدا ہوئے جن کی یاد آج بھی لوگوں کے قلب میں موجود ہے۔

آخری چار ابواب میں تعلیم نسواں، نصاب تعلیم ابتدائی اور ثانوی تعلیم اور فنون لطیفہ اور فنون لطیفہ پر روشنی ڈال کر اس بحث کو ختم کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب بھی "مفکرین تعلیم" کی طرح نہایت معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ کتاب "مفکرین تعلیم" کے مواد پر بیش بہا اضافہ ہے۔

مقدر انسانی

موجودہ دور کی مادی ترقی نے بہت سے دماغوں میں ایسی ہلچل پیدا کر دی ہے کہ صحیح غور و فکر کی قوت قطعاً جاتی رہی۔ جو لوگ اس ترقی کو انسان کی معراج سمجھتے ہیں وہ خیال کرنے لگے ہیں کہ انسان نے کائنات کی کنہ و حقیقت کو پا لیا ہے اور جو کچھ اس کے علم میں آ گیا ہے وہی حقیقت ہے۔ ان لوگوں نے . . . . . . کائنات کی جملہ اشیاء کی علت مادہ کو قرار دے لیا ہے اور اس لئے اب ان کی نظریں اس سے آگے دیکھنے کی عادی نہیں رہیں۔ یہی لوگ مادیین یا مادہ پرست ہیں۔

سچ پوچھئے تو یہ رجحان نوع بشر کے لئے نہایت مہلک ہے۔ اس باطل نظریہ کو اپنا کر انسان اپنی ہستی کے مقصد و منہاج سے بے خبر ہو جاتا ہے اور وہ خیر و شر کے درمیان امتیاز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ نتیجۃً معاشرہ میں انتشار و اختلال رونما ہوتا ہے اور یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نظارہ آج ہم سب کر رہے ہیں۔ انسانیت کو اس ذلالت و ہلاکت سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے گم کردہ راہ لوگوں کے ان غلط خیالات و نظریات کی تردید کی جائے اور انھیں بتایا جائے کہ مادہ سے ماورا بھی کوئی چیز ہے جس کی خبر ہمیں سائنس نہیں بلکہ مذہب دیتا ہے لیکن ایسے لوگوں کو عقیدہ اور ایمان کا حوالہ دے کر قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کو سمجھانے کے لئے سائنسی دلائل کو کام میں لایا جائے۔

حسن اتفاق سے ایک عظیم سائنسدان کو اللہ نے توفیق عطا فرمائی اور اس نے ایسے ہی لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھ دی جس کا نام ہیومن ڈیسٹنی (HUMAN DESTINY) ہے۔ "مقدر انسانی" اسی بلند پایہ تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف ایک فرانسیسی مفکر و سائنس داں لی کامٹ دو نوائے ہے۔ اس نے اپنی کتاب کی بنیاد خالصتاً سائنس پر رکھی ہے۔ چنانچہ تمام مثالیں مادی دنیا سے لے کر ان کا سلسلہ غیر مادی اور روحانی دنیا سے ملایا ہے۔ اس نے اس مادی دنیا میں ہونے والے واقعات کی علتوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ علتوں کا یہ سلسلہ مادی اشیاء پر پہنچ کر کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس تلاش و جستجو میں ہمیں مادیات کی حدود سے قدم نکال کر روحانی اور غیر مادی اشیاء میں جھانکنا پڑتا ہے۔ اور وہیں کوئی نہ کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جس کو ہم بہت اطمینان سے آخری علت قرار دیدیتے ہیں۔ سب سے آخری علت، علت العلل کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اور وہی ذات خداوندی ہے۔

پھر مصنف نے نہایت قطعیت کے ساتھ انسانی

علم کی کوتاہی اور سائنس کی نارسائی کے بارے میں لکھا ہے۔ اور بتایا ہے کہ

"مطلق مفہوم کے اعتبار سے کوئی "علمی حقیقت" حقیقت نہیں۔ یہ جملہ کہ "سائنس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے ایک مہمل جملہ ہے۔ ہمارے تجربہ میں تو صرف احساسات کے چند اصناف آتے ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے کے عقب میں ایک ہی ترتیب سے ظاہر ہوتے ہیں ..... جب تک ہم کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ طبیعی کیمیاوی منظہر اور ان منظاہر میں جو حیات سے متعلق ہیں اور اُن نفسیاتی کیفیتوں میں جو رونما ہوتی ہیں باہمی روابط کیا ہیں۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم پوری اہمیت سے واقف ہیں۔"

بحث بہت طویل لیکن نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ اور ایسے ٹھنڈے دل و دماغ سے کی گئی ہے کہ کہیں مناظرے کا انداز پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ تاہم یہ تحریر اُن لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو اپنی تھوڑی سی معلومات کی بنیاد پر غلط مفروضات قائم کر لیتے ہیں اور خدا کی خدائی اور مذہب کی قیود سے نکل کر خود کو روشن خیال اور ترقی یافتہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسئلہ زیر بحث نہایت ادق ہے اور اگرچہ لائق مصنف نے اس کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ موضوع ہی ایسا ہے جس کو الفاظ کی گرفت میں لانا مشکل ہے اس لئے عبارت لامحالہ کسی قدر پیچیدہ ہو گئی ہے۔ پھر ایک فرانسیسی کے انگریزی زبان میں اظہار خیال کرنے کی کوشش نے مسئلہ کو مزید دشوار بنا دیا ہے۔ غرض زبان و بیان اور موضوع کے اعتبار سے کتاب کا سمجھنا ہی مشکل ہو گیا ہے چہ جائیکہ اس کو پوری روح کے ساتھ اُردو زبان میں منتقل کر دینا۔ لیکن جس طرح قدرت نے ایک ایسے شخص کو پیدا کر دیا جو اس قدر دقیق موضوع پر اتنی کامیابی سے خامہ فرسائی کر سکا اسی طرح اس نے پردہ غیب سے ایک ایسی ہستی کو ظاہر فرما دیا جو ترجمہ کے دشوار مرحلہ کو بھی نہایت کامیابی سے طے کر گئی۔ یہ ہستی استاذی محترم جناب عبدالمجید قریشی مدظلہٗ کی ہے، جن کی حیات مستعار کا بیشتر حصہ اشاعت علم اور قوم کے نونہالوں کی تعمیر میں صرف ہوا اور جن کو قدرت نے دینی بصیرت بدرجۂ اتم عطا فرمائی ہے۔ اردو ترجمہ کے کام کو استاذی محترم نے نہایت سلیقہ سے انجام دیا ہے۔ اس کام کی اہمیت اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ آپ عمر بھر ریاضی کی درس و تدریس اور مدرستہ العلوم علیگڈھ کے انتظامی امور میں لگے رہے جس کی وجہ سے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے مواقع آپ کو بہت کم ملے اس کتاب اور اس سے پہلے ایک آدھ کتاب کے ترجمہ سے آپ کے تصنیفی کام کی گویا ابتدا ہوئی۔ لیکن آپ کی یہ ابتدا ہی بہت سے منتہی حضرات کیلئے قابل رشک بن گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ نہ اصل کتاب کی روح کو آپ نے فنا ہونے دیا اور نہ اردو زبان کی روانی و

ین ذرہ برابر فرق آنے دیا۔ اوّل سے آخر تک
کتاب میں عالمانہ شان اور ادب کی چاشنی موجود ہے
اردو زبان کے لئے یہ ایک شگون نیک ہے کہ آپ
نے اس کے دامن میں ایک ایسا قیمتی موتی ڈال دیا
ہے اکیڈمی اپنی اس پیشکش پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

مشاہیر کے تعلیمی نظریات

مختصر لفظوں میں بیان کیا جائے تو
تعلیم کا مقصد تکمیل انسانیت قرار پاتا ہے یہ مسلمان مفکرین
معلمین نے ہمیشہ یہی مقصد پیش نظر رکھا اور اسی کی روشنی
میں تعلیم اور علم کی اشاعت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جزو حیات
بن کر عمل کی اساس بنی اور اس کے ذریعہ کردار سازی
کا کام نہایت کامیابی سے ہوا لیکن جب سے دنیا پر
مغرب نے اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے اس وقت
سے اور مسائل کے ساتھ ساتھ علم اور تعلیم کی بھی مختلف
تعبیریں ہونے لگیں اور یہ مقدس الفاظ اس مصرع کی
تفسیر بن کر رہ گئے۔ ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

جان ڈیوی ہی کو لے لیجئے۔ آجکل اس کے نظریات کا
بہت شہرہ ہے اور تمام دنیا میں ان نظریات کو اتنی
مقبولیت حاصل ہے کہ بغیر ان کی روح پر غور کئے
لوگ اس کے الفاظ پر سر دھن رہے ہیں اور عملاً نہیں
تو کم از کم نظری اعتبار سے سب ہی انھیں اپنانے کو اپنی
سعادت سمجھ رہے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو اس
میں کئی جھول اور منطقی مغالطے نظر آئیں گے۔
بہر حال مغربی مفکرین تعلیم کے اثر سے بعض
مسلمان مفکر بھی تعلیم کے مقاصد اور نظریات کے تعین
کرنے میں الفاظ کی صنعت گری اور شعبدہ بازی سے
کام لینے لگے ہیں۔ پھر بھی اکثر مسلمان مفکرین و مشاہیر
ایسے ہیں جن کے بیان کردہ مقاصد اور نظریات میں
بہت سی باتیں مشترک ہیں خواہ ان کا انداز بیان کتنا ہی
مختلف ہے۔ اور یہ یقیناً اسلامی تعلیم کے اثرات ہیں جنھوں
نے انھیں غیر ارادی طور پر بھی بعض باتوں میں متفق و متحد
کر دیا ہے۔ کتاب زیر نظر ایسے ہی لوگوں کے نظریات کا
مجموعہ ہے جس کو محترم محمد حسین خاں زبیری نے نہایت
سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کل کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے
جو مختلف موضوعات کے لئے مختص کر دیئے گئے ہیں مثلاً
تیسرا باب نصب العین و مقاصد تعلیم کے لئے مخصوص ہے
اور اس موضوع پر گیارہ مشاہیر کے نظریات پیش کئے
گئے ہیں۔ یہ سب ملت مسلمہ کے عظیم لوگ ہیں ان گیارہ
مشاہیر کے نام ترتیب وار یہ ہیں۔ نواب محسن الملک۔
جسٹس امیر علی۔ سید حسین بلگرامی۔ عبداللہ یوسف علی۔
سر فضل حسین۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ جسٹس
سر شاہ سلیمان۔ مولوی فضل الحق۔ سر ابراہیم رحمت اللہ
صاحبزادہ عبدالقیوم اور پروفیسر عبدالمجید قریشی۔ اسکے
علاوہ دیگر اہم موضوعات "موجودہ نظام تعلیم۔ مذہبی تعلیم
کی اہمیت۔ تعلیم نسواں۔ اصلاح تمدن۔ تعلیم بالغان
اور تعلیم و تربیت" ہیں اور ان موضوعات پر مختلف مشاہیر
کے نظریات درج کر دیئے گئے ہیں۔ شروع کے دو
ابواب میں پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد
اور ہندوستان میں اسلامی دور کا مختصر جائزہ ہے۔

نواب محسن الملک نے تعلیم کا جو مقصد بتایا ہے وہ موجودہ مفکرین تعلیم کے لیے قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے صرف چند پیشوں کے کام کرنے کی لیاقت حاصل ہو، بلکہ تعلیم کا ... ہے کہ تمام قوتیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں وہ نمو پائیں اور نہ صرف ان ہی قوتوں کو نمو دیا جائے جو ہماری جسمانی آسائش کے کام آئیں بلکہ روحانی قوتوں کا کام میں لانا اور دماغ کو نمو پہنچانا تعلیم کا اصلی مقصود ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی تعلیم جس سے ہم معاش پیدا کرنے کے لائق ہوں ضروری ہے اور ہماری دنیاوی ذلت دور کرنے کے لیے اس کا سیکھنا بھی لازم ہے لیکن اس کے علاوہ ہم وہ تعلیم بھی چاہتے ہیں جس سے ان کے دل و دماغ روشن ہوں۔"

اب موجودہ دور کے ساختہ پرداختہ روشن خیال اور تہذیب جدید کے دلدادہ جسٹس امیر علی کی رائے بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:-

"تعلیم ایک ذریعہ ہونا چاہیئے تہذیب نفس اور تزکیۂ اخلاق کا، تربیت تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے۔ بغیر تربیت کے تعلیم غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے۔ مغرب میں تعلیم و تربیت دوش بدوش چلتی ہیں، مشرق میں مغربی تعلیم کو تربیت سے الگ کرکے رائج کرنے کے نتائج لازمی طور پر مضر ہوں گے۔"

مرحوم امیر علی نے تعلیم بغیر تربیت کے جن مضر اثرات کی پیش گوئی کی تھی وہ آج ہم بھگت رہے ہیں۔ اور اگر اب بھی ہم بیدار نہ ہوئے تو یہی مضرت ہلاکت میں تبدیل ہو جائے گی۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

موجودہ تعلیمی نظام کو مرتب کرنے والوں کیلئے یہ کتاب ایک نایاب تحفہ ہے۔

مقاصد تعلیم

موجودہ دور کے مفکرین تعلیم میں جان ڈیوی کی طرح الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ کی بھی کافی شہرت ہے۔ ڈیوی میلاداً امریکی تھا جبکہ وائٹ ہیڈ کا تعلق انگریزی قوم اور انگلستان سے تھا۔ وہ ۱۸۶۱ء میں کینٹ کے جزیرے میں پیدا ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کیمبرج اور لندن کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تدریس کا کام انجام دیا۔ ۱۹۲۴ء میں امریکہ چلے گئے اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک ہارورڈ میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں فوت ہو گئے۔ ان کے خاص مضامین ریاضیات اور فلسفہ تھے۔ غالباً ان ہی ادق مضمونوں کی تعلیم و تدریس نے ان کو دقت پسند بنا دیا تھا۔ انھوں نے تعلیم کے موضوع پر "ایمس آف ایجوکیشن" نام کی ایک کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ "مقاصد تعلیم" کے نام سے سید محمد تقی سابق مدیر جنگ نے ۱۹۵۸ء میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ فروغ احمد علوی مرحوم کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۶۸ء میں دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ ایمس آف ایجوکیشن کو پروفیسر سید حسین خاں بختیاری مرحوم نے وائٹ ہیڈ کی اچھی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کتاب کے مصنف کو فلسفیانہ تاریخ کے چند انتہائی مشکل پسند اور دقیق مصنفین میں شامل کرکے ان کے دوست برٹرینڈ رسل کی یہ رائے بھی نقل کر دی ہے کہ "وہ (وائٹ ہیڈ) الجھا

بنیاد فارغ رکھتے ہیں" جب اسی پائے کے ایک ریاضی دان اور فلسفی کی یہ رائے ہے تو ان کی دقت پسندی پر کون شبہ کرسکتا ہے۔ بہرحال کتاب زیرنظر بھی مصنف کی مشکل پسندی اور ذہنی الجھاؤ کا ایک نمونہ ہے، ایسی کتاب کا اردو زبان میں منتقل ہوجانا بڑی بات ہے۔

وائٹ ہیڈ کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد افادیت ہے۔ وہ تعلیم کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"تعلیم معلومات کے استعمال میں لانے کے فن کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ وہ فن ہے جس کا بتانا مشکل ہے۔"

چونکہ وہ علم کو جاندار اور زندہ رکھنے اور اس کو جامد ہونے سے بچانے کے سوال پر زور دیتے ہیں۔ اس لیے وہ جو طریقہ تجویز کرتے ہیں ان کے نزدیک اس کے عناصر یہ ہیں (۱) استاد کی ذہانت (۲) طلبہ کی اپنی ذہنی افتاد و مزاج (۳) زندگی میں ان کے لیے امکانات (۴) اسکول کے فوری گردوپیش کے مواقع اور اسی سے متعلقہ دوسرے عناصر۔

وائٹ ہیڈ کا کہنا ہے کہ تعلیم اس طرح ہونی چاہیئے کہ وہ طالب علم کو جزئیات کے ذریعہ مجموعی شے کو دیکھنے میں مدد دے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے مضامین کے مطالعہ کی جھلک۔ بے ربطی کو ختم کیا جائے۔ وہ تعلیم میں افادیت کے لفظ پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اصلاح نفس پر بھی اسی کا اطلاق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کیا اصلاح نفس اور کردار سازی کو ہم فائدے سے خالی سمجھتے ہیں؟ کیا یہ کوئی فائدے کی چیز نہیں ہے کہ ہم صحیح معنوں میں انسان بن جائیں۔

اس کے بعد وائٹ ہیڈ مذہبی تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"مذہبی تعلیم وہ تعلیم ہوتی ہے جو فرض شناسی اور احترام و عقیدت پیدا کرتی ہے۔ فرض شناسی واقعات کی رفتار پر ہمارے بالقوہ اقتدار سے پیدا ہوتی ہے۔ مذہبی عقیدت کی اساس کی بنیاد یہ تصور ہے کہ حال وجود کے سارے اگلے اور پچھلے کی چیزوں کے مجموعہ یعنی زمان کی ساری وسعت پر جو کہ ابدیت ہوتی ہے مشتمل ہوتا ہے۔"

ان ابتدائی تفہیمات کے بعد انھوں نے دماغ کا نظم، تعلیم مختلف ابواب میں تعلیم کے ہم آہنگ ہونے آزادی اور ضبط و نظم ٹیکنیکل ایجوکیشن اور سائنس و ادب سے اس کا رشتہ۔ کلاسیکی کتابوں کا مقام۔ ریاضی کے نصاب۔ یونیورسٹیوں کے فرائض۔ فکر میں ربط و تنظیم، چند سائنسی تصورات اور مکان، زمان اور اضافیت پر تفصیلی بحث کرتا ہے اور چونکہ خود ریاضی اور فلسفہ کا پروفیسر رہا اس لئے ہر بات کو ان ہی کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اکثر مثالیں الجبرا اور جیومیٹری کے مختلف مسائل سے حل کیں۔ پروفیسر بختیاری مرحوم نے وائٹ ہیڈ کو ریاضیاتی منطق کا بانی قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس کے استدلال کی بنیاد اسی نو ایجاد منطق پر قائم ہے۔

سائنس کے کرشمے عام مطالعہ کے لئے سائنس کے مختلف مسائل پر اردو میں جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان ہی میں سے ایک کتاب یہ ہے مسرور احمد توقیر ایم اے اس کتاب کے مصنف ہیں۔ پوری

کتاب چودہ فصلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ جن میں سائنس کے مختلف موضوعات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے مضامین کی ترتیب یہ ہے (۱) علم سائنس (۲) ہوا کا دباؤ (۳) دورانِ خون (۴) خوردبین اور اس کا موجد (۵) نامیاتی علم کیمیا (۶) جدید علم کیمیا (۷) جوہری نظریہ (۸) بیماری کا جرثومی نظریہ (۹) روشنی کا لہری نظریہ۔ (۱۰) ارضیات (۱۱) افزائش نسل (۱۲) جوہری ساخت (۱۳) ٹیلی ویژن (۱۴) فضائی دوڑ۔

مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ مضمون عام فہم اور زبان سادہ اور سلیس ہو۔

چند عظیم علمائے جراثیم

استاذی محترم جناب عبدالمجید صاحب قریشی کی یہ دوسری پیش کش ہے۔ یہ ایک امریکی علم جراثیم کے ماہر ڈاکٹر پال ڈی کرائف کی ضخیم کتاب Microbe Hunters کا نہایت رواں اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر ڈی کرائف ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا مولد ریاست مچی گن کا شہر زی لینڈ تھا۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۲۶ء میں لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اُن علمائے جراثیم کے حالات اور کارنامے نہایت دلچسپ انداز سے بیان کئے ہیں جنھوں نے مختلف بیماریوں کے جراثیم دریافت کئے۔ اس تذکرہ کی ابتدا لیون ہوپک کے ذکر جمیل سے ہوتی ہے اور اس کو جرثومہ جویوں کا مورث اعلیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اینٹونی لیون ہوپک ۱۶۳۲ء میں ہالینڈ کے شہر ڈیلفٹ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گلیلیو کو ہیئت کی بعض نئی دریافتوں کے جرم میں سزائے قید دی گئی تھی۔ ڈی کرائف لکھتے ہیں:-

"لیون ہاپک کے خاندان کے افراد نہایت ہی معزز قسم کے شہری لوگ تھے۔ اور میں نے ان کو نہایت معزز اس لئے کہا ہے کہ وہ ٹوکریاں بناتے تھے اور شراب کشید کرتے تھے اور ہالینڈ میں شراب کشید کرنے والے معزز سمجھے جاتے ہیں اور ان کی بیحد عزت کی جاتی ہے"

لیون ہاپک نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عدسوں کو ترقی دی اور ان کی قوت کو بڑھایا۔ پھر بارش کے پانی کے ایک قطرے سے اپنے تجربات کا آغاز کیا۔ آخرکار اس نے خود بھی دیکھا اور دوسروں کو بھی دکھا دیا کہ بارش کے صاف پانی میں بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے جاندار تیر رہے اور کھیل کود رہے ہیں۔ یہ گویا جرثومہ جوئی کی صبح ازل تھی۔ اس کے بعد لیون ہاپک نے اپنی کپڑے کی دوکان بھی چلائی اور جرثومہ جوئی کی مہم کو بھی جاری رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے دوسروں کے لئے بڑی حد تک زمین ہموار کر دی ۱۷۲۳ء میں لیون ہاپک کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ اُس کے شروع کئے ہوئے کام کو آئندہ کوئی جاری نہیں رکھ سکے گا لیکن قدرت کے انتظامات عجیب ہیں، ابھی چھ سال کی مدت ہی گزری تھی کہ ۱۷۲۹ء میں شمالی اٹلی کے ایک شہر سیکنڈی انو میں ایک بچہ پیدا ہوا جس نے آئندہ چل کر ایک جرثومہ جو کی حیثیت سے شہرت پائی۔ یہ لازارو سپیلنزینی تھا۔ اس نے جرثومہ جوئی کی مہم کو جاری رکھا اور آخر میں یہ انکشاف کیا کہ جراثیم کے ماں باپ ضرور ہونے چاہئیں۔ اس پر لوگوں میں کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ آخرکار مخالفت ختم ہو گئی اور

اس کے نظریہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۷۹۹ء میں سپلینڈ زینی کا
انتقال ہو جانے سے پھر جرثومہ جوئی کے سلسلے میں تعطل
پیدا ہو گیا۔ لیکن ۱۸۲۲ء میں مشرقی فرانس کے ایک
گاؤں میں لوئی پاسچر کی ولادت ہوئی اس نے ۹ سال کی
عمر سے ہی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کتے کے کاٹنے
یا دوسرے بعض حادثات سے موت کیوں واقع ہوتی ہے۔ آخر
کار اس نے یہ دریافت کر لیا کہ بہت سے جراثیم انسان
کے لئے باعث خطرہ ہیں اور وہی ایسے موقعوں پر موت
کا سبب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اور بہت سے ماہرین
جراثیم ہوئے جن میں کاک۔ روکس اور ہیرنگ ہیفیلڈ۔
تھیوبالڈ سمتھ۔ بروس۔ راس مقابل گریسی۔ والٹر ریڈ۔
پال ایلرخ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے حالات اور
کارنامے اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

استاذی محترم نے مقدرا نسانی کے بعد اس
کتاب کو ترجمہ کے لئے منتخب کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے
کہ اس ملک کے نوجوان طلبہ کو یہ سمجھا دیا جائے کہ سائنس
میں نئی دریافت کرنے کے لئے اعلیٰ سندوں، بڑی
بڑی تجربہ گاہوں، غیر معمولی ذہانت وفطانت اور
سرمائے کی ضرورت اتنی نہیں ہے جتنی عزم، استقلال
استقامت، محنت اور کام کرنے کی دھن کی ہے کیونکہ
اس کتاب میں جن مشاہیر کا ذکر ہے ان میں سے کئی
نہایت معمولی حیثیت اور معمولی ذہانت کے لوگ
تھے۔ لیکن ان سب کو کام کرنے کی لگن تھی۔ ان کو قدرت
نے عزم وارادہ کی پختگی عطا فرمائی تھی۔ انھوں نے
استقلال اور تندہی سے کام کیا۔ لوگوں کے اعتراضات
اور استہزاء کی پرواہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن
وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اور مشاہیر عالم کی صف
میں ان کو جگہ ملی۔ لہٰذا اگر ہماری قوم کے نوجوان بھی وہی
صفات اختیار کریں تو کچھ عجب نہیں کہ ان میں سے کئی
ان مشاہیر کے کاموں پر اضافہ کر سکیں۔

کتاب نہایت دلچسپ ہے اور ترجمہ نہایت
سلیس، رواں اور شگفتہ ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے
کہ اردو ادب میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔

اصول واساسِ تعلیم

تعلیم وتدریس سے تعلق رکھنے والے حضرات کے
لئے سرٹامس پرسی نن (ٹی۔ پی۔ نن) کا نام اجنبی نہیں
ہے موجودہ صدی میں جن مفکرینِ تعلیم نے دنیا کو متاثر
کیا ان میں ٹی۔ پی۔ نن بھی شامل ہیں۔ ان کا مولد و وطن
انگلستان تھا لیکن ان کے نظریات یورپ کے اکثر ممالک
نے قبول کئے۔ انھوں نے سائنس اور ریاضی کے مختلف
موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں لیکن ان کے تاج شہرت
کا سب سے زیادہ چمکدار موتی ان کی تصنیف "ایجوکیشن
اِٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس" ہے۔ زیر نظر کتاب
"اصول واساس تعلیم" اسی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ
ہے۔ مترجمین حضرات میں محترم محمد حسین خان زبیری،
اخلاص حسین زبیری، سید اظہر حسین رضوی۔ انعام عظیم برنی
اور مولوی سید بدرالحسن کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔
ایک مغربی زبان سے ایک مشرقی زبان میں جتنے اچھے ترجمہ
کی توقع کی جا سکتی ہے وہ اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔
کتاب کے مشمولات کا مختصر جائزہ لینا بھی امر محال

ہے چہ جائیکہ اِن پر تفصیلی طور پر اظہار خیال کیا جائے۔ نا کافی ہے کہ دو چار باتیں نن کے تعلیمی نظریات کے رے میں بتادی جائیں۔

نن انفرادیت پرست خود بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ "تمام تعلیمی جدوجہد کا مقصد اولین یہ ہونا چاہیئے کہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی انفرادی صلاحیتوں کو انتہائی عروج تک پہنچا سکیں تاکہ ان کی انفرادیت کی تکمیل ہو سکے.... انفرادیت کی نشوونما اسی سماجی ماحول میں ہو سکتی ہے جہاں مشترک دلچسپیوں اور مشترکہ سرگرمیوں سے اسکو غذا بہم پہنچائی جائے"

نن دوسرے مفکرین تعلیم کے نظریات پیش کر کے اُن کے اسقام بتاتا ہے اور پھر نہایت قطعیت سے اپنا نظریہ پیش کرتا ہے اُس کا کہنا ہے کہ:-

" انفرادیت زندگی کا نصب العین ہے اور تعلیم کا نصب العین انفرادیت کی تشکیل ہے۔ لہذا تعلیم انفرادیت اور زندگی لازم وملزوم چیزیں ہیں "

اِس کے بعد نن "انفرادیت" کی بحث شروع کر دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ انفرادیت کا اطلاق آدمی کی شعوری فطرت اور اس کے جسم دونوں پر ہوتا ہے کیونکہ "جسمانی نشوونما ہر منزل پر یک جہتی کے منصوبہ کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی اس سے افراد کے اشتراکِ عمل کا اظہار ہوتا ہے جنھوں نے ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد ایک مشترکہ مقصد کے لیۓ خود کو سرگرم عمل کیا ہے۔ گویا جسمانی اعضا کا حال کثیر الاصوات موسیقی کے حصوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس میں ہر حصہ اپنی موسیقیت برقرار رکھتا ہے تاہم دوسرے حصوں کا بھی برابر خیال رکھتا ہے اور موسیقیت کے اس دھن کا بھی خیال رکھتا ہے جس کے حصول میں وہ اجزا متحد ہو کر سرگرم عمل ہیں "

اس کے بعد نن نے انسان کے طبیعاتی اور کیمیاوی عناصر کا تعلق اس کی قوت ادراک سے بتا کر نفسیات پر بحث کی ہے اور پھر انسانی جبلتوں پر روشنی ڈال کر انسان کی خودی کو ابھارنے اور بیدار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس کے بعد علم اور عمل، فہم کی نشوونما اور اسکول اور فرد پر تفصیلی طور سے بحث کر کے کتاب کو ختم کر دیا ہے۔

تعلیم کے اصولوں پر یہ کتاب نہایت جامع ہے اور اس کا اردو میں منتقل کرا دینا اکیڈمی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

عظیم علمائے نفسیات

یہ کتاب ڈاکٹر ایس۔ اسٹینز فیلڈ سارجنٹ کی معرکہ آرا تصنیف بیسک ٹیچنگس آف دی گریٹ سائیکولوجسٹس (Basic Teachings of the great Psychologists) کا ترجمہ ہے جو استاذی محترم جناب عبدالمجید قریشی مدظلہٗ نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود نہایت فصیح اور آسان زبان میں کیا ہے اور جس کو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ نے ادارہ فرینکلن پبلیکیشنز کے اشتراک سے ۱۹۶۱ء میں طبع کرا کر شائع کیا۔ ترجمہ اپنے زبان و بیان کے لحاظ سے تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ اور مترجم کی محنت و جانفشانی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت کا ایک نادر نمونہ ہے

نفسیات ایک قدیم علم ہے۔ یونان اور دنیائے اسلام میں علم النفس کے بہت سے ماہر ہوئے ہیں۔ سقراط

افلاطون، ارسطو نے یونانی زبان میں اور الکندی، فارابی
شیخ بوعلی سینا۔ ابن ماجہ، ابن طفیل اور ابن رشد نے
عربی میں اس علم کا کافی سرمایہ چھوڑا ہے۔ نفسیات کے
عام مسائل کے علاوہ اطبائے یونان اور اطبائے اسلام
نے بہت سے معالجات میں بھی اس علم کو استعمال کیا۔
چنانچہ مسلمان اطبا خصوصاً محمد بن زکریا رازی اور شیخ
بوعلی سینا نے کئی معرکہ کے نفسیاتی علاج کئے۔ لیکن اس
قدامت۔ افادیت اور ترقی کے باوجود بہت عرصہ تک
اس علم کو وہ حیثیت و وسعت حاصل نہ ہوسکی، جو اب
ہے پچھلی صدی تک یہ علم، فلسفہ کی ایک شاخ سمجھا جاتا
رہا۔ موجودہ صدی میں اس کی اہمیت کو دیکھ کر اس کو
ایک علیحدہ علم کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ اور اب نفسیات
کی وسعتوں کی انتہا معلوم نہیں ہوتی۔ عام زندگی سے لگاکر
مختلف شعبہ ہائے حیات میں اسکی کارفرمائی ہے۔

چونکہ اس علم کے فوائد بے شمار ہیں اور ہر متنفس
کو اس کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے برنارڈ کالج....
کولمبیا یونیورسٹی کے نائب پروفیسر سٹینز فیلڈ سارجنٹ
نے یہ جامع کتاب لکھی اور اس میں اس علم کا کوئی گوشہ تشنہ
نہیں چھوڑا۔ تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی اور
ہر موضوع پر سولھویں صدی کے بعد کے مشہور ماہرین
نفسیات کے نظریات اور اصول بیان کردیئے۔ یہ ضخیم
کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں مختلف عنوانات
کے تحت ان سے متعلق مسائل کو نہایت تفصیل سے بیان
کیا گیا ہے۔ بیشتر مسائل کو واضح کرنے کے لئے مثالیں
دی گئی ہیں جو مختلف ماہرین نفسیات کے نظریات اور
ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں۔

پہلے باب میں علم نفسیات کی تشریح کی گئی ہے اور
اس کے ذیل میں نفسیات کے ارتقا اور اس کے میدان
عمل پر اظہار خیال کرنے کے بعد نفسیات کی بڑی بڑی
شاخوں پر کبھی قدرے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان شاخوں کے
نام عضوی نفسیات۔ تقابلی نفسیات۔ نشوونماتی یا نمائی
نفسیات۔ نفسیات اطفال۔ نفسیات شخصیت۔ غیر طبعی
نفسیات۔ عمرانی نفسیات۔ تفرقی نفسیات۔ اطلاقی یا عملی
نفسیات ہیں۔ پھر نفسیات کے دبستانوں کی وضاحت کی
ہے۔ اور مخصوص نفسیاتی مناہج تحقیق پر روشنی ڈالی
گئی ہے۔ اس طرح پہلے باب کے ذیل ہی میں نفسیات
کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا گیا ہے۔

دیگر ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔

ذہانت اور معیار ذہانت یا ذہانت کی جانچ (ذ۔
ج)۔ مخصوص صلاحیتوں کی پیمائش۔ ضعیف العقلی
اور بالغیت (اس عنوان کے تحت گھامڑ۔ بلّے اور فاتر العقل
کے فرق کو بڑے دلچسپ انداز سے سمجھایا گیا ہے اور ایک
اصطلاح فاتر العقل علامہ کی استعمال کی ہے جو بالکل نئی
ہے) فرد پر ماحول اور توارث کا اثر۔ انفرادی نشوونما۔
وتیرے کی عضویاتی اساس۔ تحریک عمل، جذبات، شخصیت
کی پیمائش۔ شخصیت کیونکر نشوونما پاتی ہے۔ دماغی عارضہ
ذہنی آویزش اور لاشعور۔ آموزش۔ یادداشت اور سہو۔
ادراک، تخیّل۔ مخیلہ۔ تخیل اور خواب (اس موقع پر
خواب کے دکھائی دینے کے اسباب جو مختلف ماہرین
نفسیات کے نزدیک ہو سکتے ہیں بتائے ہیں اور خوابوں

کی اشاریت اور بیداری کے خواب یا خیالی پلاؤ کے بارے میں بھی بڑی اچھی بحث کی ہے)۔ انسان کا سماجی وتیرہ۔ اور روزانہ زندگی اور نفسیات (اس جگہ علمی نفسیات کے مختلف شعبوں کی وضاحت کی ہے)۔

آخر میں مختلف ماہرین نفسیات کے نہایت مختصر حالات بیان کر دیئے گئے ہیں اور اس جگہ پہنچ کر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

مترجم یعنی استاذی محترم قریشی صاحب نے شروع میں ایک مختصر مقدمہ لکھا ہے جس میں مصنف کتاب کی بعض لغزشوں کی نشاندہی کی ہے بعض باتوں پر کھل کر تنقید کی ہے اور کتاب کی بعض خوبیوں کو سراہا ہے۔ غرض پوری کتاب بہت اچھی اور مفید ہے اور غالباً یہ کہنا مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے گا کہ اس موضوع پر اردو زبان میں اس جامعیت کی اور اتنی معلومات افزا کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔

مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ حصہ اول حصہ دوم
History of Muslim Education Vols. I & II

یہ کتاب اصل میں برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کی کی تاریخ ہے جس کا منصوبہ کافی عرصہ پہلے بنا تھا اور طے پایا تھا کہ یہ پوری کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہوگی جن کی تقسیم زمانے کے اعتبار سے حسب ذیل طریقہ پر ہو جائیگی

(۱) جلد اول از ۷۱۲ء تا ۱۷۵۰ء
(۲) جلد دوم از ۱۷۵۰ء تا ۱۸۵۷ء
(۳) جلد سوم از ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء
(۴) جلد چہارم از ۱۹۴۷ء تا زمانۂ حال

ان میں سے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دو باقی ہیں جلد اول کا سال اشاعت ۱۹۶۷-۶۸ء تھا اور جلد دوم ۱۹۷۳ء میں طبع اور شائع ہوئی یہ کتاب محترم پروفیسر محمد معین الدین خاں نے لکھی ہے۔ پروفیسر صاحب عرصہ دراز تک تاریخ کے استاد رہے اور کالج کے طلبہ کو اپنی قابلیت سے مستفید فرماتے رہے۔ تاریخ عالم پر آپ کی گہری نظر ہے۔ ساتھ ہی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ کتاب زیر نظر انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں زبان کے اعتبار سے کوئی کمزوری نظر نہیں آتی بلکہ پوچھئے تو زبان نہایت صاف و رواں اور انداز بیان عالمانہ ہے۔

پہلی جلد میں ابتدائیہ کافی طویل ہے۔ اس میں آغاز اسلام اور سلطنت اسلامیہ کے پھیلاؤ کا مختصر حال دے کر اسلام میں علم اور تعلیم کی فضیلت و اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور آیات قرآنی اور ارشادات نبوی سے دلائل فراہم کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں تعلیمی سرگرمیوں اور مختلف مراکز میں علم کی اشاعت کے ذرائع کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر ہندوستان کی عہد اسلامی کی علمی اور تعلیمی تاریخ کا مختصر سا خاکہ پیش کر کے یہاں کے نظام تعلیم پر ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس مرحلہ پر لا کر ابتدائیہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔

اس جائزہ کے بعد کتاب کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے۔ پہلی جلد میں کل دس اور دوسری جلد میں نو ابواب ہیں۔

پہلی جلد کے دس ابواب کے عنوانات یہ ہیں: ترقی علم

سلاطین دہلی کے زمانہ میں تعلیم کی اشاعت و ترقی۔ خود مختار حکومتوں میں علم اور تعلیم کی ترقی۔ عہد مغلیہ میں علم اور تعلیم کی ترقی۔ آخری دور مغلیہ میں تعلیم کی اشاعت۔ تعلیم نسواں نصاب تعلیم اور اس کے ترتیب دینے والے۔ فنون لطیفہ و مفیدہ کا نشوونما۔ نظام تعلیم۔ مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیم۔

ہر عنوان کے تحت متعدد ذیلی عنوانات ہیں جن میں تعلیم کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ہر زمانہ میں تعلیم کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہی اور عوام میں بھی حصول علم کا جذبہ بیش از بیش رہا۔ علماء بغیر کسی معاوضہ کے اپنی خدمات پیش کرتے۔ حکومت ان کی معاشی ضروریات پوری کرتی اور پبلک ان کی خدمات کو سراہتی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ تعلیم کو زندگی کی ایک بنیادی ضرورت سمجھ کر حاصل کرتے۔ اور حصول علم کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے۔ اس صراحت کے بعد ذریعہ تعلیم مکتب خانوں۔ تعلیمی انجمنوں اور فنون لطیفہ کا مختصر تذکرہ ہے۔ پھر الگ الگ فرمارواؤں کے دور حکومت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جونپور کے مرکز علوم کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کو ہندوستان کا شیراز بتایا گیا ہے۔ آخری دور مغلیہ کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں ولی اللّٰہی تحریک کا تفصیلی حال بیان کیا گیا ہے۔ دہلی اور جے پور کی رصد گاہوں کے قیام اور زیج محمد شاہی کی ترتیب کا تذکرہ کر کے نوابان اودھ کی علمی سرپرستی کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

تعلیم نسواں کے ذیل میں سلیمہ سلطانہ گلبدن بیگم چاند بی بی۔ ماہم انکہ۔ نور جہاں۔ ممتاز محل۔ جہاں آرا۔ زیب النساء وغیرہ کی علمی قابلیت اور ان کی علمی خدمات پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نصاب تعلیم خصوصاً درس نظامیہ اور اس کے مرتبین ملا قطب الدین شہید۔ ملا نظام الدین۔ بحر العلوم وغیرہ پر بحث کی گئی ہے اور اسی سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی خدمات اور اصلاحات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

فنون لطیفہ میں نقاشی۔ موسیقی اور خطاطی کا خصوصی تذکرہ ہے۔ پھر نظام تعلیم پر کسی قدر روشنی ڈال کر ہندوؤں کی تعلیم کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں کو کیا کیا سہولتیں حاصل رہیں۔ ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھی اور اس کے ذریعہ علم و ادب اور تاریخ کی بڑی خدمت کی۔ مرہٹی کو ترقی ہوئی۔ علوم عقلی خصوصاً طب میں ہندوؤں نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ موسیقی اور نقاشی کو فروغ دیا۔

دوسری جلد کے نو ابواب کے عنوانات یہ ہیں
یورپی قسمت آزما ہندوستان میں۔ تعلیمی سرگرمیوں کی ابتدا تعلیمی ترقی۔ تعلیمی مسائل۔ تعلیم کا دیسی نظام۔ زبان کا مسئلہ تعلیم کا نظریہ تقطیر۔ وڈ کا سرکاری روبکار۔ کلکتہ مدرسہ

ان ابواب میں یورپی اقوام کی آمد۔ ان کی تجارتی سرگرمیوں اور جنگ زرگری کا مختصر حال دیا گیا ہے۔ پھر عیسائی مشنریوں کی ریشہ دوانیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویہ میں تبدیلی کا کچھ ذکر ہے۔ کمپنی کے دور میں اسکولوں کے قیام اور وارن ہیسٹنگز کی علوم شرقیہ سے

دلچسپی مختلف سرکاری فرمانوں کے اجرا۔ دیسی نظام تعلیم کی ناکامی۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز جو میکالے نے پیش کی اور اس پر عمل درآمد پھر دیسی زبان پر زور عام تعلیم۔ تعلیم کے مختلف مدارج۔ ابتدائی۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم۔ امدادی اسکولوں کا نظام۔ تعلیم سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ اور مسلمانوں کی تعلیم میں کلکتہ مدرسہ کا حصہ۔ ان سب مسائل پر نہایت سنجیدگی سے بحث کی گئی ہے۔ اور ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

غرض برصغیر میں مسلمانوں کے دور میں جو علمی سرگرمیاں رہیں۔ اور جو نظام رائج رہا۔ اور اُس کے جو نتائج مرتب ہوتے ان دو جلدوں میں اُن سب کا ایک واضح خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ باقی دو جلدیں بھی اسی معیار کی ہوں گی۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تالیفی اور تصنیفی خدمت کے مندرجہ بالا جائزے میں ۱۹۷۵ء-۷۴ء کی عنقریب شائع ہونے والی کتابیں شامل نہیں ہیں۔ زیر طبع کتابوں میں (۱) مسلمانان پنجاب کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی جس پر عالیجناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب نے عالمانہ مقدمہ لکھا ہے اور (۲) مولانا محمد علی جوہر — حیات اور تعلیمی نظریات، قابل ذکر ہیں۔

حرف دل

(فکر لطیف سرسید مرحوم)

فلاطون طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم   مسیحا رشک می آرد زدرمانے کہ من دارم

زکفر من چہ میخواہی زایمانم چہ می پرسی   ہماں یک جرعۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دلے بریاں زعشق مصطفیٰ دارم

نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

زجبریل امین قرآں بہ پیغامے نمی خوانم   ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت   ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

رہبرہاں تابہ ایماں سنگ ہا دارد رہ واعظ

نہ دارد ہیچ واعظ ہم چو برہانے کہ من دارم

"العلم" کراچی پر ایک نظر

جناب پروفیسر ایوب قادری

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی قومی برتری ختم ہو گئی اور ذلت و ادبار، ناکامی و نامرادی اور مصائب و آلام کا دور شروع ہوا۔ حاکم و فاتح انگریزوں نے مسلمانوں کو من حیث القوم باغی و سرکش گردانا غرض مسلمانوں کی نیا سمندر میں ڈگمگانے لگی اس نازک وقت میں سر سید احمد خاں نے اصلاح حال کی کوشش اور قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ راعی و رعایا کی غلط فہمیاں دور کیں اور مسلمانوں کو بتایا کہ بدلے ہوئے حالات میں ان کو اپنا قومی وجود برقرار رکھنے کے لئے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لئے ایک باقاعدہ منظم تحریک شروع کی جو علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوئی

سر سید احمد خاں نے اپنے اصلاحی کاموں کی افادیت کے اظہار اور نشر و اشاعت کی غرض سے تہذیب الاخلاق (اجراء ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء) اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کئے۔ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے وقت سر سید احمد خاں کے سامنے انگلینڈ کے دو مشہور رسالے ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر بطور نمونہ تھے تہذیب الاخلاق نے اصلاح معاشرت اور تہذیب اخلاق کے ساتھ ساتھ اردو نثر کو بھی اسلوب بخشا علمی تہذیبی اور تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے قومی تعمیر میں ایک عظیم کردار ادا کیا۔

علی گڑھ تحریک اور سر سید احمد خاں کے ان رسائل کا یہ اثر ہوا کہ اس زمانے میں اعلیٰ علمی رسالے مثلاً دلگداز لکھنؤ (جنوری ۱۸۸۷ء) حسن، حیدر آباد دکن (۱۸۸۸ء) معارف علی گڑھ ۱۸۹۸ء وغیرہ جاری ہوئے اور سر سید کے انتقال کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں تو بہت سے تحقیقی، علمی اور تہذیبی رسالے علی گڑھ تحریک کے اثر اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حضرات کی جد و جہد سے وجود میں آئے مخزن دہلی (بعد از ان لاہور) (اپریل ۱۹۰۱ء) الندوہ، لکھنؤ اس کا جانشین، معارف اعظم گڑھ، دکن ریویو ۱۹۰۲ء پنجاب ریویو (۱۹۱۰ء) الناظر لکھنؤ (جولائی ۱۹۰۹ء) وغیرہ مؤقر رسالے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ خاص علی گڑھ میں بھی چند علمی، تحقیقی، تہذیبی اور ادبی رسالے مثلاً علی گڑھ منتھلی میگزین (میر ولایت حسین) سہیل (رشید احمد صدیقی) اور علی گڑھ میگزین مختلف اوقات میں جاری ہوئے۔ ان رسالوں نے علمی و ادبی خدمات کے ساتھ تہذیبی و ثقافتی انقلاب بھی پیدا کیا۔

—— ☆ ——

سید الطاف علی بریلوی بھی علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور سیدھے ہیں، بخت و اتفاق کی بات کہ فارغ التحصیل ہونے کے کچھ عرصے بعد وہ سرسید احمد خان کی مشہور زمانہ تعلیمی انجمن "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" سے وابستہ ہوگئے اور اس کے سرِ دفتر قرار پائے۔ قدرت نے انھیں تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق ودیعت کیا تھا۔ وہ اس سے پہلے حیاتِ حافظ رحمت خان لکھ کر تاریخی و تحقیقی میدان میں اپنا وقار قائم کر چکے تھے۔ انھوں نے دفتری ذمہ داریوں کے باوجود علمی و ادبی ذوق کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس اعلیٰ ذوق کی تکمیل کے سامان و مواقع بھی بہم پہنچائے۔

انھوں نے ایک علمی فکری اور تہذیبی جد و جہد کی غرض سے مسلم یونیورسٹی اور برصغیر کے ارباب علم و تحقیق کی ایک "مجلس مصنفین" ۵ / اگست ۱۹۴۱ء کو علی گڑھ میں قائم کی اس مجلس کے باقاعدہ علمی جلسے منعقد ہوتے تھے۔ اور ان میں ملک کے مشاہیر دانشوران و محققین علمی، ادبی اور تحقیقی مقالے پڑھتے تھے جو مجلس مصنفین کے رسالے "مصنف" میں شائع ہوتے تھے۔ مصنف کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۴۲ء کو علی گڑھ سے شائع ہوا یہ رسالہ ستمبر ۱۹۴۵ء تک جاری رہا اور اس کے بائیس شمارے شائع ہوئے ان میں چھ مقالے کتابی شکل میں شائع ہوئے اور بعض مقالوں کی بنیاد پر کئی مستقل کتابیں وجود میں آئیں۔

"مصنف" کو ملک کے نامور علماء اور ارباب تحقیق و ادب کا تعاون حاصل تھا مندرجہ ذیل نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، شمس العلماء محمد امین عباسی چڑیا کوٹی، مولوی سید طفیل احمد منگلوری، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر سراج الحق قریشی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، ڈاکٹر افضال حسین قادری، میاں محمد شریف، ڈاکٹر محمد عزیز، مولانا نظامی بدایونی۔ قاضی عبدالودود، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، ابرار حسین فاروقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی ل۔ احمد۔ اکبرآبادی، علامہ سید سلیمان ندوی، عبدالشاہد خان شیروانی۔

ظاہر ہے کہ جس رسالے اور ادارے کو ایسے اکابر و افاضل کا تعاون حاصل ہو وہ کتنا وقیع اور شاندار ہوگا۔

قیام پاکستان کے بعد حالات کی نامساعدت اور مجبوری کی وجہ سے سید الطاف علی بریلوی جون ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ ہوتے ہوئے مغربی پاکستان پہنچے کچھ دنوں ٹنڈو آدم میں قیام کیا اور پھر کراچی آگئے۔ ادیب شہیر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک موقع پر لکھا تھا۔ [1]

"سید الطاف علی صاحب کو اردو سے جو شغف ہے اس کا اندازہ کرتا ہوں تو میرے دل میں خیال آنے لگتا ہے کہ اگر کسی دن صبح کے وقت ان کی آنکھ کھلے اور وہ اپنے کو بے یار و مددگار کسی ویران لق و دق جزیرے میں پائیں تو سب سے پہلے ان کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ تصنیف و تالیف کا ادارہ جلد سے جلد یہاں کیوں کر قائم کر دیا جائے یہ بات میں نے بہت سی احتیاطوں کو ملحوظ رکھ کر کہی ہے ورنہ یہ کہنے میں مجھے تکلف نہ ہوتا کہ یہ تصنیف و تالیف کا ادارہ قائم کرنے کے بعد کچھ اور سوچتے یا کرتے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف

[1] ۱۹۵۷ء کے ہیرو از انیس فاطمہ۔ مقدمہ

صحیح ثابت ہوئی اور بریلوی صاحب نے بحیرۂ عرب کے کنارے کراچی میں جو اس زمانے میں علمی و ادبی اعتبار سے تقریباً بنجر زمین تھی، ایجوکیشنل کانفرنس کی تجدید کی اور مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں میں لگ گئے۔ اکیڈمی آف ریسرچ، سرسید گرلز کالج، ایک شاندار کتب خانہ، فری پبلک ریڈنگ روم جیسے ادارے قائم کئے اور ایک بلند پایہ سہ ماہی علمی و تحقیقی مجلہ "العلم" جاری کیا جو ہمارا موضوعِ سخن ہے۔

— ۴ —

العلم کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۵۱ء کو جاری ہوا یہ رسالہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا آرگن ہے گویا ایک علمی تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی احیا، و انقلاب کا نقیب اس رسالے میں بلند پایہ اور فکر انگیز، علمی، مذہبی، ثقافتی مقالے شائع ہوتے ہیں۔ قومی یک جہتی اس کا مقصد وحید ہے۔ اس رسالے میں ہمیں قدیم و جدید تمدن کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے جو علی گڑھ کی دین ہے۔ مذہب کی اعلیٰ قدروں کی حفاظت، مشرقی تہذیب کی نگہداشت، ماضی کے گرانقدر ورثہ کا تحفظ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ سائنسی دور کے تقاضے، جدید مسائل اور ان کا حل اور تعلیمی مسائل کی عقدہ کشائی بھی اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ العلم نے پچیس ۲۵ سال کی مدت میں ان مسائل پر بہت کچھ پیش کیا ہے۔

العلم کے اجراء پر برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم نے ارشاد فرمایا۔

"العلم کے تین پرچے نظر افروز ہوئے۔ ہر پرچہ دلچسپ مفید اور پر معلومات تھا۔ ایسے ہی پرچے پاکستان کے علمی وقار کے پائے کو بلند کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کا مستقبل اسکے ماضی سے اور بھی زیادہ شاندار ہوگا۔"

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے العلم کی اشاعت اول پر لکھا۔

"العلم" آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا نیا سہ ماہی رسالہ ہے، ایڈیٹر سید الطاف علی بریلوی صاحب حلقۂ علی گڑھ اور کانفرنس کی خوب جانی پہچانی ہوئی شخصیت ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ ہی سلطان جہاں منزل علی گڑھ اور وہاں کے پورے متلازمات کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ وہ 'مصنف' کی ایڈیٹری کا طویل تجربہ رکھتے ہیں العلم بھی گویا مصنف کا نقش ثانی ہے۔ خاصہ پر معلومات اور متنوع، مضامین کے لحاظ سے خاصا دلچسپ ہے۔" پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان نے ارقام فرمایا۔

"(العلم) گویا مصنف علی گڑھ کا ایک کراچی اڈیشن پڑھ رہا ہوں۔ وہی ترتیب مضامین کا حسن، وہی جوش عمل اور کام کرنے کی دھن، وہی انداز بیان کی دلکشی، مقالات میں وہی تنوع اور رنگا رنگی یاد رفتگاں بھی اور مستقبل کی تعمیر کا ولولہ بھی، ماضی کی حوصلہ افزا داستانیں بھی اور حال کے تقاضوں کی ترجمانی بھی ——— العلم کی اس ہما ہمی اور آب و تاب کے ساتھ اشاعت اس بات کا اعلان ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور لسانی و ادبی سرگرمیوں کے صحیفے کا ایک باب کھلے گا"

ان بزرگوں کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور العلم نے مندرجہ ذیل عنوانات ———

آثار و نوادر، کتب خانوں، آب و اخلاق، ادبیات و تاریخ، پاکستان و پاکستانیات تحریک آزادی ۱۸۵۷ء تحقیق و تصنیف، تذکرہ و سوانح، شخصیات، تصوف، تعلیم، تعلیم نسواں

تعلیمی اداروں، تہذیب و تمدن، رفتار ادب، جنگ و جہاد، خطبات، دستور و قانون، سائنس اور سائنسی اداروں، معلومات عامہ، سیاسیات، سیر و سفر، صحت و طب، علی گڑھ تحریک، برصغیر کی دوسری اصلاحی، ادبی، سیاسی تحریکات، فلسفہ و نفسیات، فنون لطیفہ، کتابیات، لسانیات، مذہبیات، معاشیات، اقتصادیات، مکتوبات، ممالک و بلاد وغیرہ وغیرہ مختلف عنوانوں پر بہت سے گرانقدر اور بیش قیمت تحقیقی مقالے پیش کئے۔ اس فہرست کو دیکھ کر اس کے تنوع اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام عنوانات پر خاصا مواد مہیا ہوگیا ہے۔ مندرجہ ذیل عنوانات پر تو بلا شبہ معرکہ کی کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اقبالیات، سرسید، مجاہدین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء علی گڑھ تحریک، قائداعظم اور تحریک پاکستان، تعلیم، لسانیات وغیرہ پر بیش قیمت مقالے پیش کئے۔

العلم میں اس پچیس ۲۵ سال کے عرصے میں تقریباً پانسو سے زیادہ اشخاص پر چھوٹے بڑے مقالے اور مضمون لکھے گئے ہیں ان میں نامور علماء، صوفیا، شعراء، ادباء، حکماء، ماہرین تعلیم، سیاست دان، فلسفی سبھی شامل ہیں اس طرح العلم کے ان مقالات کے ذریعے مشاہیر ملک و قوم کے حالات و سوانح پر کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

العلم کا یوں تو ہر شمارہ مختلف النوع تحقیقی و علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر اس نے اپنی اس پچیس ۲۵ سالہ مدت میں دو خاص نمبر جنگ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء اور غالب نمبر پیش کئے۔

العلم کا جنگ آزادی نمبر نہ صرف مقبول ہوا بلکہ اس شمارے کی اشاعت کے بعد اس عنوان پر برصغیر پاک و ہند میں جو ادب پیش ہوا اس میں اس نمبر سے اخذ و اقتباس کیا گیا اور اسکے حوالے دیئے گئے بلکہ بعض مستقل کتابوں میں اس خاص نمبر کے مقالے شائع کئے گئے۔ اس خاص نمبر کے متعلق میجر جنرل اکبر خان لکھتے ہیں۔

"آپ کی محنت، عزم اور استقلال کی داد دیتا ہوں جنگ آزادی نمبر بہت قابل قدر ہے العلم کے اس خاص نمبر کے تمام مضامین اچھے ہیں اور اس جنگ کے مختلف پہلوؤں پر ان سے روشنی پڑتی ہے" پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب لکھتے ہیں

"جنگ آزادی پر العلم کا شمارہ مل گیا تھا۔ اس سے پہلے بہت سے رسالے اور اخبار اس مضمون پر نظر سے گذر چکے تھے۔ الحمدللہ یہ شمارہ اپنے مضامین اور دیدہ زیب سرورق کے حساب سے کسی سے کم نہیں تھا۔"

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب رقمطراز ہیں۔

"العلم کا آزادی نمبر اس قدر مقبول ہوا کہ دسیوں اشخاص مجھ سے لے کر پڑھ چکے ہیں اور تقاضے بدستور ہیں"

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں العلم کا غالب نمبر شائع ہوا۔ اس نمبر میں راقم الحروف کی ناچیز مساعی بھی شریک رہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ غالب نمبر بھی خاصا مقبول ہوا۔ ملک کے نامور محققین اور ادیبوں نے ان کی پذیرائی کی اور ہمت افزائی کا اظہار کیا۔ مثلاً۔

پیر حسام الدین راشدی کا اظہار خیال

"العلم کا غالب نمبر ملا۔ پڑھا ہر ایک ورق اور ہر ایک مضمون پر دل سے دعائیں نکلیں بلا مبالغہ آپ نے اور آپ کے رفقاء نے مضامین جمع کرنے اور ان کو سلیقے سے شائع کرنے میں نہ فقط بڑی زحمت اٹھائی ہے بلکہ کمال کر دیا ہے نقاص

طور پر ایسے وقت میں جبکہ لکھنے والوں کے لیے غالب پیر تسمہ پا
بنا ہوا ہے۔

حضرت ملا واحدی کا ارشاد ہے۔

"العلم کا شاندار غالب نمبر شائع کرنے پر میری دلی مبارکباد
قبول کیجئے۔ غالب نمبر صرف شاہکار اور بھاری بھرکم ہی نہیں
ہے بلکہ مضامین کے اعتبار سے بھی بہت کامیاب، پُر از معلومات
اور دلچسپ ہے۔

مولوی عبداللہ قریشی مدیر "ادبی دنیا" (لاہور) کی رائے۔

"العلم کا غالب نمبر ملا۔ آپ نے مضامین کی جمع و ترتیب
میں جو محنت اور جگر کاوی کی ہے اسکی داد دیئے بغیر نہیں رہ
سکتا۔ غالب کے حالات و سوانح، شعر و شاعری، علم و فن، زبان
و بیان، تلامذہ و احباب، تحریرات در دواوین وغیرہ مختلف موضوعات
پر اتنے عمدہ معلومات افزا مضامین کا یکجا کر دینا کوئی آسان بات
نہیں کوئی بھی اہم ضروری گوشہ ایسا نہیں ہے جسے آپ نے
نظر انداز کر دیا یا تشنہ چھوڑ دیا ہو غالبیات میں اس خصوصی شمارے
کو بلند مقام حاصل رہے گا۔"

جناب ابن انشاء کی رائے۔

"العلم کا غالب نمبر ملا۔ اب تک جو جو غالب نمبر نکلے ہیں
یہ ان سب پر بھاری ہے۔ غالب نمبر "العلم" اور خصوصاً غالب نمبر
کے بارے میں ایک ممتاز دانشور شمشیر خان صاحب اپنی قابل
قدر کتاب "پاکستان کے منتخبہ ادبی اردو رسائل کا تاریخی،
تنقیدی و ادبی جائزہ" میں رقم طراز ہیں۔

"تقریباً اسی سال (جولائی ۱۹۵۱ء) اکیڈیمی آف
ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک سہ
ماہی مجلہ "العلم" کے نام سے شائع کیا جو ایک بلند پایہ علمی
و ادبی مجلہ ہے جس میں تحقیقی، تاریخی، تذکرہ، سیرت نگاری
تعلیمات، تاریخ و سیاسیات، فنون لطیفہ وغیرہ پر مضامین
شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔[1]

العلم کے مختلف النوع علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی
تاریخی اور مذہبی مقالات کے علاوہ اس کے اداریئے بھی خاص
طور سے قابل توجہ ہوتے ہیں جن میں العلم کے فاضل مدیر
کا تجربہ، تبحر علمی، حالات حاضرہ پر نظر رکھی، بین الممالکتی علمی
سیاسیات پر رائے، تعلیمی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل
کا تجزیہ، یادرفتگان سبھی کچھ ہوتا ہے۔ پھر زبان و بیان پر
پوری قدرت نہ افراط نہ تفریط۔

العلم کے یہ اداریئے چونکہ دوامی حیثیت کے ہوتے
ہیں اس لیئے ان کی مدد سے "تعلیمی مسائل"، "حاصل مطالعہ
و راہی دراہ نما"، "چند محسن چند دوست"، اور "مقالات بریلوی"
وغیرہ کئی کتابیں تیار ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

العلم کا ایک مستقل عنوان "بزم کانفرنس" ہے جس
کے تحت العلم کے ناظرین و قارئین اور کانفرنس سے دلچسپی رکھنے
والے حضرات کے خطوط شائع ہوتے ہیں۔ دراصل یہ کانفرنس کے
کاموں کی سہ ماہی رپورٹ ہوتی ہے، ان خطوط کی اشاعت میں بھی
بریلوی صاحب کی چابک دستی کام کرتی نظر آتی ہے، فاضل مدیر،
القاب و آداب اپنی ذات کے متعلق مدح و توصیف کے فقروں
اور مکتوب نگار کے انکساری جملوں کو حذف کرکے زیادہ تر
نفس مضمون شائع کرتے ہیں یہ عنوان ایسا ہے کہ اس کے
ذریعے برصغیر کے اکابر و مشاہیر کے بہت سے خطوط اور تحریریں
محفوظ ہو گئی ہیں، ان میں تنقید و تبصرہ بھی ہوتا ہے۔ اور تحسین
و ستائش بھی ——— مدیر العلم کی یہ فراخ دلی اور عالی

[1] پاکستان کے منتخبہ ادبی اردو رسائل کا تاریخی، تنقیدی و ادبی جائزہ از شمشیر خان (کراچی ۱۹۷۵ء) ص ۸۵-۸۶

حوصلگی ہے، کہ وہ جس طرح تعریف و توصیف شائع کرتے ہیں اسی طرح تنقید کو بھی شامل اشاعت کرتے ہیں۔

العلم میں تبصرہ نگاری "تعارف" کے تحت آتی ہے تبصرہ نگار کا قلم مائل بہ توازن و اعتدال رہتا ہے۔ نہ وہ تحسین و تعریف میدان میں سرپٹ دوڑتا ہے، اور نہ تنقیص و تردید کی وادیوں میں بھٹکتا ہے تبصرہ نگار کے پیش نظر ہمیشہ رہتا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب میں کیا چیز ہے یہ نہیں دیکھتا کہ اس میں کیا چیز نہیں ہے، پھر وہ کتاب، مؤلف کتاب اور حلقۂ قارئین کو بھی ذہن میں رکھتا ہے۔

العلم میں ایک خاص چیز "تراشے" "ادب پارے" ہوتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اکثر صفحات کے کچھ حصے خالی رہ جاتے ہیں، فاضل مدیران جگہوں پر بعض علمی و ادبی اور تاریخی کتابوں کا کوئی منتخب پیراگراف جو حاصل کتاب ہوتا ہے۔ ٹانک دیتے ہیں۔ یہ تراشے، ادب عالیہ کا بہترین نمونہ، انشاء کا شاہکار۔ گلستان کا کوئی سبق یا نصیحت کا کرن پھول معلوم ہوتے ہیں۔

العلم کی یہ ساری بہار اور کامیابی اسکے فاضل مدیر سید الطاف علی بریلوی کے دیرینہ تجربے اور انتھک محنت کی رہین منت ہے، بریلوی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے، کہ وہ اپنے طلب اور گوں کے آدمی خوب تلاش کر لیتے ہیں۔ اور رفقاء کی ایک جماعت بنا لیتے ہیں۔ جو نام و نمود اور صلہ و ستائش سے بے پروا ہو کر ان کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اور ان کے ہر کام میں ان کی معین و مددگار ہوتی ہے۔ ان کے یہاں حرف "واحد متکلم" کا صیغہ نہیں ہوتا ہے بلکہ "جمع حاضر" کی گردان ہوتی ہے اور یہ بڑی خوبی ہے ورنہ بالعموم اس قسم کے علمی و ادبی اداروں میں ایک شخص "معین" کی ذات ہی سب کچھ ہوتی ہے

العلم نے اس ۲۵ پچیس سالہ دور میں برصغیر کے مندرجہ ذیل اکابر و مشاہیر کا العلم کو علمی تعاون حاصل رہا مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ڈاکٹر زبید احمد، ڈاکٹر وحید قریشی پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا محمد میاں، ڈاکٹر غلام سرور، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، سید محمد تقی (سابق مدیر جنگ) نصر الدین ہاشمی، نجیب اشرف ندوی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، محمود اکبر آبادی، ڈاکٹر ممتاز حسن، مولوی محمد امین زبیری پروفیسر رشید احمد صدیقی، مسلم ضیائی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پیر حسام الدین راشدی، قاضی عبدالودود، نادم سیتاپوری، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ملا واحدی، شیخ اسماعیل پانی پتی، مولانا امتیاز علی عرشی، مولانا عبدالمجید سالک۔

اسی طرح ذیل میں ہم ان حضرات کی ایک فہرست پیش کر رہے ہیں جن کو ہم العلم کا مستقل مقالہ نگار کہہ سکتے ہیں اور جن کا علمی تعاون ہمہ وقت العلم کو حاصل رہا ہے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی حاجی خصلت حسین صابری پروفیسر حامی اکبر خان، مولانا حفیظ اللہ پھلواری، ثناء الحق صدیقی محمد ایوب قادری، مصطفیٰ علی بریلوی، اخلاص حسین زبیری، محترمہ انیس فاطمہ، جلیل احمد قدوائی، رشید احمد ارشد، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، انعام عظیم برنی، محمد حسین خان زبیری، حاجی محمد نور، نعمب اختر، ڈاکٹر قطب الدین عزیز، ڈاکٹر عبدالغفور بسمل مرزا علی اظہر برلاس، ناظر کاکوروی پروفیسر عبدالمجید قریشی، ڈاکٹر کیپٹن محمد ایوب سخاوت مرزا، وحید احمد مسعود، محمد احمد صدیقی۔ وغیرہ وغیرہ۔

المختصر العلم نے اس ۲۵ پچیس سالہ مدت میں جو علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت قابل قدر اور بیش قیمت ہیں۔ ⁘

سرسیّد احمد خاں — ایک ترقی پسند مفکّر

جناب محمد علی صدیقی

سرسید احمد خان کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں
ہ ایک زبردست تاریخی اہمیت کی نادرِ روزگار اور ہمہ جہتی شخصیت
یں۔ برصغیر ہی کیا انیسویں صدی کے پورے عالم اسلام میں
ن کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ سرسید سے زیادہ یا کم اہم مصلح ہر جگہ مل
لتا ہے لیکن ایسا جسے سرسید کہہ سکیں، ناممکن ہے۔ سرسید بے پناہ
قیقت پرست تھے۔ وہ اپنی قوم کے شاندار ماضی کی خواب آور یادیں
گائے بغیر حال کی درشتی اور نامساعدت کو قبول کرتے ہوئے
ستقبل کی ایک لاہی تعمیر میں مصروف تھے جس پر آج کے ہم
و "بزدلی" کا الزام تو لگا سکتے ہیں لیکن کوتاہ بینی کا نہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ سرسید کے ۱۸۹۸ میں انتقال کے
عد سرسید فہمی میں جتنا اضافہ ہوا ہے اتنا ہی سرسید کے خلاف تعصبات
یں بھی۔ اور ان دونوں رجحانات کو دائیں اور بائیں بازو کی
سیاست سے اس درجہ خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ ایک سامراج دشمن
قوم پرست اور غالی مذہبی کے لئے سرسید بہت ہی زہرناک شخصیت
ہیں۔ درحقیقت یہ سب کچھ غنیمت پسندانہ تاریخی تعصبات کا اثر
ہے جن کے تحت تاریخ افراد کے ذہن میں بنتی اور سنورتی ہے
جب سماجی و معاشی قوتیں اور قانونِ جدلیت کی عمل داری سے
انحراف ہی تاریخ فہمی کی بنیاد ہو تو پھر سکونی کائنات کے دکلار
کو حرکت، تعامل اور اشیاء اور مظاہر کے درمیان باہم ارتباط
کیوں کر نظر آئے۔؟

—×—

اس مضمون میں سرسید کے حق میں جذباتی گفتگو
تو ہمارا پورا ماحول کر رہا ہے چاہے زبان سے اس امر کی تصدیق
نہ کرے۔ تبدیلی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ماضی کی وکالت حال اور
مستقبل کو منہ چڑائے بغیر نہیں ہو رہی، اسلامی فکر کو نئے دباؤ
کا سامنا ہے۔ کل کا "کفر" چپکے سے داخلِ "ایمان" کر لیا جاتا ہے
یعنی کل جو متروک تھا وہ آج مقبول ٹھہرتا ہے۔ اب ترقی نسواں
سائنس و ٹکنالوجی اور اندھی تقلید کے موضوعات تو "پرانے"
ہو چکے ہیں بے حجابی، برہنگی کا دور دورہ ہے اور سرسید کے
ترقیٔ نسواں کے نظریہ پر تو آج کے رجعت پسند بھی سر دھنتے ہیں
کیونکہ اس نظریے کی رو سے یونیورسٹی کیمپس میں لڑکیوں کی
طرف سے مرد وارڈن کی تقرری کا مطالبہ تو نہیں ہوتا۔

الغرض سرسید کی بہت سی باتیں آج رجعت پسندی
میں داخل ہیں لیکن عقل کی برتری، غور و فکر کی اہمیت اور
نئے زمانے کے نئے علوم کی طرف جھکاؤ آج بھی قابلِ عمل ہیں۔
سرسید کے یہاں عقل، فکر، علم کی تثلیث پر اس قدر زور
ہے کہ صرف اسی بنیاد پر وہ ملت مدید تک ہمارے سماج
کے بہت سے حلقوں اور حصوں میں، ترقی پسندی، کے

ماڈل رہیں گے۔ ایک ایسے ماڈل جس کے تتبع سے بہت زیادہ فرسودگی سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے اور روشن خیالی کو کسی حد تک اپنایا جاسکتا ہے۔

سرسید پر اعتراضات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اتنی ہی طویل جتنی ان کا ۲۹ نکاتی منشور یا اتنی ہی پیچیدہ جتنی سرسید کے زمانے میں سب سے آسان کام ماضی پرستی اور تجدد بیزاری تھا سو وہ بہت سوں نے انجام دیا اور اس میں وہ انگریز دشمن کا مستزاد جذبہ شامل کرکے اپنے نقصان دہ اثرات کو کافی عرصے تک چھپانے پر قادر بھی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل کام انگریز کے خلاف ایسی مسلح بغاوت جسے ہم آج مہم جوئی کا نام نہ دے سکتے جیسا کہ آج کے روشن خیال بزرگ، انقلاب انقلاب کا نعرہ بلند کرنے والے جوشیلے نوجوانوں کے لیے کہا کرتے ہیں۔

ایک اور کام یہ ہو سکتا تھا کہ انگریزی عملداری کے سامنے صرف سربسجود رہا جاتا۔ انگریز پادری شعائر اسلامی کا مذاق اڑائیں تو کیا، یوپی کا گورنر پیغمبر اسلام کے خلاف نازیبا کتاب لکھے تو کیا۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو "وہابی" قرار دے کر ان کی بستیوں کو تاراج کرنے کے منصوبے بنائے جارہے ہوں تو کیا، اسلام کو عقل دشمن مذہب قرار دیا جارہا ہو تو کیا اسلام کو تہذیب و ترقی کے راستے میں مانع ثابت کیا جارہا ہو تو کیا، ہندوستانیوں کو صحافت، میونسپل انتظامیہ، ملازمت اور تعلیم کے میدان سے بھگایا بلکہ دھکے دے کر باہر نکالا جارہا ہو تو کیا۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ برصغیر کی سب سے بڑی مذہبی برادری انگریزوں کو اپنا نجات دہندہ قرار دے رہی ہو، راجہ رام موہن رائے عیسائیت اور ہندومت کی قلم لگا کر برہمو سماج کی بنیاد ڈال رہے ہوں اور ہندوستانی قومیت کی بنیاد ہندو ماضی پر رکھی جارہی ہو جس کے بطن سے بقول پنڈت جواہر لعل نہرو، مسلم قوم پرستی نکلی ہو تو ایسی صورت میں ایک ایسے شخص کی پیدائش جو عوام کی کافی بڑی جمعیت کو جوش کی بجائے ہوش، تقلید کی بجائے غور و فکر، توہمات اور وسوسوں کی بجائے اعتماد و یقین اور فرسودہ تعلیم کی بجائے زندہ تعلیم کا درس دے، ترقی پسندی میں کم از کم راجہ رام موہن رائے سے تو کم نہیں۔ سرسید نے تو ترکی لباس اور چھری کانٹے کی تائید کی تھی، راجہ رام موہن رائے کی طرح برہمو سماج جیسے مذہبی فرقے کی بنیاد تو نہیں رکھی تھی، جس کا سیاسی مذہب انگریز دوستی اور روحانی مسلک عیسائیت دوستی تھا۔

سرسید مسلم ہندوستان کے دور زوال میں خود اداری کے وہ منارۂ روشنی ہیں جس نے اپنی قوم کے پورے سماجی، معاشی، اخلاقی، اور مادی رشتوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور اپنی تمام تر انگریز پرستی کے باوجود اپنی قوم کے جسد بیمار کو صحت یاب اور توانا دیکھنے کے لیے اسے ایک ایسا قاموسی ENCYCLOPEDIC تناظر بہم پہنچایا جس سے علم تاریخ، علم مدن، تفسیر، عمرانیات، ادب، فلسفہ اور علم الکلام پر محیط سارے رخ منور ہوتے چلے گئے۔ اس میں کیا شک ہے کہ وہ سرسید کی اپنی فکر سے منور ہوئے اور یہ وہ دانشور جو کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے جب قدماء سے الگ ہٹ کر سوچتا ہے تو بہت سے غیر روشن حصوں کو روشن اور بہت سے روشن حصوں کو نا روشن کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ دھوپ اور چھاؤں کا کھیل ہے اور ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ جو دور قدما کے علم کو منجمد اور متعین رکھنے پر زور دیتا ہے وہ مآل کار تاریخ کے اٹل قوانین کے سامنے ہتھیار

ال دیتا ہے اور اس طرح جدلیاتی عمل میں تعطل تو ضرور پیدا کر دیتا ہے لیکن اگلی نسل کو خود سے زیادہ زود حس بنا کر اپنا زخم تازہ کر جاتا ہے۔

۱۸۱۷ء میں جب سرسید دہلی کے ایک اہم خاندان میں پیدا ہوئے تو دہلی پر انگریزوں کی عملداری کا زمانہ شروع ہوئے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔ اسے ان کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کہیئے کہ وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے اس کے پاس دلی کے بادشاہ بلکہ لال قلعے کے بادشاہ اور انگریزوں کی طاقت کے بارے میں ناقابل تردید حقائق پہلے تھے۔ سرسید چاہے کچھ بھی ہوتے لیکن خوابوں کی دنیا میں رہنے والے رومانوی آدمی ہونے پر قادر نہیں تھے۔ سرسید کے دادا سید ہادی۔ مغل بادشاہ کے منصرم مالگذاری تھے، اور ان کے نانا خواجہ فرید الدین بھی ایک عالم متبحر تھے جنھوں نے مغل اور انگریز ڈپلومیسی کا ذائقہ چکھا تھا اور علامہ تفضل حسین لکھنوی کی شاگردی کی وجہ سے مغربی علوم (مع لاطینی) سے خوب اچھی طرح بہرہ مند تھے۔ سرسید اپنے نانا کے زیر اثر تھے۔ اس زمانے کے ہندوستان کے پڑھے لکھے آدمی کے لیے ہندوستانی قومیت یا انگریزوں کو دیس نکالا دینے والے خیالات بہت دور از کار نظر آتے تھے۔ کلکتہ اپنی دلفریبی اور مغربیت میں ہندوستانیوں کے لیے بیک وقت «ایک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے» اور انفعال کا پیغام تھا۔ اٹھارویں صدی کا صنعتی انقلاب انیسویں صدی کے کلکتے کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا اور ہر چند کہ شروع میں سرسید آئین اکبری کی طباعت کے فراق میں گرفتار تھے لیکن جوں جوں زیادہ سے زیادہ حقائق بہم ہوتے چلے گئے وہ مشرقی علوم کو مغربی علوم کے مقابلے میں پس ماندہ جاننے لگے۔ مغلوں نے طباعت کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ خود عثمانیوں نے اٹھارویں صدی تک چھاپہ خانے کو حرام قرار دے رکھا تھا۔ پورا عالم اسلام عباسی دور کے مکتبی درس اور ہندوستان کے درس نظامی کی طلسمی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا جس میں سائنس، سیاست، اور تقابلی مذاہب و فلسفہ جیسا کوئی مضمون نہیں تھا تربیت اور علم میں بہت بُعد تھا۔ تقلید پرستی کا دور دورہ تھا۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو لفظ ہندوستان کے مضمرات اور جغرافیائی حدود کا اندازہ نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ایک شہر سے انگریزوں کو بھگا دینے کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا کہ پورا ہندوستان وہی ایک شہر تھا اور ادھر انگریز کا تار برقی پورے شمالی علاقے کے محاذ کو شطرنج کے کھیل کی طرح سمجھنے میں مدد دے رہا تھا۔ ایک شہر مئی میں ہاتھوں سے نکلا۔ ایک ہزار میل دور سے کمک طلب کی گئی اور اگست ستمبر تک دوبارہ واپس لے لیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ٹیلی گرافی کے پس پشت قوانین طبیعیات تو کیا ہم تو سڑکوں کے دونوں طرف گڑے ہوئے تار کے کھمبوں سے بھی ناواقف تھے۔

سرسید نے جمود کی فضا میں سانس لیا۔ غالب کے مقابلے میں آئین اکبری کی طباعت لوٹک کے دور میں وہ رجعت پسند بھی کہلائے لیکن وہ تین چیزیں ضرور جانتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزی عملداری کی وسعت اور طاقت، انگریزی سامراج کی بین الاقوامی حیثیت اور خود اپنی قوم کی بے پناہ پس ماندگی۔

۱۸۳۸ء میں وہ انگریزی حکومت کا اس وقت ایک حصہ بن گئے، جب انھوں نے اپنے ماموں مولوی خلیل اللہ خان صدر امین (دھلی) کی عدالت میں سررشتہ داری قبول کر لی۔ ان کی زندگی میں دوسرا بڑا انقلاب اپنے بھائی سید محمد کے انتقال سے پیدا ہوا۔ یہ ۱۸۴۸ء کی بات ہے اور اپنی موت تک سرسید کی

[و]ضع قطع - مع داڑھی۔ اس سانحے کا براہ راست ردعمل تھا انھوں [نے] مغلی لباس چھوڑ کر ترکی لباس اپنا لیا۔ ہندوستان میں اخبارات [کی] ترقی سے سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ دور ممالک کی خبریں [پ]ڑھنے کو ملنے لگیں۔ مسلمان مدیران زیادہ تر اسلامی ممالک کی خبروں [می]ں دلچسپی لیتے تھے اور اسی زمانے سے ترکی مسلمانان پاک و ہند کا محبوب ملک رہا ہے۔ سرسید کی ترکی ٹوپی اسی محبت و اخوت کی علامت تھی۔

سرسید ذاتی زندگی میں رقیق القلب تھے لیکن غیر ذاتی زندگی میں بہت ہی با اصول۔ تاریخ اور حالات حاضرہ کے اچھے طالب علم ہونے کی وجہ سے انھیں بخوبی علم تھا کہ مغل حکومت تو اسی دن ختم ہو گئی تھی جب ۱۷۵۹ء میں عالمگیر ثانی کو اسکے دزیر غازی الدین عماد الملک نے قتل کر دیا تھا۔

شاہ عالم ثانی کے زمانے میں سلطنت کا محض ایک تصور باقی رہ گیا تھا۔ بادشاہ نے مرہٹوں کی مدد سے ۱۷۷۱ء میں دلی واپس ہونے کے بعد کچھ عرصہ ہی گذارا تھا کہ ۱۸۰۳ء میں انگریز آدھمکے اور اب بادشاہ سلامت کی حیثیت ایک محترم قیدی کی سی تھی، انگریزوں نے بادشاہ سے "تاج برطانیہ کے زیر سایہ عزت و سکون کی بحالی" کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے کے الفاظ اور ان کی روح سے سرسید واقف ہو چلے تھے اور شاید اسی لیے ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہی اس خیال کے حامی بن گئے تھے کہ مفتوح قوم، فاتح قوم کو میدان جنگ میں شکست نہ دے سکے تو اس کی حکمت عملی، تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ڈپلومیسی کے میدان میں فتح حاصل کرنے کی کوشش کرے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک صدیوں کے منجمد افکار کو نئے تقاضوں کے مطابق نہ بنایا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اجتہاد سے کنارہ کش ہو چکا ہے اور اگر اجتہاد سماجی ترقی کے لیے اکسیر ہے تو اجتہاد دشمنی زہر ہوتی ہے ۱۸۶۴ء میں مجلس ترجمہ کی بنیاد کا مقصد نئے علوم اور موضوعات تک رسائی تھا۔ ۱۸۶۶ء میں سائینٹیفک سوسائٹی اس کام کی ترقی یافتہ شکل تھی اور ۱۸۷۵ء میں اینگلو محمڈن اسکول کی بنیاد اسی جذبہ کی ایک ٹھوس شکل تھی۔

—— × ——

۱۸۵۷ء کے بعد ہم سرسید کی زبان پر لفظ قوم کی تکرار دیکھتے ہیں، اس تکرار کی وجہ غالباً یہ تھی کہ روحانی معنوں میں قوم کا تصور وطنی قوم کے تصور سے متصادم بلکہ کہیں کہیں قطعاً لاتعلق تھا۔

سرسید نے ہندی مسلمانوں کے لیے قوم ۔ قوم ۰ کی مالا جپنی شروع کی تو اس کے پس منظر میں ہندو معلمین کی زبان پر ہندو قوم کا ورد اور انگریزوں کی طرف سے ہندوستانی قومیت کی نشو و نما کا فیصلہ تھا ورنہ اٹھارویں صدی تک انگریز برصغیر کو کثیر الاقوام براعظم سمجھتے آئے تھے لیکن انتظامی مصلحتوں کی بنیاد پر جب ہندوستانی قوم اور ملک ہندوستان سے مراد برطانوی عملداری کے زیر انتظام انبوہ آبادی اور جغرافیائی علاقہ لیا جانے لگا تو کچھ ہندو، مسلمان اور انگریز سب کے سب "قوم" کی جدید تعریف کا دم بھرنے لگے۔ لیکن یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ۷۰-۱۸۶۹ء میں سفر لندن اور دوران قیام لندن تک سرسید کے نزدیک شمالی ہندوستان کے لوگ ہی ایک قوم تھے۔ علی گڑھ اسکول کے قیام کے بعد قوم کا حدود اربعہ پورے برصغیر میں بسنے والی قوم ہو گئی۔ گو سرسید علی گڑھ کالج کے سلسلے میں چندہ کی مہم میں کبھی وندھیاچل سے نیچے ...

سکے پار نہیں گئے تھے

ہرچند کہ سرسید کی انگریز دوستی مبارک و مسعود نہیں
تھی لیکن ان کی انگریز دوستی کسی طاقتور اور فعال قوم کے فرد کی
برابری کی سطح کی دوستی نہیں تھی۔ یہ ایک کمزور کی مضبوط اور
ایک مصلحت کوش کی اولی الامر سے دوستی تھی لیکن ہر صورت
میں وقتی تیاری سے عبارت کی جاسکتی ہے۔ سرسید کی انگریز دوستی
کے بارے میں سوچتے وقت یہ ضروری ہے کہ ہم شاہ ولی اللہ
شاہ عبدالعزیز کی تعلیمات سے ان کی عقیدت کو ملحوظ خاطر رکھیں
اور ساتھ ہی شاہ اسمٰعیل کے انگریزوں کے مسلمانوں کے تعلقات
کے بارے میں فتوی پر غور کریں جو ۱۸۵۷ء سے تقریباً تیس
سال پہلے جاری ہوا تھا۔ اس فتوی میں صاف صاف مندرج
تھا کہ انگریزی دور میں مسلمانوں کے لیئے شعائر مذہبی کی بجا آوری
میں موانع درپیش نہیں ہیں۔ اس لیئے انگریزوں کے خلاف
جہاد درست نہیں ہے۔ پھر ۱۸۲۳ء میں شاہ عبدالعزیز نے
بھی ایک کالج میں انگریزی کے حق میں فتوی دے کر روشن خیالی
کی راہ ہموار کی تھی۔ لیکن غدر کے بعد وہابیوں کے خلاف اس
زور شور کا پروپیگنڈہ شروع ہوا تھا کہ مولانا محمد علی قصوری اپنی
تصنیف مشاہدات کابل و یاغستان میں رقم فرماتے ہیں کہ مولانا
عبیداللہ سندھی تک وہابیوں کے بارے میں انگریزوں کے پروپیگنڈہ
سے متاثر رہے تو پھر اوروں کا تو کیا ٹھکانہ۔ اگر سرسید جیسا متوازن
شخص اسباب بغاوت ہند میں بہت جرأت کے ساتھ انگریزوں
کے نظام حکومت کی خامیوں کی علی الاعلان نشاندہی نہ کرتا
تو واللہ اعلم ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کا اور کیا کچھ حشر ہوتا۔
۱۸۵۰ء کے بعد مکہ کے حنفی، مالکی اور شافعی علماء نے بھی ہندوستان
کو دارالسلام قرار دے دیا تھا اور ۱۸۷۰ء میں شمالی ہند کے بہت
سے علماء نے مولوی عبدالحئی لکھنوی کے ساتھ جس فتوی پر دستخط
کیئے تھے اس کے بعد سرسید کی انگریز دوستی دراصل ایک فعال اقلیت
کا رویہ بن گئی تھی اور اگر ہم پورے ملک کے سماجی و سیاسی تناظر
میں اس رویے کا جائزہ لیں تو سرسید پر انگلی اٹھانے سے پہلے
ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہندوستانی قوم پرستی کی پوری تحریک بشمول
انڈین نیشنل کانگریس انگریزوں کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہی
تھی۔ سرسید پر اعتراضات صرف اسی وقت ممکن ہیں جب ہم ان
جیسے افراد کے سلسلے میں کسی قسم کی دو عملی کا مظاہرہ نہ کریں۔
۱۹۰۵ء تک کی انڈین کانگریس کو ۱۹۰۶ء میں قائم شدہ مسلم لیگ
سے، کم از کم انگریزوں کی سرپرستی کی حد تک، زیادہ مختلف
نہیں سمجھا جا سکتا۔

رجنی پالمے دت نے اپنی کتاب
INDIA TODAY (1940) میں یہ خیال ظاہر کیا
ہے کہ برصغیر میں قوم پرستانہ تحریک ان سماجی حالات سے پیدا ہوئی
تھی جو سامراجی استحصال کا نتیجہ تھے۔ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے
ہندوستانی بورژوازی اور برطانوی بورژوازی کے درمیان
مسابقت کو معاشی کشمکش کے اٹل قانون کی حیثیت حاصل ہوگئی
تھی۔ میکالے کے نظام تعلیم کے مقاصد لاکھ سامراجی ہوں لیکن
پھر بھی ملٹن، بائرن اور شیلے کے حریت پسندانہ خیالات کا ہندوستانی
طلباء پر کچھ نہ کچھ اثر پڑنے لگا تھا۔

کارل مارکس نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہرچند برطانوی
حکومت "خبیث ترین مفادات" کے تابع تھی لیکن اس نے برصغیر
کی سماجی و معاشی ترقی میں تاریخ کے ایک "لاشعوری آلہ" کا
کردار انجام دیا ہے۔ سامراجی مقاصد کے تحت حکومت اور تعلیم
نے ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کے ساتھ ساتھ صفت قوم

رستی اور LOCAL SELF GOVT. کو ترقی دی جس سے جمہوریت کے لیئے میدان تیار ہوا۔ رجنی پامے دت آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: انیسویں صدی کے نصف اول میں برطانوی حکومت ہندوستانی سماج کی رجعت پسندانہ اور جاگیردارانہ قوتوں سے نبرد آزمائی اور ابتلا کے ذریعے ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کر رہی تھی (P. 252 - 253) ان کے خیال میں راجہ رام موہن رائے بھی اپنے دور کے ترقی پسند تھے۔

بہتر یہ ہے کہ ہم علی گڑھ کالج کے موسس کی حیثیت سے سرسید کو انگریزی اثرات کے درآمد کنندہ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ غدر سے بہت پہلے بنارس سنسکرت کالج (۱۷۹۱) کلکتہ ہندو کالج (۱۸۱۶) بشپس کالج کلکتہ (۱۸۲۰) سنسکرت کالج کلکتہ (۱۸۲۴) اور دہلی عربک کالج (۱۸۲۴) کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ پھر اور بھی بہت سی یونیورسٹیاں معرض وجود میں آئیں۔ علی گڑھ تو خالصتاً مسلمانوں کی تعلیمی اور اس کے نتیجہ میں انتظامی میدان میں پسماندگی کو کم کرنے کی طرف ایک قدم تھا لیکن اگر ہم سفرنامہ پنجاب کی تقاریر پر غور کریں تو سرسید نے شروع ہی سے ہندوؤں پر اس یونیورسٹی کے دروازے وا کر دیئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دنوں بہت سے ہندو قوم پرست مسلمانوں میں نامقبول تھے جب کہ سرسید کے دورۂ پنجاب میں وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی ان کا والہانہ استقبال کیا اور چندے دیئے

سرسید کی مخالفت میں جہل، عدم واقفیت اور موروثی تعصبات کو بہت دخل ہے سرسید کی سب سے زیادہ مخالفت ترقی پسندوں کو کرنی چاہیئے تھی چونکہ سرسید کی انگریز دوستی میں سامراج دوستی بھی شامل ہے لیکن اس کے باوجود نیاز، مجنوں، اختر حسین رائے پوری، فراق، سجاد ظہیر، احتشام حسین، سید سبط حسن ممتاز حسین اور آل احمد سرور نے سرسید سے کافی جگہوں پر اختلاف رائے کے باوجود سائنس، ٹکنالوجی اور جدید شعور کی ترقی میں ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ اور یہ کچھ کم اہمیت کی بات نہیں ہے کہ سرسید اپنی "غیر مقبول" سیاست کے باوجود "ترقی پسند" تھے۔

سرسید کی مخالفت، ان کے رسالہ کلمتہ الحق (۱۸۴۹) رسالہ دربیان تصور شیخ (۱۸۵۲) کی وجہ سے ہو، یا وہابیوں کی طرف سے ہو۔ جو سرسید کی جانب سے سواداعظم کو 'وہابیت' کے الزام سے مبرا قرار دینے کی کوشش پر برہم نظر آتے ہیں یا ان قوم پرست حضرات کی جانب سے جو دو قومی نظریے کو سرسید کے دماغ کی اختراع سمجھ کر PHENOMENON سے زیادہ IDEA کو گردن زدنی سمجھتے ہیں، ان کے جذباتی حمایتی زیادہ تر علی گڑھ تحریک کے متاثرین ہیں یا معروضیت اور سائنسی فکر پر یقین رکھنے والے حضرات۔ یہ لوگ سرسید کی سیاست کو ناپسند کرتے ہوئے بھی برصغیر میں سائنسی فکر کی نشوونما اور روحانی قومیت کے ساتھ ساتھ وطنی قومیت پر سرسید کے اصرار کو انیسویں صدی کے نصف آخر کی ترقی پسندانہ کاوش خیال کرتے ہیں۔

جیسا کہ رجنی پامے دت کا خیال ہے کہ ہندوستانی قوم پرستی کی نشوونما مخصوص سماجی حالات کا نتیجہ ہے، بعینہ سرسید نے جس نوع کی قوم پرستی کی ترویج کی اس کے پس پشت بھی تعلیم کے ذریعے معاشرتی تبدیلی کا عینیت پسندانہ خواب ہے۔ سرسید کی صحیح تفہیم کے لیئے ضروری ہے کہ ہم سرسید کو بطور ایک سماجی مصلح کے دیکھیں کہ اس روپ میں انھوں نے سب سے زیادہ خطرناک اور دلچسپ جنگیں لڑی ہیں اور ان جنگوں ہی میں وہ ملحد، زندیق، نیچری اور کرستان ٹھہرے اور انھیں جنگوں میں ان کی ثابت قدمی نے انھیں انیسویں صدی کے

مسلم برصغیر کا سب سے بڑا آدمی بنا دیا ہے ۔

رسالہ تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰) کے اجراء کے ساتھ ہی سرسید کے مشہور و معروف ۲۹ نکات سامنے آتے ہیں ۔ یہ نکات علم و عمل کی ایک دنیا ہیں ۔ "نامہذب" "قوم کو" "تہذیب یافتہ" "قوم کی پوری کا درس ہیں ۔ کورانہ تقلید کے خلاف بغاوت ہیں ۔ علم کے ساتھ ساتھ تربیت کی اہمیت کے خوگر ہیں ۔ اجتہاد کے خواہاں ہیں ۔ حریت فکر کے نقیب ہیں ۔ عقل و فہم کی بالا دستی کے داعی ہیں ۔ درستئ عقائد کی طرف اشارہ ہیں ۔ ہنر و فن و حرفہ کی اہمیت ، کلام ، لہجہ ، ضبط اوقات ، اخلاق ، صدق مقال ، تمدنی نسواں ، غلامی ، تعلیم اطفال ، خود غرضی ، کثرت ازدواج ، تدبیر منزل ، رسومات شادی ، رسومات عزت ، غیرت ، غمی ، طریق زندگی ، صفائی ، طرز لباس ، طریق اکل شرب ، مذہبی مسائل کی تحقیق اور تصحیح ، ترقی زراعت اور تجارت کے معاملات پر بہت ہی نتائجی PRAGMATIC آراء ہیں جو اگر زوال پذیر سماج کے لیئے قابل قبول ہوتیں تو وہ پھر زوال پذیر سماج ہی کیوں ہوتا ۔

ان مندرجہ بالا نکات میں وہ کون سا نکتہ ہے جس کے بارے میں سرسید یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے ہوں کہ اس میدان میں قوم کو اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں ۔ آزادئ رائے ہی کو لے لیجیئے اور اس سے سرسید کے یہاں اجتہاد کی اہمیت کا اندازہ لگایئے ۔ کورانہ تقلید کے بارے میں سرسید کا خیال تھا کہ وہ سماجی ترقی کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے ۔

سرسید کے یہاں مذہب اور رسوم کے دو علحدہ علحدہ خانے ہیں ۔ تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے میں اپنے مشن کا یوں اعلان کرتے ہیں :

" اس کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سولائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں ، وہ رفع ہو ۔ وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلا دیں ۔ سولزیشن یا تہذیب کے معنی نہایت وسیع ہیں اور اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت ، تمدن ، طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز آتی ہے ...."

سرسید نے اس کے بعد ایک اور قدم بڑھایا اور اعلان کیا :

"....... بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قومی کے بڑے مانع ہیں ۔ پس ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ کیا اسلامی مذہب بھی ایسا ہے"

سرسید نے اس قسم کے خیالات سے بہت سی دشمنیاں مول لیں ۔ وہ اجتہاد کے قائل تھے ۔ سرسید نے قرآن کو واحد اصول دینی قرار دیا اور اس طرح انھوں نے اسلامی فکر کی تشکیل نو میں ایک اہم رول انجام دیا ۔ سرسید سماجی مصلح کی

حیثیت سے بہت دلچسپ شخصیت ہیں۔ ان کے یہاں نئے علوم سے سمجھوتہ اور پرانے رسوم سے اس درجہ ناپسندیدگی ملتی ہے کہ وہ ترکی کے سلطان محمود خان کے تتبع میں تہذیب کے راستے میں کسی رکاوٹ کو پسند نہیں کرتے تھے۔

—— × ——

ایک اور خاصیت جو سر سید احمد خان کو ترقی پسند اور سکہ بند ترقی پسند بناتی ہے وہ ان کی امید اور ایقان سے شیفتگی ہے "ترقی" کا لفظ سر سید کی تحریروں میں سیکڑوں مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سر سید مایوسی اور قنوطیت کے بے حد خلاف تھے چونکہ مایوسی اور قنوطیت انسان کی امنگوں کو ختم کر کے عملی قوتوں کو شل کر دیتی ہے۔ ترقی کی راہیں مسدود اور بگڑے ہوئے حالات کو بہتر بنانے کے امکانات کو معدوم کر دیتی ہے۔ سر سید نے اپنی قوم کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے پایا تھا اور اگر اس صورت حال میں جلد ہی کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تو اصلاح معاشرہ کی ہر کوشش ناممکن ہو جاتی۔ اس لیے وہ ہر جگہ امید کے سہارے آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے یہاں امید بہت بڑی طاقت ہے۔ جس طرح یاد پچھلی باتوں کو بلاتی ہے اسی طرح امید آئندہ درپیش آنے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے۔ امید روح انسانی ہے اور امید کا دامن، زندگی کا دامن ہے۔ زندگی کے تحائف سے لطف اندوزی کا نام ہے اور زندگی کے چیلنج کو قبول کرنے کا نام۔

—— × ——

اب آخر میں ہم سر سید کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات اور برصغیر کی آئینی ترقی میں ان کے رول کا مختصر جائزہ لیتے ہیں تاکہ ان کا کردار اپنی پوری معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے آ سکے۔

اگر ہم اسباب بغاوت ہند، عیسائی مبلغین کی ہرزہ سرائیوں پر سر سید کے اعتراضات ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSALMANS کے جواب میں ان کا تبصرہ۔ سر ولیم میور کی کتاب LIFE OF MOHAMMED کے جواب میں خطبات احمدیہ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید نے جہاں ممکن ہوا اور مناسب سمجھا انگریزی نقطہ نظر کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے دوران اکثر مواقع پر انھوں نے انگریز حاکموں سے کھری کھری باتیں کہیں اور بسا اوقات ان کا رویہ ہندو قوم پرستوں سے کہیں زیادہ تیکھا اور براہ راست ہوتا تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ راجہ رام موہن رائے اور بنکم چندر چٹرجی تو آسانی سے قوم پرست اور ترقی پسند ٹھہرتے ہیں اور موخر الذکر تو اپنی تمام تر فرقہ پرستی کے باوجود جس کے تریلنے نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر آتے ہی فرقہ پرستوں کو ایک ایسا موقع فراہم کر دیا جس کے بعد ہندو مسلم اختلافات کی خلیج بڑھتی ہی چلی گئی لیکن سر سید "مسلمان فرقہ پرست" کہلاتے ہوئے بھی اپنے سفر پنجاب (۱۸۸۴) میں ہندو اور مسلمان کو دو آنکھیں کہنے کی بجائے اپنی ایک آنکھ قرار دیتے ہیں لیکن آنند ماٹھ اور اس جیسے اور فرقہ پرستانہ لٹریچر کی طباعت کے بعد ہندو اور مسلمانوں کو وطنی اعتبار سے ایک ہی قوم تسلیم کرنے والا سر سید ۱۸۸۷ء میں مسلم دشمن لٹریچر کے روز افزوں اضافے سے بجھ سا گیا اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی طرح ہمیں بھی یہ تسلیم

کر لینا چاہیئے کہ تنگ نظر ہندو قوم پرستی نے مسلم قوم پرستی کو جنم دیا۔

قومیں مصلحین سے اپنی ضروریات کے مطابق پروگرام اور حوصلہ طلب کرتی ہیں۔ سرسید کے پاس پروگرام بھی تھا اور حوصلہ بھی۔ سرسید نے امید اور رجائیت پر زور دیا۔ یاس اور قنوطیت کے خلاف مورچہ لگایا۔ مقدور بھر معروضی حقائق اور سیاسی روی کے درمیان سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنی پوری زندگی کو کہنگی کی جگہ تازگی، جمود کی جگہ حرکت، توہم کی جگہ تعقل کے لیئے کام کرتے گذارا۔

ان کا پروگرام جمود کو حرکت میں بدلنا تھا کہ اسطرح قومی انتشار کی جگہ قومی اتحاد ممکن ہو سکتا تھا۔ ہمارے مسائل کا کوئی حل سرسید کے احاطے میں داخل ہوئے بغیر نظر نہیں آتا۔ یہ اور بات ہے کہ زندگی کی ضروریات نے سرسید کو صرف ایک ضروری سنگ میل بنا کر رکھ دیا ہے۔ زندگی مستقل حرکت ہے اور سرسید کی خوبی یہی ہے کہ وہ اس کی گواہی دیتے ہیں۔

سیّد احمد خاں

معاذ اللہ وہ تاریکی سوادِ کفر و ظلمت کی
فضا ساکت ہوائیں سرد خوابستانِ غفلت کی

فضائے ہند پر چھائی تھی اک افسردگی ہر سو
بلاؤں کی طرح منڈلا رہی تھی تیرگی ہر سو

تصورِ صبح کا گم تھا دماغ شب پرستاں میں
تجلی سو رہی تھی سینۂ مہر درخشاں میں

بلائیں فتنۂ دوراں کی چوکھٹ چوم کر اٹھیں
گھٹائیں کالی کالی ہر طرف سے جھوم کر اٹھیں

ہواؤں کے تھپیڑوں میں بجھی تھی شمع مضمحل دل کی
مسافر کے لئے گم ہو چکی تھی راہ منزل کی

ارادے راستہ بھولے کچھ ایسی تیرگی چھائی
قریب روشنی دینے لگے غولان صحرائی

وہ نکلا دفعتاً سینے سے تاریکی کے اک تارا
وہ تارا جس کو کہیئے مطلع مشرق کا سیارہ

وہ تارا سب سے پہلے جس نے کھولی آنکھ طوفاں میں
وہ تارا جو پیام روز روشن تھا شبستاں میں

وہ تارا دیکھ کر اٹھے سارے شبستانی
جبیں پر جس کے لکھی تھی حدیث صبح نورانی

وہ تارا جس کی تابش سے طلوع شمس کا دھوکہ
وہ تارا جس کی تابش سے نظر آنے لگا رستا

وہ تارا جس کو کہئے اختر تقدیر گمراہاں
وہ تارا جس کو کہئے سید مرحوم احمد خاں

پروفیسر جمیل مظہری

تعلیم اور اسلامی معاشرت

از

جناب خواجہ غلام السیدین
(سابق سیکرٹری شعبہ تعلیمی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

ہندوستان میں تعلیم قدیم کے زمانے میں دورہم
ہاہم ہونے تقریباً ایک صدی ہوچکی ہے (۱۹۳۶ء میں) اور
اس سے کچھ زیادہ عرصہ ہمارے یہاں انگریزی تعلیم کو شروع
ہوئے گزرا ہے۔ تاریخ عالم میں اس زمانے کو ایک خاص
اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں دنیا میں بہت سے
زبردست معاشرتی اور اقتصادی انقلابات ظہور پذیر ہوئے
ہیں جنھوں نے نہ صرف مادی زندگی اور اس کے نظام کی
کایا پلٹ کر دی ہے۔ بلکہ انسانوں کے خیالات اور عقائد
میں ایک تزلزل ڈال دیا ہے۔ اس کا جو اثر مغربی ممالک
کی تہذیب اور تمدن پر پڑا اس سے بحث کرنے کی یہاں
ضرورت اور موقع نہیں۔ لیکن ان انقلابات کی ایک مخصوص
اور انوکھی صفت یہ ہے کہ انھوں نے تمام دنیا کو ایک
ایسے شیرازے میں منسلک کر دیا ہے اور انحصار باہمی
کو اس قدر شدید بنا دیا ہے کہ دنیا کا کوئی حصہ بھی ایسے
اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا جو دوسرے حصوں میں کارفرما
ہوں۔ لہٰذا ان تمام تبدیلیوں کا ردّعمل ہمارے ملک پر بھی
ہوا۔ ماہرین تعلیم کا فرض اوّل یہ تھا کہ ان تبدیلیوں کی
نوعیت کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے، ان کے اسباب اور نتائج
سے بحث کرتے اور یہ معلوم کرتے کہ ان حالات میں
تعلیم کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔
ابتدا میں انگریزی تعلیم جن.......

. . . .

مقاصد اور اغراض سے شروع ہوئی وہ اب لوگوں کو
بخوبی معلوم ہو چکے ہیں اور ان کی آنکھوں سے وہ خیرگی
دور ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے بعض پیشرووں کو اپنی
تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت میں ہر چیز ناقص اور
خام نظر آتی تھی۔ اور نجات کی صورت محض یہی تھی کہ
مغربی تمدن اور تعلیم کو بلا تنقید اور تمام و کمال قبول کر لیا
جائے۔ لہٰذا اب قومی زندگی کے موجودہ دور میں یہ
سوال نہایت شدت کے ساتھ اٹھنا چاہیئے تھا کہ

ہم اس جدید تعلیم کے ذریعے کس قسم کا نظام معاشرت وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اب تک صراحت کے ساتھ یہ اہم اور بنیادی مسئلہ نہیں اٹھایا گیا۔ بلکہ یہ کہنا شاید صحیح ہوگا کہ ابھی کو پوری طرح اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ تعلیم اور نظام معاشرت کا کس قدر قریبی اور گہرا تعلق ہے اور جب تک ایک قوم اپنے سامنے کوئی معین اور واضح معاشرتی نصب العین نہ رکھیے اس وقت تک وہ ایک زندہ اور اثر آفریں نظام تعلیم کی تشکیل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کے تعلیمی اصولوں اور طریقوں کی ہدایت کے لیے اس کے اساتذہ کی ہمت افزائی کے لیے کوئی بلند تخیل شمع راہ کا کام نہیں دیتا، امتحان پاس کرانا، چند طلباء کو سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کرنا، نوشت و خواند کو عام کرنا، یا بحد کمال قوم میں علوم کی اشاعت کے لیے سعی کرنا یہ تمام مقاصد سطحی اور سرسری ہیں۔ ان میں وہ قوت متحرکہ نہیں ہے جو قوموں اور افراد میں نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی بدولت یہ ممکن ہے کہ بعض افراد ذاتی وجاہت حاصل کر سکیں، یا قوم میں بحیثیت مجموعی مادی اعتبار سے ترقی کی صورت پیدا ہو جائے لیکن قومی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی اصولوں اور قدروں کی کارفرمائی نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم حقیقت سے بالکل ہٹی ہوئی ہے اور بجائے قومی زندگی اور معاشرت کی اصلاح اور تعمیر کرنے کے وہ ضمنی اور غیر اہم مقاصد میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اس لیے ماہرین تعلیم کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ جرأت کے ساتھ اس مسئلے پر غور کریں کہ موجودہ ناقص اور نامکمل نظام معاشرت کے بجائے کس قسم کی سوسائٹی قائم کرنا چاہیے۔ اور اس کے قیام کے لیے کیا وسائل اور تدابیر اختیار کرنی ضروری ہیں۔ جب تک ہم اپنی تنگ نظر یا ذہنی جرأت کی کمی کی وجہ سے اس بنیادی مسئلے کو نہیں اٹھائیں گے، ہماری قومی تعلیم کی حیثیت ایک جسد بے روح سے بہتر نہیں ہوگی۔

تعلیم کا جو مقصد میں نے اس تمہید کے دوران پیش نظر رکھا ہے وہ کسی قدر صراحت کا طالب ہے۔ کیونکہ وہ مروجہ رسمی مفہوم تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ اگر ہم تعلیمی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ نظری اور عملی طور پر بالعموم تعلیم کا مقصد یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ انسانی تہذیب و تمدن کے تمام ورثے کو جو گزشتہ زمانوں میں حاصل ہوا ہے مناسب طریقے پر نوخیز نسلوں کے سپرد کر دے یعنی وہ تمام علوم و فنون ادب اور فلسفہ سیاسی اور معاشرتی اصول اور روایات جو نسل انسانی نے اپنے ارتقاء کے دوران مرتب اور مجتمع کیے ہیں ان کو نصاب تعلیم کے ذریعے بتدریج طلبہ کے ذہن میں منتقل کرنے بے شک یہ ایک نہایت مفید اور ضروری خدمت ہے جس کے بغیر انسان بربریت کے دور سے گزر کر تمدن کے مدارج طے نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں ذاتی اور نوعی تحصیلات کے تحفظ کا جذبہ اس قدر قوی ہے کہ خواہ تعلیم کا نظریہ کچھ بھی قرار پائے اس کا ایک کام یہ ضرور ہوگا کہ وہ ان تحصیلات کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کر دے۔

لیکن یہ تعلیم کا صرف ایک پہلو ہے۔ اجتماعی زندگی کا دارومدار ایک طرف تو تمدنی اور ذہنی ورثے سے مستفید ہونے پر ہے اور دوسری طرف اس کی ترقی اور حیات کا راز اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ مسلسل اس ورثے کی تنقید اور تجزیہ کرتی رہے اور اس میں ان مناسب تبدیلیوں کو رائج کرے جو ضروریات زمانہ کے لحاظ سے مفید اور اہم ہوں۔ اگر سوسائٹی

یم جو سوسائٹی کے دماغ کا کام دیتی ہے، مروجہ تمدن اور اس
ام اصولوں اور اداروں کو تمام وکمال بغیر چون وچرا کے تسلیم
ے اور انہیں ایک اٹل اور نہ بدلنے والی چیز سمجھ کر بچوں اور
الوں کو مقررہ سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے تو اس
رجعت پسندی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور وہ ترقی اور
بیتی پیہم کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔ دنیا میں ہر قسم کی ترقی اور
ترقی کا راز ہمیشہ حریت فکر، جدت میں پنہاں رہا ہے
جیسا کہ میں آگے چل کر واضح کروں گا موجودہ زمانے میں جن
ی قوتیں بروئے کار آگئی ہیں کہ گزشتہ تمام زمانوں سے زیادہ
بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں میں غور وفکر اور اجتہاد ذہنی کی
فات کی تربیت کی جائے۔ تاکہ وہ زمانے کے سریع مطالبات کو پورا
سکیں۔ اس وجہ سے تعلیم کا دوسرا اور نہایت اہم کام یہ ہے
وہ پیہم اس تمدنی ورثے کی تنقیدی ترتیب نو کرتی رہے۔ اپنے
صاب تعلیم اور تمام اثرات اور اداروں کے ذریعے صرف اس کے
بہترین عناصر اور قدروں کی اشاعت کرے اور تعلیم یافتہ
جماعت میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ وہ آزادی اور متانت کے
ساتھ اس کے حسن وقبح پر نظر ڈال سکیں۔ اور بجائے ہر چیز کو
بے حس حیوانات کی طرح قبول کر لینے یا ہر چیز کو غیر ذمہ دارانہ
طریقہ پر رد کر دینے کے۔ قدیم اور جدید دونوں کو بہترین
اصول اخلاق وعمل پر پرکھیں اور زندگی کی رہنمائی کے لیے ایسی
عقل کی بہم رسانی کریں جو ادب خوردہ دل بھی ہو۔ یہ عقل
جو شخصی اور اجتماعی مفاد دونوں کو پیش نظر رکھے گی تعلیم
کے ذریعے نہ صرف علوم وفنون کی اشاعت کرے گی اور افراد
کو کسب معاش کے لیے تیار کرے گی بلکہ ایسے رجحانات اور
قوتوں کو دعوت عمل دے گی جو نظام تمدن کی بنیاد زیادہ
معقول اور منصفانہ اصولوں پر قائم کر سکتی ہیں۔

گزشتہ زمانوں میں آج کل کی نسبت انسانی زندگی میں
تبدیلیاں زیادہ آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طریقے پر ہوتی
تھیں اور سوائے بعض نہایت انقلاب آفریں زمانوں کے
(مثلاً حضرت عیسیٰ یا آنحضرتؐ کا زمانۂ بعثت) جب نظام
کہن لوگوں کے دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہو گیا تھا۔ بالعموم
ان تبدیلیوں کی رفتار اس قدر سست تھی کہ لوگوں کو ان سے
سمجھنے اور ان کی ضروریات کے مطابق اپنے خیال وعمل کو ترمیم
کرنے میں چنداں دقت نہ ہوتی تھی۔ سوسائٹی کا "چوکھٹ"
اپنی جگہ پر قائم تھا۔ لوگوں اور جماعتوں کی تقسیم اور امتیازات
عام طور پر مسلّمہ سمجھے جاتے تھے۔ زیادہ تر تبدیلیوں کا تعلق
جزئیات سے ہوتا تھا۔ بنیادی امور سے ان کو تعلق نہ تھا ایسی
حالت میں یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ تمدن کی محافظت
کو تعلیم کا فرض اول قرار دیا جائے اور وہ اسے کم وبیش جوں کا
توں آنے والی نسل کے سپرد کر دے۔ لیکن گزشتہ دو سو برس
میں سائنس کی ترقی نے اس مقابلتہً پُرامن و پُرسکون دنیا میں
ہلچل مچا دی ہے اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے نہ صرف ان کی مادی
زندگی اور وسائل معاش میں بلکہ ان کے خیالات اور عقائد،
ان کے نظریوں، ان کے رسوم وروایات میں انقلاب عظیم پیدا
کر دیا ہے۔ جہاں تک زندگی کے خارجی نظام کا تعلق ہے یہ
بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس دو سو برس کے
عرصے میں جس قدر تبدیلیاں اس میں ہوئی ہیں وہ اس سے پہلے
دو ہزار برس میں بھی نہیں ہوئیں۔ ان تیز رفتار تبدیلیوں کا
تقاضا یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں میں اس قسم کی صلاحیت
پیدا کی جائے کہ وہ نئے حالات کے اقتضا کو سمجھیں اور دانشمندی

کے ساتھ ان نئی قوتوں کو استعمال کرنا سیکھیں جو سائنس نے فراہم کی ہیں۔ سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی نے جہاں ایک طرف ہمیں یہ بتایا ہے کہ غافل جماعتیں فطرت کی اٹل اور زبردست طاقتوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہاں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر ان کو سمجھ کر استعمال کیا جائے تو انسان خود اپنی تقدیر اور اپنے مستقبل کا معمار بن سکتا ہے۔ اور گویا خالق کائنات کا شریک کار بن کر اس دنیائے آب و گل کی تعمیر میں ایک نمایاں حصہ لے سکتا ہے اگر سائنس کی حقیقت نما روشنی میں آپ عالم کے کارخانے پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی مکمل چیز نہیں ہے بلکہ ابھی ناتمام اور ناپختہ کار ہے اور خالق کائنات نے اپنی مصلحت سے اس میں یہ گنجائش رکھی ہے کہ انسان اپنی کوششوں سے اس کے نظام کو زیادہ مکمل اور زیادہ منفعت خیز بنائے۔ اگر وہ اس کو ہر لحاظ سے کامل بنا دیتا تو انسانی سعی اور جد و جہد کے لیے کیا موقع رہ جاتا شاید اسی نکتے کو غالب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

لہذا اس دور ارتقا میں جہاں سائنس کی حرکت آفریں طاقت ہے ہمیں سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم جس نظام تمدن کے سائے میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ کوئی اٹل اور نہ بدلنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں بے اندازہ ترمیم اور اصلاح کی گنجائش ہے اور انسان کا ناخن تدبیر اس کی بہت سی ایسی گتھیاں سلجھا سکتا ہے جن کی وجہ سے انسان صدیوں سے مختلف قسم کی محرومیوں، ناکامیوں اور مظالم کا شکار رہا ہے۔ اگر سائنس کی قوتوں کے ساتھ اخلاق اور مذہب کے سچے اصول مشعل راہ بن جائیں تو ہم اس دنیائے کہن کی جدید تعمیر عدل اور انسانیت کے اصولوں پر کر سکتے ہیں لیکن ان دونوں چیزوں میں سے ایک چیز یعنی سائنس کو حاصل کر لیا ہے اور اس کے ذریعے اس نے تقریباً تمام عالم مادی اور اس کی زبردست قوتوں کو اپنا خادم بنا لیا ہے لیکن قوتوں کے استعمال میں افراد اور جماعتوں نے اصول اخلاق کی پیروی نہیں کی اور بسا اوقات ان کو تعمیر اور خدمت کے بجائے تخریب اور تسلط کا آلہ بنا لیا۔ اس کا نتیجہ ہم آج یہ دیکھتے ہیں کہ تمام قوتیں جو انسانی زندگی کے لیے رحمت ثابت ہو سکتی تھیں عذاب بن گئی ہیں اور سیاسی اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں ہم آہنگی رواداری اور صلح پیدا ہونے کے بجائے باہمی مخالفت اور کشمکش اور ظلم کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال کے:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

لیکن یورپ میں جس قدر بڑے بڑے اہل فکر ہیں وہ خود اس صورت حال سے متوحش اور بیزار ہیں ان کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ وہ اس ہلاکت آفریں نظام تمدن کے بجائے کسی بہتر نظام کی بنا ڈالیں مگر ہمارے ارباب فکر و عمل کو بہ حیثیت مجموعی ابھی اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور ہماری معاشرت کی تنظیم بالقصد ہونے کے بجائے فطرت کی اَن بوجھی بے جانی

قوانین کی، تحت ہو رہی ہے۔

---------- X ----------

اگر ہم اپنے ملک کی طرف متوجہ ہو کر اس کے نظام تمدن و معاشرت پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ایک عبرت انگیز نقشہ نظر آئے گا میرے خیال میں کسی سوسائٹی کی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے بہترین معیار یہ ہے کہ آیا اس سوسائٹی کے تعلقات اور مراسم اصول عدل پر قائم ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی ملک یا معاشرہ علم اور دولت اور قوت اور فنون لطیفہ کے اعتبار سے معراج کمال کو بھی پہنچ جائے لیکن اسکے افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں عدل، اخوت اور مساوات کی کارفرمائی نہ ہو تو اس کا تمدن اور تہذیب دونوں ناقص اور ناپائدار ہیں یونان کی تہذیب سے لے کر موجودہ مغربی تمدن تک تاریخ اس صداقت کی تائید کرتی ہے اور اسلام کا سب سے بڑا احسان عالم انسانیت پر یہی ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ وضاحت کے ساتھ اور عملی شکل میں اخوت، مساوات اور عدل کا ایک عالم گیر پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا لیکن رفتہ رفتہ اس قدر مدت گزر جانے کے بعد نہ صرف ہندوستان میں بلکہ خالص اسلامی ممالک میں بھی اسلام کے نمونے انفع العالمین کے رخ روشن پر خود غرضی، جاہ پسندی اور بے انصافی کی نقاب کھنچ گئی ہے۔ آج ہم اپنے اس ملک میں باوجود ہر قسم کی اصلاحی کوششوں کے لوگوں کو مختلف معاشرتی اور اقتصادی جماعتوں میں تقسیم پاتے ہیں جو ایک دوسرے کو لفظی یا معنوی اعتبار سے اچھوت سمجھتی ہیں، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق غصب کرکے اپنی قوت کو ناانصافی کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہاں دولت کو امانت الٰہی یا خدمت خلق کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے محض ذاتی منفعت اور اقتدار کا وسیلہ بنا لیا گیا ہے اور اس کی مدد سے ہر قسم کی جائز اور ناجائز مراعات حاصل کی جاتی ہیں اور ہر قسم کے مظالم اور حق تلفیوں پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بے اندازہ ثروت اور ناگفتہ بہ افلاس پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی تمام زندگی حیوانوں کی طرح محض اپنے اور اپنے مالکوں کے لیے کسب معاش کی جدوجہد میں صرف کر دیتے ہیں اور ان پر علم اور تعلیم، تہذیب اور فنون لطیفہ، فرصت اور آسائش کے دروازے قطعاً بند ہیں۔ اندھی تعلیم اور مذہب کی طرف سے بے پروائی نے تعلیم یافتہ، نوکری پیشہ طبقے اور عوام میں ایسا فصل پیدا کر دیا ہے کہ ہم تھوڑے سے لوگوں کو جو مقابلتاً آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ ہماری اس فارغ البالی کی قیمت وہ تاریک زندگیاں ہیں جو ہمارے باقی تمام ابنائے جنس اور ہم وطن بسر کر رہے ہیں۔ مذہب بنی نوع انسان کی یکجہتی اور اخوت کا احساس پیدا کر سکتا تھا مگر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے اور تعلیم نے ایسے تخیل کی تربیت نہیں کی جو دوسروں کے اور اپنے درد کی گرفت کو مٹا دے جو پیغمبر اسلام صلعم کے اس ارشاد کو مسلمانوں کا جزو عمل بنا دے کہ :-

"اس شخص کا ایمان ہرگز پختہ نہیں کہ جو اپنے لیے چیز پسند کرتا ہے اور اپنے بھائیوں کے لیے نہیں ..."

اسی معاشرتی ابتری کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہمارے یہاں تک "شرفا" اور محنت پیشہ مزدوروں میں تفریق اور ... کیا جاتا ہے۔ اور جس مذہب نے "الکاسب حبیب اللہ" ... انقلاب آفریں تعلیم دی تھی اس کے پیرو عملاً یہ سمجھتے ہیں کہ ... کی پہچان دولت یا سرکاری نوکری اور ہاتھ کا کام ... کرنا ہے! گویا جو شخص جوتا بنائے وہ ذلیل ہے، جو جو ...

وہ شریف ہے، جو شخص کپڑا بنے وہ ذلیل ہے۔ جو اُسے زیب تن کرے وہ شریف۔ ان تمام خلافِ عقل اور خلافِ عدل تفرقوں کی وجہ سے ہماری سوسائٹی کا شیرازہ بالکل منتشر ہوگیا ہے اور جب تک اس کی تنظیم جدید اس طرح نہ کی جائے کہ اس کے مختلف عناصر میں یکجہتی پیدا ہو اور امیر و غریب، عالم اور جاہل میں جو افتراق و مقاصد راہ پاگیا ہے اس کا تدارک کیا جائے موجودہ صورت حال کی اصلاح نہیں ہوگی اور جو خون رلانے والا نقشہ حالی مرحوم نے اپنی نظم میں کھینچا تھا وہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ یعنی :۔

جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا!
اب جنگ و جدل چار دل طرف اس میں بپا ہے؟
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے، مفلس سو گدا ہے
دولت ہے نہ عزت، نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے
جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے!

اس وقت بھی خواہانِ قوم و ملک اور ماہرینِ تعلیم کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہی ہے کہ اس تمدن کی تعمیر نو کس طرح کی جائے جس کی بنا، بقول حالی کے "پانی پر ہے"۔

اس مختصر مضمون کی حدود میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں لہٰذا بہت اختصار کے ساتھ گویا بطور متن کے چند ضروری امور کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

پہلی بات جو اقوام مشرق کو بالعموم اور ہمیں بالخصوص طے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہم مغربی سائنس اور اس کے جزو لازم یعنی موجودہ صنعت و حرفت کے نظام کو قبول کریں یا مسترد۔ ایک مخلص اور ذی اثر طبقہ ملک میں ایسے لوگوں کا ہے جو اس جدید بدعت کو ترک کرنے اور زندگی کے قدیم سادہ نظام کو قائم رکھنے کی تلقین دیتا ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ یورپ میں نظام سرمایہ داری اور سائنس کی قوتوں نے کس قدر فساد اور ظلم برپا کیا ہے۔ لیکن یہ خیال میرے نزدیک قابل عمل نہیں۔ اوّل تو سائنس کی نئی ایجادات اور ترقیوں نے تمام دنیا کے ممالک کو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور وابستہ کر دیا تھا کہ کوئی ملک دنیا کے رجحانات اور اثرات سے خود کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ مشورہ ایک شکست خوردہ ذہنیت پر دلالت کرتا ہے جو سائنس جیسے قابل قدر عطیۂ فطرت کو محض اس کے ضمنی خطرات سے خوفزدہ ہو کر مسترد کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ انسانی کمال اور کامرانی اس میں ہے کہ ہم سائنس کی قوتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں۔ لیکن ان کو انسانی خدمت اور بہبود کے لیے استعمال کریں۔ اور انھیں کے ذریعے انسانوں کو اس کی چیرہ دستی اور ظلم سے محفوظ رکھیں۔ اسلام کی مخصوص تعلیم بھی یہی ہے کہ انسان اس عالم آب و گل کی زندگی اور اس کی کشمکش اور جدوجہد میں پورا پورا حصہ لے اور اس کی قوتوں اور خطروں کو مردانہ وار زیر کرے کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دنیا "مایا کا جال" نہیں بلکہ "مزرعۃ الآخرۃ" ہے اور اس کی تسخیر کا راز مطالعۂ فطرت اور فکر و تدبر میں

پنہاں ہے۔ لہٰذا ایک سچا مسلمان کسی حالت میں بھی ترک
دنیا پر قانع نہیں ہو سکتا اور اگر وہ شعار "ترک" اختیار
کرتا ہے تو وہ جس کی شان یہ بتائی گئی ہے کہ :۔

؎ کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری!

یہاں ... اسلامی تمدن اور مغربی تمدن کا راستہ
ایک ہی ہے کیونکہ اس بارے میں مغربی تمدن نے ان اصولوں
سے خوشہ چینی کی ہے جو اسلام نے عرب کی سنگلاخ زمین میں
بوئے تھے اور جن کے پھل پھول مصر اور ہسپانیہ، شام اور بغداد
کی تہذیبوں میں رونما ہوتے لیکن یہاں پہنچ کر دو راستے ہو جاتے
ہیں ایک راستہ وہ ہے جس پر مغرب کے جدید تمدن کی ارتقاء
ہوئی ہے۔ وہ راستہ جو مجنونانہ خود غرضی اور باہمی رقابت
کی طرف لیجاتا ہے۔ جس میں بعض چالاک، بے اصول اور کج راہ
لوگوں اور جماعتوں نے سائنس کی قوتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا
کر باقی انسانوں کے حقوق تلف کر کے انہیں اپنا غلام بنا لیا ہے
دوسرا راستہ وہ ہے جو اسلام نے ساڑھے تیرہ سو برس ہوتے
دکھایا تھا اور جس کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مستقبل کی معاشرت
کی تعمیر کامیابی کے ساتھ صرف اسی راستے پر چل کر ہو سکتی ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے کیوں ایک
شکست خوردہ، معذرت آمیز انداز اختیار کر رکھا ہے ۔
جیسے وہ ایک بالکل پسماندہ اور تہی مایہ جماعت ہوں، جن کے
پاس ہندوستانی تہذیب کے کیسے کے لیے کوئی بیش بہا عطیہ
نہ ہو، اور جن کے جد و جہد اور تخیل کی حد پرواز یہی ہو کہ وہ
دوسروں کے دسترخوان کے گرے ہوئے ٹکڑوں میں سے جتنا مل
سکے جھپٹ لیں، مسلمان اپنی موجودہ حالت سے خائف اور
مایوس ہو کر یہ بھی بھول گئے کہ وہ ایک ایسے بلیغ اور تخلیقی پیغام
کے امین ہیں جس میں دنیائے جدید کی تعمیر کا بھید پنہاں ہے
اور وہ تمام خصوصیات جو ایک متحرک، ترقی پذیر اور عادل
سوسائٹی میں ہونی چاہئیں۔ اسلامی تمدن کا جزو لازم ہیں
میں اشارۃً بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خصوصیات کیا ہیں ؟

اول ۔ اسلام نے انسانی زندگی کا جو آئیڈیل پیش کیا
ہے اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم سائنس کی ان جدید
قوتوں کو ذاتی جلب منفعت کے لیے نہیں بلکہ منشائے الٰہی کی
تکمیل کے لیے استعمال کریں یعنی دنیا میں عدل اور اخوت ہمدردی
اور خدمت کے حیات بخش اصولوں کی اشاعت اور تبلیغ کریں
اسلام کے لفظی معنی ہیں کہ انسان رضائے الٰہی کے سامنے اپنا
سر تسلیم جھکا دے اور ایک سچے مسلمان کا سب سے برتر اور بلند
دعویٰ یہی ہو سکتا ہے کہ "قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" ۔ اگر یہ دعویٰ کوئی معنی رکھتا
ہے اور محض زیب داستاں کے لیے نہیں ہے تو اس
سے لازم آتا ہے کہ اسلامی تمدن میں سائنس کو اسی طرح استعمال
کیا جائے کہ اس کی وساطت سے علم اور دولت، صحت اور
فرصت اور تمام مادی و ذہنی آسائشوں کی تقسیم سوسائٹی کے
افراد میں عدل اور مساوات کے اصول پر ہو۔ سائنس کی مدد سے
انسانی تاریخ میں اب پہلی بار اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے
کہ عوام کی زندگی کو اس بیماری، جہالت اور بے اطمینانی سے
پاک کر دیا جائے جو ابتدائے عالم سے آج تک ان پر مسلط رہے
ہیں اور انہیں مختلف خلاف عقل توہمات اور اندیشوں سے
آزاد کر دیا جائے۔ مجھے حال کے ایک امریکی مصنف سے اتفاق ہے
کہ "سائنس، آرٹ اور قوت فکر کی ترقی نے پہلی مرتبہ انسان

کے قبضے میں ایسے وسائل دیئے ہیں جن کی بدولت وہ آزاد ہو سکتے ہیں۔ گذشتہ زمانوں میں عوام کی غلامی کے ذریعے صرف معدودے چند خواص آزادی حاصل کر سکتے تھے (کیونکہ ہر قسم کے وسائل محدود تھے) اور چونکہ کوئی شخص بھی باقی تمام انسانوں سے جدا نہیں ہے لہٰذا اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ آزاد بھی گرفتار تھے۔ اور ان آزادوں کی تہذیب بھی (جو ہمارے غیر معیاری رد سے غیر اسلامی تہذیب تھی) اس غلامی کے اثرات سے آلودہ تھی۔ اب مشین کی بدولت (جو سائنس کا کارنامہ ہے) اور انسان کی نئی خادم ہے سب لوگ آزادی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہی ہے کہ ان جدید قوتوں کو امانت الٰہی سمجھ کر عوام کے فائدے کے لیئے استعمال کیا جائے۔

دوم۔ جہاں تک اقتصادی اور معاشرتی تنظیم کا تعلق ہے اسلام پہلا عالمگیر مذہب ہے جس نے عملاً نسل اور رنگ جماعت اور طریقۂ معاش کے باطل امتیازات کو یک قلم مٹا دیا۔ اور تمام بنی نوع انسان کی اخوت اور یکجہتی کو ایک ایسے زمانے میں تسلیم کرایا جب خدا کے بندے بیشمار گروہوں اور جتھوں میں منقسم تھے۔ اس نے عدل کو "اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" قرار دیا اور مساوات کے انقلاب آفریں اصول کی حمایت کی جو سوسائٹی ان اصولوں کو صداقت اور خلوص سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں راہ دے گی اس کے لیئے لازم آئے گا کہ اپنے تمام افراد کے لیئے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے دروازے کھول دے تاکہ وہ سب اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کر سکیں اور اپنی شخصیت کی تکمیل اور تربیت کر سکیں۔ یہ نہ صرف انصاف کی رو سے ضروری ہے کہ بلکہ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ جو قوم اپنے تمام افراد کے جوہر ذاتی کی تربیت نہیں کرتی وہ علمی اور مالی اعتبار سے کبھی پوری ترقی نہیں کر سکتی۔ سائنس نے تمام افراد اور جماعتوں میں اس قدر گہرا اور حقیقی اتحاد مقاصد قائم کر دیا ہے اور انھیں اس قدر مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کہ وہ تمام اثرات جو امیر و غریب، جاہل اور تعلیم یافتہ، بیکار اور مزدور میں فصل پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ ان تمام امتیازات کو قائم رکھتے ہیں جو محض جماعتوں کے لیئے دولت، فرصت، علم اور فنون لطیفہ کی تخصیص اور باقی کے لیئے افلاس اور جہالت اور حیوانوں کی سی محنت کو عام کرتے ہیں الفراد اور قومی ترقی کے لیئے سم قاتل ہیں)۔ اگر سوسائٹی کا نظام اقتصاد و معاشرت عدل اور مساوات کے اسلامی اصولوں پر قائم ہو جائے تو جماعتوں کے تعلقات میں مروجہ چھین جھپٹ اور جبر و تشدد کی کارفرمائی نہ رہے گی بلکہ لوگوں کے محرکات عمل بہتر ہو جائیں گے اور وہ بجائے مجنونانہ مسابقت اور جنگ و جدل اور وسعت درازی کے ذوق خدمت اور اشتراک عمل کے ساتھ کام کریں گے

موجودہ زمانے میں انسانوں کی زندگی میں سب سے زیادہ شدید اور زبردست محرک عمل اقتصادی ہے اور کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ باہمی مقابلہ اور رقابت، یہ صورت حال حد درجہ افسوسناک ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ اس کو دنیا داری کا خطاب دے کر لوگوں کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے یا انھیں ایک افسردہ قناعت کی تعلیم دی جائے جو لوگ مدت سے اپنے حقوق سے محروم ہیں ان کے لیئے ان حقوق کی خواہش اور ان کی خاطر جد و جہد کرنا عین فطرت انسانی ہے۔ جس کو اسلام نے ان الفاظ میں صریحاً تسلیم کیا تھا۔ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (اور دنیا میں اپنے حصہ کو مت بھولو) لہٰذا اصلاح کی اصل صورت نظام اقتصادی

کی تبدیلی ہے۔

سوم: جس طرح اسلامی تمدن نے اجتماعی تنظیم کے لیے شعائر قرار دیئے ہیں اسی طرح افراد کی تہذیب نفس کے لیے بھی ایسے اصول قائم کر دیئے ہیں جن کے اثرات بہت دور رس ہیں جس سوسائٹی کے افراد توحید کو اصول دین میں سب سے مقدس سمجھتے ہوں ان کو لازم آتا ہے کہ وہ سوائے ذات الٰہی کے کسی دوسری طاقت کے اور سوائے صداقت کے کسی چیز کے سامنے اپنا سر تسلیم خم نہ کریں اسلام نے توحید کی تعلیم دے کر نہ صرف پتھر کے بتوں کی بیخ کنی کر دی بلکہ ان تمام بتوں کا خاتمہ بھی کر دیا جن کے سامنے ہمیشہ سے انسانوں کی گردنیں جھکتی رہی ہیں، یعنی دولت اور ثروت کے سونے کے بت اور ملکی اور سیاسی قوت اور تشدد کے لوہے کے بت ؎

ماسوا را مسلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

لہٰذا اس اسلامی سوسائٹی کے قیام کے لیے جو تعلیم دی جائیگی اسے افراد میں حقیقی جرأت اور خودداری اور ایثار پیدا کرنا چاہیئے جس تعلیم کی بنیاد خوف اور بزدلی اور جبیں سائی کی عادت پر رکھی جاتے وہ سراسر روح اسلام کے منافی ہے۔

چہارم: اسلامی تمدن کی آخری خصوصیت جس کی طرف میں یہاں اشارہ کروں گا یہ ہے کہ وہ عالمگیر رواداری اور سچی بین الاقوامی ذہنیت کا حامی ہے۔ وہ قلعہ بند اور تنگ نظر قومیت کے نصب العین کو مسترد کرتا ہے۔ اس کی نظر میں تمام بنی نوع انسان باوجود اپنے جغرافی اور تاریخی امتیازات کے باوجود نسل ورنگ کے تفرقوں کے باوجود مذاہب و قبائل میں تقسیم ہونے کے ایک خالق کی مخلوق اور ایک خدا کے بندے ہیں لہٰذا کوئی ایسا نظام تمدن جو ان کو مستقل طور پر جنگ آزما اور مخالف جماعتوں میں تقسیم کر دے اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق کی نفی کرتا ہے۔

اسلام اس بات کا روادار نہیں کہ لوگ قومیت اور وطنیت کے سیاسی تصور کو ایک مقدس بت بنا کر اس کی پرستش کرنے لگیں کیونکہ یہی وہ خطرناک جذبہ ہے جس سے فائدہ اٹھا کر آج دنیا کا بہت بڑا حصہ بے اصول مطلق العنان جابروں کے قبضے میں آگیا ہے۔ اور لوگوں کے لیے جائز آزادی اور اظہار خودی کے راستے مسدود ہوگئے ہیں۔ موجودہ تہذیب کے آذر نے جو بت تراشوائے ہیں۔

؎ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

حضرات! یہ ہے اس تمدن کا مختصر اور ناقص سا خاکہ جو اسلام کی تعلیم میں مضمر ہے اور جس کے لیے مستقبل چشم براہ ہے جس کی اس پرآشوب، امن ناآشنا، ہلاکت آفریں زمانے میں تمام قوموں کو اشد ضرورت ہے، عام اس سے کہ وہ اسلام کو بحیثیت ایک مذہب کے قبول کریں یا نہ کریں اس تمدن کو دنیا کے سامنے پیش کرنا، جس کی بنیاد سائنس اور معاشرتی عدل کے ستونوں پر قائم ہوگی؛ ہمارا فرض ہے کیونکہ ہم رسول عربیؐ کے پیغام کے امین ہیں۔ لیکن ہم اس تمدن کو ہرگز زندہ اور قابل عمل حقیقت نہیں بنا سکتے جب تک ہماری تمام اصلاحی اور تعمیری کوششوں میں ان اصولوں کی کارفرمائی نہ ہو اور ہمارے راہ نما اور معاشری انجمنیں اپنے جمود اپنی خود غرضی اور اپنی جاہ پرستی کو چھوڑ کر اس معاشرے کی تنظیم کے لیے اپنی تمام جدوجہد کو وقف نہ کردیں۔

———— X ————

ان تمام ذرائع میں سب سے زیادہ با اثر اور وقیع ادارہ تعلیم کا ہے کیونکہ اس کے ذریعے ہم اپنی نوخیز نسلوں میں ان بہتر اور صحیح تر خیالات اور قدروں کی اشاعت کر سکتے ہیں

میں یہاں یہ بحث نہیں کر سکتا کہ تعلیم پر اس تمدنی نصب العین کے کیا اثرات ہوں گے لیکن ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ بقول علامہ اقبال مدظلہ العالی کے ۔

" زندگی اپنے حوالی میں کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ قانون جس کو قرآن نے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے ۔"

حضرات ! زندگی کی گہرائیوں میں اس انقلاب کا پیدا کرنا اور انسانوں کے ضمیر میں ایک نئی دنیا کا متشکل کرنا تعلیم کا اہم ترین اور مقدس ترین فرض ہے اور جب تک ہماری تعلیم اس طرف متوجہ نہ ہوگی اس میں اور قومی زندگی میں کوئی صحیح اور پر ورشتہ قائم نہ ہوگا۔ اور وہ ایسی ہی سرسری، اور بے روح اور مصنوعی رہے گی جیسی اب ہے لیکن اگر تعلیم نئی دنیا اور نئے آدم کی تخلیق میں خلوص اور یکجہتی کے ساتھ کوشاں ہو تو اب انسان کے قبضۂ قدرت میں ایسے وسائل اور ذرائع موجود ہیں جن کی مدد سے اس خواب کی تعبیر پوری ہو سکتی ہے جو بڑے بڑے حکیم اور فلسفی اور شاعر اور صوفی دیکھتے آئے ہیں اور جس کا نشان بڑے بڑے مصلحوں اور پیغمبروں نے بتایا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ عالمِ افلاک

تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن جہاں خس و خاشاک

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی !
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

فیضانِ سیّد مرحوم

اسی کی عمر بھر کی کوششوں کا ماحصل سمجھو
اثر جس عام بیداری کے ملت میں نمایاں ہیں

اسی کی ہمتِ شیرازہ بندی کے تصدق میں
مجزا نسخۂ ملت کے اوراق پریشان ہیں!

حضورِ سرورِ کون و مکان سے اس کو ترکے میں
ملا وہ دردِ مضطر قوم کے سب جس میں درماں ہیں

جگایا اس نے ہم سوتے ہوؤں کو خوابِ غفلت سے
وہ غفلت بستیاں جس سے ہوئیں قوموں کی ویراں ہیں

ریاضِ قوم کو از بسکہ سینچا اس نے اشکوں سے
بہاریں اس کی رشکِ رونقِ گلزار رضواں ہیں !

وہ خود تو خلد میں ہے کارنامے اس کے سب لیکن
مہ و خورشید کے مانند تاباں اور درخشاں ہیں

علیگڑھ میں کیا قائم دارالعلوم سیّد نے
ثنا خواں ہیں پرائے جس کے اپنے جس پہ نازاں ہیں!

ظفر علی خان

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی عظمت کا راز

از جناب پروفیسر ابوسلمان شاہجہانپوری

گزشتہ دو تین برس میں میں نے برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی، تعلیمی، تہذیبی اداروں کے موضوع پر خاصا مطالعہ کیا ہے۔ میں اس مطالعہ کے دوران اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی ادارے کی عظمت کا راز نہ تو اس کے مطبوعہ اور شائع کردہ اغراض و مقاصد کی طویل فہرست میں ہوتا ہے، اور نہ اس کی مطبوعات کی کثرت اور انبار میں۔ اس لئے کہ اغراض و مقاصد کے اعلان و اشاعت میں بہت کم عقل و فکر اور سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعداد اشاعت میں علمی ادارے تاجران و ناشران کتب کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی علمی ادارہ اپنے مطبوعہ اغراض و مقاصد کے دائرے میں اور اپنے اعلان کردہ معیار کے مطابق کوئی چیز پیش کر سکے۔ بلاشبہ دائرے اور معیار کی پابندی کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جب کسی ادارے کے ارباب بست و کشاد کے سامنے کسی دوست کی کوئی کاوش آتی ہے تو انہیں ادارے کے اصول و معیار کے مقابلے میں دوست کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات اصول و معیار اور علمی تقاضوں پر مصلحت اندیشیاں غالب آجاتی ہیں۔ میرے سامنے متعدد علمی اداروں میں بے اصولیوں کی مثالیں موجود ہیں۔

کسی ادارے کی اہمیت اور افادیت دراصل اس فکر میں ہوتی ہے جو اس کے جسم میں روح کی طرح موجود ہوتی ہے اور کسی اہلِ علم اور صاحب فکر کے لئے ادارے کے قیام کی محرک بنتی ہے اور اس کی افادیت اس کے دائرہ فیضان پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک تجارتی ادارہ قائم کرتا ہے تو یہ بات ہرگز قابلِ اعتراض نہیں لیکن اس کی نفع بخشی کا دائرہ محدود ہے۔ اس کے برعکس ایک ادارہ ہے جو ملک کی بہتر خدمت اور قوم کی علمی و فکری تربیت اور تہذیب اخلاق و تعمیر سیرت کے مقاصد کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ اس کا دائرہ فیضان چونکہ پوری قوم تک پھیلا ہوا ہے اس لئے اس کا مرتبہ پہلے ادارہ سے بہت بلند ہوگا۔ پاکستان میں تاریخ، ثقافت، تعلیم وغیرہ پر جو ادارے قائم ہوئے وہ بعض صورتوں میں کچھ افراد نے اپنے ذاتی مفاد و اغراض کی نیت سے قائم کئے تھے یا سابقہ حکومتوں کے بعض وزیروں اور حاکموں نے اپنے دوستوں کو نوازنے اور ان کے لئے باعزت روزگار مہیا کرنے کی خاطر تشکیل دیئے تھے۔ اس لئے ان کا فیضان عام نہ ہوسکا۔ اور پوری

قوم ان سے فائدہ نہ اٹھا سکی اگرچہ ان کے ناموں میں پاکستان، اسلام وغیرہ کے نام شامل تھے اور ان کا فیضان عام ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس صورت میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جبکہ مملکت خداداد پاکستان کی نئی وجود میں آئی تھی اور اس کی تعمیر و ترقی اور قوم کی تربیت کی مختلف اور اہم ضرورتیں موجود تھیں۔

لیکن اس زمانے میں بھی ایسے اداروں کے وجود سے ہماری تاریخ کا دامن خالی نہیں رہا جو پاکستان کی تعمیر اور قوم کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کی جلا، ذوق کی تربیت، اخلاق کی تہذیب، قومی جذبے کے فروغ اور تعلیم کی اشاعت کے لئے عمل میں آئے تھے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا شمار اسی قسم کے اداروں میں ہوتا ہے بلکہ وہ اس قسم کے اداروں میں نمایاں اور ممتاز ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۵۱ء میں قائم [illegible]۔ اس کا قیام سید الطاف علی بریلوی کے اخلاص نیت اور ملک و قوم کی خدمت کے جذبۂ صادق کا رہین منت ہے [illegible] ذاتِ گرامی پاکستان اور ہندوستان کے علمی ادبی اور تعلیمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے [illegible] دفتر کی حیثیت سے عملی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ لیکن وہ جس درجہ کے عملی انسان تھے اسی پائے کی علمی شخصیت بھی ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو ان کی عملی صلاحیتیں کانفرنس کے تن مردہ میں روح بن کر جاری و ساری [illegible] دوسری طرف ان کے علمی و ادبی ذوق اور اشاعت تعلیم کی لگن نے انہیں ایک ادیب کی حیثیت سے ملک کے ادبی مطلع پر نمایاں کیا۔ آج ان کی ذات ایک صاحب طرز انشا پرداز، ماہر تعلیم اور ایک علمی و تہذیبی شخصیت کی حیثیت سے تعارف کی محتاج نہیں البتہ ہمیں اپنے قومی اور اجتماعی اخلاق کے اظہار و ثبوت کے لئے ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات اور ان کے ذہن و فکر کے کمالات کے اعتراف کی ضرورت ہے۔ اور ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت علم و فکر اور اخلاق و تہذیب کی ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ان اصحاب علم و تہذیب میں سے ہیں جن کی قوم کو ہمیشہ اسی طرح ضرورت ہوگی جس طرح ملک میں جمہوریت کے قیام اور مخلص رہنماؤں کی ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا مقصد ملک کی تعمیر و ترقی اور قوم کی علمی ادبی تربیت اور تعلیم کے فروغ کی ہمہ جہت ضرورتیں تھیں۔ سید الطاف علی بریلوی نے پیش نظر مسلمانوں کی قدیم علمی و تعلیمی روایت کی اہمیت بھی تھی اور ہمارے دور کے تقاضے [illegible] جس طرح موجودہ زمانے کے حالات اور وقت کے تقاضوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح قوم کی علمی و تعلیمی روایت کی اہمیت اور اس کی افادیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی قدیم علمی، تعلیمی اور تہذیبی روایات کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ ساتھ ہی نئے حالات کے مطابق نئی تعلیمی ضرورتوں اور ثقافتی تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ اور اس طرح مملکت خداداد کی تعمیر اور قوم کی تہذیب و تشکیل کے لئے علمی، ادبی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی لحاظ سے وہ تمام سر و سامان

مہیا کر دیا جائے جس کے بغیر پاکستان کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جو قوم نے دیکھا تھا۔ اور جس کے بغیر قوم کو وہ منزلِ مراد نہیں مل سکتی جس کے لئے اس نے طویل اور صبر آزما سفر شروع کیا تھا۔ سید صاحب کا یہی جذبۂ صادق اور ان کی فکرِ صالح تھی جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا باعث بنی۔ سید صاحب کی نگاہ دور رس یہ بھی دیکھ چکی تھی پاکستان اسلامی جمہوریہ بننے والا ہے اور کسی جمہوری ملک میں ہمیشہ کے لئے کسی ایک پارٹی کی حکومت نہیں قائم ہوتی بلکہ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں گی اس لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد اور دائرہ کار ایسا ہو جہاں جماعتی سیاست اور حکومتوں کی شکست و ریخت کا اثر نہ پہنچے، چنانچہ کانفرنس کے قیام کے وقت یہ بات بنیادی اصول کے طور پر طے کر دی گئی تھی کہ کانفرنس قوم کا ایک مشترکہ علمی، تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہوگی اور وقت کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ لیکن وہ ہمیشہ علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی اشاعت و تعمیر کے تمام منصوبوں میں حکومتِ وقت کے ساتھ تعاون کرے گی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ یہ اصول کاغذ پر نہیں رہا بلکہ ملک و قوم کے فلاح و بہبود اور تعمیری منصوبوں میں ہر حکومت کے ساتھ تعاون اس کا شعار رہا ہے۔

کسی علمی ادارے کے تصور کے ساتھ علمی شخصیات ضرور ذہن میں آتی ہیں۔ علمی شخصیات کسی ادارے کے لئے ستون کا درجہ رکھتی ہیں جن پر ادارے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ذکرِ خیر میں چند شخصیات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی شخصیت تو سید الطاف علی بریلوی کی ہے۔ علمی و تعلیمی حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہے، وہ ایک اعلیٰ درجے کے منتظم ہی نہیں بلکہ بلند پایہ مؤرخ و سوانح نگار، انشا پرداز، علمی مجلے کے کامیاب ایڈیٹر، صاحبِ ذوق و نظر اور ایک علمی و تہذیبی شخصیت ہیں۔ وہ بہت بڑے اور کامیاب مقدمہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے کانفرنس کی تقریباً ایک درجن مطبوعات پر نہایت محققانہ مقدمے لکھے ہیں۔ کانفرنس کے علمی و تعلیمی میدان میں عظیم الشان خدمات اور اس کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ خود بھی صاحبِ قلم، تصنیف و تالیف کے مردِ میدان اور علمی و تحقیقی کاموں کی اہمیت کے ادا شناس ہیں۔ ایک درجن کے قریب ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں طالب علم کی ڈائری، تعلیمی مسائل، تعلیم و تعلّم، حاصلِ مطالعہ، راہی و راہ نما، چند محسن چند دوست، مقالاتِ بریلوی، اور حیاتِ حافظ رحمت خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعض تصانیف کے انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حیاتِ حافظ رحمت ان کی معرکۃ آرا تصنیف ہے۔ مشاہیرِ اہلِ علم نے اس تصنیف کی تحسین فرمائی ہے۔ یہ تصنیف روہیل کھنڈ کے نواب حافظ رحمت خاں کی سوانح عمری ہے۔ لیکن یہ اس دور کے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی حالات کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی اردو ادب میں کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یہ تحقیق و تصنیف کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ ان کی ایک نہایت قابلِ قدر خدمت "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" ہے۔ اس میں الطاف علی بریلوی نے مشاہیر شعراء اور اکابرِ ملت کی وہ تمام قومی نظمیں مواقع اور ماحول کے تعارف کے ساتھ جمع کر دی ہیں، جو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں ۱۸۸۶ء سے لے کر ۱۹۴۳ء تک پڑھی گئی تھیں۔ قومی شاعری کا یہ عظیم الشان ذخیرہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ واشاعت کے علاوہ خود آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

کانفرنس کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اسے اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں محمد ایوب قادری کا قلمی تعاون اور مشورہ حاصل رہا ہے۔ ایوب قادری اپنے مطالعہ کی وسعت، علمی تبحر، کمالِ ژرف نگاہی، بے مثال حافظہ، حیرت انگیز قوتِ استحضار اور برصغیر پاک و ہند کی علمی، تہذیبی، ثقافتی تاریخ اور اربابِ سیاست و تدبر، اصحابِ علم و فن، اہلِ فضل و کمال، اولیاء، صلحائے عظام، ادبا و شعرائے کرام کے تذکار و سوانح میں تخصص اور تبحر کی بنا پر نادرِ روزگار شخصیت ہیں۔ ان کی متعدد علمی و تحقیقی تصانیف اور تالیفات و تراجم شائع ہو کر اہلِ علم اور اصحابِ نقد و نظر سے خراجِ وصول کر چکے ہیں۔ کانفرنس کی جانب سے وقائع عبدالقادر خانی، عہدِ بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی (تاریخ فرخ آباد) اور نزہت الناظرین ان کی ترتیب و حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ آخر الذکر کا ترجمہ بھی قادری صاحب نے کیا ہے۔ تعلیمی مسائل اور نواب بہادر خاں وغیرہ پر ان کے محققانہ مقدمے ہیں۔

مولوی عبدالقادر رامپوری (۱۷۸۰ء تا ۱۸۴۸ء) عہدِ مغلیہ کی ایک باکمال اور صاحبِ علم و فضل شخصیت تھے۔ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی۔ مغلیہ دربار دہلی سے وابستہ رہے۔ نوابانِ رامپور سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اتفاق سے انہیں بنگال سے پنجاب تک بہت سے شہروں میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ وہ جہاں گئے اہلِ علم کی مجالس کو تلاش کیا۔ وہاں کے اربابِ فضل و کمال سے تعلقات پیدا کئے۔ اور وہاں کی علمی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ مرتب کی۔ وقائع عبدالقادر خانی ان کا یہی کارنامہ ہے۔ اس عہد کے حالات، بالخصوص مسلمانوں کے حالات کا یہ نہایت مستند ماخذ ہے۔ ایوب قادری نے اسے مرتب کیا۔ اس پر ایک نہایت فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ نہایت مفید حواشی تحریر فرمائے۔ اس سے اس تذکرہ کی علمی حیثیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ تاریخ فرخ آباد مفتی ولی اللہ فرخ آبادی (۱۷۵۲ء تا ۱۸۴۳ء) کے قلم سے ہے جو عہدِ بنگش کی مستند سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور علمی تاریخ ہے۔ نزہت الناظرین بھی ۱۸ ویں صدی کے ایک صاحبِ علم و قلم محمد اسلم (۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۵ء) کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد کے مشائخ، علماء اور شعراء کے تراجم قلم بند کئے ہیں۔ ان کا یہ نادر تذکرہ اس عہد کی علمی و تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ماضی میں تھا۔ ایوب قادری نے اسے ترجمہ کر کے اور اپنے محققانہ مقدمے سے مرتب کیا ہے۔ اگر ان تینوں کتابوں کے عہد کو متعین کیا جائے تو ۱۷۳۷ء سے لے کر ۱۸۴۹ء تک علمی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور مستند ترین سلسلہ وجود میں آجاتا ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں سید الطاف علی بریلوی کی معرکہ آرا تاریخی تصنیف حیاتِ حافظ رحمت خاں (۱۷۰۸ء تا ۱۷۷۴ء) کو بھی شامل کر لیا جائے اور یقیناً

کرنا چاہیے، تو یہ سلسلہ ۱۹۰۸ء تک دراز ہو جاتا ہے۔
"علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں" کی ترتیب و تدوین میں
بھی ایوب قادری، بریلوی صاحب کے ساتھ شریک رہے
ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں مرتب شعراء کے عنوان سے
ان شعراء کا تذکرہ ہے جنہوں نے کانفرنس کے اجلاسوں
میں قومی شاعری کے یہ شاہکار پیش کئے تھے۔

کانفرنس کے مصنفین میں ایک نوجوان سید مصطفیٰ علی
بریلوی ہیں۔ یہ تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔
"العلم" میں ان کے بہت سے علمی و تحقیقی مقالات شائع
ہو چکے ہیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم ان کا خاص موضوع
ہے۔ انہوں نے اپنے ذوقِ تحقیق و تصنیف سے اس
ریگ زار کو پھولوں کی وادی بنا دیا ہے۔ ان کی تعلیمی تصانیف
میں انگریزوں کی لسانی پالیسی، مسلمانانِ کراچی و سندھ
کی تعلیم اور مسلمانانِ بنگال کی تعلیم ان کی تحقیق کے شاہکار
ہیں۔ اردو میں اس نوعیت کی اس موضوع پر صرف یہی
کتابیں ہیں۔ ان کی ایک کتاب نواب خان بہادر خان شہید،
جنگِ آزادی کے ایک ہیرو پر ہے۔

کانفرنس کے مصنفین میں ایک فاضل خاتون سیدہ
انیس فاطمہ بھی شامل ہیں۔ کانفرنس کی جانب سے ان کی
تصانیف میں "ان کہی کہانیاں" یادیں اور سائے "تاثرات و
مشاہدات" پاکستان کا معاشی پس منظر، ادب منزل بمنزل،
شائع ہو چکی ہیں۔ "پاکستان کا معاشی پس منظر" تو ان کی
نہایت لاجواب کتاب ہے جس سے ان کی گہری نظر و بصیرت
اور وسعتِ مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، ان کی تحریر کی شگفتگی،
زبان کی صحت اور اسلوب کی دلآویزی کا اصحابِ نقد و نظر
نے اعتراف کیا ہے۔

کانفرنس نے اپنی پچیس ۲۵ سال کی مدت میں تعلیم اور
اس سے متعلق موضوعات پر تعداد و معیار ہر دو لحاظ سے
جو بلند پایہ تراجم اور تصانیف اردو اور انگریزی میں
شائع کی ہیں۔ اس کی مثال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
کی ساٹھ سالہ تاریخ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بچوں،
عورتوں، بالغوں کی تعلیمی ضرورت اور ان کے مسائل پر، ہندو پاک
اور مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ و نظام پر، نیز تعلیم کے اصول،
فلسفہ، مقاصد، نظام، تعلیمی نفسیات، تجربات، علماء اور
مفکرین کی تعلیمی خدمات، مشاہیرِ تعلیم کے افکار، ہندوستان
میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم، انگریزوں کی تعلیمی و لسانی پالیسی،
برٹش ہند حکومت میں بنگال، سندھ اور پاکستان و ہندوستان
کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی تعلیم کی حالت، تاریخی و
سیاسی پس منظر و پیش منظر، تدریس کے اصول و مسائل،
بچوں کی تربیت، ذہنی و نفسیاتی ارتقاء وغیرہ، غرضیکہ
تعلیم سے متعلق کوئی مسئلہ ہو، کوئی پہلو ہو، کانفرنس کی ایک
نہ ایک کتاب بلکہ بعض موضوعات و مسائل پر کئی کئی
کتابیں ملیں گی۔

یہ تو کانفرنس کا خاص دائرہ کار ہے اس نے
اس دائرے کے باہر بھی جو علمی خدمات انجام دی ہیں وہ
کوئی معمولی فخر کی بات نہیں۔ کانفرنس نے مسلمانوں کی
علمی، سیاسی، ثقافتی تاریخ، اردو زبان اور ادب کی
تاریخ، تنقید و تحقیق، لسانیات، مختلف اصنافِ ادب،
علماء و صوفیہ، مشاہیر و اکابرِ اسلام، رہنمایانِ آزادی،
شہیدانِ حریت، ماہرینِ تعلیم، سائنسدان، عمائدینِ ...

نفسیات، سیاسی، علمی، تہذیبی شخصیات کے سوانح و تذکار، تاریخ عالم وغیرہ موضوعات پر بھی جو کچھ شائع کیا ہے اگر کانفرنس اپنی پچیس ۲۵ سالہ عمر میں صرف یہی کر پاتی، تب بھی اس کے لئے یہ کوئی معمولی افتخار نہ تھا۔ لیکن اس کے دامن میں جو علمی جواہر ہیں وہ ابھی ختم کہاں ہوئے۔ کانفرنس کی خدمات کا دامن اس سے بہت وسیع ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کانفرنس نے تہذیبی و ثقافتی مسائل پر بھی نہایت فکر انگیز مطبوعات پیش کی ہیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر سائنس، فلسفہ، مابعد الطبیعات وغیرہ علوم میں بھی چند بلند پایہ مطبوعات کا پاکستان کی علمی تاریخ کے ذخیرے میں کانفرنس کی بدولت اضافہ ہوا ہے۔ اردو کے رسم الخط کے مسئلے پر اور فن خطاطی میں معرکہ آرا تصانیف کانفرنس کی خدمات کی فہرست میں شامل ہیں۔

کانفرنس کی ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری بھی ہے، جس میں الابرو مشاہیر کی تحریرات، سلاطین کے فرامین، اور سینکڑوں تصاویر کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی، علمی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، علوم و فنون اور اسلام اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ، علیگڑھ علامہ سید، ان کے رفقا اور اس عہد سے متعلق ایسے قیمتی نوادر جمع ہیں جن کی مثال پاکستان کی کسی دوسری لائبریری میں نہیں ملے گی۔ اور آخر الذکر موضوعات پر اس لائبریری کو نظر انداز کر کے تحقیق کی راہ میں قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لائبریری میں بیرونی حضرات کو استفادہ کرنے کی عام اجازت ہے۔ لائبریری کے ساتھ ایک دارالمطالعہ ہے جس میں لائبریری کی کتب سے استفادے کے موقع کے ساتھ تازہ اخبارات اور رسائل بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔

علمی خدمات کے ساتھ ساتھ کانفرنس نے عملی میدان میں بھی تعلیم کے فروغ و اشاعت میں بڑی رہنمائی کی ہے کراچی میں مشہور درسگاہ "سر سید گرلز کالج" کا قیام کانفرنس کا کارنامہ ہے، یہ کالج تعلیم کے اعلیٰ معیار، تعلیم و تربیت کے عمدہ اصول، مثالی نظم و ضبط، شاندار عمارت اور طالبات کے لئے اپنے بہترین نظم و تورع کے لحاظ سے کراچی کے چند اعلیٰ درجے کے کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کانفرنس مختلف قومی اہمیت کے تہواروں، بیرون کراچی و بیرون ملک کے مشاہیر اہل علم و ادب کی آمد پر تقریبات کا اہتمام بھی کانفرنس کی ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہے۔

جسٹس محمود

(مولانا اسمٰعیل میرٹھی)

قوم نے فرط مسرت سے سنا یہ مژدہ — سید القوم کا ہم کار رہے سید محمود

ہو گیا دور وہ جو قوم کو تھا خطرہ — للہ الحمد کہ ایک اور بھی سر ہے موجود

صد و سی سال رہے زندہ ابھی پیر بزرگ — نوح کی عمر کو پہنچے یہ جوان مسعود

دوربین فہم و خرد کی ہمیں دکھلاتی ہے — قوم کا نیر اقبال ہے مائل بصعود

خدمت قوم پہ آمادہ ہوا وہ مخدوم — نام کی طرح سے ہیں کام بھی جس کے محمود

اس کے سینے میں ہیں قدرت نے ودیعت ایسے — علم و حکمت کے گہر، فضل و بلاغت کے نقود

ایک ماہر تعلیم۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد

الحاج محمد زبیر

(سابق اسسٹنٹ پرنسپل نیشنل کالج۔ کراچی)

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور ان کی تعلیمی خدمات کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے آئینے میں دیکھنا گویا علیگڈھ تحریک اور مسلمانانِ پاک وہند کی پچاس سالہ تعلیم و ثقافت کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہے۔ درحقیقت یہی وہ آئینہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب فنا فی العلی گڑھ نظر آرہے ہیں۔ اس وابستگی و پیوستگی کی یہ شان تو دیکھیئے کہ جب کبھی ایک کا نام زبان پر آتا ہے تو دوسرا خود بخود ذہن میں گھومنے لگتا ہے وہ ۱۸۸۹ء میں بحیثیت طالب علم علیگڈھ آئے اور ۱۸۹۵ء میں ٹیچر مقرر ہوئے پوری زندگی اپنی مادرِ درسگاہ کی نذر کر دی جب تک جیئے اس کی سرزمین پر رہے اور جب ۱۹۴۷ء میں مرے تو اس کی خاک میں مل گئے۔ دراصل انھیں علیگڈھ سے انتہا عشق تھا اس عشق نے ان کو بے نیازی کی دولت سے اتنا مالا مال کر دیا تھا کہ بڑے بڑے سرکاری عہدے نہایت شانِ استغنا کے ساتھ ٹھکرا دیے اور علی گڑھ کی عمر بھر خدمت کرنے کا جو عہد انھوں نے سرسید سے کیا تھا وہ بہ حسن و خوبی پورا کر دیا۔

مسلم یونیورسٹی شاہد ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلیمی خدمات نہایت مخلصانہ اور عاشقانہ انداز سے انجام دیں اور ان کے دل میں اپنی قوم کے لیئے ہمدردی اور محبت و شفقت کا بے پایاں جذبہ موجزن رہتا تھا۔ اصل میں وہ دل و جان سے یہ چاہتے تھے کہ کشمیر سے راس کماری تک کے مسلمان مغربی علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ ہوکر اپنی ہمسایہ قوموں کے دوش بدوش نہایت بلند و بالا تر مرتبہ حاصل کرلیں اور بس اسی فکر میں وہ اپنے قائد سرسید کی طرح ہمہ تن غرقاب رہتے تھے۔ حالی نے سرسید کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کا یہ پہلا مصرع ڈاکٹر صاحب کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

زیستن درفکرِ قوم و مُردن اندر بندِ قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شُدن

ڈاکٹر صاحب جامع صفات شخصیت کے مالک تھے۔ بحیثیت معلم اُن کا دائرۂ عملی صرف کلاسوں تک محدود نہ رہا بلکہ انھوں نے اپنے علم و فضل اور اپنی صلاحیتوں سے انڈ

خدمت کا کام بھی لیا بالخصوص مسلمانوں کے تعلیمی سماجی اور
سیاسی امور میں نہایت اعلیٰ خدمات انجام دیں اور تعلیمی خدمت
کے ضمن میں ایک قابل قدر کام یہ کیا کہ اپنے شاگردوں سے تعلیمی
رابطوں کے ساتھ ساتھ شفقت و محبت کے ایسے رشتے قائم
رکھے کہ ان کی ذات طلبہ کے لیے سراپا رحمت بن گئی ۔

یہ بات ارباب علم سے پوشیدہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب
نے ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کے درجے تک پہنچنے اور اُسے
توسیع و ترقی دینے میں نہایت موثر کردار ادا کیا ۔ نیز طلبہ کے
مسائل حل کرنے کے لیے بھی طرح طرح کے جتن کیے ۔ وائس چانسلر
فنڈ قائم کیا جس سے وہ ضرورت مند طلبہ کی امداد کرتے اُن کی
فیسوں میں رعایتیں بخشتے ، وظیفے دیتے اور نادار طلبہ کے لیے
قیام و طعام تک کے لیے صورتیں نکالتے اور ان کا یہ مشفقانہ سلوک
تو آب زر سے لکھا جائے گا کہ جب طلبہ تعلیم سے فارغ ہو جاتے
تو اُن کی ملازمتوں کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہتے اس غرض کے
لیے یونیورسٹی میں ایک ایمپلائمنٹ بیورو قائم کر دیا تھا ۔

اُن کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جب کبھی
یونیورسٹی اور طلبہ کے مفاد کی راہ میں قواعد و ضوابط حائل ہو جاتے
تو وہ اُن کی بندشوں کو ڈھیلا کر دیتے آئین کے اس حصار کے
توڑنے پر مخالفین کی طعنے تشنے سنتے ، ان کی تنقیدیں برداشت
کرتے اور ان سب مخالفتوں کے باوجود علم اور تعلیم کی خدمت
بدستور کرتے رہتے ان کی یہ خوبیاں سراہتے ہوئے مولانا سید
سلیمان ندوی نے اپنے رسالہ معارف میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ۔

"شخصی طور پر ڈاکٹر صاحب سے لوگوں کو
بڑے فائدے حاصل ہوئے ان کی ذات سے
سیکڑوں غریب طالب علموں نے تعلیم
حاصل کی اور ان معنوں سے بہتوں کو جن کا کوئی
سہارا نہ تھا ملازمتیں اور بڑے بڑے
عہدے دلوائے ۔"

اور ان کی فیض رسانیوں کا ذکر مولانا عبدالماجد دریابادی نے
ان الفاظ میں کیا ہے ۔

"ڈاکٹر صاحب بڑے ذی مروت اور بڑے
ہی فیض رساں تھے ۔ اُن کا دروازہ ہر علیگڑھی
کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا ۔ ہر اولڈ بوائے
کے میزبان دوست اور دستگیر تھے ۔ آمدنی کا
بڑا حصہ طلبہ ہی کے لیے وقف تھا ۔ خدا معلوم
کتنوں کو عہدے دلوائے ، کتنے بیروزگاروں کو
روزگار سے لگایا کتنے بھوکوں کو کھلایا کتنوں
کی سفارشیں کیں ۔ کتنوں کی خالی جیبیں اپنے
پاس سے بھر بھر دیں ۔"

اور اس سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ ان کی یہ فیض
رسانیاں صرف علیگ برادری تک محدود نہ رہیں ۔ بلکہ جب کبھی
کوئی غیر علیگ یا ان کا کوئی مخالف بھی اپنی کسی ضرورت سے ان
کے پاس آتا تو وہ بلا تکلف اس کا بھی کام کر دیتے ۔ کیونکہ
ضرورتمندوں کے کام آنا وہ عبادت کی طرح ضروری سمجھتے تھے ۔

اصل میں تو ڈاکٹر صاحب کا میدان عمل علم اور تعلیم کے
شعبے تھے لیکن سیاست کے میدان اور اسمبلی کے ایوان میں بھی
ان کی ایمان دوستی اور مسلم نوازی کے چرچے رہتے تھے بلاشبہ
انھیں مسلمانوں کی پس ماندگی کا بڑا احساس تھا اور اُن کے مفاد
کی خاطر زندگی کے ہر میدان میں سرگرم عمل رہے ۔ اس ضمن میں کبھی
حکومت اور کبھی ہندوؤں سے ٹکر لیتے رہتے لیکن تعلقات بگاڑتے

کسی سے بھی نہ رکھتے۔ دونوں سے دوستی رکھتے تھے اور حکمت عملی سے اپنی قوم کا بھلا کرتے تھے۔ وہ قومی فلاح و بہبود کی لگن میں کبھی کبھی تو اتنے محو اور سرمست و سرشار ہو جاتے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اُن پر بے خودی کا ایک والہانہ جذبہ طاری ہو جاتا اور اُن کی شخصیت ایک معمہ بن جاتی۔ چونکہ یہ اُن کی ادا عام فہم نہ تھی اس لیے لوگ انھیں کھویا ہوا سمجھنے لگتے۔ تاہم اس کیف کے عالم میں بھی بڑے بڑے مسائل آن واحد میں حل کر دیتے تھے۔ گویا ؎

کمال ہوش تھا یوں بے نیاز ہوش ہو جانا

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ و سالہ زندگی غلطیوں اور کوتاہیوں سے خالی نہیں رہی یہ ممکن نہیں جب تک کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کی فطرت میں لغزشوں کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے اور سوائے پیغمبروں کے کوئی بشر معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن اُن مرحوم و مغفور کے ساتھ یہ ناانصافی ہوئی کہ مسلمانوں ہی کے ایک طبقے نے اُن کی رتی برابر غلطیوں کو بھی پہاڑ بنا کر دکھایا اور اُن کی خوبیوں کو عیب سے تعبیر کرنے کے ڈھنگ اختیار کیے یہ ساری مخالفتیں وہ صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور کبھی کسی مخالف کو کوئی آزار نہیں پہنچایا۔

اُن کی شخصیت کے اس روشن پہلو کو اُن کی علمی لیاقت نے اور درخشندہ کر دیا تھا۔ بلاشبہ وہ تعلیم کے زبردست ماہر اور ریاضی کے بہت بڑے پروفیسر تھے۔ اس کے علاوہ ادب اور مختلف مضمون میں انھوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں وہ اولین ہندوستانی تھے جنھوں نے اپنی بے پناہ قابلیت کی بنا پر سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ حاصل کیا تھا۔ ان علمی کمالات اور اُن کی تعلیمی سیاسی خدمات نے انھیں بیسویں صدی کے مشاہیر میں نہایت ممتاز کر دیا تھا اور یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود ان میں غرور و نخوت نام کو نہ تھا۔ بلکہ اس قدر سادگی اور انکسار تھا کہ اُن کی بڑائی تک پہنچنا بعض وقت دشوار ہو جاتا تھا اس سادگی نے اُن کی بڑائی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اِن ہی بے مثل خوبیوں کے باعث اُن کی شخصیت پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ایک آئیڈیل کا کام دیتی رہے گی۔

تصنیفات و تالیفات

ڈاکٹر صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کر سکے پھر بھی انھوں نے کئی اچھی کتابیں لکھیں منسوریشن پر ایک کتاب لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اُسے لکھتے وقت ان کی عمر اکیس برس تھی اور انھیں کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے تین سال گزرے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں "تاریخ التعلیم" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ لیکن ان کی کتابوں میں سسٹم آف ایجوکیشن اور سسٹم آف آرگنائزیشن، بڑی معرکتہ الآرا کتابیں ہیں پہلی کتاب کے ترجمے اردو و ہندی میں بھی ہوئے لیکن یہ کتابیں ہندوستان میں شائع ہونے کی وجہ سے پاکستان میں ناپید ہیں۔ کیونکہ وہاں سے ہمارے علمی ناتے بھی ٹوٹ گئے ہیں۔

لائبریری

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کی لائبریری کچھ ایسی مخفی رہی کہ ہر کس و ناکس کی نظر اس تک نہ پہنچ سکی دراصل یونیورسٹی کے تدریسی اور انتظامی امور میں انھیں مشغول و منہمک دیکھ کر کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ وہ کتابیں جمع کرنے اور کتب بینی کا ذوق شوق بھی رکھتے ہیں۔ مجھے اس کو واضح طور پر دیکھنے کا موقع ملا جب ان کے انتقال کے بعد وہ یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانہ

رسالق لٹن لائبریری اور حال مولانا آزاد لائبریری) کی نذر کر دی
گئی اور اس کی کتابیں درجہ بندی اور کٹلاگ سازی کے لیے میرے
سامنے آئیں تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رسالے اور رسائل کے
علاوہ دیگر مضامین کی کتابوں پر بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ کے
نشان لگے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں حاشیے بھی قلمبند ہیں۔ گویا
ان کا مطالعہ اپنے مضامین کی کتابوں پر ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ
مختلف مضامین کی کتابیں اُن کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دو ڈھائی ہزار کتابوں کا ایسا نایاب
ذخیرہ چھوڑا ہے۔ جس میں طالبان علم کے لیے نہایت عمدہ ذہنی
اور علمی غذا موجود ہے۔ مگر یہ بات بڑے افسوس سے سنی جائے گی
کہ اُن کا یہ قیمتی اثاثہ " در کان نمک رفت و نمک شد " کے مصداق
ہوگیا یعنی اسے یونیورسٹی لائبریری کے ذخائر کتب میں ختم
کر دیا گیا اور یہ کتابیں اپنی ہم مضمون کتابوں میں مل جل گئیں
گو ہر کتاب پر " عطیہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد " کی مہر ثبت کر دی گئی
ہے مگر یہ اس کی مستحق تھیں کہ انھیں جداگانہ طور پر ایک مخصوص
ذخیرہ کی شکل میں آراستہ کر دیا جاتا اور اس کی پیشانی پر یہ عبارت
کندہ کر دی جاتی۔

" ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کلکشن "

خاندان

ڈاکٹر صاحب کے خاندان کا نام زبیری کنبوی ہے جس
کا سلسلۂ نسب حضرت زبیر بن العوام پر منتہی ہوتا ہے۔
خاندان زبیری کنبوی کے کچھ بزرگ ۱۴۵ھ میں سندھ آئے
وہاں سے نکل کر پہلے ملتان اور پھر دہلی پہنچے اس کے بعد مارہرہ،
میرٹھ، بریلی، مراد آباد، سنبھل اور رامپور وغیرہ میں آباد
ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ معین الدین کا وطن
میرٹھ تھا ان کے بڑے بھائی حافظ فخر الدین اپنے چند
اعزہ کے ہمراہ مارہرہ میں رہتے تھے میں نے انھیں دیکھا ہے' اور
ان کی امامت میں نمازیں بھی پڑھی ہیں۔ اس خاندان کے بزرگوں
میں نواب وقار الملک (مشتاق حسین) اور جناب مولوی بشیر الدین
سرسید کی تحریک کے اولین معماروں میں شامل تھے نواب صاحب
ایم اے او کالج کے سکریٹری و بیش گیارہ سال تک رہے اور مولوی
صاحب کی یادگار اسلامیہ کالج اٹاوہ ہے۔

تعلیمی خدمات کی اولین یادگار

میں نے ڈاکٹر صاحب کا نام اپنی کم سنی میں اس وقت
سنا تھا جب میں نے اپنے وطن مارہرہ کے مدرسۂ اسلامیہ
اسکول میں داخل ہوا تھا اور جب ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی کی
لٹن لائبریری سے منسلک ہوکر ۱۹۶۴ء تک اس سے وابستہ رہا
تو اس بیالیس برس میں ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے
کے لیے بہت مواقع ملے۔ اور اس بات کا مجھے فخر رہا کہ میں اُس
اسکول کا طالب علم رہ چکا ہوں جہاں سے اُن کی عظیم تعلیمی
خدمات کا آغاز ہوا ہے وہ ابھی سترہ ہی برس کے تھے۔ اور
بی اے میں تعلیم پا رہے تھے کہ مارہرہ میں تعلیم کی پستی دیکھ کر ان کے
دل میں قومی خدمت کا جذبہ اُبھر آیا اس زمانے میں یہاں
ڈسٹرکٹ بورڈ کا صرف ایک پرائمری اسکول اور چند مکتب تھے
جن میں بڑی آپا کا مکتب بہت مشہور تھا اور امراء کے گھروں پر
بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ غرض صوفیہ اور عمائد
حکمار کی یہ بستی علیگڑھ سے صرف چالیس میل دور ہوتے ہوئے بھی
جدید علوم و فنون سے بالکل محروم تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں

کے باشندوں کو وقت کے تقاضوں سے آگاہ کیا اور انگریزی تعلیم کے لیئے ایک اسکول کے قیام کا منصوبہ بنا دیا جسے عملی جامہ پہنانے میں ان کے ایک قریبی عزیز محمد حاجی مرحوم نے ایسا بھرپور حصہ لیا کہ اپنی ایک کوٹھی اس کے لیئے وقف کر دی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے ان عزیز کے نام سے اسکول جاری نہیں کیا بلکہ کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈر ماریسن کے نام سے موسوم کر کے ماریسن اسلامیہ اسکول نام رکھ دیا اس کے قیام کی تقریب میں شرکت کے لیئے ڈاکٹر صاحب مسٹر ماریسن کو اپنے ساتھ مارہرہ لائے اور اس کے بعد بھی دونوں معائنے کے لئے آتے رہے۔ ان کی علمی خدمت کی یہ اولین یادگار ۱۸۹۴ء سے آج تک اہلِ مارہرہ کو فیض پہنچا رہی ہے۔

تعلیمی خدمات کا مرکز

اس اسکول کے بعد ان کی تعلیمی خدمات کا مرکز علیگڑھ قرار پایا اور آخر یہ دار العلوم ان کی اس خدمت کا ایک بے نظیر نمونہ بن گیا۔ اس سے ان کی درسی و تدریسی زندگی کا آغاز ہوا اس ادارے میں وہ ٹیچر، لیکچرر، پروفیسر، پرنسپل، پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار رہے۔ انھیں کے دور میں ایم اے او کالج یونیورسٹی کے درجے تک پہنچا اور اس کی تعلیمی و انتظامی امور کا ڈھانچہ انھوں نے تیار کیا۔ متعدد تعلیمی شعبے جاری کیئے ٹرننگ کالج طبیہ کالج، انجنیئرنگ کالج ان ہی کے دور کی شاندار یادگاریں ہیں۔ میڈیکل کالج قائم کرنے کے لیئے بھی انھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کر کے پچاس لاکھ روپیہ جمع کر لیا تھا۔ اگر مسلم لیگ ۱۹۴۷ء میں وائس چانسلری کے انتخابات کے لیئے زاہد حسین کو نامزد نہ کر دیتی تو ڈاکٹر صاحب چوتھی بار بھی وائس چانسلر منتخب ہو جاتے اور میڈیکل کالج بھی قائم ہو جاتا۔

ان کے دور کی ایک اہم یادگار .... جغرافیہ کا شعبہ بھی ہے اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہوئی کہ اس کے قیام کے وقت تک ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں یہ شعبہ قائم نہ ہوا تھا اس کے قیام کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں آیا تھا۔ مختصر یہ کہ ان کے دور میں یونیورسٹی کی توسیع و ترقی ایسے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی کہ اس کی تفصیل ان اوراق میں نہیں سما سکتی۔

تین یادگاری سال

ڈاکٹر صاحب کی یونیورسٹی سے وابستگی کے دوران کئی ایسے سال آئے ہوں گے جو کسی نہ کسی اہمیت کے حامل ہونگے۔ مگر یہ تین سال اتنے اہم اور یادگاری سال ہیں کہ اُن کے ذکر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۲۰ء اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سال ایم اے او کالج پر ترکِ موالات کی یورش ہوئی۔ اس زمانے میں ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں گاندھی جی اور علی برادران کی قیادت میں جاری ہوئی تھیں۔ ان کے اغراض و مقاصد میں درس گاہوں کو بدیشی سرکار کے اقتدار سے نکالنا اور انھیں خالص نیشنل بنا دینا بھی شامل تھا، اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیئے علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علیؒ) اور ان کے ہمنواؤں نے کالج پر قبضہ کر لیا، ایسے نازک وقت میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کالج کو اس خطرناک حملے سے بچایا، اس کی مدافعت کی اور اس کے زندہ و پائندہ رہنے کے لیئے وسائل فراہم کیئے جن لوگوں نے ان پر آشوب ایام میں اس درسگاہ کی موت و حیات کی کشمکش دیکھی ہے وہ تمام ان الفاظ کی تائید کریں گے جو انھوں نے اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرمائے تھے۔

"یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر میں سر سید احمد خاں

سے آپ کا مقابلہ کروں اگر سرسید احمد خاں اس
ادارے کے بانی تھے تو بلاشک وشبہ آپ
اس کے محافظ ہیں۔"

اور جب ۱۹۲۵ء میں اس درسگاہ کی پچاس سالہ جوبلی کا تاریخی جشن ہوا تو اس میں وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ذہنی علالت کے باعث شریک نہ ہوسکے اور اس کے جملہ کاموں کی ساری ذمہ داری کا بار ڈاکٹر صاحب پر رہا اس کو کامیاب بنانے کا سہرا ان کے مخالفین تک نے ان ہی کے سر باندھا۔ اس زمانے میں ان کی بے شمار مصروفیتیں مجھ سمیت جن جن نے دیکھی ہیں وہ انہیں خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پھر ۱۹۲۷ء میں حکومت ہند کے ایما پر یونیورسٹی کی چانسلر بیگم صاحبہ بھوپال نے یونیورسٹی کے نظم ونسق کی تحقیقات کے لئے ایک انکوائری کمیٹی قائم کردی۔ اس کے پس منظر میں جو عناصر کارفرما تھے ان کا ذکر بخوف طوالت نہیں کیا جارہا ہے بہرحال ان تحقیقات کا انجام یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی سے جدا ہوگئے لیکن ارکان کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس جدائی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کر دیئے کہ

"ہم ڈاکٹر ضیاء الدین کی پختہ علمی قابلیت ان کی کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی کی طویل علمی خدمات، اور علیگڑھ سے ان کے عمیق جذبہ محبت کے معترف ہیں۔"

مگر قدرت کو یہ جدائی گوارا نہیں ہوئی اور آٹھ سال کے اندر ہی ایسا پانسا پلٹا کہ جو افراد ڈاکٹر صاحب کے خلاف صف آرا تھے۔ وہ بھی ان کی موافقت میں سرگرم نظر آنے لگے اور ۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی کورٹ نے انھیں متفقہ طور پر وائس چانسلر منتخب کرلیا، اس عہدے پر آٹھ سال تک بلامقابلہ انتخاب ہوتا رہا۔ پھر زندگی کے آخری سانس تک متفقہ طور پر وائس چانسلر منتخب کرلیا۔ وفات کا یا اثر دیکھ لیا کہ وہ یونیورسٹی سے جدا تو ہوتے تھے۔ پر وہ وائس چانسلر کی حیثیت سے اور واپس ہوتے وائس چانسلری اور ریکٹری کی سرفرازیاں لئے ہوتے۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔

تعلیمی پالیسی

ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی پالیسی کو ان کی تعلیمی خدمات کی جان کہہ دینا بے جا نہ ہوگا اور درحقیقت وہ اتنی ہمہ گیر اور ایسی جامع و سود مند ثابت ہوئی کہ اس کی بدولت ہزارہا ان پڑھ مسلمان اور غیر مسلم تعلیم یافتہ بن گئے اس لحاظ سے یہ پالیسی پاک و ہند کی علمی و تہذیبی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اسے متعین کرنے میں انھوں نے سرسید کی ان تعلیمی نظریات سے بہت فائدہ اٹھایا جن کا منتہد مسلمانوں میں تعلیم اور روشن ضمیری پھیلانا تھا تاکہ وہ پستی سے نکل کر سرفرازیوں سے ہمکنار ہوجائیں۔ اس موقع پر انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا یہ بنیادی نکتہ بھی یاد رکھیئے کہ وہ انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں ایک ایسی قوم کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جو بقول لارڈ میکالے" خون ورنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر فکر و نظر کے لحاظ سے انگریز ہو" میکالے کی تعلیمی رپورٹ ۱۸۳۳ء کا یہ جملہ انگریزوں کی حکمت عملی کی غمازی کررہا ہے اس کے پچیس برس بعد کلکتہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے قیام کے انیس برس بعد مسلمانوں کی تعلیم کا باقاعدہ نظام ایم اے او کالج کی شکل میں قائم ہوا اس انیس برس میں ہندو مغربی علوم حاصل کرکے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے، جب سرسید نے یہ دیکھا کہ مسلمان ان علوم سے بے گانہ رہنے کی وجہ سے اپنی ہمسایہ قوموں سے پیچھے ہوتے

جارہے ہیں تو انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دی اور اس جدوجہد کو ایک تحریک کی شکل دیدی جو علیگڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہو گئی دراصل یہ ایک نہایت جامع تحریک تھی جس کا مقصد مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا تھا اس انقلابی تحریک میں تعلیم کی اشاعت سماجی و ادبی اصلاحات اور صلاح و فلاح کے دیگر امور بھی شامل تھے اس میں مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت جتاتے ہوئے سر سید نے ۱۸۷۲ء میں بمقام لاہور یہ فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کی تعلیم کا حال اور قوموں کی تعلیم سے جو ہندوستان میں آباد ہیں بالکل مختلف ہے، ان کا مذہب ان کی مذہبی تعلیم، عام تعلیم میں ایسی ملی ہوئی ہے جیسے جسم و جان جب اس کو علیحدہ کیا جائے گا۔ جسم بے جان رہ جائے گا۔ اور کبھی اس قسم کی بے جان تعلیم سے ہماری اغراض پوری نہ ہوں گی۔

اس نظریے کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی تعلیمی پالیسی کا خصوصی عنصر بنائے رکھا انھوں نے شعبۂ دینیات کی توسیع کی اور اس مضمون میں پاس ہونا نہ صرف لازمی کر دیا بلکہ اس میں حاصل کئے ہوئے نمبر دیگر مضامین کے حاصل شدہ نمبروں کی مجموعی تعداد میں شامل کیا جانا بھی لازمی قرار دیدیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دینیات کی اہمیت طلبہ کی نظر میں بڑھ گئی اور امتحانات میں اعلیٰ ڈویژن حاصل کرنے کے امکانات بھی زیادہ روشن ہو گئے۔ یونیورسٹی میں دینی تعلیم کا دائرہ بڑھانے کے سلسلے میں ایک بڑا اہم کام یہ ہوا کہ اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم کر دیا گیا اور اسلامی علوم و فنون بھی نصاب میں داخل ہو گئے۔ یہی شعبہ ترقی کر کے ادارۂ علوم اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز) کے نام سے موسوم ہوا۔ اور پی ایچ ڈی کے امتحانات ہونے لگے جو اب بھی جاری ہیں۔

دراصل ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی پالیسی بڑے گہرے مطالعے کی مستحق ہے لیکن اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس کے کچھ خصوصی پہلو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں مثلاً وہ ایسا تعلیمی نظام رائج کرنا چاہتے تھے جس میں نصابی تعلیم کے ساتھ پاکیزہ اخلاق اور انسان دوستی کی تعلیم دی جائے تاکہ ایسے افراد پیدا ہو سکیں جو صحیح معنوں میں انسان ہوں وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ صرف عالم و فاضل بن جانا بڑی بات نہیں ہے، بڑی بات ہے انسان ہونا اور خدمت کی لگن رکھنا۔

جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے۔ وہ لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر دینا نہایت ضروری خیال کرتے تھے مگر ایسی مخلوط تعلیم کے ہمنوا نہ تھے جو طالبات کو آزادی و بے باکی کے ساتھ طلبہ سے منسلک رکھے ان دونوں کے آزادانہ میل جول کے جو نتائج ہم آج دیکھ رہے ہیں وہ ان کی دوربین نگاہوں نے اب سے برسوں پہلے دیکھ لیے تھے۔

اس پالیسی نے ایک بڑا یادگاری کام یہ کیا کہ تعلیم کو عمومیت اور وسعت کی راہیں دکھا دیں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ اس پالیسی کے اساسی پہلو دو ہیں ایک تعلیم کی اشاعت اور دوسرا سستی تعلیم کی فراہمی ڈاکٹر صاحب کی فراست نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ تعلیم عام ہونے کی راہ میں تعلیمی اخراجات کی زیادتی بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ اسے دور کرنے کا انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا اور تعلیمی اخراجات کم کر کے سستی تعلیم فراہم کرنے کی صورتیں نکالتے رہے یونیورسٹی میں طرح طرح کے تجربے کئے جو کامیاب ہوئے ان کے عہد میں طلبہ کی فیسیں دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت کم تھیں۔

ان مفید تجربوں سے علیگڑھ سے باہر کی درسگاہیں بھی متاثر ہوئیں انہی خطوط پر اسلامیہ کالج اٹاوہ میں بھی تجربہ کیا گیا اور وہاں تعلیم اور قیام و طعام کی کل فیسیں بارہ سے پندرہ روپیہ ماہوار تک ہو گئیں تھیں گو وہ سستے کا زمانہ تھا پھر بھی ماہرین تعلیم نے اس تجربے کو ایک کارنامہ قرار دیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی تعلیمی پالیسی کے لئے مواد فراہم کرنے میں
ں اسلامی نظریہ کو بھی پیش نظر رکھے رہے کہ "حکمت مسلمانوں کی
اُہشدہ چیز کی طرح ہے جہاں کہیں بھی ملے حاصل کر لے" اس
یکیانہ اصول پر عمل کرنے کا وقت ۱۹۱۷ء میں آیا جب وہ کلکتہ
یونیورسٹی میں سیڈلر کمیشن کے ممبر ہوتے اور وہاں انہیں سرآسو
توش مکرجی کی اس پالیسی سے آگاہی ہوئی کہ وہ ہر ہندوستانی کو
گریجویٹ دیکھنے کا منصوبہ بنائے ہوتے ہیں، ہندو یونیورسٹی بنارس
ؤ بھی یہی پالیسی تھی اور وہاں سے دھڑا دھڑ ہندو گریجویٹ بن بن
زنکل رہے تھے یہ حال دیکھ کر ڈاکٹر صاحب چونکا ہو گئے لیکن ان
حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے وسائل نہایت محدود تھے مسلمانوں
کی تعلیم کے لیے صرف ایک علی گڑھ کالج تھا جو اس وقت تک یونیورسٹی
کے درجے تک پہنچا تھا۔ بہرحال انھوں نے تعلیم عام کرنے کی
یہ صورت نکالی کہ علیگڑھ میں تعلیم کو اتنا سستا کر دیا کہ معمولی حیثیت
کے شخص کے لیئے بھی اپنے بچوں کو تعلیم کے لیئے علی گڑھ بھیجنا آسان
ہوگیا پھر جب کالج ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی بن گیا تو انھوں نے
ہائی اسکول کے امتحان میں پرائیویٹ طور پر شریک ہونے کے لیئے
یونیورسٹی کے دروازے کھول دیئے اور ہندوستان کے ہر گوشے
سے مسلم طلبہ امتحان دینے کے لیئے جوق در جوق علیگڑھ آنے لگے۔
اس پالیسی سے غیر مسلموں نے بھی خوب فائدہ اٹھایا اور ہزارہا مسلم
اور غیر مسلم افراد تعلیم یافتہ بن گئے مگر یہ خیال رہے کہ اس پالیسی سے
اعلیٰ تعلیم کے معیار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا وہ بدستور بلند رہا پرائیویٹ
طور پر پاس ہونے والوں کی یہ صورت ہوئی کہ جو ذہین تھے وہ
خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ
مدارج پر پہنچ گئے جو تعلیم جاری نہ رکھ سکے ان کی بے روزگاری
دور ہونے کی راہیں کھل گئیں۔

جب مسلم یونیورسٹی کے مرکز سے تعلیم کے فیوض و برکات عام
ہونے لگے اور اس کی مرکزیت و افادیت کے چرچے پھیل گئے تو یہ
دردناک صورت رونما ہوئی کہ ان خوبیوں کو صدمہ پہنچانے کے لیے
اپنے اور غیر سب ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان پرائیوٹ امتحانات
کی حکومتِ ہند اور یوپی کے تعلیمی محکموں نے شدید مخالفت کی اور اسے
آئین کی خلاف ورزی قرار دیا۔ ہندو پریس بھی گورنمنٹ کا ہم آواز
ہو گیا اور غضب یہ ہوا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب
احمد خاں اور ان کے ہمنواؤں نے بھی اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب سے
تعاون نہیں کیا بلکہ گورنمنٹ کی حمایت کی اور ایسا سخت مخالفانہ رویّہ
اختیار کیا کہ یونیورسٹی میں یکجہتی کی فضا قائم نہ رہ سکی اس مسئلے پر
ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ یونیورسٹی ایک با اختیار ادارہ ہے
اور اسے اپنی پالیسیاں بنانے کا پورا حق ہے۔ غرض اس مخالفت
کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کو عام کرنے کا جو منصوبہ انھوں نے بنایا تھا وہ
فروغ نہ پاسکا۔ چند سال جاری رہ کر ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ تعلیمی نظام
چلانے کے لیے حکومت سے تعاون رکھنا اور اس کے قوانین اور
احکامات کا احترام کرنا ضروری ہوتا ہے تاہم وہ یونیورسٹی کے
معاملات میں گورنمنٹ کی بے جا مداخلت و مزاحمت کے خلاف تھے
وہ کہا کرتے تھے کہ قومی تعلیم کو گورنمنٹ کے تسلّط سے آزاد رہنا چاہیئے
ان کے نزدیک وہ ہی ادارہ قومی ادارہ کہلانے کا مستحق ہے، جس
کی پالیسیاں اور جس کا نظام و نصاب کلیتاً قوم کے ہاتھ میں ہو۔

یہ ہیں ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی پالیسی کے وہ اساسی پہلو جو
آج بھی ہماری تعلیم کی بنیادیں مضبوط و مستحکم کر سکتے ہیں۔ کیا اچھا
ہو کہ ہمارے ملک کے فاضل اساتذہ اپنے فرائض کے ضمن میں یہ پہلو
پیش نظر رکھا کریں اور یہ بھی خیال رکھیں کہ ڈاکٹر صاحب کے

استقلال کو پچیس برس گزر جانے کے باوجود ان کی تعلیمی پالیسی کے وزن میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ کبھی آئے گی۔

حیات ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا سن وار مرقع

۱۸۷۷ء پیدائش بمقام میرٹھ

۱۸۸۹ء ایم اے او کالجیٹ اسکول میں داخلہ

۱۸۹۴ء مارہرہ میں اسکول قائم کرنا۔

۱۸۹۵ء بی اے میں کامیابی

ایم اے او کالج میں ملازمت

۱۸۹۸ء الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے پاس کیا۔

۱۹۰۱ء ڈی ایس سی کی ڈگری فرسٹ ڈویژن میں حاصل کی۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان جانے کے لیے اسکالر شپ دیا۔

۱۹۰۱ء ۱۹ر جولائی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کی روانگی

۱۹۰۶ء ۱۱ر دسمبر کو یورپ سے واپسی

۱۹۱۰ء الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری سے انکار

۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۰ء پہلے عارضی اور پھر مستقل پرنسپل رہے۔

۱۹۱۷ء یوپی صوبہ کونسل میں الہ آباد یونیورسٹی کی نمائندگی، سیڈلر کمیشن کلکتہ یونیورسٹی کا ممبر ہونا۔

۱۹۱۱ء خواہشمند ملازمت اولڈ بوائز کے لیے ایک دفتر کا قیام۔

۱۹۲۲ء ایم اے او کالج پر ترک موالات کا حملہ

۱۹۲۲ء ایم اے او کالج کا یونیورسٹی بن جانا

۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۸ء پرو وائس چانسلر رہنا۔

۱۹۲۲ء یوپی صوبہ کونسل میں دوبارہ منتخب ہونا۔

۱۹۲۵ء جشن جوبلی

۱۹۲۷ء انکوائری کمیٹی اور ڈاکٹر صاحب کا مستعفی ہونا

۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء مرکزی اسمبلی کا ممبر رہنا۔

۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۶ء وائس چانسلر رہنا

۱۹۴۸ء ۲۳ر دسمبر بمقام لندن وفات پانا۔

۱۹۴۹ء ۲ اور ۳ر فروری کی شب میں لاش کا لندن سے علی گڑھ پہنچنا۔

۴ر فروری کو یونیورسٹی مسجد میں مزار سرسید کے برابر دفن ہونا۔

وہ سرسید!

پروفیسر جمیل مظہری

وہ سرسید کہ جس کو اس چمن کا باغباں کہیے
نسیم جانفزائے نو بہار گلستاں کہیے!

وہ سرسید کہ جس نے فکر کی دنیا بدل ڈالی
فضائے مادیِ ملت بیضا بدل ڈالی

وہ سرسید، ہوئیں بیدار موجیں جس کے افسوں سے
وہ سرسید، ارادے جس کے ٹکراتے تھے گردوں سے

نگاہ دوربیں نے جس کی فتنوں کو جری دیکھا
ضمیر سنگ میں رقص بتان آذری دیکھا

اذاں سوتی ہوئی بستی میں دی اٹھ کر سویرے سے
نکالا صبح مستقبل کو ماضی کے اندھیرے سے

ہیں جس کے نقش پا پر قافلے گرم خرام اب تک
فضائے ہند میں گونجا ہے جس کا یہ پیام اب تک

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

ایجوکیشنل کانفرنس — حرفے چند

جناب وفا راشدی ایم۔ اے

زندۂ جاوید ماند ہر کہ نکو نام زیست
کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے سر سید احمد خان کو، پاکستان نے قائد اعظم کو، پیام اقبال نے علامہ اقبال کو اور انجمن ترقی اردو نے بابائے اردو کو زندہ جاوید کر دیا اسی طرح آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے سید الطاف علی بریلوی کو حیات جاودانی بخش دی ہے۔ کام سے نام اور نام سے انسان زندہ رہتا ہے۔ دوسروں کے لیئے جینے والے، نام و نمود، صلہ و ستائش سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کو ٹھوس اور مفید مقاصد میں صرف کرنے والے ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتے ہیں۔ قوم در قوم نسل در نسل تک گویا صدیوں تک ان کے جلائے ہوئے چراغ سے چراغ جلتے رہتے ہیں۔ تاریکی دور ہوتی رہتی ہے اور روشنی پھیلتی رہتی ہے۔ کیا جانے والا زمانہ کیا آنے والا زمانہ ایسے لوگوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہی قانون فطرت ہے یہی آئین قدرت ہے۔

جس لگن اور مشن کے ساتھ سر سید احمد خان نے سنہ ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرس علی گڑھ کی بنا ڈالی تھی اسی لگن اور مشن کے ساتھ سید الطاف علی بریلوی نے سنہ ۱۹۵۱ء آل پاکستان ایجوکیشنل کراچی کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اب یہ دونوں نام لازم اور ملزوم ہیں گویا ایک ادارہ ایک تحریک کے دو نام ہیں۔

پروردگار عالم خالق کونین جب اشرف المخلوقات میں سے کسی کو شرف بخشنا چاہتا ہے تو اسے اپنی تمام نعمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔ جس طرح سر سید احمد خان کو مقاصد کی تکمیل کے لیئے گام بہ گام صالح اور مخلص رفقائے کار ملے۔ اسی طرح سید الطاف علی بریلوی نے بھی اپنے سفر کے لیئے پیکر اخلاص و ایثار ساتھیوں کو تلاش کر لیا۔ ان کے رفیقوں اور معاونین میں ملک کے اکابر علم و ادب، ماہرین تعلیمات، سربراہان فنون اور اہل فضل و کمال شامل ہیں۔ یہ وہ جلیل القدر ہستیاں ہیں جو اپنے اپنے فن اور اپنے اپنے شعبوں میں خصوصی مہارت و خصوصی علمیت کی حامل ہیں۔ قوم کی ایسی نامور و ناقابل فراموش شخصیتوں میں ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم، ڈاکٹر محمود حسین مرحوم، پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم مرحوم، جسٹس قدیر الدین احمد، سید حسین امام، حسن علی عبدالرحمٰن، پروفیسر اے۔ ایم قریشی، سید حامد علی جعفری، پروفیسر شجاع احمد زیبا مرزا اظہر علی برلاس، پروفیسر حامی الدین خان، مولانا سید عبد القدوس، لیڈی غلام حسین ہدایت اللہ، ثناالحق صدیقی پروفیسر محمد ایوب قادری اور محترمہ سیدہ انیس فاطمہ کی علمی و قومی خدمات نہ صرف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے لیئے بلکہ پوری قوم کے لیئے باعث افتخار ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ ایک درجن سے زائد بہترین
کارکن پچیس سال کے عرصے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان
کی خدمات عالیہ ہمیشہ آب زر سے لکھی جائیں گی اور ان کو
کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

جناب سید الطاف علی بریلوی اس وقت ستر کے
پیٹے میں ہیں لیکن اک انداز دلبری اور جوش عسکری سے
شب و روز کام میں مشغول رہتے ہیں کام ان کی زندگی کا مقصد
ہے نصب العین ہے، عبادت ہے، ریاضت ہے، اس عمر میں بھی کام
کرنے کا یہ دل نواز و دلفریب انداز جو ہر ایک کا دل موہ لیتا ہے

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تنظیم، کتب
خانے کی ترتیب و تدوین، دفتر کی کارگزاریاں، علمی ادبی،
ثقافتی سرگرمیاں، تصنیف و تالیف، پروف ریڈنگ،
مضمون نگاری، اداریہ لکھنا، رسالے کی کتابت و اشاعت
مضامین کی فراہمی و انتخاب سے لے کر پاسٹنگ اور
ڈسپیچ DESPATCH کا ہر کام وہ خود بھی کرتے ہیں
اور اپنی نگرانی میں دوسروں سے بھی کرا لیتے ہیں کم سے
کم عملے سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کام لینا ایک فن
ہے اور یہ گر الطاف بریلوی صاحب کو خوب آتا ہے پھر
یہ کہ دوسروں سے وہی شخص کام لے سکتا ہے جو وہ
خود کام کرتے یا متعلقہ کام کو سمجھنے کی غیر معمولی اہلیت
رکھتا ہو اللہ نے انھیں اس بات کی بے پناہ صلاحیت
عطا کی ہے وہ کئی کئی آدمیوں کا کام بیک وقت خود
نبٹا لیتے ہیں۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا
ان کو مصروف کار دیکھا ہے کبھی کچھ لکھ رہے
ہیں، کبھی کچھ پڑھ رہے ہیں، کبھی ہدایات جاری کر رہے
ہیں اور کبھی کسی نہ کسی معاملے میں دوسروں کی رہنمائی
فرما رہے ہیں ان کے آگے کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں رہتا
اس عمر میں یہ کس بل، یہ حوصلہ، یہ ہمت، یہ عزم
یہ استقلال، اللہ اللہ۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے
کہ سر سید احمد خاں کی روح سید الطاف علی بریلوی
کے قلب میں سما گئی ہے ہمارے سامنے سر سید کا دوسرا
روپ نظر آتا ہے۔

پاکستان میں ان کے سر سید کے صحیح متبع ہونے
میں کیا کلام ہے۔ آخر وہ بھی سید تھے یہ بھی "سید"
ہیں۔ وہی نصب العین، وہی مقصد، وہی منشور
پاکستانی مسلمانوں کو اسلامی تعلیم و تربیت سے آراستہ
کرنا، ملت اسلامیہ کو اقوام عالم کے برابر لا کھڑا کرنا
اور دنیا کے سامنے اس ملک کو سربلند رکھنا الطاف
بریلوی کا مشن ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
ان کی مسلسل جد و جہد اور پیہم کاوشوں کا روشن
مینارہ ہے جس سے نہ صرف آج کی نسل بلکہ آنے
والی نسل بھی روشنی پائے گی۔ تعلیمی، علمی، ادبی،
تہذیبی، ثقافتی، غرض ہر میدان میں ملت پاک کا لوہا مانا
جائے گا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد کراچی کی
اپنی خوبصورت عمارت میں قائم ہے خدا اسے رہتی دنیا
تک قائم رکھے۔ کانفرنس کے تحت کتب خانہ، تاریخی
ثقافتی نوادرات، مشاہیر کی نایاب تصاویر،
قلمی نسخوں، دارالمطالعہ اور جلد سازی کے شعبے
بیک وقت سرگرم عمل ہیں۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل

ریسرچ ذیلی ادارہ ہے۔ کانفرنس کی مشرقی جانب سو گز کے فاصلے پر اپنی شاندار عمارت میں سرسید گرلز کالج کا قیام ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کے شعبۂ نسواں کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کالج نے جس قومی انداز میں تعلیم نسواں کا معیار بلند کیا ہے اور قوم کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ و اشاعت میں جو گراں قدر حصہ لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

شعبہ تصنیف و تالیف، ترجمہ و تحقیق اپنی افادیت و وسعت کے اعتبار سے ایک ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے اس ادارے نے تاریخ اقوام اور تاریخ اسلام کے پس منظر و پیش منظر میں مسلمان قوم کے مزاج، عروج و زوال، سکوت و تلاطم کی روشنی میں تعلیمات نفسیات و فلسفہ، سائنس اخلاقیات، عمرانیات ادبیات، لسانیات، انتقاریات، سیرۃ، سوانح اور تذکرے جیسے ہمہ گیر موضوعات پر بکثرت کتابیں شائع کی ہیں۔ ان مطبوعات* میں خود جناب سید الطاف علی بریلوی کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہوکر ارباب نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے الطاف بریلوی صاحب کے تبحر علمی، تعلیمی بصیرت، تحقیقی شعور اور فکر و نظر کی بلندی اور ان کے ذی علم رفقائے کار کے خلوص عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

ماہی اور راہ نما۔ طالب علم کی ڈائری۔ تعلیمی مسائل۔ تعلیم و تربیت۔ حاصل مطالعہ۔ حیات حافظ رحمت خان۔ چند محسن چند دوست علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں اور مقالات بریلوی وغیرہ

"العلم" آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سہ ماہی رسالہ ہے جس کا اجرا جولائی ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ جناب الطاف علی بریلوی اس جریدے کے مدیر اعلیٰ ہیں یہ صحیفہ پاکستان کی تعلیمی ترقی اور تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ترجمان ہے مشہور و ممتاز اہل قلم کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ عموماً تنظیمی و انتظامی صلاحیت رکھنے والے لوگ تحریر و تقریر کے لئے وقت نہیں نکال پاتے لیکن الطاف بریلوی کی حیثیت غیر معمولی اور منفرد ہے ان کا اور ان کے ساتھیوں کا قلب گرم، روح بیدار، ذہن روشن، قلم برق رفتار، زبان شیریں اور آنکھیں چمک دار ہیں۔ سہ ماہی "العلم" کا ہر شمارہ اپنے مضامین کے تنوع اور مواد کے توازن کے اعتبار سے خصوصی اشاعت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس رسالے کے جو خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں ان میں غالب نمبر، جنگ، آزادی نمبر، بائیس سالہ جشن اشاعت نمبر وغیرہ یادگار نمبر ہیں۔

"العلم" کا اداریہ قومی، سیاسی، تعلیمی و علمی مسائل کے کسی نہ کسی پہلو پر حاوی ہوتا ہے اور اپنے افادی پہلو کی بنا پر فکر انگیز ہوتا ہے "العلم" کے ذریعے ہر تین ماہ میں "بزم کانفرنس" نظر افروز ہوتی

---

* مطبوعات کی فہرست طویل ہے یہ فہرست مطبوعہ ہے اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس حاصل کی جا سکتی ہے

ہے جس میں ارباب فکر ونظر اور اہل قلم ودانش کی
محفلیں بالاہتمام سجائی جاتی ہیں یوں ملک کے گوشے
گوشے کے دانشوروں اور قلم کاروں کا خاصا اجتماع
ہو جاتا ہے۔ مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں تعمیری
رجحانات علمی میلانات اور ادبی خیالات کی تبلیغ و
اشاعت کے لئے فضا پیدا ہوتی ہے۔

"العلم" کے لکھنے والوں میں ہر مکتبۂ فکر اور
ہر مدرسۂ خیال کے لوگ شامل ہیں۔ "العلم" کا دامن
گروہ بندی اور حلقہ سازی کی لعنتوں سے پاک ہے۔
الطاف صاحب علم دوست اور وفا آشنا ہی نہیں
جوہر شناس بھی ہیں۔ اہل ذوق واہل علم حضرات
کی پذیرائی سے انہیں مسرت ہوتی ہے۔ "العلم" میں
شائع ہونے والے مضامین ومقالات کی افادیت
اور ان کے موضوعات کی وسعت وہمہ گیری کا اندازہ
ان عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے

آثار ونوادر۔ کتب خانے۔ آداب و
اخلاق۔ اصلاحی مضامین۔ آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس۔ اداریئے۔ ادبیات۔ شعر وسخن۔ پاکستان
و پاکستانیت۔ تصوف۔ تعلیم۔ تعلیم نسواں۔
تعلیمی ادارے۔ تہذیب وتمدن جائزے اور مطالعے
جنگ وجہاد۔ خطبات۔ دستور وقانون۔ سائنس
اور سائنسی ادارے۔ سیاسیات۔ سیر وسفر۔ صحت و
طب۔ علی گڑھ تحریک۔ فلسفہ اور نفسیات۔ فنون
لطیفہ۔ کتابیات۔ لسانیات۔ مذاہب۔ اسلام
اور مسلمان۔ معاشیات اور اقتصادیات۔ مکاتیب
ممالک وبلاد وغیرہ

ان عنوانات کے تحت سید الطاف علی بریلوی صاحب
کے بھی ان گنت مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ سید
صاحب نے متعدد کتابوں کے بارے میں جو بصیرت
افروز مقدمے۔ پیش لفظ۔ تقریظیں اور دیباچے
تحریر فرمائے ہیں وہ ان مضامین کے سوا ہیں۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو "العلم" کا بائیس سالہ
جشن اشاعت نہایت تزک واہتمام سے منایا گیا
وفاقی وزیر حج واوقاف مولانا کوثر نیازی اس
تقریب سعید کے مہمان خصوصی تھے۔ ان کی عالمانہ
وفاضلانہ تقریر نے حاضرین کو بہت متاثر کیا۔

جناب سید الطاف علی بریلوی مدیر اعلیٰ "العلم"
سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے سپاس نامہ
میں کانفرنس کے اغراض ومقاصد اور مسائل و
مشکلات کا جس اثر انگیز پیرائے میں بیان فرمایا تھا
اس کا نہایت خوش گوار نتیجہ برآمد ہوا۔ "العلم" اور
کانفرنس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں
مدد ملی۔ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم۔ ڈاکٹر ممتاز حسن
مرحوم، پروفیسر اے بی۔ اے حلیم مرحوم، سید حسین امام

٭ ان "العلم" بابتہ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۳ء میں شائع شدہ مضامین کی مکمل فہرست کے لئے ملاحظہ
ہو اشاریہ مضامین "العلم" اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء ص ۷۷ تا ۱۱۲

پروفیسر عبدالمجید قریشی اور ڈاکٹر زمان فتحپوری نے جلسہ سے خطاب کیا۔ "العلم" کی یہ خصوصی تقریب اپنی نوعیت کی نہایت کامیاب تقریب تھی۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریبات، جلسے اور مشاعرے ایسے سلیقے اور اہتمام سے منعقد ہوتے ہیں کہ وہ اہل دل کے دلوں میں خوش گوار اثرات چھوڑ جاتے ہیں اسی قسم کا ایک یادگار "قومی نظموں کا مشاعرہ" وہ تھا جو کانفرنس کے زیر اہتمام ۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء کی شام کو اس کے یوسف میموریل ہال میں انعقاد پذیر ہوا تھا۔ اس کی صدارت ابتدا میں جناب شان الحق حقی نے اور بعد میں جسٹس قدیر الدین احمد صاحب نے فرمائی تھی۔ شعرا و شاعرات خاصی تعداد میں شریک بزم تھے جن کی قومی و ملی نظموں نے ملت کے دلوں کو گرمایا اور روحوں کو بیدار کیا۔ ان نظموں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں اخوت، محبت، انس و اتحاد اور اخلاص و آشتی کا پیغام تھا۔ حب الوطنی اور انسان دوستی کے جذبات سے معمور تھیں۔

یہ تمام نظمیں "العلم" کے شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکی ہیں اس طرح نئی قومی ملی نظموں کا نیا ذخیرہ ایک شمارے میں محفوظ ہو گیا ہے اس لحاظ سے اس شمارے کو "قومی شاعری نمبر" کہا جا سکتا ہے۔ سید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی نگرانی میں ایک یہ خدمت بھی انجام پا گئیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کی ملت اسلامیہ میں اجتماعی فضا پیدا کی جائے۔ مسلمانوں کو پستی کی گہرائی سے نکال کر تعلیمی بیداری اور سیاسی شعور کے جوہر سے آراستہ کیا جائے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور اس سے ملحقہ شعبے یا ادارے سرسید گرلز کالج اور دیگر علمی و تعلیمی سرگرمیاں شاہد ہیں کہ پاکستانی سید نے برصغیر کے سید کے مشن کو نہ صرف حسن و خوبی اور ترقی و کمال کے ساتھ آگے بڑھایا بلکہ نئی مملکت پاکستان کے سیاسی، تعلیمی، تہذیبی اور ادبی تقاضوں سے بھی ہم آہنگ کیا ہے۔

جناب سید الطاف علی بریلوی کی مرنجان مرنج، ہمہ رنگ اور پہلودار شخصیت اور ان کی گوناگوں خدمات کا تقاضا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں "العلم" الطاف علی بریلوی نمبر شائع کیا جائے ہمارے ہاں مردہ پرستی کے برعکس زندہ دوستی کی روایات پڑ چکی ہے۔ اگر فیض احمد فیض نمبر، جوش نمبر، حفیظ نمبر اور احمد ندیم قاسمی نمبر کے ذریعے ان اکابر و مشاہیر کی بے پناہ خدمات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے تو الطاف شناسی کی مثال بھی قائم کی جا سکتی ہے مجھے یقین ہے کہ وسیع القلب اور مخلص حضرات مجھ ناچیز کی اس علمی تجویز پر سنجیدگی سے توجہ فرمائیں گے تاکہ آنے والے دن کو شکوہ سنجی کا موقع نہ ملے۔

ہم بھی تھے گوہر گراں مایہ
پر کوئی صاحب نظر نہ ہوا

اگلے زمانے کے لوگوں کی عظمت اس بات میں تھی کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ اسکول، کالج، ہسپتال اور ایسے ہی دوسرے تعمیری و تعلیمی کاموں کے لئے مختص کر دیا کرتے تھے۔ آج بھی خدا کے نیک اور صالح بندوں کی کمی نہیں جن کے نزدیک دولت سے کھیلنا ہی معیار زندگی نہیں بلکہ اسے مفید قومی کاموں میں صرف کرنا ان کی زندگی کا نصب العین ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ارباب خیر و اثر کی توجہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی مالی امداد کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اہل رسوخ حضرات پر مشتمل کمیٹی کے زیر نگرانی "کانفرنس فنڈ" قائم کیا

جائے ساتھ ہی اگر کتب فروشوں کے دیانتدارانہ و مخلصانہ تعاون سے کانفرنس کی مطبوعات کی نکاسی کا بھی معقول بندوبست ہو جائے تو کانفرنس کی ترقی و تعمیر کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں ایسے جذبۂ اخلاص ایثار اور جوش و شعور کی کمی نہیں جس سے زندگی میں بہاریں آتی ہیں۔ ایک زندہ اور باشعور قوم علامہ اقبال کے اس نکتہ راز سے خوب واقف ہے ۔

ع ۔ نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر

سرسیّد اور کالج

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انسان ہے ناتمام

بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام

تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسبِ حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام

سید کے دل پہ نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام

صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

دکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام

نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احترام

اکبر الہ آبادی

مسلم یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی (سنہ ۱۹۲۵ء) اور اس عہد کے کچھ رہنما

از

پیرزادہ سید اصغر علی شاہ ریٹائرڈ جج

میں قادری باغ۔ ڈبائی ضلع بلند شہر کا رہنے والا ہوں۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کا تعارف یا تو ان وفود کے ذریعے سے ہوا جو موسم گرما کی تعطیلات کے زمانے میں بغرض وصولیابی چندہ مخصوص مقامات پر جاتے تھے ان میں سے ایک مقام قادری باغ بھی تھا۔ یا ان اعزا واحباب کے ذریعے سے ہوا۔ جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں مجھ سے پہلے داخل ہوئے۔ میں اکثر ان سے ملنے جاتا تھا اور اُن کے ہوسٹل کلاس روم۔ اور کالج کی خوشنما و خوبصورت مسجد کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا اور اسی سلسلہ میں سرسید علیہ الرحمۃ کے مزار اقدس پر فاتحہ پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ جب میں نے مندرجہ ذیل شعر سرسید مرحوم و مغفور کے کتبۂ مزار پر دیکھا اور پڑھا تو اس سے میں بے انتہا متاثر ہوا۔

تاب یک جلوہ نیاوردنہ موسیٰ و نہ طور
ایں دلم ہست کزیں گونہ ہزاراں دیدہ است

سنہ ۱۹۲۴ء میں میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا اور سنہ ۱۹۲۵ء میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ اسی سال دسمبر میں گولڈن جوبلی کا جشن منایا گیا۔ ایسا عظیم الشان جلسہ علی گڑھ میں نہ کبھی پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد۔

اس وقت مستقل وائس چانسلر صاحبزادے آفتاب احمد خاں صاحب بار ایٹ لا سابق ممبر پریوی کونسل تھے لیکن اس زمانے میں ان کی طبیعت ناساز تھی اور کچھ مصلحت بھی ایسی تھی کہ یونیورسٹی کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہو کہ .... صاحبزادہ صاحب مرحوم و مغفور نے جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں آف بھیکم پور (علی گڑھ) کو قائم مقام وائس چانسلر

بنا دیا تا کہ گولڈن جوبلی کے موقع پر جلسۂ افتتاحیہ کی صدارت نواب صاحب ممدوح فرمائیں۔ دوران جلسہ جناب نواب مزمل اللہ خاں صاحب نے ایک لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان فرمایا اور کہا یہ چیک حاضر ہے۔ اس پر خوشی کی تالیوں سے جن کا سلسلہ بدیر رہا سارا پنڈال گونج گیا۔ وہ منظر قابل دید تھا۔ اور ہمارے سب علیگ بھائی جو اس وقت اس جلسے میں شریک تھے۔ کبھی اس منظر کو نہیں بھول سکتے۔ اسی جلسے میں مہاراجہ الور آنجہانی بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے چالیس ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان فرمایا۔ ان مہاراجہ صاحب کی عقلمندی تدبّر اور دور اندیشی ملاحظہ فرمائیے۔ اس چالیس ہزار میں سے مبلغ ۲۵ ہزار روپے کی رقم شعبۂ دینیات کے لئے مخصوص فرمائی اور بقیہ پندرہ ہزار روپیہ کسی دوسرے شعبہ کو دیا۔ اس جلسے میں سارے ہندوستان کے مسلم قائدین قوم مثلاً جناب محمدؐ علی جناح۔ سر علی امام سر محمدؐ شفیع وغیرہ شرکت فرما رہے تھے۔ اور اچھی سے اچھی تقریریں سننے میں آئیں۔ سر علی امام نے جس وقت یہ فرمایا " اے علی گڑھ کے فرزندو سر سید کی جلائی ہوئی شمع علم کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں لے جاؤ " تو یہ الفاظ سننے کے بعد جلسے میں جان پڑ گئی۔ اور اسی قسم کی تالیوں سے پنڈال گونج اٹھا۔ کہ جو سماں اس وقت برپا ہوا تھا جب نواب مزمل اللہ خاں صاحب نے اپنے عطیہ کا اعلان فرمایا تھا۔ سر علی امام کے مندرجہ بالا الفاظ آج تک میرے دل پر نقش ہیں۔

ایک بات جس سے تمام جلسہ بالعموم اور علی گڑھ بوائز بالخصوص بے حد متاثر ہوئے قابل ذکر یہ ہے کہ سر محمدؐ شفیع نے اپنی سرخ گاؤن دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر بار بار ہلائی۔ اور یہ فرمایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جو آنریری ڈگری ڈاکٹریٹ کی مجھ کو عطا کی ہے اس کے باعث میں اتنا فخر محسوس کرتا ہوں کہ سر کا خطاب اور دوسرے اعزازات جو مجھ کو منجانب گورنمنٹ برطانیہ تفویض کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی اتنی سرفرازی اور خوش قسمتی محسوس نہیں کرتا کہ جتنی اس لال گاؤن کے پہننے کے بعد محسوس کرتا ہوں۔ ان الفاظ نے مسلم یونیورسٹی کو وہی خراج تحسین پیش کیا۔ کہ جو سر علی امام کے الفاظ نے سر سید علیہ الرحمۃ کی جلیل القدر خدمات کو پیش کیا تھا۔

علی گڑھ بوائز نے مہاراجہ الور کی یہ عزت کی کہ ریلوے اسٹیشن سے بجائے گھوڑوں کے خود ان کی گاڑی کو کھینچ کر مزمل پیلس تک پہنچایا جہاں مہاراجہ کے اعزاز میں لنچ دیا گیا تھا۔ اور ایک شاندار سنہری دروازہ بھی تعمیر کرایا گیا تھا جو اس وقت تک موجود ہے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمدؒ صاحب اس زمانے میں پرو وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے میرے سپرد یہ خدمت کی کہ افغانستان سے جو ڈیپوٹیشن ہز ایکسی لینسی سید محی الدین منسٹر آف ایجوکیشن کی سرکردگی میں بغرض شرکت اجلاس ہائے گولڈن جوبلی علی گڑھ آیا تھا اس ڈیپوٹیشن کی میزبانی کا انتظام میں کروں اور میری مدد کے لئے ایک اور طالب علم جو سرحد کے رہنے والے تھے ان کو بھی تعینات کیا۔ ہم دونوں فارسی بول سکتے

تھے اس لئے اس خدمت کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ ہز ایکسی لینسی سید محی الدین کے علاوہ تین ڈائرکٹران ایجوکیشن بھی اس ڈیپوٹیشن میں شامل تھے ان حضرات کے قیام کے لئے میریس روڈ پر ایک خوشنما کوٹھی بیت العزیز جو نہایت عمدہ فرنیچر سے آراستہ کرائی گئی تھی، مخصوص کی گئی تھی۔

فجر سے عشار کے بعد تک میرا قیام اسی ڈپوٹیشن کے ساتھ رہتا تھا۔ جب میں نے اہالیان ڈیپوٹیشن کو یونیورسٹی کی مختلف عمارات یعنی جملہ ہوسٹل شاہجہاں منزل اولڈ بوائز لاج۔ یونیورسٹی سوئمنگ پول وغیرہ دکھلائیں۔ تو ہز ایکسی لینسی سید محی الدین بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''ایں یک شہر دیگر است'' اہالیان ڈیپوٹیشن سے ملنے کے لیئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب، پروفیسر ہادی حسن صاحب و دیگر زعمائے قوم وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے، پروفیسر ہادی حسن صاحب کا ایرانی لب ولہجہ انتہائی قابل ستائش تھا۔ اس قدر عمدہ فارسی کی گفتگو سننے میں آئی گویا گل افشانی ہو رہی ہے۔ ان سے ملاقات کرکے اہالیان ڈیپوٹیشن بے حد محظوظ ہوئے۔ کابل سے مختلف اقسام کے تر و تازہ میوہ جات اہالیان ڈیپوٹیشن اپنے ساتھ لائے تھے اور جو صاحبان بغرض ملاقات تشریف لاتے تھے۔ ان کی تواضع انتہائی خلوص کے ساتھ کی جاتی تھی اور بڑے اصرار کے ساتھ افغانی فواکہات پیش کیئے جاتے تھے۔ شطرنج کا ہر چہار ممبران ڈیپوٹیشن کو بڑا شوق تھا۔ اس زمانے میں میں بھی شطرنج کھیلتا تھا۔ جب ان حضرات نے دیکھا کہ میں بڑے غور و انہماک کے ساتھ ان کی چالیں دیکھ رہا ہوں تو انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ کیا آپ بھی شطرنج کا شوق رکھتے ہیں"؟ میں نے کہا کبھی کبھی کھیلنے کا اتفاق ہوتا ہے، جیسے ہی ان کی بازی ختم ہوئی۔ سید محی الدین صاحب نے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ شطرنج کھیلوں گا۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ بازی شروع ہوگئی تھوڑی دیر تک تو خاموشی کے ساتھ کھیل جاری رہا۔ لیکن اس کے بعد جوش بڑھنا شروع ہوا اور ہر سہ ڈائرکٹر صاحبان نے بار بار مداخلت کی اور بڑے پُر جوش الفاظ میں سید محی الدین صاحب کو مشورے دینا شروع کر دیئے۔ میں نے کہا صاحب یہ مداخلت بہت بیجا ہے اور ان حالات میں یکسوئی کے ساتھ شطرنج نہیں کھیلی جا سکتی۔ یا تو آپ اس مداخلت کو بند کریں یا پھر بہتر یہ ہے کہ آپ ہر چہار حضرات ایک طرف ہو جائیں۔ اور افغانستان کی نمائندگی کریں اور میں تنہا ہندوستان کی نمائندگی کرتا ہوں۔ بالآخر میری یہ تجویز منظور کرلی گئی۔ اور بازی میں بہت سنجیدگی پیدا ہوگئی اور سارا شور و غوغا خاموشی میں تبدیل ہوگیا۔ اور چالیں انتہائی احتیاط کے ساتھ ہر دو جانب سے چلی گئیں۔ ایک موقع پر میں نے ایک گھوڑا افغانیوں کا مارلیا۔ اور اس کے بدلے میں ان کو ایک پیادہ بھی نہیں دیا۔

اب بازی نے بہت طول اختیار کیا۔ تقریباً چار گھنٹے تک
یہ بازی جاری رہی اور دو یا تین بجے رات کے درمیان
اس نتیجے پر ختم ہوئی کہ بجز افغانیوں کے بادشاہ کے
اور سب مہرے میدان کارزار میں کام آگئے۔ اور
افغانستان پر ہندوستان کو نصف بازی کی صورت
میں فتح ہوئی یعنی بُرد میرے حق میں ہوئی۔

غرض کہ اسی طرح یہ تین چار دن کا زمانہ بے حد
پُرلطف رہا اور افغانستان کے نفیس و لذیذ میوہ جات
خوب خوب نوش کیئے گئے۔ اور افغان ڈیپوٹیشن
کی ضیافت بہترین ہندوستانی کھانوں سے کی گئی۔

دہلی سے حکیم سراج الدین خاں صاحب بغرض
شرکت گولڈن جوبلی علی گڑھ تشریف لائے تھے اور قیام
میرے غریب خانہ پر فرمایا۔ حکیم صاحب قبلہ کی بیگم صاحبہ کی
بھانجی مجھ سے منسوب تھیں۔ اور سر سید علیہ الرحمۃ سے
جناب حکیم سراج الدین خاں صاحب کا یہ رشتہ تھا کہ
سرسید کی نانی اور حکیم صاحب قبلہ کی دادی حقیقی بہنیں
تھیں۔ اسی قرابت کی بنا پر زمانہ طالب علمی میں حکیم
سراج الدین خاں صاحب کا قیام سرسید کے ساتھ رہا۔
اور ان کو بھی مثل سرسید کے علی گڑھ سے یعنی ایم۔ اے
او کالج اور مسلم یونیورسٹی سے والہانہ تعلق تھا۔ اپنی ذاتی
کوشش سے زائد از چھ ہزار روپے کی رقم بسلسلہ عطیات
ساکنان دہلی سے وصول کر کے اپنے ہمراہ لائے تھے اور
یہ رقم میں نے جناب حکیم صاحب قبلہ کے ارشاد کی تعمیل میں
ڈائس پر جا کر پیش کی تھی۔ حکومت افغانستان کی طرف
سے صرف چھ ہزار روپے کا عطیہ پیش کیا گیا۔ جبکہ حکیم سراج الدین
خاں صاحب کی کوشش کے نتیجے میں زائد از چھ ہزار روپے
کی رقم پیش کی گئی تھی۔ اپنے طالب علمی کے زمانے کے اساتذہ
میں سے مندرجہ ذیل حضرات کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

۱۔ جناب پروفیسر انعام اللہ خاں صاحب | انگلش لاجواب
پڑھاتے تھے۔ ان کو انگریزی زبان پر اور بالخصوص انگریزی
نظم پر بڑا عبور تھا۔ جناب انعام اللہ خاں صاحب کا
انگلش پیریڈ مسٹر ہال و مسٹر ڈکینسن جو اہل زبان تھے۔
ان سے بھی زیادہ پُرلطف ہوتا تھا۔

۲۔ جناب ڈاکٹر لودھی کریم حیدر صاحب | اقتصادیات
کے پروفیسر تھے۔ اور شمالی ہندوستان میں اپنی لیاقت
کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ صرف تھوڑے ہی عرصے
میرے زمانہ طالب علمی میں جناب ڈاکٹر کریم حیدر صاحب
نے اقتصادیات کا کلاس لیا اور اپنی غیر معمولی قابلیت
کی بنا پر سنٹرل پبلک سروس کمیشن کے ممبر منتخب ہو کر
دہلی تشریف لے گئے۔ جناب ڈاکٹر صاحب ممدوح کے
در دولت پر بھی مجھ کو حاضری کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کے
خلوص و محبت سے و نیز ان کی بیگم صاحبہ کی عظیم شخصیت
سے جو جرمن نژاد تھیں میں بے حد متاثر ہوا۔ ان ہر دو
حضرات کو میں آج تک انتہائی احترام کے ساتھ یاد رکھتا ہوں۔

۳۔ جناب حمید الدین خاں صاحب شعبۂ فارسی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ | متوطن شہر بریلی تھے۔
ان کی فارسی کی لیاقت مسلمہ تھی۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں
عبور تھا۔ میرے اوپر بڑا کرم فرماتے تھے۔ ریویو کے لیے
جو نئی کتابیں ان کے پاس آتی تھیں اکثر مجھ کو عنایت کرتے
تھے۔ پرشین گرامر سے مجھ کو بے حد لگاؤ ہے اور اب تک

میں پرشین اور انگلش گرامر کو اس لطف اور شوق کے ساتھ پڑھتا ہوں کہ جس طرح لوگ ناول پڑھنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ممدوح کی ہر بات بہت باقاعدہ ہوتی تھی۔ نہایت سچے، صاف گو اور ہمدرد انسان تھے اور علی گڑھ تحریک کے دلدادہ۔ شکار کا بہت شوق تھا۔

۴۔ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب صدر شعبہ

دینیات بڑے جید عالم تھے اور ہم سب طلباء جناب مولانا صاحب کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ان کے بارے میں ایک واقعہ قابل تحریر یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب سے ریاضی کا ایک مسئلہ حل نہ ہو سکا اور ڈاکٹر صاحب ممدوح نے جرمنی کے سفر کا قصد کیا تاکہ وہاں جا کر اس مسئلے کا حل تلاش کریں جب مولانا سلیمان اشرف صاحب کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ بجائے جرمنی کے بریلی کا سفر اختیار کریں اور مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم و مغفور سے اس مسئلے کا حل دریافت کریں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو بہت حیرت ہوئی لیکن مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے ان کو مجبور کیا۔ اور اپنے ساتھ بریلی لے گئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا تعارف مولانا احمد رضا خاں صاحب سے کرایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا غیر حل شدہ مسئلہ ریاضی بیان کیا۔ اور اسی وقت پہلی ملاقات میں وہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اب تو ڈاکٹر صاحب کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس وقت تک مغربی تعلیم کا اثر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب پر بہت

زیادہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ مولوی صاحبان کو تو محض عربی کی لیاقت ہوتی ہے۔ اور دیگر مضامین کے بارے میں ان کی معلومات بہت گھٹیا قسم کی ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ڈاڑھی رکھائی اور پابندی سے نماز پڑھنے لگے۔ خود ڈاکٹر صاحب کی ریاضی کی لیاقت مسلمہ تھی۔ ایک مرتبہ اُن کی پردو الس چانسلری کے زمانہ میں ریاضی کے ایک پروفیسر صاحب نے ایک ورالڈ پرابلم کے بارے میں جناب ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ورالڈ پرابلم ہے اور ابھی تک اس کا حل دریافت نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے کمال یہ کیا کہ بلا کسی خاص تیاری کے اپنے دفتر کی میز پر بیٹھے بیٹھے اور بلا کسی کتاب سے مدد لیئے ہوئے اس پرابلم کو منٹوں میں حل کر دیا۔ اور یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ انھوں نے انجام دیا۔ لیکن ہمارے مولانا احمد رضا خاں صاحب علم ریاضی میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سے بھی بازی لے گئے بجز اس کے کیا کہا جائے کہ ان کی قوت ایمانیہ نے ان کا ساتھ دیا۔

علی گڑھ نے جو مشاہیر قوم پیدا کیئے ان میں سے چند حضرات کے نام حسب ذیل ہیں۔

مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں جسٹس سید محمود۔ سر سید راس مسعود بار ایٹ لا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ ڈاکٹر خان بہادر۔ مولوی حبیب اللہ خاں۔ سر سید رضا علی۔ سر محمد یعقوب۔ مولانا سید طفیل احمد منگلوری

خاں بہادر قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی ۔ ڈاکٹر
ذاکر حسین ۔ پروفیسر غلام السیدین ۔ مسٹر غلام محمد ۔
خواجہ ناظم الدین ۔ مسٹر عزیز مرزا ۔ ڈاکٹر سید محمود ۔ ان
نامہائے نامی کی فہرست بہت دراز ہے ۔ بسبب اختصار
صرف چند ناموں پر اکتفا کرتا ہوں ۔ اس مختصر مضمون میں
ان جملہ حضرات کے حالات زندگی قلمبند نہیں ہو سکتے ۔
میں صرف جناب مولانا طفیل احمد صاحب منگوری
کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے ۔ ۱۹۲۹ء میں
ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔ میں نے لکھنؤ کے سفر کا قصد کیا ۔
جب علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور ٹرین میں سوار
ہوا ، تو میں نے دیکھا کہ جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب
بھی اسی کمپارٹمنٹ میں تشریف فرما ہیں کہ جس میں قلی نے
میرا سامان رکھا تھا ۔ اس وقت تک میں صرف مولانا کے
نام سے واقف تھا اور اتنا جانتا تھا کہ ایک فرشتہ صورت
اور نیک خصلت انسان جن کو میں کبھی کبھی ولایت منزل
میں دیکھتا تھا وہی صاحب اس درجے میں موجود ہیں ۔
مولانا صاحب بھی میرے بارے میں اتنا جانتے تھے کہ
علی گڑھ کا پڑھا ہوا ایک نوجوان شخص ہے جو اکثر مولوی
حبیب اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضری کی غرض
سے ولایت منزل آتا رہتا ہے ۔

سلام علیک کے بعد میں نے دریافت کیا "جناب
مولانا صاحب کہاں کا قصد ہے ؟ فرمایا " دو تین روز کے
لیے لکھنؤ جا رہا ہوں " جب مجھ سے جناب مولانا صاحب نے
دریافت فرمایا ۔ تو میں نے بھی عرض کیا کہ میرا بھی قصد
لکھنؤ کے سفر کا ہے ۔ یہ سن کر مولانا صاحب بہت خوش
ہوئے اور سفر شروع ہو گیا ۔ جناب مولانا صاحب نے اپنا
نصف بستر کھول لیا اور پڑھنا شروع کر دیا ۔ ان کی عادت
تھی کہ وقت بالکل ضائع نہیں کرتے تھے ۔ مجھے اس زمانہ
میں ٹینس کھیلنے کا بے حد شوق تھا ۔ میں نے پریس
سے اپنا ٹینس بیٹ نکالا اور گرپ کی پریکٹس شروع
کر دی ۔ بریلی اسٹیشن پر گاڑی تبدیل ہوئی اور ہم
دونوں پھر لکھنؤ کے لیے ایک ہی کمپارٹمنٹ میں سوار
ہو گئے ۔ لکھنؤ تک سفر نہایت آرام سے گزرا ۔ جناب
مولانا صاحب اپنے مطالعے میں مصروف رہے ۔ اور میں
ٹینس گرپ کی پریکٹس کرتا رہا ۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی
ہوا کہ ناشتہ اور کھانے کے وقت جناب مولانا صاحب
سے کسی موضوع پر گفتگو ہو گئی ۔ کوئی اخبار فروش
آ گیا تو اخبار خرید کر اس پر ایک نظر ڈالی ۔ لکھنؤ پہنچنے
پر میں نے دریافت کیا کہ قیام کہاں ہو گا ۔ مولانا صاحب
نے فرمایا ۔ میں تو جب بھی لکھنؤ آتا ہوں مسلم فرینڈس
ہوٹل امین آباد میں قیام کرتا ہوں ۔ میں نے عرض کیا
کہ یہ ہی دستور میرا بھی ہے ۔ مختصر یہ کہ دو تین دن
تک جناب مولانا صاحب کا اور میرا قیام ایک ہی
کمرے میں رہا ۔ تیسرے دن مولانا صاحب نے فرمایا کہ
میرا کام تو ختم ہو گیا اور اب میں بدایوں جاؤں گا ۔
میں نے عرض کیا کہ جس کام کے سلسلے میں میں علی گڑھ
سے لکھنؤ آیا تھا میرا بھی وہ کام آج ختم ہو گیا ہے اور
عجیب اتفاق یہ ہے کہ مجھ کو بھی بدایوں جانا ہے ۔ میری
والدہ اور میری اہل خانہ وہاں مقیم ہیں اور میری آمد

کی منتظر ہیں۔ اب تو مولانا صاحب بہت ہی خوش ہوئے
اور میری خوشی کی تو کوئی انتہا نہیں تھی۔ کیونکہ زندگی
میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دو تین دن اس عظیم
شخصیت کے ساتھ گذارے تھے اور مجھ کو اس بات کا
پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی میں مجھ کو جو کام انجام
دینے متصور ہیں ان کے لیے جناب مولانا سے زیادہ
اچھا رہنما ملنا دشوار ہے۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ تا بدایوں
یہ سفر بھی بہت پُر لطف رہا اور بدایوں کے قیام کے
زمانے میں جو دو تین دن تک جاری رہا۔ جناب مولانا
کے توسل سے نظامی صاحب مرحوم و مغفور اور خان بہادر
مولوی فصیح الدین صاحب ریٹائرڈ کلکٹر و دیگر شرفا
بدایوں سے خوب خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ اس لکھنؤ اور
بدایوں کے سفر نے مجھ کو جناب مولانا سے قریب تر کر دیا۔

جب علی گڑھ سے تبدیل ہو کر میں آگرہ چلا گیا
اور وہاں مجھ کو اسپیشل منیجر کورٹ آف وارڈس
اضلاع آگرہ و علی گڑھ کا چارج ملا۔ اسی زمانے میں
جناب خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب بلگرامی
بھی آگرہ میں بحیثیت سینئر ڈپٹی کلکٹر تعینات تھے۔ صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ کے انتقال کے بعد خان بہادر ڈاکٹر حبیب اللہ
خاں صاحب اور جناب مولانا سید طفیل احمد خاں
صاحب بہ سلسلہ فراہمی چندہ بغرض تعمیر آفتاب ہال
آگرہ تشریف لائے اور ضلع آگرہ و متھرا کے سفر میں جناب
قاضی صاحب اور میں برابر مولوی حبیب اللہ خاں
صاحب اور جناب مولانا سید طفیل احمد خاں صاحب کے
ہمراہ رہے اور خاصی رقم چندے کی وصول ہوئی اور
بہت سے وعدے بھی ہوئے اور یہ وعدہ شدہ رقومات
وصول ہونے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ آگرہ کے قیام
کے زمانہ میں مولوی حبیب اللہ خاں صاحب نے اور
جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب نے آگرہ کے بہترین
سنگ تراشوں سے بات چیت کی اور جس جس قسم کے
پتھر درکار تھے ان سب کے آرڈر دیئے گئے۔ اور بعد
تکمیل ان پتھروں کے علی گڑھ پہنچانے کا کام میرے
سپرد کیا جو بحمد اللہ وقت مقررہ کے اندر انجام پا گیا۔ اور
جناب خاں بہادر حبیب اللہ خاں صاحب کی عین
مسرت کا باعث ہوا۔

آگرے کے بعد جن جن اضلاع میں میری تعیناتی
ہوئی جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب برابر کرم فرماتے
رہے اور جب بھی موقع ملتا میرے پاس قیام فرماتے
مثلاً لکھنؤ، سیتاپور، کانپور، شاہجہانپور، بریلی۔ ان
سب مقامات پر جناب مولانا صاحب تشریف لائے۔
اور قومی ملکی و تعلیمی امور پر بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو
ہوتی رہی۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں جبکہ جناب مولانا
صاحب اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل"
تصنیف کرنے میں مصروف تھے۔ ایک روز صبح کی چہل
قدمی کے وقت فاران محل روڈ اور وکٹوریہ اسٹریٹ
سے گذر کر ہم دونوں ایک وسیع پارک میں بیٹھ گئے۔
اور میں نے یہ کہنا شروع کیا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے
مسلمانوں کی سیاسی ترقی نے بڑی زبردست
کروٹ لی ہے۔ یہ گفتگو لکھنؤ کے وکٹوریہ پارک میں ستمبر

یا اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ جناب مولانا نے ارشاد
فرمایا کہ مسلمانوں کی اس سیاسی ترقی کو ذرا تفصیل
کے ساتھ سننا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ سب
سے پہلے امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں کا مقابلہ
کیا۔ باقاعدہ جنگ ہوئی۔ اور اس جنگ کے نتیجے میں امان اللہ
خاں بجائے امیر افغانستان کے شاہ افغانستان
ہوگئے اور انھوں نے انگریزوں کی بالادستی کا مکمل طور
پر خاتمہ کردیا اور افغانستان ہر اعتبار سے ایک آزاد
اسلامی سلطنت میں تبدیل ہوگیا۔ اور اسی طرح مصر
نے انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کی۔ اور مصطفیٰ کمال
پاشا نے مردہ ٹرکی کو حیاتِ نو دلائی اور شکست خوردہ
فوج کو یکجا کرکے اور سامان جنگ جس طرح بھی ہوسکا
جلد سے جلد مہیا کرکے انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کی
اور ان کے بحری بیڑے کو اتنا نقصان پہنچایا کہ برطانیہ
اپنی اس شکست اور نقصان و ذلت کو تاقیامت بھول
نہیں سکتا مختصر یہ کہ برطانیہ جیسی عظیم طاقت کو سر جھکانا
پڑا اور ٹرکی جس کا سلطان برطانیہ کے حق میں خط غلامی
لکھ چکا تھا۔ از سر نو ایک آزاد ملک بن گیا۔ اور روز
بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ سعودی عرب جو بڑی
حد تک برطانیہ کے زیر اثر تھا۔ اب ایک آزاد اسلامی
ملک میں تبدیل ہوچکا ہے اور امید ہے کہ رفتہ رفتہ
خاصی ترقی کرے گا۔ ۱۹۳۵ء میں ایران و عراق سے
انگریزوں کی وہ فوجیں جو ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کے بعد
سے ان ہر دو ممالک میں چھاؤنیاں قائم کرکے اپنے پیر
جمائے ہوئے تھیں۔ اب وہاں سے رخصت ہوچکی ہیں۔
اور ان چھاؤنیوں سے یونین جیک اتر گئے ہیں۔
افریقہ کے ان تمام علاقوں میں جہاں مسلم اکثریت ہے
کافی بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ اور مجھ کو تو ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام مسلم علاقے جو ایک زمانہ
میں سلیمان ثانی خلیفہ ٹرکی کے زیر نگیں تھے۔ اب رفتہ
رفتہ خود مختار و آزاد ہوجائیں گے۔ اور ان علاقوں
میں اسلامی سلطنتیں پوری قوت و طاقت کے ساتھ قائم
ہوجائیں گی۔ (یاد رہے کہ ۱۵۲۶ء میں جبکہ بابر نے
پانی پت کے میدان میں فتح حاصل کرکے سلطنت مغلیہ
کی بنیاد ڈالی اسی سال سلیمان ثانی خلیفہ ٹرکی نے
ہنگری فتح کیا اور رفتہ رفتہ جنوبی یورپ کے بہت سے
علاقے سلطنت ٹرکی میں شامل کرلیے۔ خلیفہ کے دوسو
پچاس باقاعدہ گورنر تھے۔ اور سلیمان ثانی نے اپنی بڑی
اور وسیع سلطنت قائم کی تھی کہ جس کی مثال تاریخ عالم
میں نہیں ہے) میں نے ان سب علاقہ جات کو نام بنام
گنا کر جناب مولانا سے عرض کیا کہ ایک وقت وہ آنے
والا ہے کہ ان شاء اللہ مسلمان دنیا کے سب سے بڑے
رقبے پر اور تقریباً ان تمام ممالک پر قابض ہوں گے
کہ جو سلیمان ثانی کے زیر نگیں رہ چکے ہیں اور اس میں
انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ کا اور اضافہ ہوگا۔ میری یہ
گفتگو سن کر جناب مولانا صاحب کی خوشی کی کوئی انتہا
نہ رہی جس بنچ پر ہم دونوں بیٹھے تھے اس سے اٹھ کر
مجھ کو چمٹا لیا۔ اور بار بار یہ کہتے تھے کہ آپ بالکل صحیح کہہ
رہے ہیں۔ اور ان شاء اللہ وہ سب باتیں مستقبل قریب میں
ظہور پذیر ہوں گی۔ جن کو آپ نے اس وقت تفصیل کے ساتھ

بیان کیا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ تمام علاقہ جات نہ صرف آزاد مسلم سلطنتوں میں تبدیل ہو چکے ہیں بلکہ ان میں آپس میں ایک عظیم بین الاقوامی مسلم اتحاد رونما ہوا ہے۔

جب کبھی میں یو۔پی کے دور دراز اضلاع سے علی گڑھ آتا تھا میرا قیام جناب خان بہادر ڈاکٹر مولوی حبیب اللہ خاں صاحب کے پاس ولایت منزل ہوتا تھا۔ اور جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب کا اور میرا کمرہ ایک دوسرے سے متصل ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۶ء تک برابر جاری رہا اس لیے مجھ کو جناب مولانا صاحب کے اخلاق حمیدہ اور کارہائے نمایاں کے بارے میں بہت کچھ واقفیت حاصل ہوئی۔

جناب مولانا صاحب کا لباس سادہ۔ غذا سادہ، خلوص بے انتہا اور قومی خدمت کا جذبہ عدیم المثال تھا۔ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ میری قومی زندگی کی نشو و نما سب سے زیادہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی رہین منت ہے۔ سر سید احمد خاں صاحب علیہ الرحمۃ کے بارے میں فرماتے تھے کہ قومی جلسوں کا انتظام ہم نے ان سے سیکھا۔ اس سلسلے میں بڑی تفصیل سے گفتگو فرماتے اور یہ کہتے تھے کہ سر سید علیہ الرحمۃ جلسے کی تاریخ اور وقت سے چوبیس گھنٹے پیشتر ہال کو پورے طور پر آراستہ کر کے مقفل کر دیتے تھے۔ ایک جلسے کے بارے میں فرمایا کہ سر سید کی اسپیچ سن کر ایک انگلش پروفیسر جو انگلینڈ سے چند ہفتے پیشتر ہی علی گڑھ آیا تھا اور اردو زبان سے ذرا بھی واقفیت نہ رکھتا تھا۔ جلسے کے اختتام پر یہ کہتے ہوئے سُنا گیا کہ حقیقتاً بہت بہت بڑا آدمی ہے۔

جناب مولانا صاحب نے ہندوستان کے تقریباً ہر صوبے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے منعقد کرائے، جن سے قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ لاتعداد مسلم اسکول اور کالج سارے ہندوستان میں قائم ہو گئے۔ ان جلسوں میں بہترین قومی نظمیں پڑھی گئیں اور فاضل مقررین نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں اپنا اپنا اظہار خیال کیا۔ کانفرنس کی ان خدمات کی وجہ سے علی گڑھ کا نام سارے ہندوستان میں روشن ہوا۔ اس عظیم کام میں جناب مولانا صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بڑی محنت کر کے ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۹۱۳-۱۴ء تک کی ڈائرکٹری علی گڑھ اولڈ بوائز کے بارے میں تیار کی جو بے حد مفید ثابت ہوئی۔ کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی۔ اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور اقتصادی حالت کے تباہ کرنے میں جو کام انگریزوں نے کیا تھا اس کو خود ان کی خفیہ تحریروں کا حوالہ دے کر ثابت کر دیا۔

جب مولانا صاحب یو۔ پی میں صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تو انھوں نے مسلم اوقاف کے سلسلے میں نہایت عمدہ خدمات انجام دیں۔ ان کی دیانت داری کا یہ عالم تھا۔ کہ گورنمنٹ برطانیہ کسی قیمت پر ان کا ووٹ نہ خرید سکی۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی پیش کش بھی کی گئی لیکن مولانا صاحب نے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام زندگی بھر میں نہیں کیا۔

جناب مولانا عرصہ دراز تک مسلم یونیورسٹی کی ایگزیکیوٹیو کونسل کے ممبر رہے۔ اور کبھی بھی کسی موقع پر اپنے ووٹ کا

غلط استعمال نہیں کیا۔ ایک مرتبہ یہاں تک نوبت آئی کہ مولوی حبیب اللہ خاں صاحب کی منشا کے خلاف ووٹ دیا حالانکہ ساری عمر کا ساتھ تھا۔ ایک ہی مکان (ولایت منزل) میں رہتے تھے۔ اور جلسے کی شرکت کے لئے ایک ہی وکٹوریہ میں سوار ہو کر گئے۔ اور اسی وکٹوریہ میں ولایت منزل واپسی ہوئی۔ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں خاں صاحب کو اپنے بڑے بھائی کی جگہ متصور کرتا ہوں۔ یہ رشتہ اس وجہ سے قائم ہوا تھا کہ مولانا صاحب کے بڑے بھائی صاحب جناب خاں صاحب (مولوی حبیب اللہ خاں صاحب) کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ بوقت شام تقریباً ہر روز خاں صاحب میر ولایت حسین صاحب۔ مولوی حبیب اللہ خاں صاحب مولوی سید طفیل احمد صاحب اور دیگر معززا ولڈ بوائز ولایت منزل میں جمع ہوتے اور مجھ کو بھی اکثر ان حضرات کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملتا تھا۔

یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول تنہا اپنی کوشش سے قائم کیا اور بحیثیت منیجر مولانا نے اس ادارے کا بہترین انتظام کیا۔ یو۔ پی گورنمنٹ نے خفیہ طور پر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کو لکھا کہ ایک ہندو اور ایک مسلم منیجر اسکول کا نام رائے بہادری اور خاں بہادری کے خطاب کے لیے منجانب سررشتہ تعلیم یو۔پی بھیجا جائے۔ کافی چھان بین کے بعد جناب مولانا صاحب کا انتخاب خان بہادری کے لئے کیا گیا۔ اور رپورٹ اس سلسلہ میں گورنر کے پاس بھیج دی گئی۔ کسی ذریعے سے جناب مولانا صاحب کو اس کا علم ہو گیا سب کام چھوڑ کر فوراً ہی الہ آباد پہنچے اور ایک ہندو ڈپٹی ڈائرکٹر کو جن کا نام غالباً نونہال سنگھ تھا۔ درمیان میں ڈال کر بے حد کوشش کی اور ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کو جو انگریز تھا اس پر آمادہ کیا کہ جناب مولانا کا نام فہرست خان بہادری سے واپس لیا جائے اور کوئی دوسرا مسلم منیجر اس اعزاز کے لیے منتخب کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی قومی خدمات کے صلہ میں کسی قسم کی نام و نمود کو جناب مولانا صاحب پسند نہیں فرماتے تھے۔ خاموشی کے ساتھ ساری عمر قومی خدمات انجام فرماتے رہے اور اس بارے میں اپنی نظیر آپ تھے۔

شہر علی گڑھ میں محلہ قاضی پاڑہ میں ایک پرائمری اسکول قائم کیا اور اس اسکول میں پارچہ بافی کے شعبے پر بہت زور دیا۔ جناب مولانا مسلمانوں کے لیے ٹیکنیکل تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے کہ گاندھی جی والی واردھا اسکیم جس کو جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور جناب پروفیسر غلام السیدین صاحب نے ترتیب دیا تھا اس وقت تک ہندوستان کے کسی حصے میں رائج نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے۔ کہ قاضی پاڑے کے پرائمری اسکول کے بچے جنھوں نے چوتھی کلاس کے بعد کسی دوسرے اسکول میں داخلہ نہیں لیا محض اپنی پارچہ بافی کی صلاحیت کی بنا پر دو سو ڈھائی سو تین سو چار سو روپے ماہوار تک اس زمانے میں کما لیتے تھے۔ جبکہ ایک گریجویٹ کو سو روپے ماہوار کی نوکری حاصل کرنا دشوار تھا۔ اس سے اندازہ فرمائیے کہ جناب مولانا صاحب کس قدر دور اندیش او صائب الرائے تھے

علی گڑھ اولڈ بوائز میں جناب مولانا صاحب مرحوم و مغفور اپنے حسن اخلاق خلوص اور قومی خدمات کی بنا پر ایک عظیم ترین حیثیت کے مالک ہیں، ان کو جس قدر بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

جناب مولانا صاحب نے ایک نہایت مفید کام یہ انجام دیا کہ سید الطاف علی صاحب بریلوی کو جبکہ وہ حیات حافظ رحمت خاں لکھ کر فارغ ہوئے بریلی سے علی گڑھ لے آئے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کا تقرر بحیثیت سر دفتر جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی سے منظور کرایا۔ جناب مولانا کے ساتھ ساتھ سید الطاف علی صاحب بریلوی بھی انتہائی خلوص، محنت و ہوش مندی کے ساتھ کانفرنس کی خدمت کرتے رہے۔ اور پاکستان بننے کے بعد یہاں کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کانفرنس نے سرسید گرلز کالج جیسا عظیم الشان ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے متعدد قومی جلسوں میں مجھ کو شرکت کا موقعہ ملا ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گذشتہ سال ایک جلسے میں جناب الانہ صاحب وزیر سررشتۂ تعلیم صوبۂ سندھ نے دو مرتبہ اپنی تقریر کے دوران ارشاد فرمایا کہ سرسید گرلز کالج سے بہتر کوئی دوسرا ادارہ ہمارے ملک میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کالج کے جلسوں کا حسن انتظام دیکھ کر علی گڑھ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اکیڈمی آف ریسرچ تقریباً اسّی کتابیں اسلامی تعلیم، تہذیب و تمدن کے سلسلے میں شائع کر چکی ہے۔ یہ بھی ایک بڑی ٹھوس اور قابل قدر خدمت ہے۔ سہ ماہی رسالہ "العلم" بڑی خوبی اور بڑی کامیابی کے ساتھ علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات انجام دے رہا ہے۔ بحمداللہ کانفرنس کی لائبریری میں اس وقت کتابوں کا نہایت بڑا ذخیرہ ہے۔ رہنمایان قوم کے فوٹو گراف جو لائبریری ہال میں لگائے گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر قوم کا ہر فرد بے حد متاثر ہوتا ہے۔ اس عظیم لائبریری اور ریڈنگ روم سے ہماری قوم کے بچے و دیگر اہلِ ذوق برابر مستفیض ہو رہے ہیں۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس زندہ باد پائندہ باد۔

اے علیگڑھ

اے علی گڑھ! اے جوانِ قسمتِ دبستانِ کہن
اے کہ شمعِ فکر سے تابندہ تیری انجمن
تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شرابِ علم و فن
حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن
مشعلِ مینا سے روشن تیرا میخانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

جوشؔ ملیح آبادی

سر سید کی تعلیمی خدمات

از جناب محمد حسین خاں زبیری ایم اے (علیگ)

مسلمان اپنے عہد کشور کشائی میں جہاں بھی گئے فتوحات کے بعد مساجد کی تعمیر کا کام بھی جاری کیا ان ہی مساجد میں بساط علم بچھائی گئی تعلیم کو جو مخصوص طبقوں کی جاگیر بن گئی تھی عام کر دیا ہندوستان میں بھی یہی ہوا۔ فتوحات کا دور ختم ہوا تو مساجد تعمیر ہوئیں اور ہر مسجد میں مدرسہ قائم کر دیا گیا۔ مساجد کے علاوہ امراء و سلاطین کے مقبروں اور بزرگان دین کی خانقاہوں میں بھی مدارس قائم کر دیئے جاتے تھے اور حکومت وقت ان کی سرپرستی کرتی تھی اور امرائے دربار بھی تعلیم کے لئے اوقاف قائم کرتے تھے تاریخ گواہ ہے کہ محمد تغلق کے عہد حکومت میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے غیر مسلم مورخین بھی معترف ہیں کہ مسلمانوں کے دور میں تعلیم کی ترویج کا اہتمام تھا۔ کپتان ہملٹن لکھتا ہے کہ عہد عالمگیر میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں چار سو مدرسے مختلف علوم و فنون کے جاری تھے ایک مورخ میکس مولر لکھتا ہے کہ برطانوی عہد سے قبل صرف بنگال میں اسی ہزار مدرسے قائم تھے اور اوسطاً چالیس افراد کے لئے ایک مدرسہ تھا مسٹر آرنلڈ نے ۱۸۵۶ء کی تعلیمی رپورٹ میں لکھا ہے کہ پنجاب میں تعلیمی میدان مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور ہندو مسلم سب ان میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی میں انگلستان کے تاجروں کی یلغار شروع ہوئی اور تاجروں کے ایک گروہ نے اقتدار حکومت حاصل کر لیا اس کی ابتدا ۱۷۵۷ء سے ہوئی جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو میدان پلاسی میں فتح حاصل ہوئی پھر ۱۷۶۵ء میں کمپنی اور شاہ عالم کے درمیان معاہدۂ الہ آباد کے بعد تو گویا کمپنی کی حکومت کا آغاز ہوا ابتدائی دور میں کمپنی نے مسلمانوں کا نظام تعلیم قائم رکھا اور اسی کے تحت کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا پھر ۱۷۹۲ء میں ہندوؤں کے لئے اسی قسم کا ایک مدرسہ بنارس میں قائم کیا گیا۔ ۱۷۹۷ء میں یہ تحریک چلائی گئی کہ ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھائی جائے۔ بحث و مباحثہ کے بعد ۱۸۲۳ء میں ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور اس طرح کمپنی نے محکمہ تعلیم کا آغاز کیا ۱۸۳۵ء میں کمپنی نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کو اپنا مقصد بنا لیا ۱۸۳۷ء میں فارسی کو عدالتوں اور دفاتر سے خارج کر دیا گیا۔ ۱۸۴۴ء میں یہ طے کر دیا گیا کہ انگریزی خواندہ کو سرکاری ملازمتوں میں ترجیح دی جائے گی۔ پالیسی کی اس تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب موسومہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھتے ہیں:۔

> "اپنی عملداری کے اول پچھتر سال میں ہم نے اپنے انتظامی عہدیدار تیار کرنے کے لئے مسلمانوں کے اس نظام تعلیم کو جاری رکھا اور جوں ہی ایک نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھا کر پھینک دیا جس سے مسلمان نوجوانوں کی ملازمت کے تمام راستے مسدود ہو گئے"

اس جدید نظام تعلیم کو روز بروز ترقی دی گئی۔ اس دور کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عیسائی مشنری کثیر تعداد میں آگئے اور انھوں نے مدارس قائم کر دیئے جہاں عیسائیت کی تبلیغ کی جاتی تھی اور کمپنی عہدیداران ، پادریوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے مسلمان اقتصادی طور پر بھی پست ہوتے جا رہے تھے تجارت پر ہندو اور انگریز قابض تھے اور اب مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت میں بھی کوئی حصّہ نہ تھا ان حالات میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تباہی انتہا کو پہنچ گئی اور بغاوت کا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ دیا گیا۔ ہندو اور انگریز متحد ہو گئے حکومت متعصب تھی بنگال میں مسلم اوقاف سے ہندوؤں کی تعلیم ہونے لگی۔

۱۸۵۷ء میں اہل ہند کو شکست ہو گئی تو اس وقت سر سید مسلم قوم کے مسیحا بن کر منصہ شہود پر نمودار ہوئے انھوں نے اول تو اپنا شہرۂ آفاق رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر ممبران پارلیمنٹ کو لندن روانہ کیا اس میں علاوہ دیگر مسائل کے قوم کی تعلیم کا مسئلہ بھی پیش نظر رکھا انھوں نے قوم کی بقا کے لیے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھا ان کے مخالفین ان کے متعلق کچھ بھی رائیں رکھیں لیکن اگر اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت اس نظام تعلیم کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا کیونکہ دیگر اقوام حکمراں قوم سے تعاون کر کے تعلیمی میدان میں بہت آگے بڑھ گئی تھیں۔

سر سید کی تعلیمی خدمات کی ابتدا ۱۸۵۹ء سے ہوتی ہے انھوں نے مراد آباد میں ایک اسکول قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے اپنی دو دکانیں وقف کر دیں ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا یہاں انھوں نے ۱۸۶۴ء میں [illegible]

بہ عنوان "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" شائع کیا اور ایک ادارہ "سائنٹفک سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل وطن میں مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے سوسائٹی کے جلسوں میں علمی مضامین پر لکچر دیے جائیں عوام کے خیالات حکومت پر اخبار کے ذریعہ ظاہر کیے جائیں اور یہ اخبار انگریزی اور اردو زبانوں میں شائع ہوا کرے ان کی کوششوں سے ہندو مسلمان اور انگریز اس کے ممبر بنائے گئے تاکہ قومی مفادات کے حصول کے لیے مذہبی تعصب سد راہ نہ ہو۔ مغربی علوم کی کتابوں سے ہندوستانی فائدہ اٹھائیں اور ان کے ترجمے کیے جائیں تینوں اقوام کے اصحاب نے اس سوسائٹی کی ممبری قبول کی۔ برطانوی ہند میں یہ پہلا ادارہ تھا جو رفاہ عامہ کے لیے سر سید کی مساعی سے قائم ہوا سر سید نے غازی پور میں بھی ایک اسکول قائم کیا اس کے لیے عوامی چندہ سے سترہ ہزار روپے جمع ہوئے اور عمارت تعمیر ہوئی اس اسکول میں فارسی عربی سنسکرت اردو اور انگریزی کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور یہ اسکول وکٹوریہ ہائی اسکول سے موسوم ہو کر مشہور ہوا۔

۱۸۶۴ء میں سر سید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا سوسائٹی کا دفتر بھی وہیں منتقل ہو گیا انگریزی [illegible] اور علمی لکچروں کا سلسلہ بھی [illegible] بھی [illegible]

تھے اور محکمۂ تعلیم کے افراد بھی ان کے ممبر ہوا کرتے تھے سرسید
کو پتہ چلا کہ کمیٹی کے ارکان یورپین حکام اراکین سے مرعوب رہتے
ہیں اور کمیٹی میں بول نہیں سکتے تو انھوں نے ایک یادداشت حکومت
کو بھیجی جس میں لکھا کہ :-

"جس غرض سے کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ پوری
نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو
مخالف فریق تصور کرتے ہیں اور ان کو شکست
دینا اپنا قومی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر
کمیٹی میں ان موم کی مورتیوں کی مانند معلوم ہوتے
ہیں جو مادام تساد کی نمائش گاہ میں تھیں"

۱۸۶۷ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن
کی طرف سے ایک درخواست گورنر جنرل کی خدمت میں بھیجی
جس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) اعلیٰ تعلیم کا ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے
جہاں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان
میں ہوا کرے۔

(۲) دیسی زبانوں میں ان مضامین کا امتحان ہوا
کرے جس میں کہ طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی
میں امتحان دیتے ہیں۔

(۳) جو سند انگریزی میں امتحان دینے والوں کو
دی جاتی ہے وہی دیسی زبانوں میں امتحان
دینے والوں کو دی جائے۔

(۴) اردو فیکلٹی یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی
جائے یا دیسی زبان کی یونیورسٹی الگ صوبہ یوپی
میں قائم کی جائے۔

اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ ترجمے کا کام سائنٹفک سوسائٹی
انجام دے گی۔

سرسید نے قیام لندن کے دوران ایک کتابچہ انگریزی زبان
میں شائع کرایا جس میں ہندوستان کے نظام تعلیم کے نقائص بیان
کیے گئے تھے اور مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی کی تجویز کی گئی تھی۔
جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہو لیکن سید محمود جو اس یونیورسٹی اسکیم کے
مصنف تھے ان کا خیال تھا کہ یورپ کی آئے دن کی علمی ترقیات کا
ساتھ تراجم نہیں دے سکیں گے لہٰذا یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہی
رہی۔ سرسید نے اپنے انگریز احباب اور سید محمود کی مدد سے جو
تدبیریں اور تجویزیں لندن میں بیٹھ کر کی تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ایسی تدبیریں کی جائیں جس سے مسلمانوں کے دلوں
سے تعصب دور ہو جائے اور یورپین سائنس و
لٹریچر کا پڑھنا جسے وہ کفر سمجھتے ہیں اس خیال
کو ان سے دور کیا جائے۔

(۲) خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ یورپین سائنس
اور لٹریچر کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں کیا
اندیشے کی بات ہے

(۳) کالج کے لئے چندہ جمع کیا جائے اور جب موقع
ملے علیگڑھ میں کالج قائم کیا جائے۔

(۴) مسلمانوں میں قومی اتحاد، قومی ہمدردی
کا جذبہ ابھارا جائے کیونکہ یہی قومی ترقی کا اول
زینہ ہے اور سب سے مقدم یہ کام ہے کہ وہ
مسلمان ہی رہیں۔ اور اسلام کی حقیقت ان
کے دل میں قائم رہے اس لئے ضروری ہے
کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی ہو اور

عقائد مذہبی میں انھیں پختہ کردیں اور تاریخ اسلام اور مذہب اسلام سے انھیں آگاہ کریں جس کے سبب عرب کے کل باشندے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بول اٹھے تھے۔

(۵) مسلمانوں کو اخوت اسلام کا سبق دیں اور بتائیں کہ اخوت اسلامی ایک چیز ہے جو نسبی اخوت سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔

(۶) ہم کو ان میں قومی ہمدردی پیدا کرنا چاہیئے۔ قومی ہمدردی کا پیدا ہونا بجز اس کے کہ غول کے غول مسلمان بچوں کو ہم ایک جگہ جمع کریں وہ سب مل کر ایک جگہ رہیں ایک جگہ پڑھیں اور ایک ساتھ کھائیں اس مطلب کے لیئے ہم کو ایک بورڈنگ ہاؤس بنانا چاہیئے جس میں کم سے کم ایک ہزار طلبہ کالج کلاسوں کے رہ سکیں اور ان میں باہمی اخوت اور بھائی بندی پیدا ہو۔

۱۸۸۱ء میں جب سر سید کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ پنجاب میں علوم مشرقی کو فروغ دینے کے بہانے سے انگریزی اعلیٰ تعلیم کو کم کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں تو انھوں نے اس کی مخالفت میں نہایت زوردار مضامین شائع کیئے جو بقول مولانا شبلی ان کے تین پر زور آرٹیکل پنجاب یونیورسٹی پر قلعہ شکن توپیں تھیں جن کے صدمے سے مشرقی تعلیم چکنا چور ہوگئی پھر جب الہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی تعلیم کے کھلنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے اس کی بھی شدید مخالفت کی۔

یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ سر سید علوم مشرقی کی تعلیم کے مخالف تھے اور بعض لوگ یہ اعتراض کرتے بھی ہیں درحقیقت یہ بات نہیں ہے وہ ہرگز علوم مشرقی کی ترقی کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ علوم مغربی جن کا حاصل کرنا نہایت ضروری تھا محض علوم مشرقی کی ترویج کے بہانے ختم نہ کیئے جائیں ان کا اصرار تھا کہ علوم مشرقی کی تعلیم و ترقی کا انتظام مسلم اوقاف سے کیا جائے۔ چنانچہ امرتسر میں ایک تقریر کے دوران فرمایا:

مسلمانوں کو یہ بھی لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں، یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت میں سمیٹک زبانوں میں لاثانی ہے بشرطیکہ افراط تفریط نہ ہو۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری زندگی بہ آرام بسر ہونے کے ذرائع بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے ذرائع انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے"

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو ایک خط کے لکھتے ہیں کہ:

"میں یہ تدبیر بتا رہا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے کسی طرح قائم رہے اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی"

۱۸۸۶ء میں جب انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تو اس کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا۔

"علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علماء اسلام
جا بجا بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا
اور اس کو بدستور قائم و جاری رکھنے کی مناسب
تدبیریں عمل میں لانا"

کانفرنس کے اجلاس میں یہ بحث ہوئی کہ اوقاف کا روپیہ مغربی تعلیم پر بھی صرف کیا جائے تو سرسید نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ یونیورسٹیوں میں علوم مشرقی کی تعلیم کے وہ اس وجہ سے مخالف تھے کہ یہ علوم جو قدیم سے رائج ہیں ان کے ساتھ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل ایسے مخلوط ہیں کہ انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اگر اس چیز کو خارج بھی کیا جائے تو جو شخص علوم مشرقی کا خواہاں ہے۔ اسے پسند نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو مسلمانوں میں اس کی وقعت نہ ہوگی۔

لندن میں تعلیم و تربیت کے نتائج دیکھ کر ان کا دل بے چین ہوتا تھا کہ کاش ان کے ملک میں بھی ایسے ہی شائستہ اور تعلیم یافتہ ہوتے۔ ایک خط میں نہایت دل سوزی سے محسن الملک کو لکھتے ہیں:۔

"افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے
جا رہے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں
ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر
نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے
کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ
میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی!
کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے
ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اب ڈوبنے میں
بہت کم فاصلہ ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے
تربیت کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد
کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے اور
کس طرح پر قوم عزت حاصل کرتی ہے،
انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آ
کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔"

لندن سے واپسی پر سرسید نے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی اس کمیٹی کا آغاز بھی اس طرح کیا گیا کہ ابتدا میں انھوں نے ایک "التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند در باب ترقی تعلیم مسلمانان" طبع کرا کے شائع کیا جس میں سرکاری مدارس، کالجوں، یونیورسٹیوں کے فوائد کا ذکر کر کے اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ۔

"فی الحقیقت مسلمان طالب علم بہت کم ہیں
جو سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے مستفید
ہوتے ہیں خصوصاً اپر انڈیا یعنی شمالی ہندوستان
میں جہاں کے کل طالب علموں میں سے مسلمان
طالب علموں کو فی صدی تین سے زیادہ نسبت
نہیں ہوگی۔ پس یہ بات بلاشبہ کانوں
کو عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اور اس غفلت
اور قلت کے اسباب اور وجوہات دریافت
کرنے کی خواہش کو اشتعال دیتی ہے مجھے
یقین کامل ہے کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان
نہیں ہے جو اپنے ہم مذہبوں کو ایسی
حالت تاسف خیز پر دل سے افسوس نہ کرتا
ہو اور ان کی ترقی کا دل سے خواہاں نہ ہو

لیکن تاوقتیکہ اس مرض کے اصلی اسباب دریافت
نہ ہوں اس کا کوئی مؤثر علاج نہیں ہوسکتا
سب سے عمدہ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ
اس امر کی تحقیقات ہو"۔

غرض انھوں نے ایک کمیٹی قائم کی اور ایک اشتہار اخبارات میں دیا گیا کہ اہل علم مسلمان اس مضمون پر پمفلٹ تحریر کریں کہ مسلمان طالب علموں کا سرکاری مدارس میں اس قدر کم داخل ہونے کے وجوہات کیا ہیں اور ان کے رفع کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس اشتہار کے جواب میں بیشتر مضامین موصول ہوئے جن میں مضمون نگاروں نے وجوہات مشکلات اور علاج کی تجاویز پیش کر دیں۔ تین مضمون نگاروں کو بالترتیب ۵۰۰ - ۳۰۰ - اور ۱۵۰ روپے انعام دیا گیا۔

سرسید کا منشا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کریں لیکن جب حکومت نے یونیورسٹی کی امداد سے انکار کر دیا تو مجبوراً انھوں نے کالج ہی پر اکتفا کیا لیکن یونیورسٹی کا خیال انھوں نے ترک نہیں کیا گورداسپور میں ایک تقریر کے دوران فرمایا:-

"ہندوستان کی ترقی اس وقت ہوگی جب وہ
اپنے باہمی چندے، اپنے انتظام، اپنی قوت
سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے افسروں
کے اپنی خودسری اور اپنے مرضی کے موافق
اپنے بچوں کی تعلیم کریں گے"

مشنری اسکولوں کا حوالہ دیتے ہوئے ایک تقریر میں یوں گویا ہوئے:-

"مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں
میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو جوش
پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو غیرت نہیں آتی"۔

پہلے تو ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کیا گیا اور پھر ۱۸۷۷ء میں کالج کی ابتدا ہوئی جس کا سنگ بنیاد لارڈ لٹن گورنر جنرل نے رکھا۔ دینیات کی تعلیم کے لیے شیعہ و سنی علماء کی دو کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ نماز میں حاضری لازمی تھی اور کلاس میں ترقی کے لیے دینیات میں پاس ہونا لازمی رکھا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں قرآن مجید کا درس بھی داخل نصاب کیا گیا۔ چھوٹی عمر کے طلبا روزانہ دو آیات یاد کرتے تھے اور بڑی عمر والوں کو معنی اور تفسیر بتائی جاتی تھی تین سال میں عموماً ترجمہ قرآن پورا ہو جاتا تھا۔ ان طلباء کے لئے جن کے پاس ایم اے میں عربی ہو ایک رسالہ سیرت پاک ؐ پر عربی میں لکھوایا گیا اور ان کے لئے جن کا مضمون فارسی ہو اسی رسالے کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا۔ اسکول کے طلبا کے لئے اسی رسالے کو اردو میں لکھوایا گیا۔

۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے سرسید نے شہادت دی جہاں مسلمانوں کی تعلیم پر بہت زور دیا۔ ذریعہ تعلیم کے متعلق انھوں نے کہا کہ ایسے مدارس میں جہاں مقصد اعلیٰ تعلیم نہ ہو کل تعلیم دیسی زبان میں دی جائے لیکن ایسے مدارس میں جہاں مقصد اعلیٰ تعلیم ہو ذریعہ تعلیم انگریزی ہی ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک ان کی مناسب تعلیم نہ ہو سکے گی پس یہی مفید ہے کہ حکومت ملکی تعلیم کا کل انتظام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں بالکل مداخلت اندازی نہ کرے انھوں نے یہ بھی کہا کہ

کہ کوئی گورنمنٹ اسکول اس لیئے بند نہ کیا جائے کہ وہاں قریب میں کوئی مشن اسکول ہے۔ جو لوگ مشن اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانا نہیں چاہتے وہ اپنے اسکول کھولیں اور حکومت مالی امداد دے، سرسید نے یہ بھی کہا کہ نصاب میں مضامین کی بھرمار ہے لہٰذا کسی مضمون میں لیاقت پیدا نہیں ہوتی اور کوئی مصنف پیدا نہیں ہوتا۔ ایک فارسی مثل مشہور ہے "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان" بس یہی حال ان اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم یافتہ لوگوں کا ہے۔

مختصر یہ کہ سرسید کی زوردار شہادت کا بہت اثر ہوا اور کمیشن نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے جو سفارشات پیش کیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) حکومت دیسی مدارس کی امداد کرے۔

(۲) مسلمانوں کی تعلیم کے اخراجات مقامی بلدیہ یا صوبائی حکومت برداشت کرے۔

(۳) پرائمری اور مڈل اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔

(۴) مسلمان طلبا کو وظائف دیئے جائیں اور فیس میں رعایت کرکے ہمت افزائی کی جائے۔

(۵) نارمل اسکول بھی قائم کیئے جائیں۔

(۶) ایسے مدارس جو اوقاف سے چل رہے ہیں وہاں مسلمان مدرس مقرر ہوں۔

(۷) پرائمری، مڈل اور ثانوی امتحانات کی بنا پر مسلمان طلبا کو اسکالرشپ دیئے جائیں۔

(۸) صوبائی حکومتیں ملازمتوں میں مسلمانوں کا خاص خیال رکھیں۔

کالج کو قائم ہوئے جب دس برس ہوگئے تو سرسید کو اس کی طرف سے کچھ اطمینان ہوگیا ایک کالج تمام ملک کے مسلمانوں کے لیئے کافی نہ تھا اب سرسید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا ڈالی اس کے مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجوں تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔

(۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات کا پتہ چلانا اور نا بمقدرت دعملاً کسے اس تعلیم کے انجام کی کوشش کرنا۔

(۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بطور خود دیتے ہیں ان کو تقویت دینا اور قائم و جاری رکھنے کی تدابیر عمل میں لانا۔

(۴) جو تعلیم قدیم طرز پر مکتبوں میں دی جارہی ہے اس کے حالات کی تحقیق کرنا اور توسیع و ترقی کی تدابیر کرنا۔

اس کانفرنس کے اجلاس ہر سال ملک کے مختلف حصوں میں ہونے لگے اور مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہوگیا۔ ہر سال اکابر اور ماہرین تعلیم عموماً دسمبر کے آخری ہفتہ میں کسی شہر میں جمع ہوتے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور و خوض کرتے اور حکومت کے سامنے مطالبات پیش کرتے تھے۔ اس مفید ادارے نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنے میں بہت کام کیا چنانچہ جگہ جگہ مسلمانوں کے لیئے نئے اسکول قائم ہونے لگے۔ اٹاوہ میں مولوی بشیر الدین مرحوم نے جو سرسید کے ساتھیوں میں تھے اسلامیہ اسکول کی بنیاد

ذالی جو ترقی کرکے انٹر کالج ہوگیا۔ اسی طرح آگرہ میں مولوی
سعید احمد مارہروی نے شعیب محمدیہ اسکول جاری کیا جو انٹر
کالج ہوگیا اور ایک اسکول لڑکیوں کے لیے قائم کیا جو صغیر فاطمہ
انٹر کالج کے نام سے موسوم ہے۔ پشاور میں اسلامیہ کالج کراچی
میں سندھ مدرسہ اسی روشن چراغ کی کرنیں ہیں۔ لاہور انجمن
حمایت اسلام نے اسکولوں کا جال پھیلا دیا۔ بمبئی کے مسلمانوں نے
انجمن اسلام قائم کی اور مسلمانوں کی تعلیم کا بار سنبھالا۔

سر سید کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ قوم کی
ذہنی سطح بلند ہو اور معاشرتی اور اقتصادی حالت بہتر سے
بہتر ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم میں ایک عام علمی فضا پیدا ہو
جائے لکھنؤ میں ایک تقریر کے دوران انھوں نے فرمایا۔

"اے دوستو مجھے یہ بات کچھ زیادہ خوشی
کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے
یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ میری خوشی
قوم کو قوم بنانے کی ہے"

سنہ ۱۸۰۶ء میں مدرسۃ العلوم کے طلبا کو مخاطب کرکے
انھوں نے فرمایا۔

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہے اس پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری
قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس
پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے پھر
اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا۔ بس
امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں یعنی علم اور
اسلام کے نمونے ہوگے اور جب ہی ہماری
قوم کو عزت ہوگی۔"

اسی طرح ایک بار ایک عام جلسے میں مسلمانوں کو خطاب کیا۔

"اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت
ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی
یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔
ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر
یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں
تعلیم پھیلائیں گے فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ
میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ
میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج
سر پر"

یورپ کے نامور عالم مسٹر گب نے سر سید کے متعلق ان
خیالات کا اظہار کیا ہے جو قارئین کے لیے باعث دلچسپی ہوگا۔

"مایوسی کے اندھیرے میں مسلمانوں کو ایک
ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کو روشنی میں
لے جائے اور ان کی شکستہ دنیا کی تعمیر نو
کرے۔ یہ شخص سر سید احمد خان کی شکل
میں نمودار ہوا۔ وہ سادگی، سچائی اعلیٰ دماغی
مقصد کی مضبوطی، جذب دل کی گہرائی اور
ذاتی کشش جیسی خصوصیات کے حامل تھے
ان کی کوشش تھی کہ ان کی قوم جدید تعلیم
حاصل کرے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ
اپنے کام میں لگ گئے اور کئی سال تک مسلسل
محنت کے بعد کالج قائم کرنے میں کامیاب
ہو گئے جو سنہ ۱۹۲۲ء میں ترقی کرکے مسلم یونیورسٹی
بن گیا جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس عظیم
رہنما کی عظمت نمایاں ہوتی جاتی ہے"

ایجوکیشنل کانفرنس اور العلم سے میرے روابط

جناب اخلاص حسین زبیری
ایم اے

مجلۂ العلم جس مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتا ہے اس کا مبدا و منبع سر سید رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی بصیرت اور دیدہ دری ہے سر سید رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ۱۸۱۷ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۸ء میں ختم ہو گئی ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پورا زمانہ ان کی زندگی میں گزرا۔ اس جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد مسلمان قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مسلمان خواص شکست و انتشار میں مبتلا اور عوام نہایت بے سر و سامانی اور جمود و جہالت کا شکار تھے۔ سر سید نے اپنی خداداد عقل سلیم سے کام لے کر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جو خیر الامور اوسطہا کے اصول پر ملائیت کے جمود اور مغرب زدگی کے جنون سے مبرا تھا۔ انھوں نے اپنے نظریے کو پروان چڑھانے کے لیے ایک زبردست تحریک برپا کی جو مسلمانوں کی بے عملی اور بے علمی کو دور کرنے اور ان کے تغافل اور جمود کو توڑنے میں بے حد کامیاب رہی۔ اسی تحریک کی بدولت شبلی، حالی، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ کے علمی کارنامے وجود میں آئے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سائنٹیفک سوسائٹی جیسے ادارے اور تہذیب الاخلاق جیسے جرائد کی بنیاد پڑی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۶ء میں اسی تحریک کے زیر اثر "آل انڈیا مسلم لیگ" وجود میں آئی اور اسی تحریک کے مقتدر اور دلیر کارکنوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کا واحد سیاسی ادارہ بنانے اور بعد ازاں تخلیق پاکستان کے کام میں عظیم حصہ لیا۔

العلم کے مدیر اول آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے روح رواں سید الطاف علی بریلوی اسی تحریک کے ایک مقتدر علمبردار ہیں غیر منقسم ہندوستان میں وہ اسی تحریک کے ایک اہم ستون تھے اور ۱۹۵۱ء میں پاکستان آ کر نہایت رقت فرسا حالات میں انھوں نے اپنی محبوب تحریک کا کام شروع کیا۔ اگر ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کامیابیاں مفت حاصل نہیں ہوتیں بلکہ انسان کی جفاکشی اور خوش اعمالی کا نتیجہ ہوتی ہیں تو سید صاحب موصوف نے جو تابناک کامیابیاں پاکستان میں حاصل کیں مثلاً "سر سید گرلز کالج" کا قیام یوسف میموریل لائبریری کی تعمیر ایک نادر الوجود میوزیم کا قیام لائبریری اور ریڈنگ روم کی قابل قدر سہولتوں کی فراہمی اور کانفرنس کی اکیڈمی آف ریسرچ کی نمائندگی کارکردگی وہ ان کی غیر معمولی جفاکشی اور اعلیٰ کارکردگی کا نتیجہ ہی سمجھی جائیں گی۔

سید صاحب موصوف سے راقم کی پہلی ملاقات آپ کے ایک معزز دوست اور ہمسایہ جناب قاسم علی خان ایڈوکیٹ کے مکان پر ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ سید صاحب کس سلسلے میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔ میں قاسم علی خاں صاحب (مرحوم) کی خوبیوں سے متاثر تھا اور تقریباً ہر اتوار کو ان سے ملاقات کرتا تھا۔ سید صاحب

سے ان کے یہاں ملاقات ہونے پر میں نے ایک ترجمے کا ذکر کیا جسے میں کسی رسالے میں شائع کرانا چاہتا تھا۔ وہ مولوی تمیز الدین صاحب (مرحوم) سابق اسپیکر قومی اسمبلی کے ایک انگریزی مضمون "WHY RELIGION" کا ترجمہ تھا۔ سید صاحب نے بلا تامل اسے شائع کرنے کا وعدہ فرما لیا اور العلم کی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں اسے بعنوان "مذہب کی ضرورت کیوں ہے؟" شائع کر دیا گیا۔ اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھا کر راقم نے اپنا ایک مضمون بعنوان "آئین پر ایک نظر" شائع کرایا۔ اس کے بعد سید صاحب نے راقم کو کتاب "CULTURE AND ANARCHY" کے ترجمے میں شریک کیا۔ وہ ترجمہ کتاب "ثقافت و انتشار" کی شکل میں شائع ہو چکا ہے اور اب غالباً اس کی دوسری طبع کی تیاری ہو رہی ہے۔ بعد ازاں "PRINCIPLES OF TEACHINGS" کا ترجمہ راقم نے کیا اور وہ "اصول تدریس" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں کانفرنس کے صدر محترم ممتاز حسن صاحب (مرحوم) کی فرمائش پر ایک تاریخ کی کتاب کا ترجمہ راقم کے سپرد کیا گیا اور اس پر تشریحات لکھنے کی فرمائش بھی کی گئی۔ کام مکمل ہونے پر محترم ممتاز حسن (مرحوم) نے ترجمہ اور تشریحات کی پسندیدگی سے متعلق ایک خط سید صاحب کو تحریر کیا جس کی ایک نقل سید صاحب نے راقم کو ارسال فرمائی۔ وہ بطور ایک سارٹیفکیٹ راقم کے پاس موجود ہے۔ یہ کتاب "عہد اسلامی میں علمی ترقی" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔
۱۹۶۸ء میں سید صاحب نے نفسیات اطفال پر اردو میں ایک کتاب لکھانے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پروفیسر وحید الحق صدیقی کا ایک مسودہ حاصل کر لیا۔ وہ مسودہ ۱۹۲۹ء کی مطبوعہ ایک کتاب کا نامکمل اردو ترجمہ تھا اور قابل اشاعت نہ سمجھا گیا چنانچہ انھوں نے راقم سے نفسیات اطفال پر ایک کتاب مرتب کرنے کی فرمائش کی۔ راقم نے حسب فرمائش ایک کتاب مرتب کی اور وہ "بچے کی ذہنی و نفسیاتی ارتقا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو وجود میں لانے کے لیے جو مساعی سید صاحب موصوف نے کیں وہ تعلیمی سرگرمیوں میں ان کے غیر معمولی شوق و شغف کی آئینہ دار ہیں۔ اسی دوران میں ایک علمی کتاب "مشاہیر کے تعلیمی نظریے" کے نصف حصے کا راقم سے انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا گیا۔ اس کتاب کے نصف حصے کا ترجمہ جناب عظیم الدین خاں صاحب (مرحوم) سابق سیکریٹری سرسید گرلز کالج کر چکے تھے۔ اب وہ کتاب EDUCATIONAL CONCEPTS OF GREAT MEN کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ایک ضخیم کتاب "اصول و اساس تعلیم" کی تیاری میں بھی راقم نے حصہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ جناب مرزا علی اظہر برلاس صاحب کے ۱۳ انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ بھی سید صاحب موصوف کی فرمائش پر راقم نے کیا ہے۔ یہ تراجم کتاب "تاریخ کے شہ پارے" مطبوعہ ۱۹۸۱ء میں شامل ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ اکثر حضرات نے انھیں پسند فرمایا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں ترجمہ پر نظر ثانی کا ایک اہم کام بھی راقم نے انجام دیا یعنی کتاب "جمہوریت اور تعلیم" کی جلد دوم پر دوسری بار اس کی اشاعت کے لیے نظر ثانی کی ہے اور اب نظر ثانی شدہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

العلم میں تبصروں اور خطوط کے علاوہ تقریباً

بیس مضامین راقم کے شائع ہوئے ہیں جن میں خاص یہ ہیں - (۱) ہماری اخلاقی و معاشرتی ناہمواریاں (۲) مذہب کی اہمیت (۳) ایک انگریز کے متصوفانہ خیالات - (۴) حضور اکرم کا ابدی پیغام (۵) بھارت اور پاکستان کا تصادم وغیرہ بعض مضامین مدیر العلم کی فرمائش پر لکھے گئے جن کے عنوان یہ ہیں :- (۱) قدرتی گیس اور اس کی برکتیں (۲) چیانگ کائی شیک (۳) اسلام آباد یونیورسٹی - ایک مضمون راقم کے ایک ذاتی سفر کے متعلق بھی شائع ہوا جس کا عنوان ہے " ۱۹۶۶ء کا ایک سفر حج "

ڈاکٹر مدیر احمد

سر سید مرحوم

وہ اپنے وقت کا ایک فرد کامل بلکہ اکمل تھا
کہ ہم میں کا ہر اک اعلیٰ سے اعلیٰ اس سے اسفل تھا
خردمندوں کی صف میں سب مؤخر تھے وہ اول تھا
غرض اسلامیوں کی فوج کا لیڈر تھا جنرل تھا

اب اس کے بعد گو رہبر ہے مگر افسر نہیں کوئی
بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

یہ باتیں ہیں جو ہم نے اخذ کیں مرحوم سید سے
نہ سید بلکہ قومی رہنما و پیر و مرشد سے
وہ سمجھاتا رہا ہر ہر طرح پر ہزل سے جد سے
ولیکن ہم رہے محروم اپنی غفلت او ضد سے

وہ ہم پر جان دیتا تھا اسے دشنام ملتے تھے
یہ اپنی قوم سے اس کے تئیں انعام ملتے تھے

مگر وہ در منیر قوم ایک کوہ تحمل تھا
جو اس کے حق میں کانٹے تھے وہ ان کے واسطے گل تھا
مخالف پارٹی کا گو بہت سا شور تھا غل تھا
ولے اس کے ارادے میں نہ کچھ مطلق تزلزل تھا

کسی مطلب پہ کوئی دل نہادہ ہو تو ایسا ہو
جو ہمت ہو تو ایسی ہو ارادہ ہو تو ایسا ہو

(ماخوذ از مجموعہ نظم بے نظیر)

پاکستان میں تعلیم کا ماضی اور حال

مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایم اے بی ٹی

کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے پاکستان کا نعرہ ایک وقتی جذبے کے تحت بلند کیا تھا، اس کے پس پشت ٹھوس عوامل کارفرما نہیں تھے لیکن جب ہم حقائق کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ انگریز اور ہندو کی سیاست سے امت مسلمہ ہند کو مکمل تباہی سے بچانے کا واحد راستہ حصول پاکستان میں مضمر تھا۔ اس سلسلے میں ہمارا برادرانِ وطن سے مذہب، تعلیم، زبان اور اقتصادیات غرضیکہ ہر شعبہ میں زبردست اختلاف رہا۔ ہندو اکثریت کا مطالبہ تھا کہ انگریز اقتدار اعلیٰ اس کے حوالے کر کے چلا جائے اور اس طرح ملک آزاد ہو جائے۔ مسلمان کہتے تھے کہ پہلے حقوق کا تعین کر لو۔ پھر آزادی کی نعمت سے پر سکون انداز میں بہرہ مند ہوں۔ آج کی صحبت میں ہم تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی پسماندگی، انگریز ہندو سازش اور مسلمانوں کی زبردست جدوجہد کا مختصر خاکہ پیش کریں گے۔ مقصد یہ ہے کہ ہماری موجودہ نسل کو یہ اندازہ ہو سکے کہ پاکستان کی سرزمین کس عظیم جدوجہد اور کتنے اعلیٰ مقاصد کے واسطے حاصل کی گئی ہے، آج ہم جس شان کے ساتھ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے واسطے اربوں روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی دین ہے ورنہ ہمارے بزرگوں کو حقیر ترین رقوم کے واسطے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ اس وقت تعلیمی مد پر ڈیڑھ سے دو ارب روپے کے درمیان اخراجات ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ آزادی کی بدولت ممکن ہو سکا ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی آزاد حیثیت کی قدر کرنا چاہئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہیں خدا نے ہم کو اس نعمت سے نوازا ہے تو وہ اس کو واپس بھی لے سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ہماری مملکت میں پانچ صوبے تھے مشرقی پاکستان، سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان مشرقی پاکستان ہندوستان کی جارحیت کا شکار ہو چکا ہے، تاہم بحیثیت پاکستانی، ہم اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنے تعلیمی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی "تعلیمی کہانی" پیش کرتے ہیں

مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش)

ہمارے بنگالی مسلمان بڑے علم دوست واقع ہوئے تھے۔ اپنی خوشحالی کے دور میں انھوں نے اس کثرت سے جائیدادیں تعلیم کے واسطے وقف کیں کہ اس کی مثال پورے ملک میں مشکل دستیاب ہو سکے گی، انگریزوں نے مسلمانوں کو پسماندہ رکھنے کی غرض سے ایک منظم قانونی دھاندلی کا ارتکاب کیا۔ ظلم اور جبر کے ذریعہ ان کی جائیدادوں کو ضبط کر لیا۔ اس طرح وہ کنوئیں خشک ہو گئے جن سے علم وادب کے چمن کی آبیاری ہوتی تھی اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے فارسی زبان کو دفتروں اور مدرسوں سے خارج کر کے بنگلہ زبان سنسکرت رسم الخط میں

رائج کر دیں۔ اس طرح بقول شیرِ بنگال مولوی فضل الحق مرحوم " انگریزوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو حکومت و سلطنت سے گرا کر تعویذ لحد میں ڈال دیا ہے۔ "

(بحوالہ رپورٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۹ء کلکتہ)

ایک پیشین گوئی مولوی عبد الکریم کلکتے میں انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ جب بنگلہ زبان مسلمانوں پر مسلط کی گئی تو لکھے پڑھے مسلمان سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس کارروائی کا مستقبل میں کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ ۱۸۹۹ء میں مولوی عبد الکریم نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتے میں فرمایا۔

" اس وقت اگر ہم بنگلہ زبان کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ شریک ہونے اور اس میں اپنے علمی خزائن اور قومی ملفوظات کو داخل کرنے سے غافل رہے تو ہم سب کو ایک دن ضرور کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ "

(بحوالہ رپورٹ، اجلاس کانفرنس کلکتہ ۱۸۹۹ء)

چنانچہ صرف ۱۷ سال بعد یہ روز بد آ پہنچا جب بانگلہ درسی کتب کے ذریعے ہندو تہذیب و تمدن کی یلغار نے ہماری قوم کا ذہن ہی بدل دیا۔ اور ہم آج کفِ افسوس مل رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں پس ماندہ رکھنے کے واسطے تعلیم یافتہ ہندو طبقے نے انگریزی کی سرپرستی میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ ایک معمولی سی مثال پرائمری ایجوکیشن ایکٹ کی ہے جو ۱۹۱۹ء میں پاس ہوا تھا اور جس کو صوبائی حالات کے تحت صوبے کی اسمبلی کو قانونی شکل میں نافذ کرنا تھا۔ جس کے نتیجے میں پس ماندہ علاقوں کے بچوں کو لازمی پرائمری تعلیم کی سہولت میسر آتی۔ بنگال میں یہ قانون دس گیارہ سال تک دفتری کاغذات کی آڑ میں پاس نہیں ہو سکا۔ جب خواجہ ناظم الدین مرحوم کی کوشش سے ۱۹۳۰ء میں پاس ہوا تو عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ کلکتہ یونیورسٹی مسلمانانِ بنگال کے واسطے ایک اژدہا ثابت ہوئی۔ اس کا دائرہ کار بے حد وسیع تھا اور اسکولوں سے لے کر کالجوں تک پھیلا تھا۔ شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کی ان زیادتیوں پر گہری نظر تھی۔ انھوں نے اپنی وزارت کے زمانے ۱۹۴۰ء میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشنل کا بل پیش کیا۔ اس بل کی رو سے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی مدارس نیز کالجوں کے نصاب و امتحانات کا کنٹرول کلکتہ یونیورسٹی کی اجارہ داری کے بجائے ثانوی تعلیمی بورڈ کے ہاتھ آ جاتا۔ جس میں قدرتاً گورنمنٹ مسلمانوں کو واجبی نمائندگی دینے پر مجبور ہوتی اور ناانصافیوں کے خاتمے کی ایک شکل نکل آتی۔ مولوی فضل الحق نے اس یونیورسٹی کے خلاف اپنے بیان میں فرمایا۔

" یہ یونیورسٹی دنیا میں حکومت اور قانون کے نام سے پوری قوم پر چند گنے ہوئے اشخاص کی علمی و تعلیمی امارت و سیادت کی بدترین مثال ہے۔ "

برادرانِ وطن کا متحدہ محاذ جب برادرانِ وطن نے دیکھا کہ مسلمانانِ بنگال کلکتہ یونیورسٹی کا طلسم توڑ کر رہیں گے تو انھوں نے صوبے بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تقسیم بنگال کا زمانہ واپس آ گیا ہے۔ ہزارہ پارک کلکتہ میں دس ہزار ہندو نمائندے جمع ہوئے۔ سب پریشان تھے کہ مجوزہ بورڈ کو اختیارات مل جانے سے مسلمانوں کو کچلنے کا جو کامیاب پروگرام چل رہا تھا وہ ممکن ہے کچھ ناکام ہو جائے۔ نیز بنگالی قومیت کے فتنے میں کچھ کمزوری آ جائے۔ اس معاملے میں عام ہندوؤں کے علاوہ سرپی سی رائے، رابندر ناتھ ٹیگور، مرزا دا

کرشنن جیسے دانشور بھی اپنا تعصب چھپانے میں ناکام رہے۔
سر پی سی رائے نے کہا

"جو قدم یہ مسلم وزارت اٹھا رہی ہے اس کے نتیجہ میں قوم کی وہ جدوجہد جو بنگالی ہندو ... تعلیم پسند صوبے کی سربلندی کے واسطے مسلسل انجام دیتے چلے آئے ہیں بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی"

رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا۔

"ہم کو اپنی بنگالی زبان پر ناز ہے جس کا تحفظ ہونا چاہیئے۔"

سر رادھا کرشنن (سابق صدر بھارت) نے کہا۔
"مسلمان قوم تعلیم کے میدان میں تقسیم کے اصول کو اپنانے کے خوفناک نتائج محسوس کرے گی۔"

قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے زمین و آسمان بدل گئے۔ ڈھاکہ، راج شاہی، چاٹگام میں یونیورسٹیاں پورے ساز و سامان کے ساتھ قائم کی گئیں، ٹیکنیکل یونیورسٹی ڈھاکہ، زرعی یونیورسٹی میمن سنگھ، پولی ٹیکنک ادارے، متعدد پبلک اسکول، دیہات میں لازمی تعلیم، سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز میں ماڈل اسٹیکنیکل ہائی اسکول قائم ہو چکے تھے لیکن

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

افسوس ہے کہ آج مشرقی پاکستان کا ۲۴ سالہ "دور زریں" ایک حسین خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، ہم اس سلسلے میں اپنے مشرقی بھائیوں کے واسطے دعا ہی کر سکتے ہیں

صوبۂ پنجاب

صوبۂ پنجاب کو پاکستان کے صوبوں کا دل سمجھنا چاہیئے۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں کی مٹی سے سپاہی پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب کے مسلمان فطری طور پر بڑے جفاکش، بہادر اور پرجوش واقع ہوئے ہیں۔ عہد اسلامی میں یہ صوبہ تعلیمی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھا۔ نصف صدی سے زائد سکھوں کے دور غلبہ کے زمانے میں جب مسلمانوں کے ساتھ بحیثیت قوم وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا، اس وقت بھی مسلمان شمع علم کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہے، چنانچہ جب انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ صیغۂ تعلیم پر مسلمانوں کا ایک طرح سے اجارہ دار رہا ہے۔ مسلمانوں کے مکاتب میں مسلمان اور ہندو طلباء برابر سے شریک درس ہوتے تھے۔ انگریزوں نے پنجاب کے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے کے واسطے متعدد کامیاب اقدام کیئے۔ اولاً انگریزوں نے مسلمانوں کے اقتدار کی نشانی فارسی زبان کا خاتمہ کیا اور وقتی طور پر اردو زبان مدارس و عدالتوں میں رائج کی۔ یہ تبدیلی ١٨۵١ء اور ١٨۵۴ء کے درمیان عمل میں آئی۔ انگریزوں نے دوسرا قدم مکتبی نظام کے خاتمے کا کیا اس کے واسطے پہلے تو پرانے قائم شدہ اسکولوں پر کچھ سادہ قوانین بنا کر نیز پرانے نام امداد دیکر کنٹرول حاصل کیا، اس کے علاوہ مرکزی دیہات میں نمونے کے مدرسے قائم کیئے۔ ان میں بھی پرانے گروپ کے اساتذہ کو ملازم رکھا، لیکن مسلمان مولوی عالم، ملا، انگریزی پالیسی کو سمجھ رہے تھے، لہٰذا یہ مدرسے پرانے نظام کا حامل بن گئے۔ یہ کیفیت انگریزوں کو سخت ناگوار گزری، ایک انگریز اعلیٰ افسر مسٹر پاسک نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اقرار کیا۔

"غیر جانبداری کے اس ادعا کے خلاف جس پر محکمے تعلیم کا انحصار ہے۔ یہ اسکول زیادہ تر مذہبی نوعیت کے بن گئے۔ ماتحت افسران خصوصاً مسلمان اپنے عقائد کے مطابق

میں سب سے بدپوش ہیں۔ وہ محکمے کے قوانین سے راست مخالف ہیں، یہی لوگ اساتذہ مقرر کیے گئے۔ ان لوگوں کے جنونی کردار نے ان کو ایک لادینی تعلیم کے استاد کی حیثیت سے غیر موزوں قرار دیدیا۔"

انگریزوں نے جب اپنی پالیسی ناکام ہوتے دیکھی تو مسلمان ملازمین مکاتب کو لیاقت علیحدہ کردیا۔ نتیجہ ہوا کہ صدیوں سے صیغۂ تعلیم میں جو مسلمانوں کا زور بندھا ہوا تھا بُری طرح متاثر ہوا۔ انگریزوں نے مسلم کشی کرنے کے لیے اساتذہ کی تنخواہیں اضافہ کرکے غیر مسلموں کے واسطے میدان تیار کردیا دوسری طرف کورس میں جو تبدیلیاں کیں ان کا اندازہ مسٹر آرنلڈ کی ابتدائی دو سال کی رپورٹ کے اس فقرے سے لگایا جا سکتا ہے کہ

• ہر تحصیلی اسکول میں ایسے طلبا موجود ہیں جو ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی ادوار کے حالات کا حال بتا سکتے ہیں نیز اپنے مکمل جغرافیہ کے متعلق ذہانت کے ساتھ جواب دے سکتے ہیں۔"

انگریزوں کی مسلمانوں کو کچلنے کی پالیسی کامیابی کے ساتھ چلتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ ۵۵ فیصد اکثریت تعلیمی اعتبار سے ایک نہایت کمزور اقلیت بن گئی۔ ۱۸۸۲ء میں انگریزوں نے ہنٹر تعلیمی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے روبرو پنجاب کا کیس پیش کرنے کے واسطے حکومت پنجاب نے ایک سو سے زائد سوالات پر مبنی ایک سوالنامہ جاری کیا جس میں ہر قسم کے سوالات تھے لیکن قومی مسائل پر مسلمانان صوبہ نے جس اونچے کردار اور اتحاد کا مظاہرہ کیا اس کی مثال پورے ملک میں شاید ہی دستیاب ہو سکے۔ مثلاً ۹۹ فیصد ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں نے اردو زبان کے خلاف ہندی، گورمکھی کے حق میں بیان دیئے اور اردو کو حملہ آور اور مسلمانوں کی نشانی اور درآمد شدہ بیرونی زبان قرار دیا۔ جبکہ جملہ مسلمانوں نے بطور زبانِ درسی اردو کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں کی جانب سے انجمن حمایت اسلام نے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں مسلمانوں پر ہونے والی مسلسل ناانصافیوں کے خلاف مندرجہ ذیل الفاظ میں تنقید کی گئی تھی۔

"پنجاب کے زراعت پیشہ لوگ ایک استثنا یعنی سکھوں کے علاوہ سب مسلمان ہیں۔ یہ شدید ناانصافی ہے کہ جن رقوم کا بیشتر حصہ ان مفلوک الحال لوگوں کی جیبوں سے لیا جاتا ہے وہ شہروں کے ملازمتیوں، بنیوں اور برہمنوں کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے...... اس صوبے کے معاملات کا تعلق زراعتی کلاس کے مسائل سے وابستہ ہے۔

مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے واسطے اسپیشل اسکالرشپ اور وظیفے دیئے جا سکتے تھے۔ فیس معاف کی جا سکتی تھی۔ موجودہ سسٹم کے تحت زراعت پیشہ لوگ گویا مسلمان خاص طور پر انگریزی تعلیم سے خارج کردیئے گئے ہیں۔"

ملازمتوں کا مسئلہ محکمۂ تعلیم کے دروازے مسلمانوں پر ۱۸۷۱ء کے لگ بھگ بند ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں یہ عالم ہوگیا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں پنجاب کے ایک بزرگ مولوی نور احمد نے بیان کیا کہ

"اب ۱۹۰۴ء میں ضلع دہلی میں تو صرف بخت گڑھ میں تین مسلمان معلم ہیں اور وہ بھی لوگوں کی آنکھوں کا خار ہیں۔ یہ تو ورنا کیولر مدرسوں کا حال تھا اب رہ گئے اینگلو ورنیکولر اسکول تو ان میں صرف ایک ہیڈ ماسٹر پنجاب بھر میں مسلمان نکلا

اللہ اکبر، یا تو میاں جی کے سوائے کسی کا نام ہوتا ہی نہ تھا یا
اب نام کو بھی نمایاں جگہ نہیں۔"

نماز جمعہ کا مسئلہ مسلمانوں کی بے بسی کا یہ عالم تھا
کہ جمعہ کی نماز کے واسطے اجازت بمشکل ملتی تھی۔ جو مسلمان
معلم سرکاری احکام کی پرواہ کیے بغیر نماز جمعہ ادا کرتے تھے،
ان میں سے اکثر کی نوکریاں ختم کر دی گئیں۔ جب یہ مسئلہ لکھنؤ
کانفرنس کے اجلاس میں اٹھا تو گورنمنٹ پنجاب نے ۵ مارچ
۱۹۱۳ء کو مسلمان اساتذہ کو ایک گھنٹے کی چھٹی دینا منظور کی۔

علی گڑھ سے سرسید احمد خاں کی قیادت میں جو تعلیمی
تحریک اٹھی تھی، اس کا سب سے زیادہ اثر پنجاب کے
مسلمانوں نے قبول کیا۔ چنانچہ سرسید کی قائم کردہ آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ ۱۸۸۷ء میں لاہور
کے ایک بزرگ سید نادر علی شیفتہ نے مسلمانان پنجاب کی
تعلیم پر ایک مبسوط جائزہ پیش کیا۔ سرسید پنجاب کے مسلمانوں
کو زندہ دلانِ پنجاب کہتے تھے۔ اس رپورٹ کا ایک
اقتباس آج بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے

"اس ہندوستان میں پنجاب قدیم ملک اہل اسلام
کا ہے اور اس وقت بھی اس میں مسلمان زیادہ آباد ہیں۔
...... یہ وہ باتیں کچھ کم قابل لحاظ نہیں لیکن تیسری اور
بات ہے جو مسلمانان پنجاب کی حالت پر ان کے ہمسایہ ہم
قوموں کو خوشی کے ساتھ متوجہ کر سکتا ہے وہ یہ کہ ہمارے وطنی
خاص کر مسلمان بہت سیدھے سادے ہیں، ان میں حسد اور
بخل کم ہے اور اس لیے ترقی کا مادہ بہت زیادہ ہے۔"
"اگر پنجاب پیچھے رہ گیا تو دیگر صوبوں کے مسلمان بہت
زیادہ قوت نہ پائیں گے۔ پنجاب کے مسلمانوں کا زیادہ خیال
رکھو۔ ان کی شمولیت سے مسلمانوں کے معاملات کو بہت تقویت
حاصل رہے گی۔"

پنجاب میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مسلمانوں
میں قومی نشاۃ ثانیہ کی غرض سے کام کرنے والوں کی ایک
فوج ظفر موج میدان میں آگئی۔ ان لوگوں نے وہ سب کچھ کیا جو
ان کے بس میں تھا لیکن قدم قدم پر مالی مشکلات اور سرکاری
امداد کی کمی مانع تھی۔ تفصیلات سے قطع نظر ۱۹۲۲ء
میں راولپنڈی اور ملتان کے اضلاع میں مسلمانوں کی تعلیمی
حالت کا جائزہ اس زمانے کے ایک تعلیمی کارکن خان بہادر
قاضی سراج الدین کی زبانی سنیئے۔ جو انھوں نے مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس کے اجلاس علیگڑھ میں پیش کی تھی۔

"گورنمنٹ پنجاب کا یہ دستور ہے کہ ہر ایک مدرسے کی
عمارت اور دیگر مصارف تعلیم میں ایک خاص حصہ بطور
امداد ادا کرتی ہے اور طلباء کی تعداد اور استادوں کی قوت
کی نسبت سے امداد دیتی ہے۔ قسمت ہے راولپنڈی کی
آبادی ۲۴ لاکھ ہے، اس میں ۲۰ لاکھ مسلمان ہیں اور کل چار لاکھ
باقی قومیں ملی ہوئی ہیں لیکن مسلمانوں کے کل چار ہائی اسکول،
ہندوؤں کے ۱۶ اور سکھوں کے ۱۹ ہائی اسکول ہیں، آبادی میں
مسلمان ۸۰ فیصد، ہندو ۷ فیصد، سکھ ۵ فیصد بقیہ متفرقات
ہیں۔ ایسی صورت میں غیر مسلم کا حصہ تعلیمی مصارف میں بہت
کم ہوتا ہے لیکن حال یہ ہے کہ ہندو تھوڑا میں بڑھے ہوئے ہیں
ضرورت بلا ضرورت مدرسہ کھول لیتے ہیں اور اپنی ترکیبوں
سے بہت جلد امداد سرکار کی صورت نکال لیتے ہیں۔ مسلمانوں کو
ہم مدرسوں کے لیے بہت تھوڑی امداد ملتی ہے۔ حالانکہ انصاف

یہ ہے کہ ان کو تعلیمی پستی اور کثرت آبادی پر امداد ملنی چاہیئے
ہندو لڑکے سو فیصد مدرسہ جاتے ہیں۔ سکھ ۹۶ فیصد مگر
مسلمان ۱۳ فیصد ۱۴ فیصد سے زیادہ نہیں جاتے ہیں۔
راولپنڈی اور ملتان دونوں میں مسلمانوں کے ساتھ
ناانصافی ہو رہی ہے۔ انصاف تو یہ ہے کہ بلحاظ آبادی
مسلمانوں کو ۸۰ فیصدی اور باقی قوموں کو ۱۲ فیصد جگہ ملنا
چاہیئے۔"

تعلیمی میدان میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی
ناانصافیوں کی داستان بے حد طویل ہے۔ ۱۹۳۸ء میں
خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے بیان کیا کہ زنانہ تعلیم کے لئے
مسلمانوں کا ایک بھی مڈل یا ہائی اسکول اضلاع میں موجود نہیں
ہے۔ گورنمنٹ مدارس میں بہت کم مسلمان استانیاں کام کرتی
ہیں اور مسلمان ہیڈ معلمہ تو شاید ہی کہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ مسلمان استانیوں کی ٹریننگ کا کوئی خاطر خواہ انتظام
موجود نہیں ہے، گرانٹ ان ایڈ کا ۳ فیصد سے بھی کم حصہ
مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی
پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا۔ مسلمان مسلسل مطالبہ کر رہے تھے
کہ ان کو آبادی کی مناسبت سے نمائندگی دی جائے لیکن کون
سنتا ہے فغانِ درویش، کے مصداق آزادی وطن تک یہ
کیفیت جاری رہی۔

پنجاب یونیورسٹی اور مسلمان

۱۹۴۳ء میں میرٹھ کے تعلیمی اجتماع میں ایک ریزولیوشن پنجاب یونیورسٹی
میں مسلم نمائندگی کے موضوع پر پاس ہوا۔ جس کے الفاظ یہ تھے
"یہ کانفرنس افسوس کرتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے تعلیمی اور
اداروں میں ذمہ داری کے عہدوں پر مسلمان افسروں کا تقرر
شاذونادر صورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ کانفرنس یونیورسٹی
کے ارباب بست و کشاد کی توجہ مسلمانوں کی اس شکایت کے
رفع کرنے کی طرف منعطف کراتی ہے۔"

برادرانِ وطن اور انگریزوں کی ملی بھگت کا یہ نتیجہ ہوا
کہ لازمی ابتدائی تعلیم کے قوانین پاس کرانے کی جدوجہد کا حل
بیس سال ۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۰ء جاری رہی اور حقیقی عمل تو
قیام پاکستان تک ممکن نہ ہو سکا۔

صوبے کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں انجمن حمایت الاسلام
لاہور، انجمن اسلامیہ امرتسر، انجمن مسلمانانِ قصور، انجمن ہمدرد
اسلام، مدرسۃ البنات جالندھر، قیام پاکستان کے قریب انجمن
فیض الاسلام راولپنڈی نے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ اس ضمن
میں انجمن حمایت الاسلام کا وہی مرتبہ ہے جو سندھ میں سندھ
مدرسۃ الاسلام کی تعلیمی تحریک کا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کا ایک
مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ آزادی اور غلامی کے فرق کا اس امر
سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت پنجاب میں گلی گلی
تعلیم کا چرچا ہے، میٹرک تک تعلیم مفت ہے تعلیمی پالیسی کے
تحت ۱۹۷۲ء میں جب حکومت نے نجی اداروں کو قومی تحویل میں
لیا اس وقت ان کی تعداد ۱۹۵۰ تھی جن میں آٹھ لاکھ سے زائد بچے
تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان اداروں میں ۱۹ ہزار سے زائد اساتذہ
اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ گورنمنٹ کے ادارے ان کے
علاوہ درس و تدریس میں نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ صرف پنجاب
میں ۱۹۷۲ء میں طلباء کے پرائمری اسکول ۶۹۲۰ ۔ طالبات
کے ۳۲۰۳ گویا دس ہزار ایک سو پچاس اسکول موجود تھے

دوران سال مزید ترقیات ہو رہی ہیں، ان تفصیلات کو یکجا کرنے
کے واسطے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ فی الوقت ہمہ جہت ترقی
کا اندازہ پنجاب کے وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق کی ایک تقریر کی
اخباری رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہے، خدا کی ذات
سے امید ہے کہ مستقبل قریب پاکستان کے دیگر صوبوں کے ساتھ ساتھ
پنجاب بھی اپنا اعلیٰ مقام نہ صرف برقرار رکھے گا بلکہ بیش از
بیش ترقی کرے گا۔

"عوامی حکومت تعلیمی پسماندگی کو ختم کرنے کا تہیہ
کر چکی ہے اور نئی تعلیمی پالیسی کے تحت پروگرام پر مرحلہ وار
تیزی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امسال فروری میں
ایک ہزار نئے پرائمری اسکولوں کا اجراء کیا گیا تھا۔ انھوں نے
کہا کہ انگریزی دور حکومت کے پرانے اور ناکارہ فرسودہ نظام تعلیم
کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلامی ممالک کے نظام تعلیم
کے نصاب کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ وزیر تعلیم نے انکشاف کیا کہ نئی
تعلیمی پالیسی کے مرحلہ وار پروگرام کے تحت ۱۹۷۵ء کے طلباء کے
نئے گاؤں اور شہروں میں پرائمری اسکول ہوں گے، اور
لڑکوں کے واسطے تعلیم کا منصوبہ پورا ہو جائے گا۔ انھوں نے
کہا کہ آئندہ سال مزید گیارہ سو اسکولوں میں فنی اور زرعی تعلیم
کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فروری کے بعد امسال
مزید اسکول کھولے جائیں گے جن کی پورے ملک میں تعداد
چھ ہزار ہو جائے گی، انھوں نے کہا کہ اب تعلیم با مقصد کی ضرورت
ہے۔ چھٹی کلاس سے بچوں میں زرعی تعلیم اور بچیوں میں گھریلو
تعلیم دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے میٹرک تک تعلیم مفت
کر دی ہے جبکہ بھارت میں پرائمری تک تعلیم مفت
ہے۔"

صوبہ سندھ

صوبہ سندھ کو بجا طور پر "باب الاسلام" کہا جاتا ہے
کیونکہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں آفتاب اسلام سب سے
پہلے طلوع ہوا تھا۔ مسلم عہد حکومت میں پورے ہندوستان
میں یکساں مکتبی نظام رائج تھا۔ اس واسطے بقول جے ایم سین
مصنف تاریخ التعلیم۔

"سندھ اور بنگال کے مدرسوں میں کوئی فرق نہیں
تھا"

جب تعلیمی نظام اور علوم مروجہ یکساں ہوتے ہیں تو قدرتاً
سوچنے سمجھنے کا انداز بھی قریب قریب یکساں ہو جاتا ہے۔ انگریزوں
نے مختلف صوبوں کے مسلمانوں کے ذہن کو تبدیل کرنے کے واسطے
مختلف حربے استعمال کیے، لیکن مکتبی نظام کو تباہ کرنے کے معاملے
میں سب جگہ ایک سی پالیسی برتی گئی۔ ۱۸۴۳ء میں صوبہ
سندھ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد مفت تعلیم دینے والے
اداروں پر کیا گزری، اس کا اندازہ رچرڈ برٹن کے الفاظ میں یوں لگایا جا سکتا ہے

"ہم نے اپنے عہد حکومت میں یہاں کی تمام درسگاہوں کا ذرائع
آمدنی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ویران ہو جانا گوارا کر لیا یعنی
ذرائع آمدنی سے محروم کر کے انھیں فنا کر دیا ہے۔"

(مقالہ، پروفیسر شبیر احمد "العلم"، کراچی جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء)

سندھ میں ٹھٹھہ اور روہڑی بہت بڑے تعلیمی مراکز
تھے، یہاں سادات کے کچھ مشہور خاندان آباد تھے۔ ان
خانوادوں سے علم و ادب کے چشمے رواں تھے۔ انگریزوں
نے سادات کی وقف جائدادوں کو ضبط کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ یہ شریف و نجیب گروہ نان شبینہ کو محتاج ہو گیا۔ دوسری طرف
وہ تمام دارالعلوم اور مدارس جو ان لوگوں کی سرپرستی میں فیض

پہنچا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ انگریزوں کی اس
پالیسی نے سادات سندھ کو انگریزوں کے سخت خلاف کر دیا
کیپٹن ایسٹ وِک نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

"دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں سیدوں کا
اس قدر اثر ہو۔ جتنا سندھ میں ہے۔ ہماری آمد نے ان کی
حاصل شدہ رعایتوں اور معافیات کا بالکلیہ خاتمہ کر دیا ہے۔
وہ قبیلوں کو ہمارے خلاف ابھارنے میں کبھی نہ تھکیں گے۔"

امیران سندھ کا دور مسلمانوں کے تسلط کا آخری
زمانہ تھا اس وقت بھی مسلمانوں میں تعلیم کا کس قدر
چرچا تھا، اس کا اندازہ انگریزی اقتدار کے ۹ سال بعد ۱۸۵۲ء
میں شائع ہونے والے ایک تعلیمی جائزے سے لگایا جا سکتا
ہے جو ایک انگریز مسٹر ایلس نے مرتب کیا تھا۔

اس وقت عام دیسی مکاتب کی تعداد ۷۴۳
قرآن شریف ناظرہ و عربی تعلیم کے مدارس کی
تعداد ۲۷۸
عربی فارسی مخلوط تعلیم کے مکاتب ۲۴۸
خالص فارسی اسکول ۵۶
کل ۱۳۲۵

ٹھٹھہ اور روہڑی کے علاوہ عادل پور، گمبٹ، ہالہ
نصرپور کے مدرسوں کی عام شہرت تھی، انگریزوں نے پہلا
کام یہ کیا کہ فارسی زبان کے مدرسے حکماً بند کر دیئے۔ بقول
پیر حسام الدین راشدی۔

"انگریزوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عوام سے
براہ راست تعلق پیدا کرنے کے لیے فارسی کی عملداری
دفاتر سے اٹھا دی۔"

اس فیصلے کا اثر یہ ہوا کہ سرکاری دفاتر سے
مسلمان خارج ہونا شروع ہوگئے اور ہندو ملازمتوں پر

چھا گئے۔ جنہوں نے سندھی نوشت و خواند سیکھ لی تھی۔
مسلمانوں کے سخت رویے سے متاثر ہو کر انگریزوں
نے مدرسوں میں فارسی زبان پھر رائج کر دی اور سندھی
فارسی اسکول قائم ہوئے جو اوائل بیسویں صدی تک جاری
رہے، ادھر یہ ہو رہا تھا دوسری طرف ہندوؤں نے اس
امر کی کوشش کی کہ سندھی زبان کا عربی رسم الخط تبدیل کر کے
ہندی کر دیا جائے، اس معاملے میں نرائن جگناتھ وِدیا
ایک مرہٹہ برہمن نے جو ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا بڑا زور دکھایا۔
لیکن بااثر عامل قوم کے ہندوؤں اور انگریزوں کے ایک گروہ
کی کوشش سے یہ شرمناک سازش ناکام ہوگئی۔ عربی فارسی تعلیم
کے مدرسوں کی تباہی کا المناک نتیجہ برآمد ہوا، شیخ صادق علی ڈینو
خیرپور میرس (۱۹۰۷ء) کے بقول

"فارسی و عربی ختم ہونے کے تباہ کن اثرات یہ نکلے کہ
مسلمان مولویوں اور ملاؤں کا جوش ہمدردی اور خیر خواہی بالکل
زائل ہوگیا۔"

(رپورٹ اجلاس تعلیمی کانفرنس علیگڑھ بمقام کراچی ۱۹۰۷ء)

انگریزی عہد اقتدار میں مسلمانِ سندھ تعلیمی اعتبار سے
شدید خسارے میں رہے، اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی ترقی بمنزلہ
صفر تھی۔ انگریزوں کے تسلط کے پورے ۲۹ سال بعد ۱۸۷۲ء
میں پہلا مسلمان گریجویٹ ہوا جس کا نام مرزا صادق علی [illegible]
۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۶ء کوئی مسلمان بی اے نہیں کر سکا۔
۱۹۰۶ء میں ۵ مسلمان گریجویشن کر سکے ۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۷ء
اوسطاً ایک مسلمان فی سال کامیاب ہوا۔ ایم اے پاس
مسلمان تو تبرکاً بھی نہیں ملتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں پروفیسر [illegible]
نے ایم اے پاس کیا۔ اگلے بیس سال تک ایک بھی مسلمان [illegible]

نہ کرسکا ۔ خود سندھ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے نمایاں کامیابی حاصل کرکے اس جمود کا خاتمہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی ناکامی میں منجملہ دیگر وجوہ کے ایک خاص سبب برادران وطن کی تعلیمی میدان میں اجارہ داری اور انگریزوں کی مسلم دشمنی تھی ۔

ابتدائی تعلیم کے میدان میں بھی صوبہ سندھ کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے طرح طرح کی دھاندلیاں کی گئیں ۔ ۱۹۱۹ء کے لازمی تعلیم کے قانون کو صوبے میں نافذ کرنے کے بارے میں مجرمانہ غفلت برتی گئی ۱۹۲۶ء میں اس ایکٹ کے تحت لازمی تعلیم کے نفاذ کا اعلان کیا گیا لیکن عملی شکل کہیں ۱۹۳۰ء میں ممکن ہوسکی۔

قیام پاکستان تک ان پسماندہ بستیوں کے اردو، سندھی اور گجراتی اسکول بنیادی ضروریات سے محروم اور مسائل کا شکار تھے ۔ برادران وطن نے جان بوجھ کر ان علاقوں میں مارواڑی اور مقامی زبانوں سے نابلد مرہٹہ اساتذہ کا تقرر کیا۔ اسکول بورڈ کراچی کی رپورٹیں، کتب خانہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں موجود ہیں ۔ جن سے مسلمانوں کی بے بسی کی زندہ تصویر نظر آتی ہے ۔

سندھ مدرسہ کراچی کے بغیر مسلمانان سندھ کی تعلیم کا ہر تذکرہ نامکمل رہے گا ۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرحوم حسن علی بے آفندی علیگڑھ تحریک سے متاثر تھے، اس مدرسہ کے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر عرصہ تک علی گڑھ سے درآمد ہوتے رہے، اس طرح یہ ادارہ ملت اسلامیہ ہند کے درمیان ایک ذہنی پل کا کام دیتا رہا ۔ سندھ یونیورسٹی کا خیال بڑا خاصا پرانا ہے ۔

لیکن ۱۹۳۶ء میں جب صوبہ سندھ بمبئی سے علیحدہ ہوا اس وقت اس بارے میں خصوصی توجہ ہوئی، ۱۹۴۲ء میں سندھ کے مشہور بزرگ میران محمد شاہ مرحوم نے ایک مبسوط رپورٹ مرتب کی جس میں مجوزہ سندھ یونیورسٹی کے بارے میں کماحقہ بحث کی گئی تھی، اس وقت سندھ کے بند وغیرہ کے اکثر اسکول بمبئی یونیورسٹی سے الحاق رکھتے تھے ۔ اس طرح پورے تعلیمی نظام پر کلکتہ یونیورسٹی کی طرح برادران وطن کا مستحکم قبضہ تھا ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی بھی شکل میں یہ استحصالی نظام شکست پائے اس لیے انہوں نے مجوزہ سندھ یونیورسٹی کی مخالفت کرنا اپنا فرض قرار دے دیا ۔ اور وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا لیکن فرزند علی گڑھ پیر الہٰی بخش چٹان بن کر کھڑے ہو گئے ۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر یونیورسٹی سے ایک طالب علم اور صرف ایک ادارہ وابستہ ہوگا ۔ تب بھی یونیورسٹی قائم ہوگی ۔ اور قائم رہے گی ۔ یونیورسٹی کی پہلی سینیٹ ۲۴ جون ۱۹۴۷ء کو قائم ہوئی ۔ اگرچہ پاکستان کا قیام تقریباً یقینی امر ہوچکا تھا ۔ لیکن برادران وطن کی مخالفت کا زور اس وقت ٹوٹ سکا جب بمبئی یونیورسٹی اپنا قانونی حق کھو بیٹھی اور برادران وطن کی بڑی تعداد ہندوستان چلی گئی ۔ خدا کا شکر ہے کہ سندھ یونیورسٹی اپنی وسعت ساز و سامان اور شان و شوکت کے لحاظ سے پاکستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے ہم پلہ ہوتی جارہی ہے، ان سب ترقیات سے ہم اعلیٰ قومی جذبے کے تحت ہی فائدہ اٹھا سکیں گے ۔

قیام پاکستان کے بعد سندھ کی تعلیمی ترقیات کا اندازہ

اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ میٹرک تک تعلیم عام ہے جو کہ ۱۹۶۷ء میں لڑکوں کے ۳۵ اور لڑکیوں کے ۹ کالج تھے۔ صوبے کا تعلیمی بجٹ کافی بڑھ چکا ہے۔

اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تنخواہوں، گرانٹ وغیرہ کی مدات ہی کالج، ہائی اسکول، مڈل اسکول، پرائمری اسکولوں، بشمول اسپیشل اسکولوں نیز نظامت ہائے تعلیمات سندھ کا تین سال کا بجٹ کس حد تک بڑھ چکا ہے۔

یہ مجموعی رقم درج ذیل ہیں۔

۱۹۶۲-۶۳ء	۱۹۶۳-۶۴ء	۱۹۶۴-۶۵ء
۱۹،۹۲،۰۵،۳۹۵	۲۲،۳۱،۴۲،۱۳۰	۲۹،۳۸،۴۳،۹۰۰

صرف کراچی میں ۷۲۲، ۵۸، ۶ طلبا اسکولوں میں حاضری دے رہے ہیں۔ میر ہزار خان بجارانی کے بیان کے مطابق صوبے میں فنی تعلیم رائج کرنے کے منصوبے پر ۶ پچاس لاکھ روپے خرچ کرنے کا مزید پروگرام ہے۔

صوبہ بلوچستان

برطانوی دور حکومت میں بلوچستان میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت بمنزلہ صفر تھی۔ اس امر کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۸۷۔ ۱۸۸۶ء میں اس وسیع و عریض علاقے میں صرف تین اسکول تھے جو کوئٹہ، سبی اور کرووک میں قائم کیے گئے تھے۔ ان میں طلبا کی تعداد ۵۵۔ ۴۳ اور ۱۲ علی الترتیب تھی۔ ان طلبا کی تعلیمی اہلیت کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے صرف ایک لڑکا مڈل کے امتحان میں لاہور جا کر شامل ہوا۔ اور وہ بھی فیل ہو گیا۔ قلات ڈویژن میں پہلی مرتبہ ۱۹۰۴ء میں بمقام مستونگ طلبا کے لئے پرائمری اسکول قائم ہوا جو ۱۹۳۸ء میں ہائی اسکول ہو سکا۔ ۱۹۶۱ء میں یہی مدرسہ پائلٹ اسکول بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں پہلی بار محکمہ تعلیم بلوچستان نے مڈل کا امتحان لیا۔

قائد بلوچستان قاضی محمد عیسیٰ نے ۱۹۴۶ء کی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ۔

"مسلمان لڑکیوں کے واسطے کوئی ہائی اسکول نہیں تھا۔ جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کے واسطے یہ انتظام صاحب کوئٹہ شہر میں موجود تھا۔ مسلمانوں کے بچے مساجد میں ابتدائی تعلیم پاتے تھے۔ صرف ساڑھے تین ہزار مسلمان بچے گورنمنٹ اسکولوں میں داخل تھے"

(بلوچستان کا مسئلہ از قاضی عیسیٰ)

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت بلوچستان میں کوئی ڈگری کالج موجود نہیں تھا۔ ثانوی اسکول صرف ۱۷، ابتدائی اسکول ۱۰۰۔ اور اساتذہ کی تربیت کا صرف ایک ادارہ ہوتا تھا قیام پاکستان کی برکت دیکھیے کہ ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء میں طلبا کے ثانوی مدرسے ۹۸ اور طالبات کے ۲۵ ہو گئے نیز ایک ڈگری کالج تو ۱۹۵۱ء میں قائم ہو گیا تھا ۶۵-۱۹۶۴ء میں طلبا کے پانچ اور طالبات کا ایک کالج قائم ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی ترقیات مستزاد ہیں۔

(رسالہ ثانوی تعلیم، لاہور، دہ سالہ نمبر ۱۹۶۸ء)

خدا کے فضل سے بلوچستان کی اپنی یونیورسٹی بھی قائم ہو گئی ہے جس کا اب سے چند سال قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ضلع لسبیلہ

بلوچستان کے صوبے مکران، کچھی خاران، مری بگٹی قبائل میں قیام پاکستان کے بعد سابقہ ادوار کے مقابلے میں خاصا کام ہوا۔

لیکن قبائلی نظام، سرداری سسٹم اور ایک قسم کی دو عملی

کی وجہ سے تعلیم کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ ضلع لسبیلہ ون یونٹ کے زمانے میں کراچی سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ یہ ضلع ۱۲۱۴۰ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ آبادی کی یہ کیفیت ہے کہ ایک مربع میل میں صرف تیرہ آدمی بستے ہیں قیام پاکستان سے قبل اس علاقے پر جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ایک مڈل اسکول اور چھ پرائمری اسکول اتنے بڑے علاقے میں کافی شمار کیے جاتے تھے جن پر صرف بیس ہزار روپیہ سالانہ اخراجات ہوتے تھے سب سے زیادہ لطف کی بات یہ تھی کہ ایک ٹیچر اسکول ہونے کے باوجود ماسٹر صاحب کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر سڑک کی تعمیر کے نگران یا ہسپتال کے ڈریسر وغیرہ کے فرائض بھی انجام دینے پر مجبور کیے جاتے تھے۔

۱۹۷۵ - ۷۶ء میں اس علاقے میں مختلف النوع پرائمری تا سیکنڈری اسکولوں کی تعداد ۵۵ تک پہنچ گئی میزنگ یہاں کے طلباء کو مفت اسٹیشنری وظائف اور درسی کتب کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔

(ضلع لسبیلہ کا تعلیمی جائزہ۔ مقالہ آمنہ رونق صاحبہ، رسالہ قومی تعلیم، گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج کراچی)

آجکل بلوچستان ہمہ جہت ترقی کی راہ پر گامزن ہے ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۸۰ء کو جام میر غلام قادر خان، وزیر اعلیٰ بلوچستان کا حسب ذیل بیان تعلیمی ترقیات کے سلسلے میں شائع ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد جو سفر ہم نے شروع کیا تھا وہ اب ماشاءاللہ کس منزل تک پہنچا ہے۔

"حکومت زراعت، اور رسل و رسائل کے ساتھ ساتھ تعلیمی ترقی سے بھی غافل نہیں ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی کے ذریعے وہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں جن کا بیڑا عوامی حکومت نے اٹھایا ہے اور تعلیم کی بدولت صوبے میں سرداری نظام کی پھیلائی ہوئی خرابیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے اس مقصد کے لیے حکومت اسکول اور کالج کھول رہی ہے کئی اسکولوں کا درجہ بڑھایا جا رہا ہے۔ میٹرک تک تعلیم تمام صوبے میں مفت کی جا چکی ہے جو یقیناً ایک انقلابی اقدام ہے۔ اس کے ساتھ تقریباً ۲۷ لاکھ روپے کے وظائف مختلف طالب علموں کو ہر سطح پر دیئے جا رہے ہیں۔ بولان میڈیکل کالج نے کام شروع کر دیا ہے اور جلد ہی ایک انجینئرنگ کالج بھی کھول دیا جائے گا۔"

بلوچستان یونیورسٹی

بلوچستان یونیورسٹی میں ۷۵ - ۱۹۷۴ء کے سال کے دوران میں طلباء کی تعداد ۴۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔ جبکہ ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں یونیورسٹی میں صرف سو طلباء زیر تعلیم تھے یہاں قومی زبان اردو کے علاوہ پشتو براہوی، بلوچی کلاسوں کا خاص اہتمام ہے۔ طلباء میں وظائف تقسیم کیے جاتے ہیں، یونیورسٹی میں ریسرچ کی سہولتیں موجود ہیں۔ وائس چانسلر پروفیسر کرار حسین جیسے سمجھدار اور متین شخص ہیں، انھوں نے اپنے گرد قابل ترین اشخاص کی ایک کھیپ جمع کر لی ہے خدا کی ذات سے امید ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی اتحاد قومی کا وہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دے گی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی کر کے کیا تھا۔

بولان میڈیکل کالج

یہ کالج اپریل سنہ ۱۹۷۲ء میں قائم ہوا۔ جب میڈیکل

انسٹی ٹیوٹ سے ۷۲ طلباء کو اس میں داخل کیا گیا تھا۔ آجکل کالج میں تیسرے سال میں ۷۲ طلباء اور دوسرے سال میں ۷۲ اور ایک سو بیس پہلے سال میں ہیں۔

اس وقت صوبے کے کوئٹہ ڈویژن میں زنانہ و مردانہ ۴۲۲ پرائمری اسکول، ۲۰۴ مڈل اسکول اور ۵۹ ہائی اسکول موجود ہیں۔

قلات ڈویژن میں ۳۰۳ پرائمری، ۱۰۴۵ مڈل اور ۲۷ ہائی اسکول چل رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار اپنا جواب آپ ہیں۔

(اخبار صدائے بلوچ کراچی)

صوبہ سرحد

قیام پاکستان سے قبل صوبہ سرحد اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ یہاں مسلمانوں کی ہندوستان بھر کے جملہ صوبوں سے زیادہ واضح اکثریت تھی۔ نیز یہاں کے مسلمان آزادی کے زبردست متوالے تھے۔ انھوں نے تقریباً ایک صدی انگریزوں اور اس سے قبل تقریباً نصف صدی سکھوں کے ظلم و ستم کا انتہائی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انھوں نے جان دی اور جان لی، لیکن استبدادیت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ایک انگریز مسٹر جیمس نے سکھوں کی خون آشامی اور بربریت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے ——!

۱۸۰۷ء سے لیکر ۱۸۲۰ء میں پشاور میں مسلسل ہلچل مچی رہی۔ سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لئے بلائے جان تھا۔ ان کا وہاں پہنچنا اس امر کی علامت تھی کہ ملک و مکان اور بیش قیمت اسباب کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ یہ نفرت زدہ دشمن جہاں تک آگے بڑھتے تمام خطۂ ملک برباد کرتے جاتے۔ اور جو کچھ سامنے آتا اسے تاخت و تاراج کرتے اور کھیتوں و زراعت کو تباہ کر دیتے۔

۱۸۴۹ء میں سکھ حکومت کا خاتمہ ہونے کے بعد انگریزی سامراج مسلط ہوا۔ انگریزوں نے بھی محسوس کیا کہ سرحدی مسلمانوں کو اگر آزاد چھوڑ دیا گیا تو ہمارا اقتدار ایک دن بھی قائم نہ رہ سکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ پٹھانوں کو پلاننگ کے تحت جملہ شعبہ ہائے زندگی میں پس ماندہ رکھا گیا۔ یہی حال تعلیمی شعبے کا تھا۔ ۱۸۸۴ء تک بقول مسٹر گراہم کمشنر پشاور ڈویژن باضابطہ عربی، فارسی اسکول کے اساتذہ ہماری امداد نہ تو پسند کرتے تھے اور نہ اس کے خواہش مند تھے۔ ہندوؤں کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔

(بحوالہ ہنٹر کمیشن سوالنامہ پنجاب ۱۸۸۴ء)

۱۹۱۱ء میں صوبہ سرحد میں خواندگی کا اوسط قابل ذکر تھا۔ پورے ضلع اٹک میں صرف ایک شخص گریجویٹ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب مزید چند مسلمانوں نے بی اے کیا تو یہ خوشخبری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی کے شاندار اجتماع میں سنائی گئی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خاں اور چند دیگر بزرگوں کا صوبہ سرحد پر زبردست احسان ہے، کیونکہ ان کی زبردست کوششوں کے نتیجے میں پشاور میں ایک ایسی معیاری درسگاہ قائم ہوگئی۔ جس کا فیض مسلسل جاری ہے۔

صوبہ سرحد کے مشہور انگریز گورنر سر ہارنٹ بٹلر نے کہا۔ "دہ درۂ خیبر کے سامنے ایشیا کا اس خوبصورت نظارہ پر کشش

ہوکر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے تصور اور قوت متخیلہ پر اس روشنی کا زبردست اثر پڑ رہا ہے جو اس اسکول اور کالج سے نہ صرف اس صوبے میں بلکہ ایشیا کے دور دراز گوشوں میں منعکس ہوکر پھیلے گی۔

(رپورٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی ۱۹۱۳ء)

انگریز کے زمانے میں کالج کی انتظامی مجلس میں چیف کمشنر، انسپکٹر جنرل پولیس، انسپکٹر جنرل ہسپتال، چیف انجینیئر اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بھی ممبر ہوتے تھے۔ تمام تر سرکاری مداخلت اور بندشوں کے باوجود اس کالج نے پٹھانوں کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت پر زبردست اثر ڈالا، اگر اس صوبہ کی تعلیم سے اسلامیہ کالج کے کردار کو خارج کر دیا جائے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ یہاں کے طلبا بکثرت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے اور انھوں نے قومی زندگی میں اپنے نقوش چھوڑے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء مسلمانان سرحد کے واسطے بڑا مسرت کا دن تھا۔ کیونکہ اسی روز قائد ملت لیاقت علی خان نے پشاور یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس وقت صوبہ سرحد تعلیم کے اعتبار سے پاکستان کے دیگر صوبہ جات سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ میٹرک تک تعلیم عام ہو چکی ہے۔ قبائلی علاقے خصوصیت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔

قبائلی علاقوں کی تعلیم

بہتر تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے واسطے حکومت نے قبائلی علاقوں کے طلبا کو وظائف دینے، نئے پرائمری، مڈل اسکول، ہائی اسکول اور کالج کھولنے نیز ہوسٹلوں کی تعمیر اور نچلے درجے کے اسکولوں کو اعلیٰ درجہ دینے کی اسکیمیں شامل ہیں۔ زبردست تعلیمی سرگرمیوں کی بنا پر اخراجات بہت بڑھ چکے ہیں۔

۷۲ - ۱۹۷۱ء اٹھارہ لاکھ بیس ہزار — ۷۳ - ۱۹۷۲ء چھبیس لاکھ ننانوے ہزار۔

۷۴ - ۱۹۷۳ء ایک کروڑ پندرہ لاکھ اکہتر ہزار۔

۷۵ - ۱۹۷۴ء دو کروڑ چھتیس لاکھ ستر ہزار۔

موجودہ مالی سال میں صرف وظائف کی مد میں تیس لاکھ پچیس ہزار روپے مخصوص کیے گئے ہیں۔

قبائلی علاقوں میں اس وقت ۶۲۸۰ پرائمری ۱۸ مڈل اور ۵۴ ہائی اسکول ہیں، اسی طرح کالجوں کی تعداد بھی ۷ ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم بالغان کی طرف بھی کما حقہ توجہ ہے۔

چیست انسانی

می‌توان قطب زمان شد، می‌توان شد غوث وقت	ہرچہ خواہی می‌توانی شد، بجز انسان شدن
چیست انسانی؟ تپیدن در غم ہمسائیگاں	از سموم نجد مرد باغ صدرن بریاں شدن
خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس	در شبستان تنگ دل از محنت زنداں شدن
زیستن در فکر قوم مردن اندر بند قوم	گر توانی می‌توانی سید احمد خاں شدن

ہم اور ہماری تعلیم

از جناب مولوی بشیر احمد صدیقی
سابق سکریٹری بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کراچی

مولوی محمدؐ اسماعیل میرٹھی مرحوم کو خدا بخشے ان کی اردو کتابوں کے نقوش جو بچپن میں پڑھی تھیں اب تک محفوظ ہیں۔ اپنے بچپن کی باتیں سب کو پیاری لگتی ہیں۔ مگر مولوی اسمٰعیل مرحوم کی کتابیں جو پانچ حصوں میں لکھی گئی تھیں۔ ایک عرصہ تک یو۔ پی کے اسکولوں میں چلتی رہیں اور ان کا مقابلہ کوئی اور کتاب نہ کر سکی۔

اس کے کسی حصہ میں (غالباً حصہ دوم میں) ایک مضمون تھا۔ "نئی دنیا کا پانا" جس میں مرحوم نے امریکہ کی دریافت کے سلسلہ میں کولمبس کی جاں فشانی اور اس کے تاثرات کی عکاسی کی تھی۔ میرے بچپن اور طالب علمی کا زمانہ وہ تھا جبکہ برٹش راج کا آفتاب اقتدار عروج پر تھا۔ امریکہ یا کسی اور ملک کو ہم لوگ برطانیہ کا باج گذار ہی سمجھتے رہے۔ اور کوئی توجہ نہ دیتے متمول طبقہ کے لوگ کبھی بیرون ملک جانے کی سوچتے تو انگلستان کی طرف رُخ کرتے مشہور تھا کہ فلاں صاحب "ولایت پلٹ" ہیں۔ ولایت سے ہمیشہ انگلستان بلکہ لندن سے مراد لیا جاتا تھا۔ خال خال ہی لوگ بیرسٹری کے لئے جاتے۔ معدودے چند آکسفورڈ اور کیمبرج پڑھنے کے لئے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ کچھ لوگ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے جاتے جیسے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم۔ غرضیکہ اس سے زیادہ کہیں اور جانے کا تصور کم ہی ہوتا۔

بہر نوع یہ افسوں ٹوٹا اور جنگ عظیم اول کے دوران چند ایسے مجاہد پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ملک کی آزادی کے لئے تن من۔ دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ اور جنگ عظیم دوم کے بعد ملک کی آزادی یقینی ہو گئی اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کی کوششوں سے قائدِ اعظم کی قیادت پر پاکستان بن گیا۔

جنگِ عظیم دوم کے دوران لوگوں نے امریکہ کا نام اس شد و مد سے سنا کہ نئی دنیا اب پرانی دنیا سے بغل گیر ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ امریکہ کے نئے باسیوں (انگریزوں۔ فرانسیسیوں۔ ڈچوں وغیرہ وغیرہ) نے وہاں کے مقامی باشندوں

کے ساتھ جو خون آشام کھیل کھیل کر انھیں ختم کیا تھا۔ امریکہ اس جنگ میں "آزادی ممالک" کا چیمپین (نابغۂ روزگار) بن کر ابھرا۔

پاکستان بننے کو تو بن گیا مگر ہندو اور انگریز خصوصاً لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے کسی بڑے ملک کی مدد کا طالب بھی تھا۔ امریکہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مختلف طریقوں سے اپنے اثر و رسوخ کو پاکستان میں خاصا مستحکم کر لیا اب لوگ برطانیہ کی بجائے امریکہ کا رخ کرنے لگے امریکہ نے مختلف معاہدوں کے ذریعہ لوگوں کو امریکہ بھیجنا شروع کیا اور وہ لوگ بھی جو مالی دقتوں کی وجہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے جانے لگے۔

میرے دل نے بھی انگڑائی لی اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے اس مضمون کی بازگشت نے رہ رہ کر خیال دلایا کہ .... کیوں نہ وہاں کے تعلیمی حالات کا جائزہ لیا جائے۔ اور اگر کوئی صورت اپنے ملک کی وہاں کی فکر و نظر سے استفادہ کرنے کے بعد ہو سکے تو کی جائے۔ میں اس وقت بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی کا سکریٹری تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء کے جون میں ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی وساطت سے مجھے یہ موقع مل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس سال حج بھی جون ہی میں تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے حج کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد امریکہ روانہ ہو گیا۔ ۲۵ جون ۱۹۵۷ء کی صبح کو میں نیویارک پہونچا اور اسی وقت واشنگٹن کے لئے ہوائی جہاز سے روانہ ہو گیا۔ وہاں میرا بیٹے سے چھوٹا لڑکا فرید اور بھیجے خواش جلال الدین احمد پہلے سے موجود تھے۔ انہیں کے ساتھ میرا قیام ہوا۔

میں چونکہ LEADER EXCHANGE پروگرام کے تحت گیا تھا۔ طعام و قیام کی ذمہ داری وہاں کے تعلیمی بیورو کی تھی اور ان لوگوں نے ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ مگر میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنے بچوں کے ساتھ ٹھہروں۔ کراچی سے روانہ ہونے کے بعد مجھے کھانے پینے کے معاملہ میں خاصی پریشانی ہو چکی تھی۔ میں ایک پرانی وضع کا انسان ہونے کی وجہ سے جائز ناجائز کا سختی سے قائل ہوں اور جہاز میں حلال حرام چیز کے کھانے پینے کا اہتمام کم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے راستہ بھر صرف چائے اور بسکٹ پر گزارہ کیا۔ اسی وجہ سے ہوٹل میں ٹھہرتے ہوئے محتاط رہنا پڑتا ہے۔

بورڈ میں میرے ذمہ اور کاموں کے علاوہ خاص کام امتحان کا اہتمام بھی تھا۔ اس سلسلہ میں عرصہ سے محسوس کرتا تھا کہ ہمارے ہاں کے امتحان لینے کا طریقہ فرسودہ ہے اور نصاب میں بھی تبدیلی کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ امریکہ پہونچ کر میں نے انہیں چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا اور مجھے اس کے اعتراف میں مسرت ہے کہ وہاں کے اصحاب نے بست و کشاد نے دل کھول کر میری معاونت کی۔

واشنگٹن سنیٹر میں کئی دن اس موضوع پر وہاں کے سکریٹری وغیرہ سے گفتگو رہی اور میں اپنے خیال میں اور پختہ ہو گیا۔ تعلیم اور تسلیم کا مسئلہ جس قدر اہم ہے غلامی کے دور میں مسلمہ اقدار کے خلاف اس سے اتنی ہی بے اعتنائی برتی گئی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے جب وار دھا اسکیم کا چرچا ہوا تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں کہ برادران وطن اب اپنی ثقافت کا جوا تعلیمی اصلاح کے نام سے مسلمانوں کے کندھوں پر بڑی چالاکی سے ڈال کر ان کو اصل مرکزی اسلامی ثقافت سے بیگانہ بنانے میں کوشاں ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک کمیٹی بنائی اور یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ڈھانچہ اس طور پر تیار کیا جائے کہ علم کے حصول کے ساتھ ساتھ مسلمان مسلمان باقی رہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کمیٹی خاطر خواہ کام نہ کر سکی۔ غالباً مسلم لیگ اور کانگریس کی آویزش کے آخری دور میں اس طرف زیادہ توجہ نہ دی جا سکی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہندو زعماء نے خصوصاً آچاریہ کرپلانی نے ایک سازش کے تحت ہندو تاجروں اور صنعت کاروں کو پاکستانی علاقوں سے اس لئے ہندوستان چلے جانے کا مشورہ دیا کہ پاکستان مالی دقتوں میں مبتلا ہو کر جلد یا بدیر اکھنڈ ہندوستان کی گود میں بسیرا لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ قائداعظم نے اس صورت حال کو بھانپ کر مسلم تجار اور صنعت کاروں کو پاکستان آنے کی دعوت دی جنھوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور ملک کی اقتصادی حالت سنبھل گئی لیکن دفاعی اہمیت اور خود سکریٹریٹ کا قیام نیز دوسری ضروریات کے پیش نظر فوری طور پر تعلیمی سرگرمیوں کی طرف توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ پاکستان خصوصاً کراچی میں مختلف شہروں اور صوبوں سے آمدہ مہاجروں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے بچوں کی تعلیم میں حرج واقع ہو رہا ہے، تو جہاں تک سندھ میں ہندوؤں کے وقت کے رائج الوقت نصاب کو فوری طور پر قبول کرنے کا کام شروع کر دیا۔ کراچی میں سوائے سندھ مدرسہ کے تمام تعلیمی ادارے یا تو ہندوؤں کے تھے یا عیسائیوں کے جہاں بڑی بڑی فیسوں کی ادائی کے بعد تعلیم کا حصول ناممکن تھا۔ مزید یہ کہ فیس کی ادائی کے طریقہ کو اس طور پر رکھا گیا تھا کہ غریب مسلمان اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے یعنی چھ چھ ماہ کی فیس یکمشت لی جاتی تھی۔ جب میں یہاں حاضر ہوا تو یہی صورت حال تھی۔ چنانچہ بحیثیت سکریٹری بورڈ میں نے ان تمام چیزوں کا جائزہ لیا اور فیس ماہ بماہ لینے کا طریقہ رائج کیا۔ میرے آنے سے قبل ایک ایک اسکول میں تین تین چار چار شفٹیں چلتی تھیں مگر یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء سے منقطع ہو کر صرف دو شفٹ کا طریقہ رہ گیا تھا جو جگہ کی قلت اور طلبا کی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے آج بھی رائج ہے۔ دوسری دقت یہ تھی کہ عموماً ہر صوبے میں دسویں جماعت تک ہائی اسکول تھے۔ کراچی میں گیارہویں جماعت کرنے کے بعد امتحان ہوتا تھا جو باہر کے صوبوں سے آئے ہوئے طلبہ کے لئے ایک سال کے نقصان کے مترادف تھا۔ میں نے کوشش کے بعد بورڈ

ہائی اسکول کر دیا جس سے پرائیویٹ طلبا اور باہر کے
صوبوں سے آنے والوں کے لئے بڑی سہولت ہو گئی۔
ہر نوع موقع موقع سے مختلف اصلاحات اور اقدامات
کئے گئے۔ با ایں ہمہ میں سلیبس اور کریکولم سے مطمئن نہ تھا۔

ہر مسئلہ اور اس کا حل اپنی اپنی جگہ مشکل ہوتا
ہے۔ با ایں ہمہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو تعلیم کے بعض
پہلو اتنے وسیع اور ہمہ گیر ہوتے ہیں کہ اہم سے اہم
مسئلے ہوتے ہوئے بھی ان سے فرار ممکن نہیں۔ میری
دانست میں تعلیم کا مسئلہ اس لئے سب سے زیادہ اہم
ہے۔ غالباً آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ
کی کامیابی ملکی دفاع کثرتِ آلاتِ حرب کے ذریعہ نہیں
ہوئی تھی بلکہ ہمت، جرأت اور حاضر دماغی کی بدولت
ہوئی جو بحیثیت مسلمان ہمیں ورثہ میں ملی تھیں اور جو
اسلامی تعلیمات اور ان کے لگاؤ سے ہمیں جان سے
زیادہ عزیز تھے۔ بلاشبہ آلاتِ حرب اپنی جگہ اہم
ہیں مگر سترہ دن کی جنگ میں کامیابی کا سہرا افواج کی
شجاعت، حاضر دماغی اور جذبۂ جہاد کے ساتھ ساتھ عوام
اور خواص کی بیدار مغزی، بلند ہمتی، اتحادِ فکر اور
حالات سے پوری طرح نبرد آزما ہونے کی اپنی قوت تھی۔
میں یہی عرض کروں گا کہ یہ باتیں اسی تعلیم کا نتیجہ ہیں
جو ہم کو بحیثیت مسلمان اسلامی روایات سے ورثہ میں
ملی تھیں جس کے فقدان نے ہم میں غدار و سازشی
پیدا کئے اور یہ ملک حالیہ جنگ کے نتیجہ میں ٹکڑے ٹکڑے
ہو گیا۔

تعلیم ہیں وہ تمام طریقے جن سے ملک و قوم کے
افراد کو باخبر کر کے ان کو بامقصد و کارآمد بنایا جا سکے
شامل ہیں۔ اسی کے پیش نظر اسکول، کالج اور
اور یونیورسٹی کھولی جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ
اس مقصد کے حصول میں موجودہ طریقۂ تعلیم کہاں
تک مفید ہے۔ اصحاب دانش ایک مدت سے اس
تعلیم کو ناقص بتاتے چلے آئے ہیں مگر مرض کی صحیح
تشخیص اول تو ہوتی نہیں اور اگر تھوڑی بہت ہوتی
بھی ہے تو اس کے علاج میں اتنے موانع پیش آجاتے
ہیں کہ تمام افکار معطل ہو کر رہ جاتے ہیں بعض اوقات
معالج مرض کے اظہار کی جرأت نہیں کرتے۔ ان کے سامنے
اربابِ بست و کشاد کی خوشنودی یا ناخوشی کا مسئلہ
سامنے آجاتا ہے۔ اور اس طرح نسخے کو چیستان بنا کر
سر سے بلا ٹال دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ ملک و قوم سے
بے اعتنائی کے مترادف ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی
جرأت کرنا بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا ہوگا۔

تعلیم کو صحیح طور پر کس طرح رائج کیا جائے اور
اس کی بنیاد کن اصولوں پر رکھی جائے جو ایک مکمل
نظامِ تعلیم کا حامل ہو اور اس کے حصول کو قابلِ عمل
بنایا جا سکے۔ یہاں تک کہ ہر فرد کو مفید اور کارآمد بنایا
جا سکے۔ اور پھر یہ افراد ملک اور قوم کے روشن مستقبل
کی ضمانت ہو جائیں۔ بس یہ حقیقی مسئلہ ہے جس کے حل
کی ہمیں ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے اہل الرائے
اور ماہرین تعلیم کی ضرورت ہے جنہوں نے اس خدمت
میں عمریں صرف کر دی ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونا الگ بات
ہے۔ اور ماہرِ تعلیم ہونا قطعی دوسری بات۔ ہمارے

ہاں دشواری یہ ہے کہ ان چیزوں میں فرق نہیں کیا جاتا۔ بہرحال عرض یہ کرنا ہے کہ یہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے مجھے امریکہ جانے کی خواہش ہوئی کہ وہاں کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے اور اس تجربہ کی روشنی میں اپنے ملک میں کچھ اقدام کیا جائے۔ اس سفر کے دوران میں نے انگلستان۔ جرمنی۔ فرانس۔ ہالینڈ کے تعلیمی اداروں کے اصحاب حل وعقد سے بھی تبادلۂ خیال کیا اور وہاں کے طرز تعلیم اور طریق امتحان کو بہ نظر غائر دیکھا۔ اگر تفصیل کے ساتھ اس کو لکھوں تو ایک کتاب بن جائے گی جس کی نہ تو اس وقت ہمت ہے اور نہ میرے پاس اس کے چھپوانے کے ذرائع ہیں۔ اس لئے مختصر مختصر طور پر اپنے تاثرات ہی لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

۔۔۔۔۔۔ ۲ ۔۔۔۔۔۔

پاکستان ایک نو زائیدہ ملک ہے جو مختلف النوع مسائل سے دوچار ہے اور ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش بھر نوع کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے بنیادی تصور کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کیا جائے تو اس کا پس منظر تاریخی نظر آتا ہے۔ اگر اس بنیادی تصور کو سامنے رکھا جائے۔ تو یقین ہے کہ تعلیم اپنے اصلی خطوط پر چل نکلے اور ملک کی سیاسی۔ فنی۔ اخلاقی۔ معاشرتی اور اقتصادی مشکلات کا حل بھی ممکن آئے اور پھر ہمیں زندہ رہنے کا حق بھی حاصل ہو جائے گا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دنیا کے ہوش مند لوگ ملکی مسائل کے حل سے قبل ایک مرکزی خیال رکھتے ہیں۔ خواہ وہ کسی مکتبۂ خیال یا معاشرہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ کیونکہ بغیر مرکزی خیال کے نہ کوئی نظام قائم رہ سکتا ہے اور نہ ملک و قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں اور نہ آزاد فضا میں سانس لینا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس مرکزی خیال کا تصور میں بلند آہنگی ہمہ گیری وسیع النظری۔ اپنے مذہبی اقدار سے وابستگی اور اس پر فخر کا جذبہ ہونا لازمی ہے ورنہ مستقبل کے روشن ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ مستقبل حال سے پیدا ہوتا ہے اور حال ماضی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے ماضی کو فراموش کر دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انگلستان کا روایتی اقدار پر قائم رہنا اس کی کمزوریوں کے باوجود اس کو مقام دیئے ہوئے ہے۔ نظام تعلیم کے تعین سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعلیم کا مصرف کیا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی کیا ضرورت ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ دولت وجاہ کی بنیاد پر مختلف طبقات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور برتری کا معیار دولت یا عہدہ بن گیا ہے۔ مالدار طبقے کے لئے ایسے ایسے SAINTS کے نام سے اسکول کھول دیئے گئے ہیں۔ جن کا پتہ غالباً بائیبل میں بھی نہ ملے۔ وہاں برائے نام انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا کر بڑی بڑی فیسیں وصول کی جاتی ہیں۔ سلام کی جگہ ٹاٹا کھلایا جاتا ہے اور والدین خوش ہیں کہ لڑکا ٹاٹا بولتا ہے اور گڈ مارننگ بولتا ہے۔ ان اسکولوں کے طلبہ اپنے ہی ملک میں اپنے غریب ہم وطنوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو برتر اور

مخصوص طبقے کے افراد سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح متوسط یا غریب گھرانوں کے طالب علم باوجود بہتر ذہانت اور صلاحیت کے یا تو احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یا اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے لگتے ہیں۔ اس صورت حال سے معاشرہ کا متاثر ہونا لازمی ہے جس کی خطرناکی سمجھنے کے لئے ذہن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔

موجودہ گورنمنٹ نے اسکولوں کو قومی ملکیت میں لینے کا اچھا اقدام کیا مگر افسوس کہ طبقاتی اسکولوں کا وجود پھر بھی باقی رہا۔ والدین اور طلبہ کا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ طلبا بغیر فیس پڑھیں۔ وہ فیس کی گرانی کے شاکی تھے کہ اسے اس سطح پر رکھا جائے کہ غریب آدمی بھی بہ آسانی دے سکے مثلاً وہ فیسیں جو گورنمنٹ اسکولوں میں لی جاتی ہیں۔ وہ دوسرے ادارے لیں۔ دوسری شکایت یہ تھی کہ اساتذہ کو تنخواہیں وقت پر نہیں ملتیں۔ اور دکھایا کچھ جاتا ہے اور دیا کچھ جاتا ہے۔ اس طرح چند مستثنیات کو چھوڑ کر خود ساختہ منیجر یا مالک پرنسپل جو بمشکل سائیکل پہ چل سکتے تھے گورنمنٹ سے گرانٹ ان ایڈ کے بہانہ خاصی رقم وصول کرتے تھے۔ اور طلبہ سے مختلف مدات میں روپیہ لے کر اعلیٰ درجہ کی کاروں اور مکانوں کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اس کا انسداد کیا جائے۔ بہرحال اب تعلیمی ادارے قومیا لئے گئے ہیں اور حکومت کے خزانے پر خاصا بار پڑا ہے۔ توقع ہے کہ اب یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی۔

طلبہ کے اخلاق اور معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ استاد اور طالب علم میں علی قدر مراتب شفقت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو۔ حالت یہ ہے کہ استاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف قلیل مشاہرہ پانے والے طبقہ سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ طلبہ پر پوری توجہ دینے کے بجائے اپنے وسائل آمدنی کو بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا مقام کھو بیٹھتا ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں اپنے فرائضِ منصبی میں کوتاہی کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ اساتذہ کو معاشرہ میں ایک خاص مقام دینا ہوگا۔ اور اسی لحاظ سے اس کا مشاہرہ بھی مقرر کرنا ہوگا۔ موجودہ گورنمنٹ نے اس سمت میں کچھ توجہ کی ہے مگر روپیہ کی قوت خرید اتنی کم ہو گئی ہے اور روز افزوں گرانی نے لوگوں کو بیچارگی کی اس حد تک پہونچا دیا ہے کہ تنخواہوں میں اضافہ کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

اب ذرا رائج الوقت تعلیم کے پس منظر پر نظر ڈالئے۔ انیسویں صدی سے پہلے مشرق اور مغرب دونوں جگہ قدیم طرز تعلیم مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ مغرب میں یونانی اور رومی نظریات کار فرما تھے اور دنیائے اسلام میں اسلامی تعلیمات قرآن و حدیث اور کوئی نہ کوئی فن۔ اس کا طریقہ تھا کہ معلم اور طلبہ کو تعلیم دینے اور حاصل کرنے میں ایک شغف ہوتا تھا۔ معلم کی تعظیم اور تکریم میں کوئی فروگذاشت

نہیں کی جاتی تھی۔ اس سے ذہنی و دماغی افکار کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ روحانی اقدار میں بھی ترقی ہو جاتی تھی۔ مشرق میں ایسے معلمین عموماً مدارس اور مکاتب میں تعلیم دیتے تھے۔ طلبہ اور ان کے سرپرست اور والدین ان کی عزت کرتے تھے۔ اور ان کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ براہ راست طلبہ سے فیس لینے کا دستور نہ تھا۔ انیسویں صدی میں جب انگریزوں کے منحوس قدم ہندوستان میں پہونچے تو انگریزی تعلیم نے جنم لیا جس کے ذریعہ لوگوں کو ان کی ملازمتوں کے حصول کا چسکا لگا اور آہستہ آہستہ پرانے اقدار ختم ہونے لگے۔ علم خواہ کوئی ہو اسلامی نظریہ کے مطابق اس کا حصول ناجائز نہیں بلکہ ضروری ہے البتہ اصل مقصد یعنی دنیا کے ساتھ ساتھ دین کے بقا کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ مگر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مقصد کچھ اور ہی تھا جس کو لارڈ میکالے نے وضاحت کے ساتھ لکھا تھا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی اس سے واقف ہے۔

انگریزی تعلیم پہلے مشنریوں کے ذریعہ پہونچی۔ مشنریوں کا جال خود سرکار انگلشیہ نے بچھایا تھا جس کی غرض و غایت عیسائیت کی تبلیغ اور سرکار کے وفادار پیدا کیا جانا تھی۔ اور ان کے دفاتر میں کام کرنے کے لئے کلرکوں کی کھیپ تیار کرنا تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت کے رعب و داب کی وجہ سے لوگ انگریزی سے رفتہ رفتہ محبت کرنے لگے اور خود اپنی زبان سے ایک طرح کا احساس کمتری محسوس کرنے لگے۔ جو شخص انگریزی میں گفتگو نہ کر سکتا بلکہ اردو کو بھی انگریزی لہجہ میں نہ بول سکتا وہ تعلیم یافتہ ہی نہ سمجھا جاتا لوگ اس طرح پرانے اقدار کو ختم کرنے میں خود معین ہو گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب انگریزوں نے اپنی ملکی مصالح کے پیش نظر ہندوستانیوں کو ذرا اچھے عہدے دینے کا آغاز کیا تو مقابلہ کا امتحان رکھا جو بجائے خود یہ بری بات نہ تھی مگر اس مقابلہ کے لئے عمر کی قید ایسی رکھی کہ ہر شخص جلد سے جلد گریجویٹ ہو کر اس کی تیاری کرنے لگا۔ اور مکتب کی تعلیم جہاں عموماً ناظرہ قرآن شریف، کریما، گلستان، بوستاں گلزار دبستان اور ضروری حساب کتاب اور خطاطی کے اسباق ہوتے تھے ختم ہونے لگی۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی اور اخلاقی تربیت کا دروازہ بالکل بند ہو گیا۔ مدارس اور مکاتب جو ان چیزوں کے منبع تھے۔ صرف ایسے لوگوں کے لئے رہ گئے جو یا تو بالکل کودن سمجھے جاتے تھے یا پھر طبقاتی حیثیت سے کم درجے کے لوگ۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ تعلیم کی رفتار رک گئی۔ مکاتب کی تعلیم کے ضمن میں ہر شخص تھوڑی بہت اردو و حساب پڑھ لیتا تھا اور کسی نہ کسی درجہ میں خواندہ ہو جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کی ترویج کے بعد مکاتب اور پرانے مدارس بیکار سمجھے جانے لگے اور انگریزی تعلیم ہر شخص کی دسترس سے باہر تھی۔

انگریزی بحیثیت زبان کے پڑھنا پڑھانا اور اس کے ذریعہ سے ایجادات نو اور سائنس کے انکشافا

کو حاصل کرنا ایک گونہ ضروری ہے۔ مگر اس کو ذریعۂ تعلیم بنانا طالب علم پر سخت ظلم ہے۔

اس وقت عالم یہ ہے کہ چند مخصوص اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ تمام نام نہاد انگریزی میڈیم اسکولوں میں انگریزی اور اردو ملی جلی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو نہ اردو آتی ہے نہ انگریزی کالجوں میں بھی کم و بیش یہی حال ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ بہت ہی ناپسندیدہ نتیجہ جو اس قسم کی تعلیم سے نکلا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کا تعلیم یافتہ عوام سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ صرف انتخابات کے موقع پر اپنے دام تدویر میں پھانسنے کے لئے ان کے پاس جاتا ہے اور بس۔ اس طرح وہ اپنے ہی ملک میں غیر ملکی بن جاتا ہے۔ اور مختلف طبقات کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ جب جاہ اور حب مال میں مبتلا ہو کر آہستہ آہستہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کو خیرباد کہنے لگے۔ آج ہم جس اخلاقی بے راہ روی اور شرافت نفس کا رونا ہر شعبۂ زندگی میں رو رہے ہیں وہ اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ یقیناً وسائل آمد و رفت کی سہولتوں نے دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ سیاسی حالات۔ ملکوں کے انقلابات۔ نظریۂ حیات کی تبدیلی اپنے اثرات چھوڑتی ہے۔ لیکن یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ آدمی اپنے گھر کے اثاثے کو صرف اس امید موہوم میں لٹا بیٹھے کہ دوسروں سے ایک نئی مل جائے گا۔ ضرورت ہے کہ مکاتب اور مدارس کو پھر سے زندہ کیا جائے اور ان کی اصلاح اس طرح کی جائے کہ ضروری دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری مذہبی اور اخلاقی بنیاد بھی قائم رہے۔ اور عملاً بھی ہماری زندگی اسلامی سانچہ میں ڈھل جائے۔ ثانوی۔ اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں اسی مناسبت سے ایک ربط پیدا کیا جائے تاکہ نہ تو اپنی قومی اور اسلامی روایات سے انحراف ہو اور نہ کسی قسم کی تعلیم کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہو۔

آخر اپنے اپنے زمانے میں انہیں مکاتب کے پڑھے لکھے لوگ تھے جنھوں نے دنیا میں اپنے اپنے تجربات سے ایسی ایسی ضیا پاشی کی کہ آج تک یورپ ان کا خوشہ چین ہے۔ بوعلی سینا جیسے امام الطب، البیرونی جیسے امام الہیئت کہاں سے پیدا ہوئے، امام ابو حنیفہ اور امام غزالی جیسے فقیہ میسر آئے۔ اسی نظام تعلیم کا فیض تھا کہ کہیں آپ مسلمانوں کو منجنیق ایجاد کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ کہیں جر ثقیل سے کام لیتے ہوئے کہیں، اصطرلاب اور دوربین سے مستفید ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہیں گھڑیاں بنا کر یورپ کو حیرت میں ڈالتے ہیں، کہیں پانی کی لہروں سے کام لے کر دریائے سندھ پر پل باندھتے ہیں، کہیں بحری جہاز یا کشتیاں چلا کر فنون حرب میں اضافہ کرتے ہیں۔ کہیں تاج محل آگرہ تعمیر کر کے اور شالامار بنا کر فنون تعمیرات میں دنیا کی رہبری کرتے ہیں۔ کہیں محمود بن کر پچکاریوں سے آتش سیال کی بارش کر کے جے پال کے ہاتھیوں

کے پردے کو منتشر کر دیتے ہیں۔ مسلمان کا مذہب بھی قائم
رہتا ہے اور تمام علوم و فنون کی منزلیں طے کرتے
جاتے ہیں مگر کہیں کسی گوشہ سے بھی یہ آواز نہیں اٹھتی
کہ مذہب دنیاوی ایجادات اور علوم و فنون کی
ترقی میں حارج ہے۔ یہ عالم یا شیخ وقت کسی نہ کسی
پیشے کا ماہر نظر آتا ہے۔ کوئی تجارت کرتا ہے۔ کوئی
نقشبند بن جاتا ہے۔ کوئی نقش دوزی کے کمالات
کا مظہر ہے۔ کوئی روئی صاف کرنے میں کمال دکھاتا ہے
کوئی دنوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ برتنوں پر قلعی
کرنے کا ماہر ہے۔ کوئی خطاط ہے کوئی خیاط، کوئی
عطار، غرضیکہ کوئی حقیقی عالم ایسا نہ ملے گا جو علم کو
ذریعۂ معاش بنانے کا حامی ہو خواہ وہ فارابی
ہوں، سعدی و رومی جیسے ادیب اور فلسفی ہوں سب
کے نزدیک سماجی تعلیم وہی ہے جس کے ساتھ پیشہ ورانہ
تعلیم بھی ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں
جو ذات پات کی تفریق ہے اس سے مسلمانوں نے بھی
متاثر ہو کر پیشوں کو ذاتوں میں محبوس کر دیا اور صرف
زمینداری یا ملازمت کو شرافت کا معیار قرار دیا جس
کے نتیجہ میں آج بے روزگاری کا مسئلہ خصوصاً تعلیم یافتہ
طبقہ میں ایک جان لیوا مسئلہ بنا ہوا ہے۔

امریکہ میں میں نے اسی چیز کو بہ نظر غائر دیکھ کر
محسوس کیا کہ جن باتوں کو مسلمانوں نے قدیم چیزیں سمجھ کر
ترک کر دیا ہے۔ وہاں اس کی افادیت کو خاص اہمیت
دی جاتی ہے۔ یہی حال جدید چین کا ہے۔ احترام محنت
DIGNITY OF LABOUR وہاں کی زندگی کا
اہم جزو خیال کیا جاتا ہے۔ اور ہر اسکول میں کسی نہ کسی
پیشے میں مہارت حاصل کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
نے اس خصوص میں کافی کام کیا ہے اور اب کہ اس کی سلور
جوبلی کا جشن منایا جانے والا ہے جس میں آئندہ کے
تعلیمی منصوبوں پر غور کیا جائے گا۔ توقع ہے کہ وہ میری
مخلصانہ گذارشات کو بھی لائق اعتنا سمجھے گی۔

علی گڑھ مسلمانوں کا ملجا و ماوا

سرسید کے بعد مسلمانوں کی قیادت ان کے جانشینوں
کے ہاتھ میں آئی اور نواب وقار الملک کی سکریٹری شپ کے دور تک
اسلامی ہند میں علی گڑھ کی مرکزیت مسلم رہی۔ سرسید کی رہنمائی میں
مسلمان عام طور پر ہندوستان کی سیاسی جدوجہد سے بے تعلق رہے
اور ان کا واحد اجتماعی پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
رہا جسے سرسید نے اپنے اصلاحی منصوبے کے تعلیمی پہلوؤں کو عملی جامہ
پہنانے کے لیے قائم کیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں
آیا۔ لیگ کیوں اور کس طرح وجود میں آئی اس پر گفتگو کرنے کے
کا یہ محل نہیں ہے البتہ اتنا کہنے میں تامل نہیں ہے کہ ملک میں
سیاسی بیداری کا عام رنگ دیکھ کر یہ جماعت قائم ہوئی گو عام
مسلمانوں کی تائید اسے بہت دنوں تک حاصل نہ ہو سکی ۱۹۱۱ء تک
علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کا ملجا و ماوی بنا رہا۔ اس کے بعد
بین الاقوامی سیاسیات، عالم اسلامی کے تہلکے اور ہندوستان نیز علیگڑھ
کی ایسی صورتیں پیدا کر دیں کہ قیادت کا مرکز علی گڑھ سے منتقل ہو گیا
پھر بھی علی گڑھ کا اثر و اقتدار کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کے معاملات
میں کار فرما رہا۔ علی گڑھ کے نامور فرزندوں نے قومی زندگی کے مختلف
شعبوں میں جو امتیاز حاصل کیا وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

از:- جناب ناصر الدین ناصر لاہور

جنّتِ گم شُدہ

انسان کا اعلیٰ ترین تصور جب تک اس کے سامنے مجازی لباس میں نہ آئے، اس کی گمشدہ جنت کہلاتا ہے اور جب تک یہ جنت اس کے ہاتھ نہ آئے وہ مسلسل اُس کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔

علمی و ادبی رسائل کا ایک اعلیٰ تصور میرے ذہن میں بھی مدتوں گھومتا رہا اور باوجود مسلسل جستجو کے وہ مجسّم شکل میں میرے سامنے نہیں آیا۔

قیام پاکستان کے تین چار سال بعد، دورانِ سفر ایک روز میرا گزر پشاور کے قصّہ خوانی بازار میں ہوا اور میں نے دیکھا کہ شہدائے آزادی کی یادگار کے قریب ایک دکان کے برآمدے میں پرانی کتابوں کا ڈھیر لگا ہے اور اس ڈھیر میں سہ ماہی رسالہ "مصنف" علی گڑھ کے بھی کچھ شمارے ہیں۔ ان رسالوں کے مضامین کی فہرست اور مصنفین کے ناموں پر جہاں جہاں نظر پڑی اٹک کر رہ گئی۔ میں نے خوشی خوشی وہ پرچے خریدے اور ہوٹل واپس آگیا اور دن بھر بے قرارانہ ورق گردانی کرتا رہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پا لیا ہے۔

"مصنف" کے سرورق پر مدیر اور ناشر کی حیثیت سے سید الطاف علی بریلوی کا نام چھپا ہوا تھا ہر شمارے میں اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء کی نگارشات کے ساتھ ساتھ سید الطاف علی صاحب کی رواں دواں فکر انگیز تحریریں بھی تھیں۔ گویا انکی ذات سے غائبانہ عقیدت اور محبت کے تمام سامان موجود تھے تاہم مجھے اپنی کوتاہی جنوں کا اعتراف ہے کہ میں نے "لیلیٰ خیال" کی جستجو میں ذرا سی بھی دشت نوردی کی زحمت نہیں اٹھائی۔ البتہ اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ چند برس بعد لاہور کے ایک بک اسٹال پر نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سہ ماہی "العلم" کراچی پر ایڈیٹر کا نام سید الطاف علی بریلوی لکھا ہے۔ بس پھر کیا تھا وہ دن اور یہ دن شاید ہی "العلم" کا کوئی شمارہ ہو جس کا بے تابی سے انتظار نہ رہا ہو اور دوران مطالعہ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا آیا ہو کہ تب شوق طلب میں اضافہ نہ ہوا ہو۔ آخر "العلم" میں ایسی کون سی بات تھی جس نے اس قدر مجھے اپنی جانب مائل کر لیا تھا اور میں اس درجہ اس کے حسنِ سادہ سے مسحور ہو گیا تھا کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن مختصر یہ ہے کہ:-

۱- العلم کے ایڈیٹر نے ادب اور زبان سے اپنے خلوص کو کچھ اس والہانہ انداز سے رسالے میں شامل کر دیا۔ تاکہ قاری اس کے اثر کو محسوس کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

۲- رسالے کے اکثر مقالات اپنی اپنی جگہ ایک مستقل اور مبسوط کتابچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳- اس کے بلند پایہ مضامین ادب، فلسفہ، تصوف، تاریخ تہذیب، تعلیم اور دیگر تحقیقی عنوانات کی رنگارنگی کے باوجود بعض اوقات ایک ہی شمارے میں یکجا ملتے ہیں اور یہ چیز اگر ناممکن

نہیں تو بعید دشوار ضرور ہے۔

۴۔ یہ رسالہ علمائے عصر کی بے بدل تحقیقی کاوشوں کے ساتھ ساتھ بعض مبتدیوں کو بھی اسی فراخ دلی سے جگہ دیتا ہے جس سے محرابِ عبادت میں اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تخصیص نہ ہو اور عبادت گاہ کی عظمت میں بھی فرق نہ آئے۔

۵۔ العلم کے لکھنے والوں کو اس بات کی کھلی آزادی ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر جس طرح چاہیں بیان کریں، نہ خیال پر قدغن نہ زبان پر بندش، گویا ایسی آزادی جو آزادیٔ فکر کی عملاً داعی ہو۔

۶۔ العلم کا ظاہر و باطن ایک ہے اور وہ یہ کہ علم کی سچی اشاعت اور بہتر توسیع۔ "العلم" گویا مختصر نعرے کے اسم بامسمیٰ ہے۔

۷۔ تصنع اور تکلف سے العلم کا دامن یکسر پاک ہے اور اس کی گروہ بندی کی عصبیت کا ادھر کوئی گزر نہیں۔ یہ فیض احمد فیض کی شاعرانہ عظمت کا بھی قائل ہے اور ماہر القادری کی مہارتِ فن کا بھی دل سے معترف۔

۸۔ العلم نے مختلف الخیال ادبی نظریات اور عقائد کو اپنے غیر جانبدارانہ نقد کی کسوٹی پر کچھ اس طرح پرکھا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

۹۔ بعض ناقدین کی نظر میں "العلم" نے ایک خاص انداز طبع وضع کر لیا ہے اور گویا یہ اس کی طبعی کمزوری ہے کہ وہ حتی الامکان کسی کو ہدفِ تنقید بنانے سے گریز کرتا ہے۔ معترضین کے خیال میں گویا قصیدہ خوانی کا عنصر غالب ہے۔

واقعہ یہ نہیں ہے، حضرت مُلا واحدی کی مثال بے محل نہ ہوگی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ انتہائی بے غرض انسان ہیں، ان کا مقصد محض انسانی دل شکنی سے گریز اور ابنِ آدم کی ہمت افزائی ہے۔ اس کی فطرتِ عالیہ کا عکس جمیل العلم کو بھی کہا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ العلم کی ایک اور کمزوری بعض احباب کو کھٹکتی ہے کہ اس نے کلاسیکی موسیقی کی اشاعت میں باوجود کلاسیکی زبان کی پابندی نہیں کی۔ اعتراض کی آزادی ہر شخص کو حاصل ہے اگر کلاسیکیت ہی کی نشر و اشاعت مقصود ہوتی تو العلم پر یہ گرفت ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں مقصد علم اور زبان کی وسیع تر اشاعت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس سے بہتر لائحہ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اردو زبان و ادب کے عظیم سرپرست پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے بحیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی پنجاب، استادوں کے نام ایک سرکلر جاری کیا تھا جس میں یہ لکھا تھا کہ آپ جس لہجے میں جس محاورے میں چاہیں بلاتکلف اردو بولیں اور لکھیں۔ ہم اسے خوش آمدید کہیں گے اور جب ثقہ قسم کے ادبی بزرگوں نے اس کھلی چھٹی پر اعتراض کیا تو مرحوم نے فرمایا کہ جو ابتدائی درجے میں داخل ہوں گے۔ وہی اگلے مدارج بھی طے کر سکیں گے۔ جو پانی میں اتریں گے ہی نہیں وہ تیرنا کیا سیکھیں گے۔

العلم کی یہ وسعتِ نظر ہی تھی جس نے علامہ سید سلیمان ندوی کے پہلو میں طالب العلم ابو البیث صدیقی کو جگہ دیکر علامۂ عصر بنا دیا، اور کلاسیکی ادب کی حدود سے تجاوز کر کے ادب کے افق کو وسیع تر کر دیا۔

کمزوری ایک تقاضائے بشریت ہے اس سے مفر نہیں کچھ کمزوریاں اور بھی تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن فیصلہ تو اس امر پر ہوتا ہے کہ اتنی بہت سی خوبیوں کا پایا جانا کیا نیک نامی اور اچھی شہرت کی دلیل کیلئے کم ہے؟

سید الطاف علی بریلوی کی ذات کو "العلم" سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ گویا ایک عظمت کے دو نام ہیں۔ "العلم"

الطاف علی کی ذات کا پرتو جمیل ہے۔ مقصد سے والہانہ لگن، انتھک محنت، بے غرض سیادت، نیت کا خلوص اور دیوانگیٔ عشق اگر سید الطاف علی کی فطرت میں داخل ہوں تو "العلم" کے محاسن بھی اس سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ ان تمام اوصاف میں تو ایک جزو ہی کسی کو مل جائے تو بڑی بات ہے۔ چہ جائیکہ اور بہت سی خوبیاں بھی ہوں۔

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ اس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا لے

زبان پر ان کا نام آنے سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بات بہت نہ بڑھ جائے۔ اور "العلم" کی اپنی وجودیت میں کمی نہ آ جائے اس لیے بات کو مختصر ہی کرنا پڑتا ہے تاہم ایک واقعہ قارئین کیلئے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

گردشِ مدام سے تو باوجود دارو درماں کے مرزا غالب بھی گھبرا گئے تھے۔ سید الطاف علی بریلوی پر بھی یہ مرحلے بارہا آئے ہوں گے، تقریباً دو برس پہلے کی بات ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس کے دوران جس کی صدارت ممتاز الملک ممتاز حسن مرحوم فرما رہے تھے۔ سید الطاف علی بریلوی نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ ناگفتہ بہ مالی حالات کے پیشِ نظر انہیں ان کے عہدے سے سبکدوش کیا جائے اور "العلم" سہ ماہی کو بند کر دیا جائے۔ راقم خود اس اجلاس میں شریک تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ممتاز حسن صاحب کے جذبات کا اس وقت کیا عالم تھا اور خود میرے اپنے دل کی کیفیت کیا تھی۔ اس تحریک کی مخالفت کی گئی لہٰذا سید صاحب کو یہ بارِ گراں (میں کہوں گا بارِ گراں قدر) اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔ اور سید صاحب کو زیادہ اپنے عشق کے سامنے اور کچھ حاضرینِ مجلس کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا اور آج انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ یہ اسی کڑے امتحان میں کامیابی کا نتیجہ ہے کہ "العلم" اپنا سلور جوبلی نمبر نکال رہا ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے اور اپنے فیضِ علم سے ہماری سرزمینِ پاک کو "العلم" قیامت تک سرفراز رکھے آمین۔

"العلم" کی درازیٔ عمر کی دعا کی حدیں تو قیامت تک ملائی جا سکتی ہیں لیکن جناب الطاف علی بریلوی کی عمر کے لیے یہ تمنا تو حیات مناسب ہوگی ہم کم از کم اپنی زندگی میں اس کی طلائی جوبلی منا سکیں۔ "العلم" کو جنھوں نے پڑھا اور سید الطاف علی بریلوی کو جنھوں نے سنا ہے وہی جانتے ہیں کہ مرزا غالب کی ایک غزل کا یہ مصرع اپنے اندر کیسا سرور رکھتا ہے۔ ع

یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

ع لوگ ہر شمع کو فانوس پہنا دیتے ہیں

یہ لہو جس میں تب و تاب نفس سے تیرے — دیکھ ایوانِ حکومت میں چراغاں نہ بنے
لوگ ہر شمع کو فانوس پہنا دیتے ہیں — شعلہ اپنا بھی چراغِ تہِ داماں نہ بنے
رگِ ہر سنگ میں جو لعل و گہر بنتا تھا — وہ شرارہ بھی کہیں شمعِ شبستاں نہ بنے
موج جو کہتی تھی ہر گام پہ طوفانِ تخلیق
کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

آل احمد سرور

جامعہ ملیہ، علی گڑھ کا ایک شجرِ بارآور

از جناب محمد عبداللہ شکیب ایم اے

علی گڑھ سے قوم نے جو کچھ حاصل کیا وہ اس کا اپنی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنا تھا۔ سر سید کو اس ادارے سے بہت کچھ توقعات تھیں جس کی حیات میں پورے طور پر مکمل نہ ہو سکیں سر سید کے نزدیک مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمت کا حصول بھی مقدم رہا ہے اور علی گڑھ کالج کے قیام کا ایک بڑا مقصد بھی یہی تھا۔ یہ بات درست ہے کہ سر سید مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوششیں اور انہیں اپنی ہمہ گیر تحریک کی وجہ سے کامیابی بھی ہوئی۔ حالی شبلی۔ سمیع اللہ خاں۔ وقار الملک اور محسن الملک نے اس تحریک کو آگے بڑھایا علیگڑھ کالج بھی مقاصد کو لے کر آگے بڑھایا تھا حالات نے ایک مرحلے پر اس کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا اور یہ صورت نواب محسن الملک کی وفات کے بعد پیش آئی، کالج میں کچھ حالات اس طرح ابھرے کہ اس کے متعلقین دو گروہوں کی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔

اس کے اسباب چاہے اور کچھ ہوں علی گڑھ کے قیام کے بعد اس کے اہم ترین مقاصد کے سرکاری ملازمت تک محدود رہنے اور مخصوص نصابات کی وجہ سے کئی ایسی روحانی، ذہنی اور مادی خرابیاں پیدا ہو گئیں اور کالج اپنے اہم مقاصد پورے کرنے سے اس حد تک قاصر رہا کہ خود علی گڑھ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ یہ کالج میں قوم کے تمام امراض کا علاج نہیں اور قومی اصلاح اور ترقی کے لئے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد اور دستور العمل علی گڑھ کالج سے مختلف ہو چنانچہ خود علی گڑھ کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک نے ۱۹۱۲ء میں ان مسلمانوں کے لئے جو سرکاری ملازمتیں نہیں چاہتے تھے ایک جداگانہ جامعہ قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا[۵]۔ اس ضمن میں وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم حکومت کے اثرات سے یکسر آزاد ہو، حکومت سے آزادی کا تصور اس وقت مسلمانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر چکا تھا اس صورت میں نواب وقار الملک کی طرح مسلمانوں کی ایک جماعت اس طور پر یقین رکھتی تھی کہ جو تعلیم حکومت کے زیر اثر ہوگی مسلمانوں کے لئے کسی لحاظ سے بھی مفید نہ ہوگی اور جب ۱۹۲۰ء میں تحریک موالات شروع کی گئی اور سرکاری ملازمتوں، اداروں اور امداد و اعانت کا مقاطعہ کیا گیا۔ جن تعلیم اداروں کو حکومت سے امداد ملتی تھی یا جو خالصاً سرکاری تھے ان سے بھی [illegible] طور پر اس عمل میں مسلمان پیش پیش تھے[۱] تعلق توڑ لیا گیا۔ چونکہ علی گڑھ کالج بھی سرکاری اثرات کے ماتحت تھے، اس لئے آزاد خیال افراد نے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی کوششوں کے ذریعے ایک جداگانہ درسگاہ جامعہ ملیہ کے نام سے علی گڑھ میں قائم کر دی

شیخ محمد اکرام موجِ کوثر ص ۱۵۸

؎ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ [illegible]
تفصیلات کے لئے ڈبلیو سی اسمتھ MODERN ISLAM P. A
آئندہ حوالہ [illegible] سے دیا جائے MAULANA MOHD.

یعنی تعلیم تجاویز کا تجربہ اس میں شروع کیا[۱] تحریک ترک موالات کے تحت علی برادران نے طلبا میں علی گڑھ سے علیحدگی کی ایک پرجوش تحریک چلائی جس کے نتیجے میں تقریباً ۶۰۰ چھ سو طلبا مسلم یونیورسٹی سے نکل کر جامعہ ملیہ میں داخل ہوئے[۲] یہ یقینی امر ہے کہ جامعہ ملیہ کے قیام سے علی گڑھ کالج کے دو ٹکڑے ہوگئے[۳] اور اس سے مسلمانوں میں جن چپقلش ضرور پیدا ہوئی لیکن پھر بھی جامعہ ملیہ کو ایک حد تک سرسید کی تعبیر سمجھا جا سکتا ہے اور یہ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کا تخلیق کردہ کامیاب ترین تعلیمی ادارہ تھا[۴]

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن باضابطہ طور پر جامعہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان کیا گیا شیخ الہند مولانا محمود الحسن اپنی علالت اور ضعیفی کے باوجود علی گڑھ تشریف لائے[۵] انھوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں جو مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں منعقد ہوا تھا جامعہ ملیہ کی افتتاحی رسم ادا فرمائی۔ ان کی علالت کی وجہ سے ان کا خطبہ تاسیس مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا[۶] ان کے خطبہ تاسیس سے جامعہ ملیہ کے قیام کا مقصد واضح ہوتا ہے

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد ہو، کیا بہ اعتبار عقائد و خیالات اور کیا بہ اعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم (الشان) قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد و قرطبہ یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم ان کو اپنا استاد بناتے[۷]

اس کی تاسیس کے وقت جو مزید تقاریر ہوئیں ان میں اس کے قیام کے جن مقاصد کا اظہار کیا گیا وہ یہ تھے

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین "تعلیمی خطبات" ۲۱۱ اور اللہ بخش یوسفی " " ۹۶ سید طفیل احمد منگلوری "مسلمانوں کا روشن مستقبل"

اللہ بخش یوسفی ص ۹۷

شیخ محمد اکرم "موج کوثر" ص ۵۹

۴۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ص ڈبلیو۔ سی اسمتھ" ص ۱۵۱۔

۵۔ قاضی عبدالغفار "حیات اجمل" ص ۲۲۵

عبدالغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ص ۲۶

۶۔ بحوالہ عبدالغفار مدہولی، جامعہ کی کہانی ص ۲۷

۱۔ یہ درس گاہ حکومت کے اثر سے آزاد قومی اور ملی مصالح کی پابند ہو

۲۔ اس کے نصاب میں دینی اور دنیاوی قدیم اور جدید عناصر کا صحیح امتزاج ہو

۳۔ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک میں حصہ لے[1]

مرکزی خلافت کمیٹی نے اس ادارے کے لئے دس ہزار روپے ماہانہ کی امداد منظور کی اور پھر مختلف اہل ثروت والیانِ ریاست جیسے فرمانروائے دکن، نواب بھوپال، نواب رامپور، ریاست کشمیر اور بلدیہ دہلی۔ حکیم اجمل خان امیر جامعہ اور مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے شروع میں خیموں میں درس و تدریس کا کام شروع ہوا لیکن درحقیقت ان افراد کا جذبہ ان تمام تکلیفوں اور مادی اذیتوں کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تھا بلکہ وہ تو ایک ملی نشے سے چور تھے۔

اس وقت مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کے لیے جو کوششیں کی جا رہی تھیں ان میں جامعہ ملیہ کے قیام کو بڑی اہمیت ہے جن لوگوں نے اسے قائم کیا تھا مسلمانوں کے لیے ان کی مجموعی خدمات مختلف پہلوؤں سے ناقابل فراموش ہیں۔ اس کے بانیوں کی امتیازی خصوصیات ان کا ایثار و قربانی ہے اس میں وہاں کے اساتذہ کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے ان کا ایثار ہی تھا کہ اس ادارے نے نمایاں ترقی حاصل کی بیشتر اساتذہ[1] وہ ہیں جنھوں نے تعلیمی میدان میں نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی امتیاز حاصل کیا تھا اور انھوں نے نہایت معمولی مشاہروں پر اپنے آپ کو اس ادارے کے لیے وقف کر دیا جبکہ وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اعلیٰ مناصب حاصل کر سکتے تھے۔ ایک انفرادیت اس ادارے کی سادگی ہے جو ابتدا سے انتہائی عروج تک اس کو حاصل رہی اس کا قیام چند خیموں میں ہوا جن میں نواب اسمٰعیل خان نے میرٹھ سے بھیجا تھا ان کے علاوہ ایک دو مزید کوٹھیاں بھی کرائے پر لی گئی تھیں اس سے متعلقہ تمام افراد ان ہی خیموں اور کوٹھیوں میں رہتے تھے اور درس کھلے میدان میں دیئے جاتے تھے[1] اس کی ایک اہم خصوصیت جو علی گڑھ کالج کے قیام کے اہم مقصد کی سی نوعیت رکھتی ہے۔ طلباء کو ملازمت کے حصول میں مدد دینا ہے۔ چنانچہ اس میں صنعت و حرفت کی تعلیم کو اہمیت دی گئی مگر کہ جامعہ نے صرف سرکاری ملازمت کے حصول کو اپنے طلباء کا نصب العین نہیں بنایا تھا لیکن اس نے طلباء کے اقتصادی مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے ایک لائحہ عمل ضرور مرتب کیا چنانچہ نصاب میں صنعت و حرفت اور دستکاری کو طلباء کے لئے حصول معاش کا ذریعہ قرار دیا اور مختلف پیشوں کی تدریس اور ترتیب کا بھی اہتمام کیا

جامعہ کے قیام کے بعد اس کی مجلس تاسیس نے نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر کیا تھا مولانا محمد علی جوہر نے کمیٹی کے ارکان کی سفارشات سے ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک کے لیے نصاب تجویز کیا ان تمام مضامین میں قرآن کی تعلیم کا بھی انتظام ہو چونکہ اس کے قیام کے بعد دوسرے تعلیمی اداروں سے آنے والے طلبا بھی تعلیم پا رہے تھے اور ان کے سلسلہ وار امتحانات کا معاملہ درپیش تھا اس لئے ابتداً نصاب میں سرکاری مدرسوں کے عام نصاب کے مقابلے میں کچھ اہم تبدیلیاں نہ کی گئیں۔ مولانا محمد علی کی یہ خواہش تھی کہ ہر جماعت کے طلباء کے لیے دینیات کی تعلیم لازمی ہو اس سے مسلمان طلباء کے لیئے اسلامیات کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی تعلیم

[1] مزید تفصیلات کے لیے عبدالغفار مدہولی۔ جامعہ کی کہانی ص ۱۸

لازمی قرار دیا[۱]۔ ان کے خیال میں ایک طالب علم کے لیے ضروری تھا کہ قرآن پاک نہ صرف ناظرہ پڑھے بلکہ اس کے معنوں کو بھی اخذ کر سکے اس لئے کہ وہ ضروری سمجھتے تھے کہ ابتدائی مرحلہ پر ہی طلبا کو قرآن مجید کا ترجمہ اردو یا کسی اور دیسی زبان میں سکھایا جائے اور جو کچھ آیات نماز میں پڑھی جاتی ہیں ابتدائی عمر کا طالب علم نماز پڑھتے ہوئے ان کو سمجھ سکے دوسرے مرحلہ پر وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر طالب علم لازمی طور پر عربی زبان سیکھ لے تاکہ وہ مکمل قرآن شریف اور منتخب احادیث کو سمجھ سکے اس کے ساتھ ہی ساتھ عبادت، اخلاق و سیرت پر مبنی فقہ کی تعلیم بھی ان کے لیے ضروری سمجھی گئی تعلیم کے لئے اعلیٰ مدارج پر عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی اہم سمجھا گیا جیسے ثانوی مرحلہ پر طلبا کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کوئی بھی مغربی زبان اپنی دلچسپی کی بنا پر سیکھ سکتے ہیں[۲]۔

اور اردو کے ایسے قاعدے مرتب کئے گئے جو طلبا کو اردو سکھانے کے ساتھ ساتھ مفید معلومات بھی دے سکے۔ یہ نصاب ماہرین تعلیم اور عام افراد کی رائے حاصل کرنے کے لئے اخبارات میں شائع کروایا گیا مختلف آرا کی روشنی میں مناسب تبدیلی کے ساتھ مجلس تعلیمی نے ایک مفصل نصاب تعلیم ہر جماعت کے لئے منظور کیا[۳]

اس کے مطابق

(۱) مسلمان طلبا کے لئے دینیات اور ہندو طلبا کے لئے اخلاقیات کی تعلیم لازمی تھی۔

(۲) جو طلبا اردو زبان اول کے طور پر نہ پڑھنا چاہیں ان کے لئے کسی دوسری دیسی زبان کا متبادل نصاب رکھا گیا۔

(۳) ہندی کے طلبا کے لئے آسان اردو سیکھنا ضروری تھا

(۴) چوتھی جماعت سے عربی زبان اور انگریزی کی تعلیم لازمی تھی، ہندو طلبا کے لئے عربی کے بجائے سنسکرت کی اجازت تھی۔

(۵) پانچویں جماعت سے کسی ایک فن کا سیکھنا لازمی تھا

(۶) خوشخطی کو نصاب کا ایک لازمی جز قرار دیا گیا تھا[۴]

کل نصاب تعلیم چودہ سالہ درجات پر مشتمل تھی۔ ابتدا میں ایک درجہ "مکتب" کا تھا پھر تحتانیہ (پرائمری) میں چھ سال اور پھر ثانوی کے چھ سال اسی میں موجود گیارہویں جماعت کے بعد بی۔ اے کی تعلیم کے لئے ۳ سال رکھے گئے تھے بی اے کے علاوہ بی۔ اے امتیازی (آنرز) کی تعلیم بھی ہوتی تھی صحافت

---

[۱] اللہ بخش یوسفی ص ۱۱۱

[۲] مزید تفصیلات کے لئے "اللہ بخش یوسفی" ص ۱۱۲ تا ۱۱۶

[۳] تفصیلات کے لئے عبدالغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ص ۴۳، ۶۴

[۴] عبدالغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ص ۶۳، ۶۴

اور تجارت کے ڈپلوما نصاب کا بھی انتظام تھا[۱]
بعد میں اس میں ٹیچرز ٹریننگ انسٹیٹیوٹ اور ماڈل اسکول
کا اضافہ ہوا ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ مدارج میں صنعت و
حرفت کو اہمیت دی گئی قفل سازی، الیکٹرو پلیٹنگ،
پالش، پارچہ بافی، جلد سازی، طباعت، تصاویر
بلاک سازی، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کی تربیت
کے انتظامات ہوئے۔

طلبا کے لیے ضروری سمجھا گیا تھا کہ وہ کھدر کا لباس
استعمال کریں، تقریبات کے موقع پر شیخ الجامعہ اپنے
استادوں اور دیگر اراکین سے ملنے کے وقت نیز شہر یا
شہر سے باہر جانے کے وقت کھدر کا سادہ سبز چوغہ جس
کی آستینوں پر زرد کنارہ ہوتا استعمال کرتے[۲] فیس
میں تحتانیہ (پرائمری) کے طلبا سے ۱۵ روپے اور ثانوی
کے طلباء سے ۱۶ روپے ۱۲ آنے لئے جاتے تھے جس
میں تعلیم، طعام و قیام، اخراجات دار الاقامہ، طبّی
امداد اور انجمن اتحاد کی فیس شامل تھی غریب
طلباء کے لیے ماہواری وظائف اور ذہین اور کام
کرنے والے طلبا کے لیے مختلف وظائف تھے[۳]

مجموعی طور پر جامعہ ملیہ کے قیام کے مقاصد
اس کے بانی اور اساتذہ اور اس کے نظام تعلیم نے
نے اس کو صحیح معنوں میں ایک آزاد قومی و تعلیمی نظام کے حامل
ادارے کی شکل دے دی۔ اس نے حکومت کے اثر سے
آزاد رہنے کی وجہ سے اور اپنے مقاصد اور اثرات کے
لحاظ سے ملک میں اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ
مختلف شہروں کے کئی مدارس نے اس سے اپنا الحاق
کرالیا اس کے ابتدائی دور میں دو تین سالوں میں مختلف
شہروں کے تقریباً ۱۷ سترہ مدارس نے اپنا الحاق
جامعہ ملیہ سے منظور کرالیا[۴]

چونکہ جامعہ ملیہ کی ایک قومی سیاسی تحریک کے نتیجے میں
تشکیل ہوئی تھی اس لیے اس کا قیام اور اس کی ترقی
کا فرض ابتدا میں سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ رہا اس
کے مجلس تاسیس تحریک خلافت کے پرجوش ارکان
پر مشتمل تھی اس کمیٹی نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو جو
انتظامیہ تشکیل دی تھی اس میں بھی زیادہ تر یہی لوگ
تھے علی برادران اس کے بانی مبانی تھے۔ حکیم اجمل
خان، امیر جامعہ اور عبد المجید خواجہ اور ڈاکٹر
مختار انصاری جو اس کے معتمد اعزازی تھے عبد الرحمٰن
بجنوری، مفتی کفایت اللہ، قاضی عبد الغفار، مولانا
آزاد سبحانی، مولانا عبد الماجد دریابادی۔ مولانا
حسین احمد مدنی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، حسرت موہانی

---

۱ عبد الغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ص ۶۳، ۶۴
و نیز ڈبلیو سی اسمتھ ص ۱۵۳ و بعدہٗ

۲ عبد الغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ص ۶۶

۳ بحوالہ عبد الغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ص ۶۶

۴ فہرست مندرج عبد الغفار مدہولی "جامعہ کی کہانی" ضمیمہ ۳ ص ۲۸۲

سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، علامہ اقبال، سر شیخ عبدالقادر، مولانا ثناء اللہ امرتسری، ڈاکٹر سید محمود، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی محمد اکرم، مولوی فضل الحق، یعقوب حسن غلام محمد بھرگری، حاجی عبداللہ ہارون، مولوی عبدالحق، محفوظ علی بدایونی وغیرہ اہم نام ہیں جو اس کے اراکین مجلس تاسیس میں تھے۔ اور اپنے اپنے صوبوں کی نمائندگی کرتے تھے[1] ان کے علاوہ گاندھی جی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، تصدق احمد خان شیروانی ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین مستقل طور پر مجلس انتظامی اور مجلس تعلیمی کے رکن رہے۔ یہ وہ شخصیات ہیں جو کم از کم ہندوستان گیر شہرت رکھتی ہیں پھر ان کے علاوہ اسلم جیراج پوری، سعید انصاری، خواجہ عبدالحیٔ، پروفیسر محمد مجیب، حامد علی خان، خواجہ غلام السیدین، شفیع الدین نیر، پروفیسر محمد سرور اپنی ایک منفرد ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ جامعہ ملیہ کے متعلق یہ وہ چند شخصیات ہیں جو برعظیم میں کسی لحاظ سے ایک مستقل اہمیت رکھتے ہیں۔

جامعہ کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کو ابتدا سے پرخلوص اساتذہ کا تعاون رہا ان میں سے بیشتر غیر معمولی لیاقت اور تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے نامور ہیں یہ شخصیات جامعہ اور اپنی قوم کے لئے ہمیشہ سے پرخلوص اور بے لوث رہے چنانچہ کم سے کم مشاہروں پر انہوں نے دوسرے اداروں کے مقابلے میں جہاں انہیں زیادہ آسائش اور فراغت حاصل ہو سکتی تھی جامعہ کو ترجیح دی۔ ایسے اساتذہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان حضرات نے اپنی ساری زندگی بے لوث انداز میں جامعہ کے لئے وقف کر دی۔ ابتدائی چند سالوں میں مولانا محمد اسلم جیراج پوری، پنڈت جوالا پرشاد، عبدالحمید خواجہ، ایل ایس گپتا، مولانا خواجہ عبدالحیٔ سید نذیر نیازی، سعید انصاری، عبداللطیف اعظمی، مولوی نورالرحمٰن، پروفیسر محمد سرور، عبیداللہ سندھی، شفیع الدین نیر جامعہ کے نامور اساتذہ رہے ان میں بیشتر حضرات کی قومی ملکی، ملی، ادبی اور علمی حیثیت مسلم ہے۔

جامعہ کے ان اساتذہ میں سے بعض افراد نے تصنیف و تالیف کی طرف خاص توجہ دی تھی یہ جامعہ کی ایک مزید خصوصیت ہے کہ یہاں علمی زندگی کا اظہار ہوتا ہے اس میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف قائم کیا گیا تھا اس کے ناظم نورالرحمٰن تھے تصنیف و تالیف کے مقاصد کے تحت جامعہ میں ایک اردو اکاڈمی کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی جب اس کا قیام عمل میں آیا تو معیاری کتابیں اس اکاڈمی کے تحت مکتبہ جامعہ کے سلسلے میں تصنیف ہونے لگیں۔ اس اکاڈمی کے نگراں اس صدی کے اہم مفکر اور ادیب ڈاکٹر عابد حسین رہے۔ خوش قسمتی سے اس کے مکتبہ کو ایک مناسب پریس بھی حاصل ہو گیا جس کے ناظم عبدالعلی تھے اور پھر حامد علی خاں رہے مکتبہ جامعہ کے قیام کے ساتھ اسلم جیراج پوری کی نمایاں تصنیف "تاریخ الامت" کی دو جلدیں مولانا محمد بن یوسف

[1] تفصیلی فہرست کے لئے عبدالغفار مدہولی ــ "جامعہ کی کہانی" ضمیمہ ۲ ص ۴۸۱ - ۴۷۹ تک

سورتی کی "ازہار ارب" شائع ہوئی پھر جامعہ کے ایک مجلہ "جوہر" کے مضامین کا انتخاب شائع ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی "مبادی معاشیات" اور ترکوں کی کہانیاں شائع ہوئیں۔ نیاز فتحپوری کی کتاب — "اخبار الاولین" اور نورالرحمن کی کتاب "انتخاب کلام میر" طبع ہوئیں مولانا محمد حسین محوی لکھنوی نے "تاریخ فیروز شاہی" اور مولانا محمد مسلم عظیم آبادی نے "المنجد" کا ترجمہ جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کے تحت کیا تھا۔ جامعہ سے ایک علمی اور ادبی رسالہ "جامعہ" بھی جاری ہوا جو اب تک نکلتا ہے۔ اس کے مدیروں میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سلامت اللہ اور ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی شامل رہے ہیں۔ جامعہ کے مدرسہ سے "جوہر" اور "رحمن" جیسے سنجیدہ علمی رسالے بھی نکلے ہیں اور طوفان اور پینچ کے نام سے مزاحیہ رسالے بھی جاری ہوئے ہیں طوفان کے مدیر فیاض حسین صاحب تھے جنھوں نے بعد میں "ہونہار" نکالا تھا[1]

جامعہ کے اساتذہ نے اور اس سے متعلقین نے مستقل علمی اور ادبی تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر سیاسی رہنما، مقرر، صحافی اور شاعر تھے شاعری میں "کلام جوہر" اور صحافت میں "ہمدرد" اور "کامریڈ" ان سے یادگار رہیں۔ ان کی تقاریر پر مبنی مجموعہ بھی طبع ہو چکا ہے ان کی خود نوشت MY LIFE-A FRAGMENT اہم سیاسی وقائع نگاری پر مبنی ہے۔

حکیم اجمل خان علم دوست اور ادب نواز شخصیت تھے شاعری سے تعلق تھا شیدا تخلص کرتے تھے ان کا کلام "دیوان شیدا" کے نام سے مطبوعہ ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین ماہر تعلیم، معاشیات دان، مورخ اور ادیب تھے معاشیات ان کا مخصوص مضمون تھا "معاشیات قومی" اور "معاشیات مقصد و منہاج" اپنے مضمون پر طبع زاد تصانیف تھیں اور مبادی معاشیات ان کا اردو میں کیا ہوا ترجمہ تھا۔ اس میں "جمہوری افلاطون" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ ادب میں "حالی محب وطن" ان کی تصنیف ہے۔ تعلیم کے متعلق ان کے خطبات کا مجموعہ "تعلیمی خطبات" کے نام سے کئی دفعہ چھپ چکا ہے "مرغ اجمیر چلی" اور "سعیدہ کی اماں" کتابیں بچوں کے لئے لکھی گئیں۔ اسی انداز کی ایک اور کتاب "ہندوستان کیا ہے" لکھی تھی۔

پروفیسر محمد مجیب بیسویں صدی کے نامور مورخ ہیں۔ ادب اور فلسفہ سے لگاؤ تھا اور ڈرامے بھی لکھے تھے تاریخ میں "تاریخ ہند کی تمہید" "تاریخ تمدن ہند قدیم" "جنگ کے چار سال" اور INDIAN MUSLIM اہم کتب ہیں روسی ادب دو حصوں میں روسی ادب کی تاریخ

---

[1] یہ ساری مطبوعات بڑی حد تک عبدالغفار مدہولی کی مذکورہ تصنیف "جامعہ کی کہانی" سے ماخوذ ہیں ص ۶۴، ۶۵

پراؤن کی اہم تالیف ہے "تاریخ فلسفہ سیاست" ان کا کیا ہوا ترجمہ ہے "ادیب اور ادیب" ان کے مقالات ہیں۔ وہ اردو کے اہم ڈرامہ نگار شمار ہوتے ہیں۔ کھیتی۔ انجام۔ کیمیا گر۔ خانہ جنگی۔ ان کے اہم ڈرامے ہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین اس صدی کے مفکر، ادیب اور مترجم ہیں۔ ہندوستانی قومیت ان کا خاص موضوع ہے اس کے بارے میں ان کی بعض کتابیں بڑی اہم ہیں پہلے انگریزی میں لکھتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ "ہندوستانی قومیت" اور "قومی تہذیب" تین حصوں میں "قومی تہذیب کا مسئلہ" ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" اس سلسلے کی اہم تصانیف ہیں۔ تراجم میں "تنقید عقل محض" کانٹ کی اہم کتاب کا ترجمہ ہے "مکالمات افلاطون" "قضیات" مصنف ایڈورڈ ورفسپنگر نصابی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ "علم الاقوام" دو جلدوں میں عمرانیات پر مفید ترجمہ ہے "قوم کی آواز" گاندھی کی گول میز کانفرنس میں کی گئی تقاریر کا ترجمہ ہے "تلاش حق" گاندھی کی خود نوشت اور "میری کہانی" نہرو کی خود نوشت کے تراجم تحریک آزاد ہند کی اہم دستاویز ہیں "ضبط نفس" اور "نفس پرستی" بھی گاندھی کی کتاب کا ترجمہ ہے "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" خالدہ ادیب خانم کی اہم تصنیف کا اردو قالب ہے "تاریخ فلسفہ اسلام" فرانسیسی سے براہ راست ترجمہ ہے "مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ" پیش نظر تحریر کے موضوع پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین کو ادب سے بھی خاص لگاؤ ہے انھوں نے ڈرامے، ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں "پردۂ غفلت" اردو کا اہم ڈرامہ سمجھا جاتا ہے۔ ادبی مضامین (مطبوعہ) ان کی ابتدائی تصنیف ہے۔

مولانا اسلم جیراج پوری بڑے پائے کے عالم سمجھے جاتے ہیں "تاریخ الامت" ان کی موقر تصنیف ہے جو چھ جلدوں میں ہے عام طور پر انھوں نے مذہبی موضوعات پر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ایسی شخصیات پر بھی کتابیں لکھی ہیں جن کا ہمارے ماضی سے اہم تعلق رہا ہے۔ ان کی خاص تصانیف یہ ہیں۔ مجاہد اسلام، ارکان اسلام، خواتین، نوادرات، نکات القرآن، جواہر ملیہ، تاریخ نجد، سیرۃ النبی اور مستشرقین، سیرۃ عمرو بن عاص، بیان حافظ، حیات جامی، تاریخ القرآن تعلیمات القرآن۔

مولانا عبدالحی مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں ان سے یہ کتابیں یادگار ہیں۔ ہمارے رسول، خلفائے اربعہ، نبیوں کے قصے۔ سبیل الرشاد، بیان۔ صراط مستقیم، بیان عبرت

مولانا محمد بن یوسف سورتی نے قواعد عربی مرتب کی تھی۔ ازھار العرب بھی ان کی تصنیف ہے۔

پروفیسر محمد عاقل نے اقتصادی اور سیاسی موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ آپ کی غذا، مسئلہ آبادی، اجتماعی زندگی کی ابتداء

نورالرحمن صاحب نے میر کے کلام کو مرتب کیا تھا اور ایک اہم کتاب "حیات سر سید" بھی تصنیف کی تھی "حیات جاوید" کے بعد سرسید پر یہ اہم کتاب قرار دی جاتی ہے۔

سعید انصاری نے تعلیم کے مسائل پر، ادب پر، اور بچوں کے لیے کتابیں تصنیف کیں۔ "ادیب" "مولانا شبلی بحیثیت انشا پرداز" تعلیم میں "تعلیم اور سماج" اور بچوں کے لیے "بھولا بچہ" "زندگی کا رخ" "بچوں کی نظمیں" مچھلی

کے رسول مرتب کیں۔ انھوں نے ON LIBERTY
کا ترجمہ "آزادی" کے نام سے کیا
ڈاکٹر سلامت اللہ نے فنِ تدریس کو اہمیت دی۔ ہم
کیسے پڑھائیں ان کی تصنیف ہے۔
محمد شفیع الدین نیر نے جو شاعر بھی تھے اپنی صلاحیتوں
کو بچوں کے لیے وقف کر دیا تھا نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھیں۔
نظم میں بچوں کا تحفہ، تعلیمی تحفہ، بچوں کا کھلونا
اسلامی کہانیاں، وطنی نظمیں اور نثر میں بھی شکر تارا کا ڈنڈا
لکھیں۔
مولانا عبید اللہ سندھی تحریک شاہ ولی اللہ کے
اس صدی میں اہم مبلغ تھے اس تحریک سے متعلق اور بیسویں صدی
کے ہندوستان کے اور اس کے مسائل سے متعلق ان کی تحریریں
اور تقریریں بڑی وقعت رکھتی ہیں، ان کی تقاریر اور خطبات کا
مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک
ان کی اہم اور مستند تصنیف ہے شاہ ولی اللہ کی کئی کتابیں
انھوں نے مرتب اور ترجمہ کیں۔
پروفیسر محمد سرور عبید اللہ سندھی کے ارادتمندوں میں۔ جامعہ
ملیہ میں کافی عرصے تک پڑھاتے رہے ہیں۔ علمی دنیا میں بھی
اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ تحریک شاہ ولی اللہ، مولانا عبید اللہ
سندھی اور جماعت اسلامی پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔
"الرحیم" کے عرصے تک ایڈیٹر رہے۔
مولانا عبید اللہ سندھی کی تقاریر اور خطبات کو انھوں نے
مرتب کیا ہے۔ عبید اللہ سندھی پر ایک کتاب "ملفوظات عبید اللہ
سندھی" کے نام سے لکھی ہے۔ شاہ ولی اللہ کی کئی کتابوں
کو ترجمہ اور ترتیب کے ساتھ شائع کیا۔ ابھی ان کی تازہ ترین
کتاب "ارمغان شاہ ولی اللہ" منظرِ عام پر آئی ہے۔

ظہیر احمد صدیقی

مادر درس گاہ

❖ ❖ ❖

یہ کعبۂ عقل و دانش ہے یہ علم و ہنر کا مخزن ہے ❖ تا حشر خزاں آئے نہ جہاں یہ گلشن ایسا گلشن ہے
یاں بادۂ عقل کے ساغر بھی اور عشق کے رنگین جام بھی ہیں ❖ اس میکدۂ عرفان میں رومی بھی ہیں خیام بھی ہیں
اس علم کدہ میں جینے کے آداب سکھائے جاتے ہیں ❖ انسانیتِ عظمیٰ کے سبق انسان کو پڑھائے جاتے ہیں
گہرائیاں فطرتِ انساں کی اس مخزن میں کھو جاتی ہیں ❖ اخلاق کی اقدار اعلیٰ کردار میں ضم ہو جاتی ہیں
انسان کو ہجومِ غم سے یہاں پیغامِ امن مل جاتا ہے ❖ گم کردہ منزل راہی کو منزل کا نشان مل جاتا ہے
یاں دیپک علم و عرفاں کا گوشہ گوشہ میں روشن ہے ❖ یہ خطہ خطۂ یوناں ہے یہ وادی وادیٔ ایمن ہے
اس بزم میں حق و صداقت کا پیغام سنایا جاتا ہے ❖ اخلاق سنوارا جاتا ہے کردار بنایا جاتا ہے
ہر ذرے میں جاری و ساری ہے سید کا فیض روحانی ❖ تکمیل یہاں پا جاتی ہے ناپختہ سرشت [illegible]
ناسازیٔ فطرت آدم کو اس در سے دوا دی جاتی ہے ❖ اور علم و عمل کے شعلوں کو دامن سے ہوا دی جاتی ہے
ہر لحظہ جلا ئیں پاتا ہے ادراک یہاں احساس یہاں ❖ ہے صدق و وفا کا ذوق یہاں اور مہر و وفا [illegible]
اس ارض پاک پہ شام و سحر انوار کی بارش ہوتی ہے ❖ مٹی نہ کہو یہ سونا ہے شبنم نہ کہو یہ موتی ہے
لافانی عظمت و شوکت کے عنوان بنائے جاتے ہیں ❖ اس علم کدہ میں اے ساقی انسان بنائے جاتے ہیں

اللہ کرے یہ علم کدہ تا روزِ ابد آباد رہے
ہر آفت سے محفوظ رہے ہر خدشے سے آزاد رہے

غالب اور سر سید احمد خاں

از جناب پروفیسر ایوب قادری

مرزا غالب یوں تو آگرہ میں پیدا ہوئے مگر ان کی ساری عمر دلی میں گزری، بقول خواجہ الطاف حسین حالی سات برس کی عمر سے دلی میں آنے جانے لگے تھے[1] تیرہ سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش معروف (ف ۱۲۴۳ ہجری)[2] کی صاحبزادی کے ساتھ عقد ہوگیا۔ پھر آرجار اور بڑھ گئی اور کچھ دنوں کے بعد تو مستقل طور سے دلی کے باسی ہوگئے۔

خاندان لوہارو، دلی کا ایک نامور اور مشہور خاندان تھا۔ نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں (ف ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء) سرکار و دربار میں اعزاز و منصب کے مالک تھے۔ قلعہ معلیٰ سے بھی متعلق اور انگریزی سرکار کے بھی خدمت گزار، غالب کے اس خاندان سے دُہرے، تہرے رشتے تھے بلکہ اس سے زیادہ مرزا غالب اپنے چچا نصر اللہ بیگ (ف ۱۸۰۶ء) کی سرکاری خدمت گذاری کے سلسلے میں پنشن کے مستحق ٹھہرے۔ امراء و رؤساء میں شمار رہا۔ دربار میں کرسی ملی۔ خلعت و انعام سے سرفراز ہوئے۔ سرکاری خط و کتابت میں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" لکھا گیا۔ بادشاہ دہلی کے ہاں سے "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" کا خطاب پایا۔ اور مرزا غالب دلی کی اعلیٰ سوسائٹی کے ایک رکن بن گئے۔

سر سید احمد خاں کا خاندان بھی دلی کا ایک ممتاز اور صاحب منصب خاندان تھا۔ سر سید کے والد جواد الدولہ میر متقی (ف ۱۵ رجب ۱۲۵۴ھ) اور اکبر شاہ ثانی سے ذاتی تعلقات تھے بلکہ ایک موقع پر بادشاہ نے ان کو وزارت کا منصب بھی سونپنا چاہا جسے انہوں نے اپنے خسر نواب فرید الدولہ فرید الدین احمد خاں (ف ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء) کو دلوا دیا[3]۔ فرید الدولہ دو مرتبہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر رہے۔ وہ انگریزی حکومت کے بھی متوسل و معتمد تھے۔ بلکہ انہوں نے سرکار انگریزی کی خاص خدمات انجام دی تھیں۔ اس طرح سر سید احمد خاں کا خاندان اور نوابانِ لوہارو کا خاندان دونوں کم و بیش برابر کے درجے کے تھے۔ اور ان دونوں خاندانوں میں تعلقات ہونے یقینی تھے۔ اور یہ تعلقات تھے بھی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں (ف ۱۴ رمضان ۱۳۰۲ھ) کے حال میں لکھتے ہیں[4]:-

---

[1] حالی، خواجہ الطاف حسین، یادگار غالب، (شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۲ء) ص ۱۳

[2] عبدالودود قاضی، آثار غالب، (مشمولہ علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء علی گڑھ) ص ۴۶ مگر مولوی عبدالماجد بدایونی نے دیوانِ معروف کے مقدمے میں ان کا سالِ انتقال ۱۲۴۳ ہجری لکھا ہے۔ (دیوانِ معروف طبع نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۵ء)

[3] سر سید احمد خاں، سیرت فریدیہ (مرتبہ محمود احمد برکاتی) پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۰۷

[4] سر سید احمد خاں، آثار الصنادید (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۶ء) ص ۳۱۲-۳۱۳

"پھر وسعتِ خلق کا یہ حال ہے کہ اگر اس
کو خلقِ محمدی سے تعبیر کریں تو بجا ہے۔
راقم کو اس سر گروہ اراکین روزگار کی
خدمت میں بہت اخلاص اور کمال اختصاص
ہے، اور دعویٰ اتحاد پر نازاں اور اس
تذروۂ اہلِ کمال کی طرف سے بھی کمترین
عباد پر مراسم الطاف اور مدارج اعطاف
اس طرح سے مبذول ہیں کہ زبانِ تقریر
کو نہ طاقتِ سخن ہے نہ یارائے بیان۔"

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں بزمرۂ شعراء
نواب ضیاء الدین خاں کے علاوہ اس خاندان کے دو افراد
نواب زین العابدین خاں عارف ابن نواب غلام حسین خاں
ابن نواب فیض اللہ خان بہادر اور ان کے علاتی بھائی
نواب غلام حسین خاں محو کا بھی ذکر کیا ہے[۵۱] مرزا غالب
خاندانِ لوہارو کے متعلقین و متوسلین میں تھے۔ لہٰذا ان
سے بھی سرسید احمد خاں کے تعلقات تھے۔ بلکہ ان کے بھائی
سید محمد خاں (ف ۳ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ) سے تو غالب کے
گہرے روابط تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان کو اپنا روحانی دوست
سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالب اپنے ایک انگریز دوست کو
لکھتے ہیں:[۵۲]

"آں کہ دربارۂ سید الاخبار داد نگارش
دادہ اند منتے دیگر بر من نہادہ اند"
اور پھر اسی خط میں لکھتے ہیں:[۵۳]
"نہاں نماند کہ نقش مطبع سید الاخبار
انگیختہ طبع یکے از دوستانِ روحانی
من است۔"

محمد عتیق صدیقی تو سرسید احمد خاں کے متعلق
بھی لکھتے ہیں:[۵۴]
"مرزا غالب اور سرسید احمد خاں میں گہرا
تعلق تھا۔"

حالانکہ غالب اور سرسید احمد خاں کی عمروں میں بیس سال
کا تفاوت ہے۔۔

مرزا غالب کا اردو دیوان سب سے پہلے شعبان
۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں سرسید احمد خاں کے بڑے
بھائی سید محمد خاں کے قائم کردہ پریس میں چھپا تھا۔ اور
اس میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ بھی شامل ہے
اس دیوان کے سرورق کی عبارت یہ ہے[۵۵]
دیوان اسد اللہ خاں بہادر غالب تخلص مرزا
نوشہ صاحب مشہور کا دہلی میں سید محمد خاں
بہادر کے لیتھو گرافک پریس میں شہر شعبان

---

۵۱ سرسید احمد خاں۔ آثار الصنادید ص ۳۲۱-۳۲۴
۵۲ غالب، اسد اللہ خاں، کلیات نثر غالب، مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۵ء) ص ۱۰۲ بحوالہ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی
(انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۵۷ء) ص ۲۷۸
۵۳ محمد عتیق صدیقی ص ۲۷۸
۵۴ محمد عتیق صدیقی ص ۲۷۹
۵۵ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید ص ۳۰۱

سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق سنہ ۱۸۴۱ء کو سید عبدالغفور
کے اہتمام میں چھپا ہوا ہے"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۴۱ء کے بعد اس پریس کا نام ... سید المطابع ہوا۔ ہم نے دیوانِ غالب کا یہ پہلا ایڈیشن صولت پبلک لائبریری رام پور میں دیکھا ہے۔

سر سید احمد خاں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب آثار الصنادید میں مرزا غالب کا تذکرہ مع نمونہ نثر و نظم پورے طور سے شامل کیا ہے بلکہ "بلبل نوایانِ سواد جنت آباد حضرت شاہجہاں آباد" کے عنوان کا آغاز ہی غالب کے ذکر سے کیا ہے اور مرزا کی تعریف میں سر سید احمد خاں نے قلم توڑ دیا ہے، چنانچہ وہ غالب سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں؛ ۵ے

"راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت
میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں
ہے اور نہ احاطہ تحریر میں آسکتا ہے۔
اور چونکہ "دلہا را بدلہا راہ باشد" آں عزت
کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ
شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی
مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے
اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک
کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک
گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے
تو حق بھی یہی ہے۔"

مرزا غالب نے بھی آثار الصنادید پر ایک زوردار تقریظ لکھی ہے۔ آثار الصنادید کی تقاریظ میں وہ سب سے پہلی تقریظ ہے اس کے بعد امام بخش صہبائی (ف سنہ ۱۸۵۷ء) اور منشی صدرالدین آزردہ کی تقاریظ نقل کی گئی ہیں۔ جواب آں غزل میں مرزا غالب لکھتے ہیں؛ ۵ے

"خوشا دانا دل ہنر دست گاہ و فرخا
کردار گزار کار آگاہ مہر ورز کین فراموش،
اہرمن دشمن یزداں دوست، فرزانہ با فر و
فرہنگ جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر
عارف جنگ آں کہ خامہ را در نگارش
افسون، زندہ کردن نام بداں روش
روانی داد کہ نام آوراں روز فرو رفتہ
را زندگی جاودانی داد۔"

سر سید احمد خاں سے غالب کی خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ جس زمانے (سنہ ۱۸۴۲ء تا سنہ ۱۸۴۶ء) میں سر سید احمد خاں فتح پور سیکری میں منصف تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کو ایک خط لکھا تھا اور غلام امام شہید (ف ۲ر اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء) کے دو اشعار بھیجے تھے کہ ان کو تضمین کر دیا جائے۔ یہ بات مرزا غالب کے طبع نازک پر سخت گراں گزری۔ وہ قتیل (ف ۲۳ر ربیع الاوّل سنہ ۱۲۳۳ھ) کے شاگرد غلام امام شہید کو کب اس مرتبے کا سمجھتے تھے کہ ان کے اشعار کی تضمین کریں۔ اس سلسلے میں مرزا غالب نے جو خط سر سید احمد خاں کو لکھا ہے

۵ے سر سید احمد خاں، آثار الصنادید ص ۳۷۲

وہ ملاحظہ ہو [1]

بنام جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر منصف فتحپور

نواب معلی القاب و سید عالی جناب سلامت،

بعد رسیدن منشور رافت نشاں شادماں شدم و ازاں چہرا لبہ انجام آں فرماں دادہ اند غمیں، یک دوبیت اندیگرے گرفتن و بہ آں گفتار دوچار بیت از خویش افزودن کدام آئین سخن وری و کدام شیوۂ معنی پروری است، خاصتہً ایں دوبیت کہ جز شکوہ الفاظ تازی ہیچ گونہ معنی نازک ندارد، و سیما در بحرے واقع شدہ کہ ہیچ کس از ایرانیاں در آں بحر غزل نگفتہ، آنچہ بریں دوبیت افزایند، خواہی آں را مسدس نام نہند و خواہی ترجیع بند خوانند، خاص از بہر آں ست کہ گدایاں یاد گیرند و بر در ہا با ہنگ حزیں بخوانند کدام عاشق خاتم المرسلین بسماع ایں اشعار از خود رود و گریاں درد۔ حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہ اللہ تعالیٰ ہر چہ گفتہ اند خوش گفتہ اند و خوشتر ازیں نتواں گفت، لیکن ایں شاعری و سخن وری نیست، چیزے دیگر ہست کہ در مجلس مولود شریف تواں خواند۔ فقیر حقیر را در نعت اشرف المسلمین [2] علیہ و آلہ السلام قصیدہ ہا و مثنویہا است، از آں جملہ یک مثنوی نقل کردہ بخدمت می فرستم، ایں را بنگرند و بخوانند و از بندہ اشعارے کہ نہ شیوہ سخن گستراں باشد، آرزو نکنند و بندۂ خود انگارند و بخدمت مہین برادر خود سلمہ اللہ تعالیٰ سلام رسانند، والسلام۔

اس خط کے تیور بتاتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کی یہ فرمائش غالب کی طبع نازک پر گراں گزری لیکن تعلقات بدستور قائم رہے۔

سر سید احمد خاں تصنیف و تالیف کا شغف رکھتے تھے

چھوٹی بڑی متعدد کتابوں کے علاوہ آثار الصنادید ان کی شہرۂ آفاق کتاب تھی۔ وہ تاریخ کا بھی نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ دلی کے ایک سوداگر حاجی قطب الدین مرحوم نے سر سید احمد خاں سے درخواست کی کہ اگر وہ علامی ابو الفضل کی کتاب "آئینِ اکبری" کی تصحیح و تہذیب کر دیں تو وہ اس کو چھپوا دیں گے۔ اور اس کے معاوضے میں سوا سو روپے کی قیمت کی مطبوعہ کتابیں ان کو دیں گے۔ بقولِ حالی دہلی کی ملازمت کے زمانے میں وہاں کے ایک تاجر سے یہ معاملہ کرنا سید احمد خاں نے مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب وہ بجنور پہنچے تو انہوں نے یہ کام شروع کر دیا۔ [3] اور نہایت محنت شاقہ کے بعد مختلف نسخوں کی روشنی میں اس کتاب کو مرتب کیا جو خامی اور کمی تھی اس کو پورا کیا، صحیح نقشے اور جدولیں بنوائیں اور حاجی قطب الدین مرحوم نے حسب وعدہ اپنے بھائی شیخ اسماعیل کے نام سے دہلی میں ایک "مطبع اسماعیلی" قائم کر کے اس کتاب کو ۱۲۷۲ھ میں طبع کرایا۔ اس طرح سر سید احمد خاں نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ سر سید احمد خاں کو اس سلسلے میں جو کوشش و کاوش کرنی پڑی وہ "خاتمۃ الطبع" کی عبارت سے واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں [4]:

---

[1] غالب کا یہ خط بہارِ دانش کے ایک قلمی نسخے میں بھی شامل ہے جو انجمنِ محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس نسخے سے اس خط کو نقل کر کے اپنے مضمون "نوادرِ غالب" میں شامل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ "آج کل" دہلی فروری ۱۹۶۴ء

[2] یہ لفظ "اشرف المرسلین" ہونا چاہیئے۔ [3] حالی، خواجہ الطاف حسین، حیاتِ جاوید (اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۷ء) ص ۔

[4] ابو الفضل، آئینِ اکبری (بہ تصحیح و تہذیب سر سید احمد خاں) (مطبع اسماعیلی دہلی ۱۲۷۲ھ) ص ۲۶۹

"ایزد را سپاس کہ تصحیح ایں والا نامہ آگہی انجام پذیرفت، دل رسیدہ آرامش یافت و جان از خود رفتہ باز جا آمد۔ مدتے نقد رواں عمر بدیں کار صرف شد تا گوہر یکتائے شناسائی بدست آمد و زمانے در پریشانی سپری گشت، تا ایں منتخب مجموعۂ معنی و فہرست دفتر دانائی اینشیرازۂ تصحیح در بر گرفت اگر نیک نگریستہ آید بندگان را آئینہ جہاں نما ماہ گشت و کوراں را عصائے راہ، ابتدا بہت اقتاد، بروح را از دمائے تربیت ہم رسید۔ آگاہ دلاں را چشم بصیرت کشادہ تر گشت و راہ گم کردگاں را چراغ ہدایت افروختہ شد۔ نے من کجا و ایں سخن سرائی از کجا ایں ہم معنی آرائی ماز آنست کہ بندگان آگاہ دل و والا گوہران قدسی نفس ایں جگر کاوی را پسند کردند و داد تحسین و آفریں دادند۔ نقطۂ انتخاب ہر یکے از بس بزرگاں سویدائے دلم گشت، من ہیچ در حساب را ہزاراں سامان عزو جاہ آمادہ شد۔ اگر بر بخت بیدار خود صد ہزار بار نازم رواست و کلاہ گوشۂ افتخار بفلک رسانم سزاست، با یزداد نقار لیطلے کہ بزرگان عالی ہمت بر تصحیح ایں نگاریں نامہ، رقم فرمودہ اند، پایۂ خود را بفلک الافلاک می رسانم و دستاویزے بر مشکوری سعی خویش بدست می آرم۔"

سر سید احمد خاں کے اس کام کی اہل یورپ نے خاص طور سے داد دی اور اس کتاب کے انگریزی مترجم ایچ۔ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے اس اڈیشن سے بہت فائدہ اٹھایا[۵۱]۔ بلاک مین اس کتاب کی اہمیت کے سلسلے میں رقم طراز ہے[۵۲]:

"یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں۔ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ یہ فی الواقع اس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی۔ ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشہ جات ہیں، جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جس کے لئے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن، رپورٹوں، نقشوں اور اگزیٹروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

آئینِ اکبری[۵۳] کے متعلق خواجہ الطاف حسین حالی اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں[۵۴]:

"لیس سر سید کا ایک ایسی نادر الوجود کتاب کی تصحیح تہذیب میں کوشش بلیغ کر کے اس کو از سر نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام

---

۵۱ سر سید احمد خاں، سرکشی ضلع بجنور (سلمان اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء) ص ۶۵

۵۲ حالی، خواجہ الطاف حسین (حیاتِ جاوید) ص ۱۲۶

۵۳ آئین اکبری مطبوعہ اسماعیلی پریس دہلی ۱۲۷۲ھ راقم الحروف کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۵۴ حالی، حیاتِ جاوید ص ۱۲۶-۱۲۷

نہ تھا، بلکہ فی الحقیقت پبلک پہ ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنف اور نامور بادشاہ کے کارنامے کو دنیا کے سامنے ایک دل نشین صورت میں پیش کرنا تھا۔"

سرسید احمد خاں نے اس کتاب پر مرزا غالب اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (ف ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) سے تقاریظ لکھوائیں۔ مرزا غالب نے جو تقریظ لکھی اس میں انہوں نے انگریزوں کی ایجادات و آئین کی تعریف کی اور سرسید احمد خاں کو مردہ پرستی کا طعنہ دیا۔ مرزا غالب نے دہلی، لکھنؤ اور کلکتہ تک کا سفر کیا تھا۔ وہ جدید علوم و فنون اور ایجادات و انکشافات سے براہِ راست متعارف و متاثر تھے لہٰذا انہوں نے صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دی چنانچہ وہ لکھتے ہیں[۱]

گر ز آئین می رود با ما سخن
چشم بکشا و اندریں دیر کہن
صاحبانِ انگلستان را نگر
شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئینہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم است "آئین" داشتن
کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند
ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب
دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد
گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
غلتک گردوں بگرداند دخاں
نرہ گاو و اسپ را ماند دخاں
از دخاں زورق برفتار آمدہ
باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ
می زنند آتش بباد اندر ہمیں
می درخشد باد چوں اخگر ہمی
مرزا غالب نے ایک دو اشعار میں یہاں تک کہ
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

---

۱ غالب، اسداللہ خاں، کلیاتِ غالب فارسی جلد اول (مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء

غالب کی یہ صاف گوئی اور بے لاگ تبصرہ سرسید احمد
خاں کو پسند نہ آیا اور انہوں نے یہ تقریظ غالب کو واپس کر
دی۔ اتفاق کی بات کہ نواب مصطفےٰ خاں نے عربی میں تقریظ
لکھی مگر انہوں نے بھی آخر میں ایک فارسی شعر ایسا ہی لکھ دیا
جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کے دل میں بھی آئین اکبری
کی کچھ زیادہ وقعت نہیں ہے۔[1]

سرسید احمد خاں نے یہ دونوں تقریظیں اپنی کتاب
میں شامل نہیں کیں۔ صرف مولوی امام بخش صہبائیؒ کی تقریظ
شامل کی۔

یہ بات صحیح ہے کہ غالب تاریخ کا وہ ذوق
نہیں رکھتے تھے جو سرسید احمد خاں کو تھا اور یہ بھی حقیقت ہے
کہ کتب تواریخ میں آئین اکبری کی اہمیت مسلّم ہے مگر مرزا غالب
نے اس تقریظ میں جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سراپا
حقیقت تھے۔ اس میں نہ انگریز پرستی کو دخل تھا اور نہ
ابوالفضل کی تخفیف مقصود تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ
بعد میں سرسید احمد خاں نے اپنی اصلاحی اور تعلیمی مہم شروع
کی تو انہوں نے بھی یہی کہا بلکہ انہوں نے انگریزوں کے
آئین، علوم وفنون، معاشرت اور ایجادات واکتشافات کی
اس سے زیادہ تعریف کی اور اسی کی توضیح و تشریح کی جو
بانداز مرزا غالب اپنے ان چند اشعار میں کہہ گئے تھے۔ اس سے
مرزا غالب کی وسعتِ نظر، دور بینی اور ژرف نگاہی کا اندازہ
ہوتا ہے۔

یہ ایک خالص علمی معاملہ تھا اس سے سرسید احمد خاں
اور مرزا غالب میں ایک نوع کا بُعد ہو گیا۔ اور بقولِ حالی
"دونوں کو حجاب دامن گیر ہو گیا تھا"۔ سرسید احمد خاں بجنور
ہی میں تھے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہو گیا اور پھر
اس کی لپیٹ میں پورا ملک آ گیا۔ اس کے مابعد اثرات
میں غالب اور سرسید دونوں مبتلا رہے۔ مارچ ۱۸۶۰ء
میں جب مرزا غالب پہلی مرتبہ رام پور سے واپس ہوتے
ہوئے مراد آباد کی سرائے میں ٹھیرے اور سرسید احمد خاں
کو معلوم ہوا تو وہ انہیں اپنے گھر لے گئے اور یہ حجاب رفع
ہو گیا۔ چنانچہ حالی لکھتے ہیں:[2]

"سرسید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا اس
وقت مرزا صاحب، نواب یوسف علی خاں مرحوم
سے ملنے کو رام پور گئے تھے ان کے جانے کی تو
مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مگر جب دلی کو واپس جاتے
تھے میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں
ٹھیرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا
صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے
مکان میں لے آیا۔ ظاہراً سبب یہ ہے کہ سرسید نے
تقریظ چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے
اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو
حجاب دامن گیر ہو گیا تھا۔ اور اسی لئے مرزا نے
مراد آباد میں آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔
الغرض جب مرزا سرائے سے سید کے مکان پر پہنچے
اور پالکی سے اُترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں
تھی۔ انہوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع
پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی

---

۱ حالی، حیاتِ جاوید ص ۱۲۶

۲ حالی، حیاتِ جاوید ص ۱۲۵-۱۲۶ (حاشیہ)

تھی۔ سید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے، سرسید نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا۔ بھئی مجھے دکھا دو۔ تم نے کہاں رکھی ہے؟ انہوں نے کوٹھری میں سے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے پی ہے؟ شاید اسی لئے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے:۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہو گئی مرزا دو ایک دن وہاں[۵۱] ٹھیر کر دلی چلے آئے۔[۵۲]

اس طرح ان دونوں کے تعلقات پھر استوار ہو گئے بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد (ف ۱۹۵۸ء) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مرزا غالب کی پنشن کی بحالی کے سلسلے میں بھی سرسید احمد خاں نے کوشش کی تھی چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون "مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام" (مصائب غدر، قلعۂ معلی کی تباہی وفاداری و بغاوت کی ایک قدیمی حکایت) میں لکھتے ہیں[۵۳]

"جن لوگوں نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لئے خاص طور پر کوشش کی تھی مجھے معتبر[۵۴] ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سرسید مرحوم بھی تھے۔ اس واقعہ سے سید صاحب اور مرزا مرحوم میں صفائی بھی ہو گئی جن کے باہمی تعلقات قدیمانہ آئینِ اکبری کی تقریظ کے قضیے سے کچھ مکدر ہو گئے تھے۔"

مرزا اور سرسید کے تعلقات تو مرزا کی رام پور سے واپسی پر پہلے ہی بحال ہو چکے تھے مگر ان کی بحالی کی عملی تعبیر اس وقت ظاہر ہوئی جب سرسید احمد خاں نے پنشن کی بحالی میں کوشش کی۔

---

۵۱ مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ سرسید کے پاس دو ایک دن قیام نہیں کیا تھا بلکہ اسی دن روانہ ہو گئے تھے۔ (مکاتیب غالب (مرتبہ امتیاز علی عرشی رام پور ۱۹۳۹ء) ص ۱۰۴۔

۵۲ مرزا غالب دوسری مرتبہ (دسمبر ۱۸۶۵ء) رام پور سے واپس ہوتے ہوئے مراد آباد میں مولوی محمد حسن خاں بریلوی صدر الصدور (ف تقریباً ۱۸۷۳ء) کے یہاں ٹھیرے تھے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں واقعات کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو "آج کل" دہلی فروری ۱۹۶۴ء ص ۴۔

۵۳ الہلال (کلکتہ) ۱۷ر جون ۱۹۱۴ء مطابق ۲۲ر رجب ۱۳۳۲ھ ص ۴۳۷ - ۴۴۰۔ نیز دیکھئے مالک رام، ذکرِ غالب (مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۶۴ء) ص ۱۴۶-۱۴۷، غلام رسول مہر، غالب (لاہور ۱۹۴۴ء) ص ۲۱۹

۵۴ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس معتبر ذریعہ کی وضاحت نہیں کی ورنہ بات اور بھی کھل کر سامنے آتی، کہ سرسید احمد خاں کی کوششوں کو کس حد تک دخل تھا۔ اور وہ ذریعہ کہاں تک قابلِ اعتبار تھا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جب دلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا تو سر سید احمد خاں کے بڑے ماموں خواجہ وحید الدین کو کسی گورے نے گھر میں گھس کر گولی مار دی۔ ان کے سانحہ ارتحال پر غالب نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے۔ ۵

تاریخ وفات ناظر وحید الدین

کرد چوں ناظر وحید الدین ز دنیا انتقال
گفتم آیا بر کدام آئین بود سال وفات
گفت غالب کز سزا ہای اگر نامش برند
خود ہمیں "ناظر وحید الدین" بود سال وفات

---

۵ کلیات فارسی (مجلس ترقی ادب لاہور اڈیشن) ص ۳۰۵

پروفیسر شہباز

وہ سر سید کہ جس کا سر نہ تھا، تھا عقل کا مخزن
وہ سر سید کہ جس کا دل نہ تھا، تھا خلق کا معدن
وہ سر سید برہمن آنکھ پر جس کو بٹھاتے تھے
سمجھ کر دیوتا تعلیم کا کرتے تھے سب درشن
شجاعت کی اگر تقریر کرتا تھا سلیقے سے
تو پیہم بولنے لگتا تھا میدان سخن میں رن
بہاتا تھا کبھی جب قوم کو مردہ تو رقت سے
بہا دیتا تھا دریا آنسوؤں کا بر سر مدفن
برابر دوڑتی رہتی تھی غور و فکر کی بجلی
کبھی نیویارک میں تڑپی کبھی چمکی وہ جا لندن
اسی سے داد پاتے تھے خیالات مصفا کی
ادھر جا سر ادھر کالج ادھر ملٹن ادھر نیوٹن
زبان چلتی تھی جیسے تیغ چلتی ہو سپاہی کی
کسی کا کٹ گیا پنجہ کسی کی کٹ گئی گردن
وہ سر سید کہ جس کے نوک خامہ کے اشارے سے
سمٹتے ہی چلے آتے تھے دنیا بھر کے علم و فن
حدیث و فقہ و تفسیر و کلام و فلسفہ حکمت
حساب و جبر و اقلیدس طبیعی کیمیا ہیئت

٭ ٭ ٭

ایجوکیشنل کانفرنس اور خصلت حُسین صابری

از صابر خصلت بی اے (عملیگ)

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے مسائل پر غور و عمل کرنے کی غرض سے ۱۸۸۶ء میں سر سید احمد خانؒ نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا گیا۔ لیکن چند سال بعد اس ادارے کا نام بجائے کانگریس کے کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہندوستان میں اس ادارے کا نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مشہور و معروف ہوا۔ کانفرنس کا پہلا جلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں زیر صدارت الحاج مولوی سمیع اللہ خانؒ علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ سر سید احمد خانؒ کانفرنس کے پہلے سکریٹری مقرر کیے گیے۔ سر سیدؒ کی زندگی میں کانفرنس کے کل گیارہ (۱۱) اجلاس ہوئے۔ ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو سر سید احمد خانؒ کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کو مالی نیز نت نئی دشواریوں نے آگھیرا۔ ان دنوں کالج کی حالت بیحد نازک تھی اور شدید خطرہ لاحق تھا لیکن نواب محسن الملک نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اولوالعزمی سے سارے خطرات کو ٹالا۔ نواب صاحب کانفرنس کے منصرم اور مہتمم بھی بنے۔ انھوں نے کانفرنس کو واقعی آل انڈیا ادارہ بنا دیا ورنہ یہ ادارہ اس وقت صرف یوپی اور پنجاب تک محدود تھا۔ انھوں نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کانفرنس کے اجلاس نہایت شان و شوکت سے منعقد کرائے۔ ان اجلاسوں میں کالج کی بقا اور اس کو یونیورسٹی بنانے کے لیئے مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں حاصل کی جاتی تھیں۔ سر سید فنڈ کے لیئے ہر قسم کے عطیات وصول کیے جاتے تھے۔ اس طرح ایجوکیشنل کانفرنس کے کارہائے نمایاں میں سے یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے علی گڑھ کالج کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بالکل ابتدائی دور میں مکمل تباہی سے بچا لیا۔

کانفرنس کی کوششوں سے ملک میں مختلف مقامات پر مسلمانوں کے کافی اسکول قائم کیے گئے۔ سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی اجازت دلوائی گئی۔ تصنیف و تالیف و تراجم کے ذریعے اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت کی گئی۔ اصلاح تمدن کے وسائل فراہم کیے گئے۔ ہزار ہا ضرورت مند طلبا کو لاکھوں روپیے کے وظائف دیئے گئے۔ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے ہر ممکن اور مناسب طریقہ اختیار کیا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں شعبہ "ترقی اردو" قائم کیا گیا جس کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی بنائے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبد الحق اس کے سکریٹری ہوئے جو بعد میں بابائے اردو کہلائے۔ اردو کالج کراچی اسی انجمن کا فیض ہے۔ ۱۹۰۶ء میں کانفرنس کے اجلاس ڈھاکہ کے موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ جیسی مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس کے ذریعے برصغیر کے مسلمان ترقی کی نئی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔ ہز ہائی نس سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم

مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا حسرت موہانی۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور آخر میں قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں اس سیاسی تنظیم نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو عالم وجود میں آئی۔ ان سب کارناموں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس نے برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی میں آب حیات کا کام دیا اگر ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں نہ آتا تو آج کے ذہنی اور انقلابی خیالات کا وجود ہی نہ ہوتا۔

طالب علمی کے زمانے سے صابری صاحب کی کانفرنس سے دلچسپی

میرے والد الحاج سید محمد خصلت حسین صابری مرحوم و مغفور ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ کالج میں بی اے۔ کے طالب علم تھے۔ اسی سال دہلی میں جشن تاجپوشی جارج پنجم منایا گیا۔ کانفرنس کا پچیسواں اجلاس بھی اس موقع پر نہایت شان و شوکت سے منایا گیا۔ یہ اجلاس عربک اسکول دہلی کی وسیع عمارت اور ملحقہ کشادہ میدان میں منعقد کیا گیا تھا۔ ہز ہائی نس آغا خان نے اس اجلاس کی صدارت اس شرط پر قبول کی تھی کہ کانفرنس کے انتظامات کے لئے دہلی کے مقامی حضرات کو تکلیف نہ دی جائے کیونکہ وہ تاجپوشی کی وجہ سے مصروف ہوں گے۔ لہٰذا جملہ تیاریاں علی گڑھ سے کی جائیں اور ایسا ہی کیا گیا۔ مگر آغا خان دیگر مصروفیات کی وجہ سے صدارت نہ کر سکے اور ان کی جگہ مولوی سید حسین بلگرامی نے صدارت کی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان ان دنوں کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ انھوں نے دو معتمد اشخاص یعنی مولوی محمود احمد عباسی اور مولوی انوار احمد زبیری کو دہلی میں انتظامات کے لئے تعینات کیا۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے طلبا کا بھی ایک دستہ رضاکارانہ طور پر دہلی گیا تھا جس میں والد صاحب بھی شامل تھے۔ والد صاحب اس کانفرنس اور اس کی دلچسپیوں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے اس کی کئی وجوہ تھیں۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری مرحوم مصنف (مسلمانوں کا روشن مستقبل) سے مرزاپور سے تعلقات تھے۔ میرے دادا سید محمد مبارک حسین صاحب مرحوم مرزاپور میں ناظر تھے اور مولانا سید طفیل احمد صاحب سب جج تھا دونوں میں بہت دوستی تھی۔ میرے والد کی پیدائش بھی مرزاپور محلہ واصلی گنج پتھر والے مکان میں ۲۲ جون ۱۸۸۶ء میں ہوئی مولانا کے مشورہ پر ہی والد صاحب کو علی گڑھ بھیجا گیا تھا۔ نیز یہاں پر یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ میرے پردادا یعنی سید محمد اکرام حسین صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء میں ضلع اٹاوہ کے ڈپٹی کلکٹر تھے سر سید احمد خان کے بڑے مداح اور ان کی تحریک کے حامی تھے انھوں نے علی گڑھ تحریک کی دامے۔ درمے۔ قدمے سخنے خود بھی اعانت کی نیز دوسروں سے بھی مدد کروائی۔ اسی وجہ سے اکرام حسین صاحب کے نام کی پتھر پر کندہ تختی اسٹریچی ہال میں نصب ہے۔

علی گڑھ کالج ترقی کی راہ پر گامزن تھا اور اس کے طلبا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تاج پوشی کی وجہ سے دہلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا اور اس کی چہل پہل میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ کانفرنس کے انتظامات اعلیٰ پیمانہ پر کیے گئے تھے۔ اجلاسوں میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوئے۔ والئی بھوپال مہاراجے، امیر الامراء۔ شہزادے۔ حکومت کے ارکان۔ کانفرنس کے اکابرین، سبھی طرح کے لوگ موجود ہوا کرتے تھے جس نے کانفرنس کی شان کو دو بالا کر دیا تھا۔ کانفرنس کے ایک اجلاس

کی صدارت ہز ہائی نس بیگم بھوپال نے کی۔ تقریر کرنے والوں میں ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب بڑودہ نے کارکنان کانفرنس کی اعلیٰ کارکردگی اور حسن انتظام پر حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے مسلم یونیورسٹی کی اسکیم کے متعلق جو اس زمانہ میں مسلمانوں کا تعلیمی نقطۂ نگاہ سے محبوب اور اہم ترین مسئلہ تھا اس پر سر ہارکورٹ بٹلر ممبر تعلیم حکومت ہند نے اردو میں ایک مختصر اور ولولہ انگیز تقریر کی جس کی وجہ سے سر سید فنڈ یعنی مجوزہ یونیورسٹی کے لیے چندہ وصول کرنے میں بڑی آسانی ہوئی مہاراجہ دربھنگہ نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی اور بیس ہزار روپے عطیہ کا اعلان کیا غرض کہ دہلی والا کانفرنس کا پچیسواں اجلاس نہایت اہمیت والا اور تاریخی تھا

کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی
منعقدہ علی گڑھ ۱۹۳۷ء

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اڑتالیسواں سالانہ اجلاس بمقام علی گڑھ جناب نواب سی عبدالحکیم مدراسی کی صدارت میں منایا گیا۔ اسی موقع پر کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی بھی منائی گئی۔ اس کانفرنس کا پروگرام ہمہ گیر اور وسیع تھا۔ اس میں بارہ شعبہ قائم کیے گئے تھے۔ ہر شعبہ کا ایک صدر ایک سکریٹری الگ الگ تھا۔ شعبۂ ابتدائی تعلیم اور مدارس اردو کے صدر سید آل علی نقوی انسپکٹر مدارس اسلامیہ یو۔پی۔ تھے۔ اور شعبۂ لٹریسی تعلیم بالغان کے صدر مولانا سید طفیل احمد صاحب تھے۔ والد صاحب ان دنوں لکھنؤ ڈویژن کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس اسلامیہ تھے۔ اور لکھنؤ سے کانفرنس میں شرکت کے لیے علی گڑھ آئے تھے۔ انھوں نے سید آل علی نقوی صاحب اور مولانا سید طفیل احمد صاحب دونوں کے شعبوں میں بھرپور معاونت کی۔ خاص طور پر ابتدائی مدارس اور توسیع تعلیم بالغان کے لیے ہر دو حضرات کو جو تجاویز پیش کی تھیں وہ بے حد پسند کی گئیں۔

اس اجلاس میں شعبۂ تعلیمی نمائش بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس میں مختلف صوبوں سے صنعت کاری کے نمونے نادر مخطوطات اور قلمی کتب۔ سید نزار حسین کاظمی آرٹسٹ کے بنائے ہوئے مرقعے۔ سکے اور ڈاک کے ٹکٹ۔ طبیہ کالج علی گڑھ کے جدید آلات اور مجسمے۔ مختلف صوبوں کے اسلامی مدارس کی سرگرمیوں کے چارٹ جس سے ہر صوبہ کی تفصیلی کیفیت معلوم ہوتی تھی پیش کیے گئے تھے۔ والد صاحب نے اس نمائش میں کلام پاک کے دو نادر اور قلمی نسخے بھی رکھے تھے۔ ایک کلام پاک جلی حروف میں شہنشاہ اورنگ زیب کی تحریر کا اور دوسرا قلمی کلام پاک پنج سورہ کے سائز کا۔ جلی حروف میں لکھا ہوا کلام پاک دس دس پاروں کی تین جلدوں میں تقریبا ۱۵"×۲۷" کے سائز میں تھا۔ یہ کلام پاک میرے پھوپھی زاد بھائی سید محمد نثار حسین۔ ایم۔اے۔ ایل۔ٹی۔ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول الہ آباد کے پاس موجود ہے اور پنج سورہ کے سائز کا قلمی کلام پاک میرے پاس موجود ہے یہ دونوں قلمی کلام پاک سید محمد اکرام حسین صاحب یعنی میرے پردادا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کانفرنس کے زمانہ میں میں اپنے اسکول کے اسکاؤٹس کا ٹروپ لیڈر تھا اور زیر نگرانی انچارج تعلیمی نمائش جملہ سامان کی دیکھ بھال میرے ٹروپ کے سپرد تھی۔ اس نمائش میں میں نے ڈاک کے ٹکٹوں کی کثیر تعداد کو انوکھے اور دلکش انداز میں پیش کیا تھا۔ ٹکٹوں سے WEL COME بنایا

تھا۔ ہر انگریزی حرف کا الگ فریم تھا۔ نمائش میں داخل ہونے والے صدر دروازے کے بالکل سامنے کی دیوار پر اسے "خوش آمدید" کو ترتیب سے آراستہ کیا گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے یہ انداز بہت سراہا۔ جوبلی کے موقع پر کانفرنس نے مجھے دو طلائی تمغے بھی مرحمت فرمائے تھے۔ ایک سامان نمائش کی نگرانی کے سلسلے میں حسن کارکردگی پر اور دوسرا ڈاک کے ٹکٹوں کو نئے انداز میں پیش کرنے پر۔

کانفرنس کا باونواں اجلاس
بمقام علی گڑھ ۱۹۴۳ء

۱۹۴۳ء میں والد صاحب علی گڑھ بحیثیت ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس پہنچ چکے تھے اسی سال کانفرنس کا باونواں ۵۲ اجلاس زیر صدارت نواب ظہیر یار جنگ (حیدر آباد دکن) منایا گیا۔ والد صاحب چونکہ خود علی گڑھ میں موجود تھے اس لئے انھوں نے اجلاس میں بڑے انہماک سے حصہ لیا۔ اس اجلاس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ نواب بہادر یار جنگ نے شرکت کی۔

۲۔ جناب پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیم سندھ۔ سندھ سے تشریف لائے۔

۳۔ کمال یار جنگ کمیٹی کی مشہور رپورٹ پیش کی گئی۔

۴۔ نواب ظہیر یار جنگ نے انجینئرنگ کے سولہ ۱۶ طلباء کے لیے بیس ۲۰ روپے فی کس کے وظائف مقرر کیے۔

اس اجلاس کے بعد ہندوستان میں کانفرنس کے دو ۲ مزید اجلاس ایک جبلپور ۱۹۴۴ء میں سر عزیز الحق کلکتہ والے کی صدارت میں اور دوسرا آگرہ ۱۹۴۵ء زیر صدارت شہید ملت لیاقت علی خاں منعقد ہوئے تھے ہندوستان میں کانفرنس کا آگرہ والا اجلاس آخری تھا اس کے بعد ملک تقسیم ہوگیا۔

جون ۱۹۴۵ء میں مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم نے جناب سید الطاف علی بریلوی کے اردو ادب سے شغف اور ان کے تاریخی اور تحقیقی اعلیٰ ذوق کا والد صاحب سے پہلے ہی ذکر کیا تھا۔ خاص طور پر ان کی معرکۃ الآرا کتاب "حیات حافظ رحمت خان" کی تعریف کی تھی اور اسی زمانے میں ولایت منزل علی گڑھ ڈپٹی حبیب اللہ خان صاحب مرحوم کی کوٹھی پر مولانا نے الطاف صاحب کا والد مرحوم سے تفصیلی تعارف کرایا تھا۔ والد صاحب جب ۱۹۴۳ء میں تبادلہ ہوکر علی گڑھ آگئے تو سید الطاف علی بریلوی صاحب سے ان کے مراسم اور زیادہ بڑھ گئے اور والد صاحب سید صاحب کی ذوق علمی کے قائل سے قائل تر ہوتے گئے۔ والد صاحب کہا کرتے تھے۔ "سید صاحب موصوف میں تصنیف و تالیف کے کاموں کے علاوہ انتظامی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جتنا بڑا جلسہ یا اجلاس ہوتا سید صاحب اس کے انتظام میں اتنی ہی خوش سلیقگی کا ثبوت دیتے اور نہایت خندہ پیشانی سے دوسروں کے دل موہ کر کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں"۔

آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس کا قیام

تقسیم ملک اور پاکستان قائم ہونے کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرہ عمل صرف منقسم

ہندوستان تک محدود ہو گیا اس لیے پاکستان میں تعلیمی ترقی کو قائم رکھنے کے لیے اس ادارے کی انتہائی ضرورت تھی۔۔۔ جناب سید الطاف علی بریلوی صاحب جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان پہنچے اور والد صاحب ۱۳ ستمبر ۱۹۵۰ء کو کراچی پاکستان آگئے۔ سید صاحب علی گڑھ کانفرنس کے سر دفتر تھے انھوں نے اپنے سابقہ تجربہ کو بروئے کار لاکر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی پندرہ ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء کو بنیاد رکھی۔ اس سلسلے کا مجلس شوریٰ کا پہلا اجلاس الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاولپور کی کوٹھی "دارالسلام" واقع جمشید کوارٹر منعقد ہوا جس میں والد صاحب بھی شامل تھے مرحوم آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے لائف ممبر تھے اور آخر دم تک سید صاحب کا ساتھ دیتے رہے۔

از پروفیسر شہباز

سرسیّد

ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

وہ سرسید کہ جس کی زندگانی تھی
حیات اس کی ہماری زندگی کی نشانی تھی

جسد میں قوم کے تھا جو بعینہٖ قلب کی صورت
بھلائی میں تمام اعضا کی جس کی جانفشانی تھی

رگ وپے میں کبھی وہ دوڑتا تھا خون کی صورت
رواں پر رواں آسا کبھی اس کی روانی تھی

عیونِ قوم کی پتلی اسی کی خوش نگاہی تھی
لسانِ قوم کی بولی اسی کی خوش بیانی تھی

مچا رکھی تھی اس نے ہند میں اک لوٹ چندے کی
بچا اس کے قطاول سے نہ راجہ تھا نہ رانی تھی

گورنر وائسرائے اس سے برابر رائے لیتے تھے
اسے حکامِ بالا پر بھی حاصل حکمرانی تھی

یہ وہ لوتھر تھا جس کو عقل کل تھی علیٰ دوراں
یہ وہ اکبر تھا جس کو صلح کل مریم زمانی تھی

وہ لفظوں کا شناور بھت قلزم پار اتر جاتا
وہ معنی کا سمندر جس کی مشکل تھا وہ پانی تھی

اثر اعجاز کا تھا اس کے دردانگیز نالے میں
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دیدۂ بینائے قوم سر سید احمد خاں

سیّد الطاف علی بریلوی

ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان آپ اپنے لئے سب سے بڑا استاد ہے۔ دنیا کے تمام واقعات اس پر گزرتے ہیں اور ان کے اثرات سے جس قدر وہ واقف ہوتا ہے دوسرا کوئی نہیں ہوتا اور ان سے اس کو عبرت پکڑنے کا سب سے زیادہ موقع ملتا ہے۔ ناکام جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید نے جس درد کو اپنے دل میں جگہ دی تھی وہ آخر دم تک ان کے ساتھ رہا اور جس حوصلے اور ہمت سے اس دور کے اندھیرے میں انھوں نے اجالا پھیلانے کی کوشش کی اس نے ان کو کبھی آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ مذہبی تعصبات، ذاتی عناد و کدورت اور عام افلاس و جہالت نے مسلمانوں کو تنزلی کی اس آخری حد تک پہنچا دیا تھا جس کے بعد تباہی و بربادی کی کوئی منزل باقی نہیں رہتی۔ سر سید ایسے شخص ہیں جن کی آنکھیں زوال سلطنت اسلامیہ کی آخری گھڑیاں بھی دیکھ چکی تھیں لیکن جب آفتاب اقبال غروب اور افق ہند بالکل تاریک ہوگیا تب بھی ان کی آنکھیں معجزانہ طور پر کھلی رہیں اور انھوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ مرنے کے بعد ان کا نام نامی ہمیشہ کے واسطے زندۂ جاوید ہوگیا۔ مولانا حالی نے سر سیّد کی لائف "حیات جاوید" لکھی، جو کہ ان کا ہیرو جاندار تھا اس لئے ایک ایسی کتاب مرتب ہوگئی جس کی بابت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے اس کے تبصرے میں لکھا کہ "اگر کوئی شخص دنیا میں بڑے بڑے کام کر کے اس شوق میں جان دیدے کہ اس کو ایسا سوانح نگار ملے گا جیسا کہ سر سید کو ملا تو ہمارے خیال میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس نے سستا سودا خریدا"

سر سیّد کی زندگی کا اصلی معرکہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا عہد زریں اس وقت ختم ہوا جب کہ انیسویں صدی کے کمالات ظاہر ہوچکے تھے اور نظام عالم ایک عظیم الشان انقلاب کے لئے آمادہ نظر آتا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں اس انقلاب کا اثر اس لئے غیر معمولی ہوگیا کہ اسلامی حکومت کا زوال اور انیسویں صدی کا آغاز یعنی دنیا کے دو زبردست انقلابات ایک ہی وقت میں واقع ہوئے اور سر سید کی یہ کوشش رہی کہ دورِ جدید کو اس طرح اپنائیں کہ ماضی کی عظمت بھی فراموش نہ ہو۔ سر سید قدیم سوسائٹی کے فرزند رشید تھے اور جدید سوسائٹی میں انھیں کام کرنا تھا۔ سر سید کی لائف اس امر کا قطعی فیصلہ ہے کہ جب تک جدید تربیت کے ساتھ قدیم اوصاف مسلمانوں میں پیدا نہیں کئے جائیں گے اس وقت تک تعلیم جدید سچے مسلمان پیدا نہیں کر سکتی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ جب تک جدید تعلیم کی برقی قوت کے زور سے قدیم صفات کے اکڑے ہوئے جسم میں حرارت پہنچا کر حرکت نہ پیدا کی جائے اس وقت تک وہ کارآمد نہیں ہوسکتا۔ سر سید کی کوشش رہی کہ محبت و ارتباط، خلوص و نیکدلی، امنگ و زندہ دلی، علمی ذوق، مردانہ فنون، غرض وہ تمام اوصاف جو ایک صحتمند معاشرے کے لیے ضروری ہیں مسلمانوں میں پیدا ہو جائیں

سر سید نے مشرق و مغرب میں ہم آہنگی پیدا کرکے اصلاح معاشرت اور علمی و تعلیمی خدمات کے ماسوا قوم میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیئے بھی بے پناہ کوشش کی اور اس میدان میں انھوں نے جو کام کیئے وہ ان کی سیاسی قابلیت، بیدار مغزی، اصابت رائے اور مضبوط عزم و ارادہ کا ثبوت ہیں چنانچہ ہندوستان کی سیاسی حالت کا بخوبی اندازہ کرنے کے بعد جب انھوں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی کوشش کی تو ساتھ ہی ساتھ ان میں وہ طاقت بھی پیدا کرنا چاہی جو مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی روز افزوں ذمہ داریوں کو پورا کرسکیں اور ان کی سعی نے مسلمانوں کو بالآخر ایسی شاہراہ پر پہنچا دیا جہاں سے وہ بلا خوف و خطر منزل مقصود پر اغیار کی اعانت و رہبری کے بغیر پہنچ سکے۔

ایک عرصہ تک قولاً اور عملاً سر سید ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کرتے رہے لیکن جب ان کو اندازہ ہوا کہ انگریز حکمرانوں اور ہندو اکثریت کو مسلمانوں سے دلی عناد ہے تو انھوں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ "اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا"۔ یہیں سے دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔ جو بالآخر تقسیم ملک پاکستان اور بھارت دو آزاد ملکوں کے قیام پر منتج ہوا۔

جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بقول سر سید احمد خاں دنیا کی ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی قوم کی بے لوث خدمت کی اور اپنی پس ماندہ اور خوابیدہ قوم کو محکومی و غلامی کی زندگی سے نجات دلانے کی جد و جہد میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ بابائے اردو نے انھیں مصلح اعظم کا خطاب دیا ہے کیونکہ انھوں نے قوم کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کے لیئے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس سے ان کی قوم کو فائدہ پہنچ سکتا تھا لیکن لوگ ان کے مشن کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے حتیٰ کہ غیر تو غیر اپنوں نے بھی انھیں طرح طرح کے خطابات سے نوازا۔ ایک نے کہا یہ کافر ہوگیا ہے دوسرے نے کہا کہ یہ انگریزوں کا خوشامدی ہے اپنا مطلب پورا کرنے کے لیئے ساری قوم کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانا چاہتا ہے اس کی باتوں میں مت آؤ۔ کسی نے انھیں "کرسٹان" اور کسی نے بے دین کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ ان کے خلاف مضامین لکھے گئے اور ان کی خوب تشہیر کی گئی۔ ان کے کام میں کاوٹیں پیدا کی جاتی تھیں مگر وہ سب باتوں سے بے نیاز اپنے مشن کو چلاتے رہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے ان کے مخالفین کا طوفان امنڈ آیا تھا مگر وہ اپنے بلند عزائم کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے رہے

دراصل زمانے نے ہر اس شخص کی مخالفت کی ہے جس نے قوم کی اصلاح کرنی چاہی۔ سر سید کے مخالفین نے بھی انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر اپنا حق ادا کیا مگر سر سید ایک مستقل مزاج اور بلند حوصلہ انسان تھے، انھوں نے مخالفین کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اپنی دھن میں کام کرتے چلے گئے۔ بڑی بڑی مخالفتوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور یہی وہ سبق ہے جو ہمیں سر سیّد کی زندگی سے حاصل کرنا چاہیئے [1]

---

[1] اس مضمون کی ترتیب میں متعدد اہل قلم کی تحقیقات سے استفادہ کیا گیا ہے (برلیوی)

تعلیمات
مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مُرتّبہ
آنسہ شاہنیہ رشید بی۔ اے

مولانا شروانی نے ۱۲ رشعبان ۱۳۱۳ھ کو جو تحریر ایک تقریب شادی میں پڑھی تھی۔ اس کے کچھ حصے یہ تھے۔

"صاحبو! عید تو عید شادی بیاہ میں خوشی اور چہل پہل کیسے ہو یہ سارے جلوے ہیں آپس کے میل جول، باہمی محبت وارتباط کے اور دلوں کے انبساط کے یہاں آپس میں کشمکش اور نفسانیت سے یہ عالم ہے کہ دنیا ہم پر تنگ ہو رہی ہے اور ہم خود اپنی جانوں سے بیزار بیٹھے ہیں، پھر کیسی خوشی اور کہاں کا ولولہ"

ہاں حضرات! جب یہ شامت اعمال ہمارے ہاتھوں سے ہمارے سروں پر آئی ہے تو ہمیں کو اس کا چارۂ کار سوچنا چاہیئے۔ اور اس پر عمل کرنا ضرور ہے "اب علاج کیا ہے؟ اس میں بحث ہے" آپ فرماتے ہیں کہ اول تمام برادری میں اتفاق قائم ہو، اور کل جھگڑے جو عدالتوں میں دائر ہیں یا تھے، پنچایت سے طے ہوں اور باہم یہ عہد ہو جائے کہ آئندہ نہ جھگڑیں گے، جب یہ سب کچھ ہو لے تو پھر مدرسہ ہے۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو، یہ تدبیر عمدہ ہے مگر مجھ کو اس میں شبہ ہے کہ یہ تدبیر سرسبز بھی ہونے والی ہے یا نہیں۔

میرے خیال میں اول یہ طے ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے مقصود کیا ہے؟ ہم نے اپنے ذہن میں تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ ان میں پھر باہمی ہمدردی، اولو العزمی اور راست بازی پیدا ہو اور پھر وہ اپنے باپوں کے سپوت ہوں اسی کے ساتھ صفات قائم رہیں، اور اسی ضمن میں ان کو تعلیم کے اس سے کمتر درجہ کے فوائد بھی مثل ملازمت وغیرہ

لہ سوانح حیات نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۲ء

نصیب ہوں۔" ان مقاصد کے حصول کے
واسطے ضروری ہے کہ قوم کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم
دی جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم اول
اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوائیں۔ اس کے
بعد انگریزی پڑھائیں اور اس طرح اس
ہلاکت سے ان کو بچائیں جن میں اکثر انگریزی
طلبہ پڑتے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک شہر
میں مولوی نورالدین صاحب نے انگریزی
اسکول کے طلبہ سے نماز کی بابت پوچھا تو
معلوم ہوا کہ ان کو الحمد بھی یاد نہ تھی۔ خود
سید صاحب نے بھی اس طوفان بے تمیزی
کو تسلیم کیا ہے۔ جب یہ عالم ہے تو کس طرح
اپنے لخت جگر بچوں کو آگ میں جھونک دیں؟

بس ضرور ہے کہ ہم اول اپنے بچوں
کو ضروری دینی تعلیم دلوائیں تب مدرسوں
میں بھرتی کریں، اور اس واسطے ضروری
ہے کہ ابتدائی تعلیم کا بندوبست اپنے ہاتھوں
میں رکھیں ص۸۵"

۱۹۲۶ء کے صوبائی اجلاس سہارنپور کے آپ صدر ہوئے
اس میں آپ نے فرمایا:۔

"صاحبو! کسی فرد یا قوم کا کیرکٹر وہ
خصلت راسخہ ہے جو اس کو مشکلات و مصائب
میں راحت و عیش میں، غم و خوشی میں، صحت و
مرض میں، افلاس و دولتمندی میں غرض زندگی
کے تمام پست و بلند تلخ و شیریں مرحلوں میں
اس طریقے اور اصول پر مضبوطی سے قائم و
ثابت رکھے، جو اس کے دل میں کسی درسگاہ
یا صحبت و تعلیم کی تربیت نے نقش کر دیا ہو
اور جس کا یہ اثر ہو کہ وہ انسانی کمزوریوں سے
بلند ہو کر زندگی کے معرکوں میں مردانہ ہمت
و عزم کے ساتھ در آئے حصول کامیابی میں
کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے، کامیاب
ہو یا نہ ہو، کیرکٹر کے اصلی تار و پود ایک قوم کا
کلچر، اس کی تاریخ اور اس کا مذہب ہے۔
اس کی روح وہ مقصد بلند ہے جس پر قلب
کی شیفتگی موقوف ہے۔ یہ مرتبہ تربیت کی
قوت سے حاصل کرے کہ جان، مال، راحت
و عافیت غرض ساری کائنات کا اس پر
قربان کر دینا آسان ہو۔ مدارس عربیہ کے
بارے میں فرمایا " دین کو یونانیت کی گرانباری
سے نجات دے کر طلبہ کے سینے انوار سے معمور
کئے جائیں جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے
منعکس ہوں معلوم نہیں علوم دین کا نام
لے کر کب تک ارسطو و افلاطون کے علم بردار
ہمارے مدارس رہیں گے۔ صدیوں سے
نوبت یہ ہے کہ حکمائے یونان دین اسلام کے
حاجب بنے ہوئے ہیں، جس طرح خلفائے
بغداد کے دربار میں حاجب ہوتے تھے [1]"

---

[1] رپورٹ اجلاس ہشتم ۲۰

کانفرنس کا ۴۹واں اجلاس ۱، ۲، ۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ میں ہوا، جس کی صدارت مسٹر فضل حق نے کی، بحیثیت آنریری سکریٹری، مولانا نے اپنی رپورٹ میں واردھا اسکیم اور ودیا مندر تعلیمی پروگرام کو سامنے رکھ کر فرمایا :۔

"اس وقت جب کہ "تعلیم" ایک جدید سانچے میں ڈھل رہی ہے، مسلمانوں کو جو کچھ کرنا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے کرنا چاہیئے، اتحاد فکر و عمل کی جتنی ضرورت آج ہے، کبھی نہ تھی اس موقع پر مسلمانوں کا اختلاف رائے ان کے قومی و تعلیمی مقاصد کے لئے سخت مضر ہوگا۔

گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تعلیم کے متعلق جس قدر اہم مسائل پیش آئے کانفرنس نے ان سب میں نمایاں حصہ لیا اور اس سلسلے میں بہت سی خدمات انجام دیں اور مفید لٹریچر شائع کیا۔ آج پھر اسی قسم کا ایک موقع آگیا ہے کیوں کہ جدید تعلیمی اسکیموں نے مسلمانوں میں ایک گونہ اضطراب پیدا کر دیا ہے، اور وہ اپنے تعلیمی مستقبل کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں اس لئے اشد ضرورت ہے کہ اس وقت ہندوستان کے ماہرین تعلیم کانفرنس جیسے آل انڈیا ادارہ کے سالانہ اجتماع میں جدید تعلیمی اسکیموں پر غور کر کے اپنا تعلیمی نصب العین متعین کریں۔

حضرات! مسلمانوں کا ایک تعلیمی دور جس کا آغاز سرسید احمد خاں مرحوم کی سعی و ہمت سے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ہوا تھا، گزر گیا۔ اور اب دوسرا تعلیمی دور شروع ہو رہا ہے پچھلا دور کامیاب رہا یا ناکام اور مسلمانوں نے گزشتہ ساٹھ برس میں تعلیم کے سلسلے میں جو جدوجہد کی وہ مفید و نتیجہ خیز ثابت ہوئی یا بے سود، یہ ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں، جن پر اس وقت کسی مفصل بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ اب دفعتاً نہایت اہم تعلیمی مسائل ہمارے سامنے آگئے ہیں، جن پر ہمیں غور کرنا ہے اور فیصلہ کرنا ہے، لہٰذا اب ماضی پر شکوہ سنج ہونا یا اس کی افسوس ناک داستان بیان کرنا کچھ ضروری نہیں، اس لئے ہمیں مستقبل کی تعمیر میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ اور جو قلیل فرصت اس وقت ہمیں میسر ہے اس میں متفق الکلمہ ہو کر یہ طے کر لینا چاہیئے کہ کہ آئندہ ہمارا تعلیمی نصب العین کیا ہوگا۔ اگر کانفرنس کے اس اجلاس میں جو صوبۂ بہار کے دار الحکومت میں ہو رہا ہے مسلمانوں نے اپنا تعلیمی نصب العین متعین کر لیا، اور مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر لیا تو یہ واقعہ صوبۂ بہار کے لئے ایک تاریخی یادگار ہوگا، اور ہمیشہ یہ کہا جا سکے گا کہ مسلمانوں کے دوسرے دور کا آغاز بہار کی سرزمین سے ہوا[۵]۔"

۵۔ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس ۳۲-۳۳

مولانا نے صدارتی تقریر میں اردو کی ترقی کے لئے بہت سی مفید تجویزیں رکھتے ہوئے کہا۔

"کسی قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کا اندازہ اس کے لٹریچر سے کیا جاتا ہے، اس معیار کے لحاظ سے ہماری قومی زبان کا لٹریچر یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں ابھی پس ماندہ ہے، مذہب، تاریخ اور افسانوں وغیرہ کے سلسلے میں اچھی اور معمولی کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن دوسرے علوم و فنون کے متعلق ابھی بہت کچھ کرنا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ علماء اور مغربی علوم کے تعلیم یافتہ نوجوان، تراجم و تصانیف کے ذریعے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

اردو کے خلاف جو پروپگنڈا جاری ہے اس کا صحیح و معقول جواب صرف یہی ہے کہ ہم اپنی مسلسل محنت و کاوش سے اردو لٹریچر میں معیاری کتابوں کا اس قدر اضافہ کردیں کہ دوسری زبانیں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں اور پھر کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہو۔"

اس اجلاس کا پہلا رزولیوشن یہ تھا کہ "کانفرنس کا یہ جلسہ ارباب مسلم یونیورسٹی سے درخواست کرتا ہے کہ علی گڑھ کی مرکزی حیثیت کو اور مستحکم کرنے، اعلیٰ تعلیم کو زیادہ مفید جامع اور معیاری بنانے کے لئے یونیورسٹی میں جلد از جلد اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے تاکہ سرسید نے ورناکیولر یونیورسٹی کا جو خواب آج سے ۵۷ سال پہلے دیکھا تھا، پورا ہو۔"

ص ۱۲۵ تا ۱۲۱

۸ مارچ ۲۵ء کے ندوۃ العلماء کے اجلاس لکھنؤ کے صدارتی خطبے میں فرمایا:۔

"علمائے ربانی کی معاملات دنیوی سے کنارہ کشی اور فرمانرواؤں کا ان کے مشورل سے محروم رہ جانا عالم اسلامی کے لئے مصیبت عظمیٰ تھی۔ اس میں پھر کوئی شبہ نہیں کہ یہ کنارہ کشی خود علماء کے حق میں بھی اس پہلو سے مفید نہیں ہوئی کہ دنیا کے معاملات سمجھنے اور ان کے حل و عقد کا ملکہ رفتہ رفتہ افسردہ ہوکر رہ گیا، عامۂ مسلمین اپنے معاملات میں ان کی رہنمائی سے محروم ہوگئے۔ نتیجہ ظاہر ہے آج صدیوں سے مسلمانوں میں دو گروہ ہیں، دیندار اور دنیادار۔ اسلام یہ تقسیم لے کر نہیں آیا تھا، ایک مسلم کی دنیا اس کے دین سے اور دین اس کی دنیا سے علیٰحدہ نہیں، حضرات! سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ظہور انبیاء کے اس طبقے میں ہوا جو جامع نبوت و حکومت تھے، مثلاً حضرت موسیٰ و داؤد و سلیمان علیہم السلام خلافت راشدہ کے دور میں سب سے بڑی دنیادار اور سب سے بڑی دین دار شخصیت ایک ہی ہوتی تھی، یعنی خلیفۂ وقت، عشرہ مبشرہ میں غالب

تعداد ایسے بزرگوں کی ہے جو دولت و معاملت میں ممتاز تھے؛

ضروری ہے کہ طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم دونوں میں اصلاحِ کامل ہو جس سے معاملہ فہم، معاملات عالم سے باخبر علماء پیدا ہوں جو عملی زندگی میں داخل ہو کر اپنی قوت فہم و فراست اور معاملہ دانی کا سکہ اہل معاملہ اور کاروباری دنیا کے دلوں پر بٹھا دیں، جب یہ سکہ چلے تو ہدایت و رہنمائی اس کا نشان ہو، اور دین کا بول عالم میں بالا ہو جائے ——— ندوۃ العلماء نے نصاب کی اصلاح سے یہی مقصد پیش نظر رکھا، اس کے ابتدائی عہد کی تحریریں پڑھیے میرے بیان کی شہادت ملے گی ——— دار العلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم و تربیت کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنی تعلیم میں علم آموزی و ذوقِ علمی کا اہتمام کتاب آموزی سے زیادہ کیا ہے، تربیت میں حوصلہ اور بلند نظری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ظہور وہ ثمرات ہیں جن کا نمونہ ابھی ملاحظہ ہوا"[1] ص ۱۲-۱۳

"مضامین ثلاثہ" کی تقریر میں انھوں نے کہا:

"جو کوششیں مسلمان نوجوانوں کی انگریزی تعلیم میں کی جاتی ہیں۔ ان کا موضوع صرف یہ ہے کہ یورپین علوم و فنون میں ان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل ہو۔ پس یہ طلبہ اپنا تمام وقت ساری دماغی قوت، اور کل آرام و آسائش اسی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں۔ مجھ کو یاد ہے کہ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میرے کلاس میں اس امر کا فخریہ چرچا ہوتا تھا کہ فلاں طالب علم خواب بھی انگریزی میں دیکھتا ہے۔ "یعلمون ظاھراً من الحیوٰۃ الدنیا" میں ندوۃ العلماء میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ اگر یہ سب کچھ ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کے ہوا، لیکن طلبہ مذہب سے واقف بلکہ اس کے پابند نہ ہوئے تو کیا ہوا۔ ص ۱۲۶-۱۲۷

——— ایک اور قابل غور امر مسلمانوں کی مذہبی مداہنت اور سہل انگاری ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی پابندی اور دینی سرگرمی میں بہت کچھ فتور آ گیا ہے، اور اس کی وجہ سے ان کے اخلاق اور باہمی تعلقات اس درجہ خراب ہو گئے ہیں۔ اور ان کے معاملات میں اس درجہ کھوٹ پیدا ہو گئی ہے کہ وہ گویا خود انتشار کی ایک مثال بن گئے ہیں ——— غرض اے حضرات! مسلمانوں پر ایک عالم طاری ہے جس پر ہر طرف عبرت برستی اور مایوسی اپنی شکل دکھاتی ہے۔ اب دو صورتیں ہیں یہ یا اپنے رسول پاک کی امت کو تباہ ہوتے دین و دنیا کا خسران اٹھاتے دیکھیں، اور

---

[1] خطبۂ صدارت اجلاس ندوہ ۱۹۲۵ء ۱۳-۱۸

ہم اپنے مشاغل میں مصروف رہیں، یا کمر ہمت
چست باندھیں۔ جان، دل اپنے بھائیوں
کی ہوا خواہی میں لڑا دیں اور پروردگار عالم
کی بندہ پروری و ذرہ نوازی پر نظر رکھ کر
یہ آیت پڑھیں "والذین جاھدوا
لنھدینھم سبلنا وان اللہ
مع المحسنین"[1]

۲۷ مارچ ۱۹۰۶ء کے جلسہ ندوۃ العلماء میں مولانا شروانی
نے دار العلوم اور علماء کی ضرورت پر مضمون پڑھا اور
دبستان دہلی کی خصوصیات گناتے ہوئے کہا۔

"جو لوگ اس دار العلوم سے پڑھ کر
آتے وہ کمالات علمی و مجموعی صفات انسانی
کے نمونے، شگفتہ دماغی کے گلدستے ہوتے
تھے، وہاں کے پڑھے ہوئے علماء میں ایسے
نمونے بھی تھے، جو علوم عربیہ میں فاضل،
ادب عربی و فارسی بلکہ اردو پر قادر طب
میں صاحب دستگاہ، ظریف الطبع اور
اس کے ساتھ مرتاض و تہجد گزار ہوتے
افسوس کہ اب وہ علمی مجالس ویران ہو گئیں
جن سے کمال کے بازاروں میں سناٹا
چھا گیا اور وہ انسانوں کے ڈھلنے کے سانچے
معدوم ہو گئے ؎

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند
سماع بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشان بلبل ازیں باغ از کہ می پرسی
برد کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند[2]

اکتوبر ۱۹۵۲ء کے ندوۃ العلماء کے جلسہ نہم میں تقریر میں کہا:

"مغربی شائستگی حاصل کرنے دینی
مناصب و سربلندی کا اہل بننے اور ہمسایہ
قوموں کا ترقی میں مقابلہ کرنے کے واسطے مغربی
تعلیم و تربیت کا حاصل کرنا لازم ہے۔" آپ نے
قوم کی ترقی میں علماء کے کردار کی اہمیت بتاتے
ہوئے کہا۔ "ہمارا مروجہ عربی نصاب اس نقص
کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔ وہ علماء کی ضرورت
کو پورا نہیں کر سکتا، جو تغیر زمانہ
سے پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ ان کی خدمات کے
پورا کرنے میں معین نہیں ہو سکتا، جو زمانۂ
حال میں ان کے ذمے ہیں۔"

پھر ندوہ کے مقاصد میں رفع نزاع باہمی اور اصلاح نصاب
پر بھرپور روشنی ڈالی اور انگریزی تعلیم کے متعلق کہا کہ

"میرا مطلب صرف یہ ہے کہ انگریزی
تعلیم کو ترقی دینا اس زمانے میں ضروریات قومی
میں سے ہے۔ اس کے ساتھ یہ لحاظ رکھنا ضروری
ہے کہ انگریزی تعلیم کی رو میں مسلمان اپنا دین
اور مذہب نہ کھو بیٹھیں۔ بلکہ مسلمان مسلمان
رہ کر مغربی تعلیم و شائستگی میں ترقی کریں۔"[3]

۱۹۲۵ء کے ندوۃ العلماء کے جلسے میں صدارتی خطبے میں ...

---

[1] مضامین ثلاثہ ۲۲-۲۳

[2] روداد جلسہ ششم ۴۵

سے نے ندوہ کے نصاب کے متعلق فرمایا:-

"ندوۃ العلماء نے ابتدا سے اس امر پر
زور دیا ہے کہ نصاب تعلیم سے منطق وغیرہ فنون
کی غیر ضروری کتابیں خارج کر کے ضروری علوم
کے اضافے اور ترقی کے لئے وقت نکالا جائے۔
تعلیم کا مفہوم خاص خاص کتابوں کے الفاظ
کے افہام و تفہیم تک محدود نہ رہے، بلکہ علوم کی
تعلیم پیش نظر ہو طلبہ کے دل علوم کے گنجینہ
میں نہ کہ الفاظ و حواشی و شروح کے دفینے!
نصاب میں ایسے فنون کا اضافہ ہو جن سے بنی
نوع انسان اور ممالک اسلامی کا علم صحیح،
دماغوں میں راسخ ہو، مثلاً تاریخ و جغرافیہ
...... علوم دینیہ خصوصاً کلام مجید پر زیادہ
توجہ کرنے میں صرف ہو، ادب عربی پر زیادہ
زور دیا جائے"۔ [۵]

جلسۂ تقسیم اسناد ندوۃ العلماء میں مولانا شروانی نے تقریر کی،
جس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

"جناب صدر! معزز حاضرین! اس
سے پہلے جتنے مقررین کھڑے ہوئے انھوں نے
تمام مجمع کو مخاطب فرمایا۔ شاید بقدر علم مجھ کو حکم
دیا گیا ہے کہ فقط تین طالب علموں کو مخاطب کروں۔
سامعین کا مجمع زیادہ ہے اور مخاطب ہیں فقط
تین، باقیوں کے لئے کچھ نہیں کہنا۔ انہیں تینوں
سے کچھ کہنا ہے، اب کہئے ان کو کیا کہا جائے۔
سب سے پہلے میں اپنے عزیز طالب علموں
کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں، یہ
مبارک باد ایک ایسے شخص کی زبان سے ہے
جسے ۳۵ سال سے ندوۃ العلماء کی خدمت کا
شرف حاصل ہے۔

پہلی نصیحت

"تم نے دیکھا کہ میں نے تم کو مولوی کہہ کر نہیں
بلکہ طالب علم کہہ کر پکارا ہے آپ اب بھی اپنے کو طالب علم سمجھیں
اور طالب علمی کے ساتھ ہی اس دنیا سے کوچ کریں جس وقت
آپ نے سمجھ لیا کہ آپ طالب علمی سے فارغ
ہو گئے، وہ وقت آپ کی زندگی میں بڑے
افسوس کا ہوگا ...... کہا جاتا ہے کہ زمانہ
بدل گیا لہذا ہمیں بھی اپنا رخ بدل دینا چاہیے۔
کتنا لغو خیال ہے صداقت ایک ہی ہے اور
ہمیشہ ایک ہی رہے گی۔ ... فرانس نے یہ
نہیں کیا کہ فرانسیت چھوڑ کر انگریزیت اختیار
کر لے۔ اور نہ انگریز کے نزدیک ترقی و عروج
کی راہ یہ ہے کہ انگریزیت کو ترک کر کے جرمنیت
کو اپنا شعار بنا لے ہم تو فرانس سے ہزاروں میل
کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن انگلستان
اور فرانس کے درمیان تو چھوٹا سا سمندر حائل
ہے۔ وہاں تو یہ حال ہے کہ وہ اپنی اپنی روایات
قومی ہی کو اپنے لئے فلاح و بہبود کا باعث سمجھتے
ہیں، جرمن نے جرمنیت قیصر نشیں کی، آسٹریا

---

[۵] روداد جلسہ نوزدہم ۳۲

اور بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنی اپنی مخصوص روش پر قائم ہیں، کیا آپ اپنی روش پر قائم رہ کر ترقی نہیں کر سکتے؟ لیکن آپ ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن پر مٹے جا رہے ہیں۔ آپ پر اپنی تہذیب و شائستگی کا کوئی اثر نہیں رہا، بیشک یورپ سے سیلاب آیا ہے، اور بڑے زور سے آیا ہے، لیکن اس کا علاج بند باندھنا ہے۔ یہ نہیں کیا جاتا کہ اس سے محفوظ رہنے کا یہ انوکھا طریقہ تجویز کیا جائے کہ اپنا اثاث البیت باہر پھینک دیا جائے۔

دوسری نصیحت

آپ کو عالم باعمل بننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ علمائے خیر ہی کی شان ہے کہ ان کو علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا شرف بخشا گیا، لیکن ایک ایسا زمانہ آیا کہ علم اور عمل الگ ہو گئے، حکام اور علماء میں کشمکش شروع ہوئی، حکام علم سے بے بہرہ ہوئے، اور علماء نے معاملات سے سروکار نہ رکھا۔ اس کھچاوٹ کے نہایت برے نتائج پیدا ہوئے، بتایئے جب علماء کو تجارت، زمینداری، اور کاشتکاری کا کوئی تجربہ ہی نہ تھا تو اس کے متعلق ان کا فتویٰ کیا اثر رکھ سکتا تھا، آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان حقائق پر غور کریں، یہ بالکل لغو اور نہایت بیہودہ خیال ہے کہ علماء کو دنیا کے کاروبار سے کیا سروکار؟

تیسری نصیحت

آپ جس علم کی عزت چاہتے ہیں، دوسرے دلوں میں بھی اس کا احترام پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، مختصر یہ کہ علم کو بیچئے نہیں، صداقت، ایمان اور دیانت کو دنیا کا کوئی طوفان بہا کر نہیں لے جا سکتا، مصر، شام اور ترکی کی عیش پسندیوں نے انھیں سیلاب یورپ کے نذر کر دیا، یقین جانیئے کہ توحید کا یقین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان، ترقی کی راہوں میں حارج نہیں ہو سکتا، بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ خدا کا تصور اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا تصور وہ بابرکت چیزیں ہیں، جن کی مدد سے برسوں کا راستہ مہینوں میں طے ہو سکتا ہے آپ اپنے مذہب پر قائم رہیئے۔ قرآن و حدیث فقہ و تفسیر کو مت چھوڑیئے۔ ترقی آپ کے قدم چومے گی۔

چوتھی نصیحت

اے عزیز میرے طالب علمو! اتباع سنت اپنا شعار بناؤ، ظاہری شکل بھی، موافق شریعت بناؤ، لیکن فضیلت علمی کو کپڑوں اور داڑھیوں تک محدود نہ سمجھو بلکہ حقیقی علم کی شان یہ ہے کہ تمہارے ہر فعل سے علم کی خوشبو اور روشنی جلوہ گر ہو، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے۔"

۲۷ نومبر کے اجلاس کی صدارت بھی مولانا
نے کی اور کئی تجویزیں پاس کیں، جن میں ایک تجویز
کی تجدید ہوئی کہ:

"ندوۃ العلما تیس برس سے جماعت
علمائے کرام اور عامۂ مسلمین کی خدمت میں
دعوت پیش کر رہا ہے کہ اسلام کی سب سے
بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے فرقہ وارانہ
نزاع اور مذہبی بحث و مباحثہ کے غلط طریقوں
کو جن سے ملت کی پراگندگی اور انتشار کو
ترقی ہوتی ہے ترک کر دیں، اس لئے یہ مجلس
جماعت علماء اور عام مسلمانوں میں جو بعض
مذہبی تنازعات غلط طریقے سے پھیل رہے
ہیں، ان پر سخت افسوس ظاہر کرتی ہے،
اور اس سے دعا کرتی ہے کہ مسلمانوں میں اس
رسوا کن تفرقہ پردازی سے پرہیز کیا جائے۔"

پھر ندوہ کے لئے قومی توجہ کی اپیل کی تائید کرتے ہوئے
فرمایا۔

"ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اللہ
تعالیٰ کی آیات سنتے ہی دیوانہ وار ان کی
تعمیل پر آمادہ ہو جائیں، لیکن یہاں یہ کہا
جا رہا ہے کہ سیلاب یورپ آ رہا ہے، لہٰذا
توحید، رسالت، تمدن، اور معاشرت کو
چھوڑ کر اسی سیلاب میں کود پڑو، اس تلاطم
کا رخ صرف ہماری جانب نہیں تھا، بلکہ
یہ ہندوؤں کی طرف بھی تھا۔ انھوں نے اس
سیلاب کے وقت اپنے چوکے تک کو نہیں
چھوڑا۔ انھوں نے تو گائے اور گوبر تک کی
نسبت اپنے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں
کی۔ انھوں نے اس سیلاب کے وقت کیا تو
یہ کیا کہ وہ سنسکرت جیسی مردہ زبان سے
چمٹ گئے، لیکن ہمارا طریق یہ ہے کہ ہم کو
عربی سے کوئی الفت نہیں رہی، حالانکہ وہ ایک
زندہ زبان ہے، اور ہمارے مذہب و تاریخ
ہماری روایات ہمارے ادب و تمدن کے خزانے
عربی زبان میں ہیں۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ آج
ایسے تعلیم یافتہ بھی ہم میں موجود ہیں جن کو
خیر سے کلمہ کا ترجمہ تو در کنار کلمہ کا صحیح تلفظ بھی
نہیں آتا وہ اسلام سے اتنے کورے ہیں کہ العیاذ
باللہ اس کا تذکرہ کرتے بھی شرماتے ہیں،
خدارا بتاؤ انصاف کی بات کہو، ہم ایسے تعلیم یافتہ
اشخاص پر بحیثیت مسلمان کے کیا فخر کر سکتے ہیں
جو بیسیوں ڈگریوں کے حامل ہوں، مگر کلمہ
تک صحیح نہ پڑھ سکتے ہوں،

(ندوہ کے) اخیر دور کی ایک تقریر میں مولانا شروانی
نے فرمایا تھا کہ

"ندوہ میں اگر اسلامی اصول سے
ہٹ کر ہزاروں لڑکے بھی زیر تعلیم ہوں تو میرے
نزدیک ناکام اور بند ہے، لیکن اگر اصول کے
مطابق اس میں تالا لگا ہو تو وہ میرے نزدیک
کامیاب اور کھلا ہوا ہے۔" [سہ]

[سہ] روایۃ عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ،

آپ نے ۱۹۱۱ء میں صوبۂ بمبئی میں بمقام پونا
ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں تعلیم کے موضوع
پر جو کچھ کہا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

"حضرات! تعلیم کا میدان بہت
وسیع ہے اور بہت لمبا چوڑا پروگرام آپ کے
سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن میں اپنی محدود
قابلیت اور محدود تجربے کی رو سے عرض
کرسکتا ہوں کہ اس وقت چھوٹے چھوٹے
جزئیات پر استقلال اور غور کے ساتھ توجہ
کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے ابھی وہ مرحلے
بھی طے نہیں کئے ہیں، جو ہر ترقی کی خواہش
مند قوم کو سب سے اول طے کرنے پڑتے ہیں۔
مثلاً مجموعی قوت سے کام کرنا، کام کرنے سے
پہلے وہ قوت پیدا کرنی چاہئے، اس قوت کے
پیدا ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ افراد قوم
باہم اعتماد کرکے ایک دوسرے کے خیالات
کی وقعت کریں، کشادہ دلی اور تحمل سے
مخالف رائے کو سنیں اور غور کریں۔ اس
کے واسطے ذاتیات کو عام معاملات سے جدا
رکھنا فرض ہے اب آپ انصاف سے غور کیجئے
کہ ہم ان منزلوں میں سے کونسی منزل میں ہیں
اگر ہماری نگاہ دھوکہ نہ دے تو پہلی ہی منزل
میں ہیں، یعنی ذاتیات کے پھندے میں پھنسے ہوئے
ہیں، اور اسی لئے یہ کھلا ہوا منظر ہے کہ جس
مقام پر زبردست اور قابل مسلمانوں کا مجمع ہے۔
وہیں ان کاموں کا کرنا محال ہے۔ جن کے واسطے
مجموعی قوت کی ضرورت ہے۔ کام وہیں ہوتا
ہے۔ جہاں شخصیت نمایاں اور پُر اثر ہے؛
یہ حالت قابل افسوس بلکہ لائق نفرت ہے۔
گر واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں کس قدر
سخت غلطی ہے کہ ہم اپنے آپ کو دھوکہ میں
رکھنا چاہتے ہیں۔ کہ ہم میں مجموعی قوت ہے۔
نتیجہ یہ کہ جو قوت نہیں اس کے نتائج کے خواب
دیکھے جائیں اور جو قوت ہے۔ اس کو برباد کیا
جائے، کام کرنے کا پہلا اصول یہ ہے کہ قول ہو
عمل کے واسطے۔" یا ایہا الذین آمنوا لم
تقولون مالا تفعلون" اور قول پر عمل
غالب ہو۔ جو تجویز قرار دی جائے اس پر استقلال
وہمت کے ساتھ پابند ہونا چاہئے اور استقلال
وہمت کی پہلی ضرب گو آزادیٔ اپنے نفس کے خلاف ہے کہ ہم
خود اپنے آپ کو اول اس کا پابند کریں اور
اس کے بعد دوسروں سے اس کی پابندی
کی توقع کریں، ہمارے ہاں معاملہ بالکل اس
کے برعکس ہے، کہا جاتا ہے، صرف کہنے
کے لئے، قوت سے عمل کو کوئی نسبت نہیں
خود پابندی نہ کرنے کے باوجود دوسروں
سے نہ صرف پابندی کی توقع کرتے ہیں بلکہ ان
کو حکم دیتے ہیں اور رسوا کرتے ہیں۔"

صہ ۳۸۲-۳۸۳

خطباتِ عالیہ

ایک کتاب جو چالیس سال میں تیار ہوئی

(مقدمہ: نوشتۂ مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم)

(از مولوی انوار احمد زبیری)

موجودہ زمانے میں جب کہ انگریزی تعلیم ہندوستان میں سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ ہزاروں سکول اور کالج قائم ہیں، اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اس زمانے کی حالت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جب کہ اب سے پچاس برس پہلے مسلمان نہ صرف انگریزی تعلیم سے ناآشنا تھے بلکہ اس کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ سرسید مرحوم نے جب اپنی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تو عام طور پر مسلمان ہر طبقے نے ان کی مخالفت میں آواز بلند کی اور بجز چند افراد کے جو ان کے ہم آہنگ تھے عام مسلمانوں کی طرف سے سرسید کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ لیکن باوجود شدید مخالفت کے سرسید اور ان کے رفقاء کار استقلال اور مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ مسلسل پچاس برس کی جدوجہد کے بعد فضا میں اس قدر تبدیلی ہوئی۔ کہ اب کوئی آواز جدید تعلیم کی مخالفت میں بلند نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو بھی تو کوئی شخص اس آواز پر لبیک کہنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان اپنے ضرب المثل افلاس تعلیم کی گرانی اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اب بھی بہ نسبت غیر مسلم اقوام کے جدید تعلیم میں پسماندہ ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ وہ جدید تعلیم کے مخالف ہیں یا اس کی ضرورت سے انھیں انکار ہے۔ سرسید نے اس مخالفت کے طوفان کا جس طریقے سے مقابلہ کیا اور آخرکار جن ذرائع سے کامیابی حاصل کی۔ اس موقع پر اختصار کے ساتھ اس کا تذکرہ کرنا غالباً بے موقع نہ ہوگا۔

جب سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان مذہبی حیثیت سے انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں اور ان کا یہ عام خیال ہے کہ ایک غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں تو انھوں نے مضامین خطبات مستقل رسائل اور اپنے مشہور ماہنامہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے مسلمانوں کے مخالف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تاریخی حیثیت سے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج و کمال میں غیر قوموں کے علوم سیکھے بلکہ ان میں خاص فضل و کمال حاصل کیا۔ سرسید کے ان پرزور مضامین نے ان کے بہت سے حامی و مددگار پیدا کر دیئے۔ جو اپنے عالمانہ مضامین

اور تصنیفات و خطبات کے ذریعے سے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرتے رہتے یہاں تک کہ مخالفت کا وہ طوفان ٹھنڈا ہو گیا اور اب لوگوں کو سرسید اور ان کے احباب کے خیالات سے وہ نفرت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ چونکہ انگریزی سکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے مسلمانوں کو عام طور پر انگریزی تعلیم سے وحشت تھی وہ خیال کرتے تھے کہ مذہبی تعلیم نہ حاصل کرنے سے ان کے بچے اسلام سے بیگانہ ہو جائیں گے اور مسلمانوں کا یہ خیال بے جا نہ تھا اس لیے سرسید نے یہ تجویز کیا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کے لیے اپنی مخصوص درسگاہیں قائم کریں جو خود مسلمانوں کی نگرانی و انتظام کے ماتحت ہوں اور ان درسگاہوں میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جائے چنانچہ چند سال کی سعی و کوشش کے بعد سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ شیعہ و سنی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیے علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نصاب تعلیم تجویز ہوا۔ نماز کے لیے مسجد تعمیر کی گئی اور اخلاقی نگرانی کے لیے اتالیق و نگراں مقرر کیے گئے۔ ان انتظامات سے مسلمانوں کو ایک حد تک اطمینان ہوا اور وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس کالج میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔

باوجود مندرجہ بالا تدابیر کے ابھی مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت ہندوستان میں ایسی موجود تھی جو یا تو سرسید کی تحریک سے قطعاً ناآشنا تھی یا ان کی مخالف تھی۔ اس لیے کالج قائم کرنے کے دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں سرسید نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کوئی مفید تحریک اس وقت تک سرسبز و کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک مسلمانوں میں ایک مستقل و مضبوط جماعت ایسی نہ ہو جو لگاتار اس تحریک کے متعلق تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دیتی رہے، بلکہ ملک کے مختلف صوبوں میں دورہ کر کے اور لوگوں کو جمع کر کے اپنے خیالات ان کو سنائے۔ سرسید کے اس تخیل کا نتیجہ وہ مشہور و معروف انجمن ہے جس کا نام مختلف تبدیلیوں کے بعد آج کل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے اور جس کا صدر دفتر مسلم یونیورسٹی کے پہلو میں بمقام علی گڑھ قائم ہے۔ اس موقع پر کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں گزشتہ چالیس سال میں کانفرنس نے اپنے مقاصد کے متعلق اس قدر کثرت سے لٹریچر شائع کیا ہے اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر اتنے اجلاس منعقد کیے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان نہ صرف کانفرنس کے نام سے واقف ہو چکا ہے بلکہ اجمالی طور پر اس کے اغراض و مقاصد سے بھی باخبر ہے۔

کانفرنس مسلمانوں کی سب سے پہلی باقاعدہ انجمن ہے جو ایک خاص قانون اور دستور العمل کے ماتحت کام کرتی ہے۔ اور موجودہ تہذیب و تمدن نے قومی مجالس کے متعلق جو تہذیب و ضابطہ لازم قرار دیا ہے۔ اُس کی پابند ہے۔ یہ کانفرنس ہر سال دسمبر کے آخری ہفتے میں اپنا اجلاس ہندوستان کے کسی خاص شہر میں منعقد کرتی ہے۔ جو اکثر تین روز تک رہتا ہے۔ اجلاس کی رہنمائی کے لئے پہلے سے ایک صدر کا انتخاب ہوتا ہے صدر اجلاس کے نظم کو باقاعدہ قائم رکھنے کے علاوہ اپنا خطبۂ صدارت بھی پڑھتا ہے۔ جو عموماً لکھا ہوا ہوتا ہے۔ چونکہ صدارت کے لیے اکثر ملک کے قابل و ممتاز اصحاب کا انتخاب ہوتا ہے، جو علاوہ تعلیم یافتہ ہونے کے اپنی قوم کی حالت کے متعلق وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

(بلکہ پہلے سے قومی خدمت میں معروف ہوتے ہیں)

اس بنا پر وہ اپنا خطبۂ صدارت خاص توجہ و محنت سے تیار کرتے ہیں۔ اور اپنے تجربہ اور وسیع معلومات کے لحاظ سے جن چیزوں کو مسلمانوں کے لیے مفید سمجھتے ہیں بیان کرتے ہیں۔ اس لیے یہ خیالات و افکار درحقیقت اس لائق ہیں کہ قوم اُن پر عمل کرے اور آئندہ نسلوں کے لیے اُن کو محفوظ رکھے۔ گذشتہ چہل سالہ مدت میں کانفرنس کے انتالیس اجلاس ہندوستان کے مختلف صوبجات میں منعقد ہوئے اور ہر اجلاس کی رپورٹ سال بہ سال شائع ہوتی رہی۔ جن میں یہ خطبات صدارت بھی شامل تھے لیکن آج یہ رپورٹیں ناپید ہیں۔ اس لیے اگر کسی شخص کو اپنے خطبات کے پڑھنے کا شوق بھی ہو تو ان کا مہیا کرنا ممکن نہیں البتہ کانفرنس کے صدر دفتر میں ایک ایک جلد محفوظ ہے۔ لیکن اس سے ہر شخص مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کانفرنس کا یہ کارنامہ لائق تحسین و ستائش ہے کہ اس نے اس پراگندہ خطبات کو یکجا کرکے شائع کرنیکا اہتمام کیا ہے۔ جو اصحاب ابتدا سے کانفرنس کے شریک و مددگار ہیں۔ انھوں نے آہستہ آہستہ چالیس سال میں یہ خطبات سنے ہیں۔ اور اس طرح سے سُنے ہیں کہ ان کے لیے سفر کی زحمتیں اٹھائی ہیں۔ روپیہ صرف کیا ہے اور بسا اوقات آرام و راحت کی قربانی بھی کی ہے۔ لیکن خطبات عالیہ کے ناظرین خوش نصیب ہیں کہ جو داستان دوسروں نے چالیس سال میں بصرف دولت و راحت سُنی وہ آج مکمل صورت میں اُن کے سامنے موجود ہے۔ جس کو وہ چند گھنٹے میں اس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ نہ سفر کی ضرورت ہے نہ صرفِ زر کی حاجت۔

قوم میں ہر خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے بعض اشخاص ایسے بھی ہوں۔ جن کے نزدیک کانفرنس کی یہ خدمت مفید و لائق ستائش نہ ہو۔ اور اُن کے خیال میں اس داستان و افسانۂ پارینہ کا شائع کرنا تحصیلِ حاصل سمجھا جائے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ ملک میں اہلِ نظر بھی ہیں جو اس کام کی اہمیت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مختلف حیثیات سے یہ مجموعہ نہایت مفید و دلچسپ ہے۔ اجمالاً بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) اس کتاب کے چالیس ابواب (خطبات) ہیں۔ لیکن ان ابواب کی خصوصیت یہ ہے کہ چالیس سال میں لکھے گئے چالیس اصحاب نے تصنیف کیے اور شائع کرنے سے پہلے ہندوستان کے چالیس موقعوں پر سنائے۔ ہزاروں سامعین دور دراز مقامات کا سفر کرکے آئے تاکہ خود مصنفین کی زبان سے سُنیں۔ اخبارات نے ان کو شائع کیا اور ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ اور آخر کار چالیس سال بعد یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ کیا ایسی خصوصیت اردو کی کسی اور کتاب کو بھی حاصل ہے؟

(۲) عام طور پر ہر کتاب زبان و طرزِ ادا کے لحاظ سے ابتدا سے انتہا تک ایک شان رکھتی ہے۔ اگر مصنف صاحبِ ذوق ہے اور اس کو زبان پر قدرت حاصل ہے تو اس کی کتاب اپنے عہد کی زبان کا بہتر نمونہ ہوتی ہے۔ لیکن خطبات عالیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ زبان کے لحاظ سے اس کا ایک باب دوسرے سے مختلف ہے چنانچہ اس کی ترتیب و تکمیل چالیس سال میں انجام پذیر ہوئی ہے۔ لہٰذا زبان میں تدریجاً جو انقلابات و تبدیلیاں ہوتی رہیں اور طریقۂ ادا طرزِ استدلال، اسلوبِ بیان، اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے زبان میں جو ترقی ہوئی ان سب کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔ ابتدائی خطبات مختصر اور سادہ ہیں۔ ان میں مضامین کی کوئی خاص ترتیب یا تقسیم نہیں۔ نہ مختلف تعلیمی مسائل پر بحث ہے بلکہ سادہ زبان میں کانفرنس کی ضرورت کا اظہار کرکے مسلمانوں

کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اسی ذیل میں کہیں کہیں اُن نکتہ چین اشخاص کا جواب بھی ہے۔ جو کانفرنس اور انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں۔ زبان میں مغربیت کا اثر مطلق نہیں پایا جاتا ہے البتہ وہ سادہ طرزِ بیان ضرور موجود ہے۔ جو سرسید نے واقعات و مسائل کے بیان کے لیے اختیار کیا تھا۔ ابتدا میں لوگ زیادہ تر سید نواب محسن الملک مولانا حالی، مولانا نذیر احمد اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لیکچر یا کلام سننے کے لیے آتے تھے۔ اور خطبۂ صدارت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ صدر قاعدے کے مطابق اجلاس کا نظم قائم رکھتا مگر سرسید کی زبردست شخصیت سے مرعوب ہو کر اُن کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔

لیکن چند سال بعد آہستہ آہستہ اس کانفرنس نے مستقل و مضبوط حیثیت اختیار کر لی اور تعلیمی کام کے تجربے کی بدولت بہت سے مسائل بحث و نظر کے لیے سامنے آگئے تو خطبہ صدارت نے بھی ایک خاص حیثیت اختیار کر لی۔ اب صدر کا کام صرف اجلاس کے طریقۂ کار کی رہنمائی کرنا نہ تھا۔ بلکہ لوگ اس سے یہ توقع بھی کرتے تھے کہ موجودہ تعلیمی مسائل اور زیرِ بحث مضامین پر مسلمانوں کو اپنے تجربہ و خیالات سے فائدہ پہنچائے گا اُن کی تمام ضرورتوں کے متعلق مفید تدابیر بتا کر اپنی قابلیت کا ثبوت دے گا۔ کانفرنس کے سات ابتدائی اجلاس خطبۂ صدارت کے لحاظ سے کچھ ممتاز نہیں ہیں، لیکن ۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علیگڑھ میں منعقد ہوا۔ اور نواب محسن الملک صدر منتخب ہوئے تو خطبۂ صدارت میں ایک خاص وسعت و شان پیدا ہو گئی۔ یہ سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے اور انشاء پردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینی کے جواب میں فرماتے ہیں کہ

مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قائم کر کے مسلمانوں کو بہکایا مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیے یہ بتا دیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لیے کیا کیا اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیے دیر و کنشت بنایا مانا کہ گناہ کیا مگر یہ فرمائیے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قائم کی۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ ہمارے دوست براہِ مہربانی یہ فرما دیں کہ انھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے۔ قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر معاذ اللہ بے سود کام کرنے کے گنہگار ہیں تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے ؎

گر وِسرِ تو گشتن و مُردن گناہِ من
دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہِ کیست
گیرم کہ وقت ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

غرض نواب صاحب کی صدارت کے بعد خطبۂ صدارت آہستہ آہستہ وسعت و جامعیت اختیار کرتا گیا۔ جدید مباحث پیدا ہو گئے۔ انگریزی زبان کے اثر سے اردو کے ذخیرۂ مفردات و مصطلحات میں اضافہ ہوتا گیا۔ طریقۂ استدلال اور طرزِ ادا میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ آج اگر ان خطبات

کو مسلسل پڑھا جائے تو زبان کے یہ تمام ارتقائی مدارج صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان نے گذشتہ چالیس سال میں اسالیب بیان اور ذخیرۂ الفاظ کی حیثیت سے کس قدر ترقی کی اور مغربی تعلیم کا خیالات و زبان پر کیا اثر پڑا۔ لہذا اس لحاظ سے بھی یہ خطبات ایک حیثیت رکھتے ہیں جو کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

قدامت و اقتدار زمانہ نے ان خطبات میں ایک تاریخی حیثیت بھی پیدا کر دی ہے۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے یہ خطبات تمام تعلیمی مباحث پر حاوی ہیں۔ اگر بحث کا کوئی پہلو ایک خطبے میں رہ گیا ہے تو دوسرے میں موجود ہے۔ ان خطبات سے مسلمانوں کی گذشتہ چہل سالہ تعلیمی تاریخ اجمالی طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے مثلاً ابتدا میں جب مسلمان جدید تعلیم کے مخالف ہیں تو تعلیم کے جواز اور اس کی ضرورت پر عقلی و نقلی دلائل پیش کیے جاتے ہیں لیکن جب رفتہ رفتہ مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلیم کے متعلق بہت سے جزئیات پر بحث کی جاتی ہے۔ اور طریقۂ کار تجویز کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان تعلیم شروع کر دیتے ہیں تو ان کی راہ میں مشکلات و دشواریاں پیش آتی ہیں کہیں افلاس زنجیر پا بن جاتی ہے۔ کہیں خاص قوانین سنگ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری تعلیم میں مشکلات پیدا کرتی ہے اس لیے مشکلات کے حل کرنے پر توجہ کی جاتی ہے۔ غرباء کی تعلیم کے لیے وظائف مانگے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ سے تعلیم میں آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ برادرانِ وطن کی بے مہری پر اظہار رنج و افسوس ہوتا ہے۔ مگر ان سب مشکلات کے باوجود تعلیمی کام جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان تعلیم پا پا کر اسکولوں

اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔ اور گورنمنٹ کی کچھ ملازمتیں ان کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ جب تعلیم اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو مسلمان ایک قدم اور بڑھاتے ہیں۔ یعنی اب تعلیم نسواں کی ضرورت سامنے آتی ہے۔ اور مسلمانوں کو خطبۂ صدارت میں بتایا جاتا ہے کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں گی بچوں کی تعلیم و تربیت معقول طریقے سے ممکن نہ ہوگی کیونکہ تعلیم کی ابتدا آغوش مادر سے شروع ہوتی ہے۔ چند سال پیہم تبلیغ کے بعد مسلمان تعلیم نسواں کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کانفرنس میں ایک مستقل شعبہ قائم ہوتا ہے اور ایک زنانہ اسکول کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اس کے بعد بالغ العمر مسلمانوں کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اب چند سال سے کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس پر بحث کی جاتی ہے۔ اور یورپ میں اس کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے اسی سلسلے میں شبینہ مدارس کے قیام کا معاملہ ہے۔ جس کی ضرورت بشدت محسوس ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جبریہ و مفت تعلیم کا مسئلہ بھی زیر بحث آگیا ہے اور اس کی ضرورت پر خاص طریقے سے زور دیا جاتا ہے اور چونکہ حالات کی تبدیلی اور برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری کی وجہ سے ملازمت کا دروازہ مسلمانوں کے لئے بند ہو رہا ہے۔ اس لیے اب ان کو صنعتی و تجارتی تعلیم حاصل کرنے کی بھی ترغیب دی جاتی ہے کیونکہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر مسلمان صنعت و حرفت پر متوجہ نہ ہوئے تو کسب معاش کے زرخیز وسائل سے محروم رہ جائیں گے علاوہ خطبۂ صدارت کے یہ مسائل مختلف تجاویز کی صورت میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں۔ غرض حالات کی تبدیلی اور زمانے کی ترقی پذیر رفتار نے بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے۔ اس

لئے دائرہ بحث زیادہ سے زیادہ وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس بنا پر کانفرنس کے صدر کا یہ فرض ہو گیا ہے کہ وہ اپنے خطبے میں مسلمانوں کی تمام ضروریات کا استقصا کرے۔ اور ان کے متعلق مفید تدابیر تجویز خطبات عالیہ کے مطالعے سے یہ سب باتیں اجمالی طور پر معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ پچاس سال کے دور میں نظام تعلیم و طریقہ تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اور مسلمانوں پر ان انقلابات کا کیا اثر پڑا۔ اس سلسلے میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک اور اس کے انجام کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ غرض سیکڑوں تعلیمی مسائل ہیں جن کی اجمالی تاریخ خطبات کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے اور وہ طریق کار بھی معلوم ہو جاتا ہے جو حالت موجودہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اگر آپ ان خطبات کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تعلیم کے متعلق کتنے جدید مسائل پیدا ہو گئے۔ اور ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت نے مسلمانوں کی تعلیم پر کیسا زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ چیزیں آپ کو کسی دوسری کتاب سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ لہذا اس پہلو سے بھی خطبات کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے مفید اور سود مند ہے۔

(۴) یہ خطبات درحقیقت علی گڑھ تحریک کی تاریخ کے چند اجزاء یا ابواب ہیں۔ اور ایک اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے علی گڑھ تحریک کے متعلق کوئی مستقل کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسی متعدد کتابیں و رسائل شائع ہو چکے ہیں۔ جن کا مطالعہ علیگڑھ تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ مثلاً سرسید، نواب محسن الملک وغیرہ کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپا کرتے تھے۔ اب مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سرسید، نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولینا نذیر احمد کے تمام لیکچر مدت ہوئی چھپ گئے ہیں سرسید کی مکمل سوانح عمری مولینا حالی کے قلم سے حیات جاوید کے نام سے اسی صدی کے اوائل میں شائع ہو گئی جس سے علیگڑھ تحریک کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم ہو سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں کانفرنس نے نواب وقار الملک کی مکمل لائف وقار حیات کے نام سے چھاپی ہے۔ جس میں علیگڑھ تحریک کے متعلق بڑا ذخیرہ معلومات کا موجود ہے۔ ان سب کتابوں کے علاوہ سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں علیگڑھ تحریک کے متعلق بہت سے اہم واقعات ملتے ہیں۔ یہ سب چیزیں کالج کی تاریخ کے اجزاء اور ابواب ہیں۔ اور اب خطبات عالیہ نے اس سلسلے کو بڑی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان سب کتابوں کا مطالعہ کرے تو علی گڑھ تحریک کے متعلق اس کو کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک سلیقہ مند شخص ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھ کر علمی تحریک کی ایک دلچسپ و مفصل تاریخ مرتب کر سکتا ہے۔ جو کمی تھی، وہ خطبات نے پوری کر دی۔ غرض مختلف وجوہ سے یہ خطبات نہایت دلچسپ و سبق آموز ہیں۔ اور جتنا زمانہ گزرتا جائے گا ان کی قدر و قیمت بڑھتی جائے گی۔

یہ خطبات بجائے خود دلچسپ تھے۔ لیکن ہر صدر انجمن کے مختصر حالات و تصاویر نے ان کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے ابھی چونکہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے۔ اس لئے کوشش کرنے سے یہ حالات فراہم ہو گئے۔ ورنہ چند سال بعد تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہ آتے۔ تصویروں کا ملنا تو اور زیادہ دشوار تھا۔ اب بھی ایک سال کی تلاش و خط و کتابت کے بعد

یہ حالات و تصویریں فراہم ہوئی ہیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمان خاں صاحب شیروانی آنریری سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کے لیے جن صاحب کو منتخب کیا ان کی موزونیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مولوی انوار احمد صاحب زبیری مارہروی (جو ان حالات و خطبات کے جامع ہیں) موجودہ صدی کے اوائل سے کانفرنس سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے زمانۂ دراز تک نواب محسن الملک بہادر نواب وقار الملک صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے ساتھ کانفرنس کا کام کیا ہے اور کانفرنس کے اجلاسوں کے انتظام میں خاص حصہ لیا ہے اس لحاظ سے وہ گویا کانفرنس کی زندہ تاریخ ہیں۔

گذشتہ چالیس سال میں جس قدر اصحاب کانفرنس کے صدر ہوئے ان میں سے بجز دو صاحبوں کے مولوی انوار احمد صاحب نے سب کو دیکھا ہے۔ اکثر سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کے خطبات صدارت خود ان کی زبان سے سنے ہیں۔ بہت سے بزرگ ایسے ہیں جن کے حالات زندگی دیکھنے کا ان کو خاص موقع ملا ہے۔ ان حالات کے لحاظ سے اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا۔ اور شاید اب علیگڑھ میں اور کوئی شخص ایسا موجود بھی نہیں جو ایک ربع صدی سے کانفرنس سے مستقل تعلق رکھتا ہو۔ جس نے کانفرنس کے اتنے اجلاس دیکھے ہوں۔ اور کانفرنس کے مقاصد کے سلسلے میں ہندوستان کے قریباً ہر صوبے کا ہزاروں میل سفر کیا ہو۔

چنانچہ جیسی توقع تھی۔ مولوی انوار احمد صاحب نے اس خدمت کو نہایت دلچسپی اور ذوق کے ساتھ انجام دیا۔ حالات کے سلسلے میں بہت سی چیزیں انھوں نے ایسی لکھی ہیں جن کے وہ چشم دید راوی ہیں۔ یہ واقعات ہم کو صرف انھی سے معلوم ہو سکتے تھے۔ اب جو شخص آئندہ کانفرنس کی تاریخ مرتب کرنا چاہے۔ اس کے لیے مولوی انوار احمد صاحب کی یہ کتاب بہت مفید و کارآمد ہے۔ اور ناظرین کے لیے بھی جو قومی تحریکات سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہوں نہایت دلچسپ ثابت ہوگی، اور حسن قبول حاصل کرے گی۔ امید ہے کہ کانفرنس کی چالیسویں سالگرہ (اجلاس) کے موقع پر (جو امسال مدراس میں ہے) ان کی کتاب کا شائع ہونا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور مدراس کا چالیسواں خطبۂ صدارت کانفرنس کی تاریخ کو گذشتہ برس تک مکمل کر دے گا۔

---

(۲)

ہر زبان کے خطیبوں کے خیالات، درافکار ذہنی اور دماغی کا ذخیرہ اس زبان کا بیش بہا سرمایہ مقصود ہوتا ہے۔ اس زبان میں کر وہ ادا کیے جاتے ہیں جو اپنے زمانے کے لحاظ سے راہ عمل اور مستقبل کے لیے قوم کی ہمت اور جوش کو ابھارتے ہیں تاریخی صفحۂ عالم پر اُن کے کارنامۂ عمل کی زندہ یادگار بن کر چمکتا ہے۔ موجودہ نسلیں ان کے ساتھ خواہ کچھ ہی سلوک کیوں نہ کریں۔ لیکن یقیناً آنے والی نسلیں اس کو شوق سے پڑھتی ہیں۔ اور اپنے ماحول کے مطابق گزرے ہوئے حالات کے لحاظ سے استخراج نتائج ہیں۔ اپنے پیش روؤں کے ٹھوس اور عمیق افکارات مدد سے کر ان کی دماغی کاوشوں کا (خواہ وہ ملکی پالیٹکس سے تعلق رکھتی ہوں۔ خواہ تعلیمات عامہ یا بہبودیٔ قوم کے دیگر

(موروث جہالت سے) غرضیکہ ہر طرح سے ان کا خیر مقدم کرنے میں پیش قدمی کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مہذب اور تعلیمیافتہ دنیا طرح طرح سے اپنی قوم کے دانشوروں کے خیالات کی اشاعت کرتی رہتی ہے۔ گویا اس طریقے سے گذرے ہوئے لوگوں کا پیغام آنے والی نسلوں کو پہنچا کر ان میں عمدہ تعلیم، بہتر تربیت اور پاکیزہ اخلاق کی تخم ریزی کر کے ان کی نشو ونما میں مصروف نظر آتی ہے اور اس طریقے سے قوم میں کسب فضائل اور ترک رذائل کا سلسلہ نا متناہی جاری رہ کر قوم کی عزت اور وقار کا درجہ علمی اور اخلاقی حیثیت کے لحاظ سے بتدریج ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی تک بلکہ اس سے زیادہ عرصہ تک مسلسل چالیس بیالیس برس کی مدت میں آل انڈیا (سابق محمڈن حال مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانان ہندوستان میں جس استقلال و استقامت کے ساتھ تعلیمی منادی کا فرض انجام دیا ہے اور جس طرح قوم کے اندر علوم جدیدہ کی اشاعت . . . میں پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے۔ بلاشبہ بیش بہا قومی خدمت ہے۔ جس زمانے میں اور جن حالات کے اندر کانفرنس قائم ہوئی۔ اس وقت دنیا متحرک تھی اور مسلمان ساکن و جامد۔ قومی تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک تاریک زمانہ تھا۔ جس کے اندھیرے میں ہماری تمام حیات ملی مردہ ہو رہی تھی۔ اس مجلس کے ممبروں نے دور حاضرہ کی خدمت میں اور حقائق حالات کی بناء پر اپنے زبردست خطبوں کے ذریعے قوم کو تعلیم پر متوجہ کرنے کی اہم کوشش کی اور ان کے پرجوش خطبوں نے اور کانفرنس کی لگاتار تبلیغ نے جو انقلاب مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور دماغی حالت کی مناسبت سے کیا ہے۔ اور اکتساب علوم جدیدہ کی وجہ سے علم و فن کی مختلف شاخوں میں قوم میں جو آثار ترقی نمایاں ہو رہے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ کتابی شکل میں قوم کے روبرو پیش کیے جائیں۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ یہ خطبے جو کانفرنس کی چالیس سالہ رپورٹوں میں منتشر ہیں۔ اور اب بھولے بسرے ہوگئے ہیں۔ ایک مجموعے کی شکل میں موجودہ نسل کے سامنے لا رکھا جائے جن کے سننے اور دیکھنے سے وہ اب تک محروم ہیں۔ کیونکہ یہ ایک وقتی سخن دانی نہ تھی جو ایک مرتبہ سن لی اور ساتھ ختم ہوگئی۔ ضرورت تھی کہ ان پھولوں کو جو چالیس برس کی گلچینی کا نتیجہ ہیں ایک گلدستے میں ترتیب کے ساتھ سجایا جائے۔ تاکہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق ان کی نزہت خوشبو اور مہک سے جسم قومی کی روح کو تسکین اور طاقت پہنچتی رہے۔

جن باوقار لوگوں نے کانفرنس کے جلسوں کی صدارت کے فرائض انجام دیئے ہیں، وہ اپنی مختلف النوع قابلیتوں اور اوصاف کے لحاظ سے اپنے اپنے دورۂ زندگی میں اس پائے کے بزرگ تھے اور ہیں۔ جن کا مرتبہ نہ صرف علمی حیثیت سے ممتاز نظر آتا ہے بلکہ ان کی اصابت رائے اور ان کی قومی ہمدردی کی وجہ سے بہی خواہان قوم کے سربرآوردہ طبقے نے انکو منصب صدارت پر منتخب کر کے عملاً ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اس لحاظ سے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ گروپ جو میں چالیس سالہ مجلس تعلیم کے صدر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد (۳۲) ہے وہ بلاشبہ ۳۲ کروڑ مسلمانان ہندوستان کے قائم مقام اور مسلم جماعت کے روح رواں ہیں۔ اور اس لحاظ سے مذکورہ بالا خطیبوں کے خطبے ہمارے گذشتہ اور موجودہ دور زندگی کی ایک ایسی تاریخ ہے جس کے سننے سے ہم چونکے، بیدار ہوئے اور اپنی غفلتوں کا ہم کو علم ہوا۔

ورثوں پر عمل پیرا ہونے سے ہم اپنی تعلیمی جدوجہد میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آئندہ بھی ان خیالات کے مطالعے سے ہم اپنی فردگزاشتوں پر مطلع ہو کر ملکی اور ملی فوائد کے لحاظ سے اپنی قومی زندگی کو کامیاب تر بنا سکتے ہیں۔ الحمد للہ کہ چند روز کی محنت و دماغ سوزی سے تقریباً نصف صدی کے بہترین اشخاص اور عالمان زمانہ کے خیالات کا بیش بہا سرمایہ مرتب ہو کر اس قابل ہوا کہ "خطبات عالیہ" کے نام سے قوم کے ہاتھ تک پہنچایا جا سکے۔ یہ مجموعہ نہ صرف باکمال لوگوں کی رائے اور ان کے تجربات اور ذہنی و دماغی قوتوں کو آپ کے سامنے لاتا ہے بلکہ ان کے ساتھ ان مشاہیر قوم کی مختصر بائیوگرافی بھی اس میں شامل کی جاتی ہے جس کے مطالعے اور پیروی سے ہماری زندگی کی دشوار گذار منزل آسانی کے ساتھ کٹ سکتی ہے۔ ان نوشتوں پر عمل کرنے سے ہم اپنی خصوصیات کو عملی و علمی لحاظ سے پھر واپس لا سکتے ہیں اور دنیا میں اخلاق محمدی کا پھر ایک ایسا نمونہ اپنی ذات میں پیدا کر کے دنیا کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ مسلم اخلاق کو ماننے اور اس کی تعظیم کرے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ بڑے لوگوں کے حالات پڑھ کر اور ان کے نام اور کام کو معلوم کرنے کے بعد اس امر کا خواہشمند پایا جاتا ہے کہ ممکن ہوتا تو وہ نہ صرف ان کے خیالات سے استفادہ کرتا بلکہ وہ ان کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتا اور ان کے خد و خال سے ان کی غیر معمولی سمجھ کی شناخت کرتا۔ ہم نے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر حتی الامکان کوشش کی کہ مشاہیر مذکورہ بالا کے فوٹو بھی ان کے حالات اور خطبات کے ساتھ چھاپے جائیں۔ جو ایک حد تک اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ بہت سی کاوشوں کے بعد جن جن اصحاب کے فوٹو دستیاب ہو سکے وہ زیب خطبات کئے گئے۔ کتاب کو ممکن سے ممکن طور پر دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غالباً یہ ظاہر کرنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اس مجموعے کی ترتیب و تیاری میں درحقیقت مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی کا ذوق ادب کارفرما تھا۔ نواب صاحب ممدوح علاوہ علمی ادبی ذوق کے اسلاف کرام کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے (اور بالکل بجا ہے کہ) یہی چیزیں قوم میں زندگی کی روح پیدا کر سکتی ہیں۔ زیادہ تر اسی جذبے نے مجھ کو آمادہ کیا کہ اس دور آخر کے مشاہیر کے حالات زندگی اور ان کے خیالات موجودہ نسل تک پہنچاؤں تاکہ قوم کے نوجوانوں کو معلوم ہو کہ اس زمانۂ زوال و انحطاط میں بھی ہماری قوم میں کیسے کیسے بزرگ موجود ہیں اور ان کے یہ قیمتی خیالات و حالات ہماری تعمیری زندگی کے لیے کیسے مفید و کارآمد ہیں۔ زمانے کی ایک یہ بھی علمی تہذیب ہے کہ جس فن اور مسئلے کے متعلق کوئی کتاب لکھی اور چھاپی جاتی ہے۔ اس فن کے نقاد اور مبصر سے نقد و تبصرہ کی خواہش کر کے مقدمہ نگار کے خیالات اور آراء کا اظہار اور اس کی زبان میں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ میرے فاضل دوست مولوی اکرام اللہ خاں صاحب (ندوی) جو عربی ادب کے ذوق آشنا اور زبان اردو کے پختہ کار نثر ہیں اور جن کو سلسلۂ تالیف "وقار حیات" نیز صدر دفتر کانفرنس کے تعلق کی وجہ سے علیگڑھ تحریک کے متعلق وسیع لٹریچر کے مطالعے کا کافی موقع ملا ہے۔ اور جنھوں نے میری اس تجویز (ترتیب خطبات عالیہ) سے پوری دلچسپی کا اظہار کر کے مجھ کو اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ جب میں نے بوجوہ بالا موصوف سے مقدمہ نگاری کی خواہش

کی تو انھوں نے میری درخواست کو منظور کر لیا اور جملہ خطبات کا از سر نو مطالعہ کر کے ایک دلچسپ مقدمہ تحریر فرمایا جو ان خطبات کے ساتھ شامل ہے۔ خطبات کی ترتیب و تدوین سے پہلے نیز دوران ترتیب میں اس کام کی ضرورت و اہمیت کے متعلق دل میں شبہات تھے۔ لیکن مقدمے کے دلآویز بیان نے جس طرح اس ضرورت کا مجھ کو یقین دلایا۔ ناظرین خطبات کے نزدیک بھی غالباً یہ محنت رائیگاں نہ سمجھی جائے گی۔

چالیس برس کے خطبات کا مجموعہ بجائے خود ایک بڑی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر ہر صدر کے مختصر حالاتِ زندگی کا اضافہ پھر مقدمہ اور فوٹو کا بیان اس لحاظ سے کہ وزن زیادہ نہ بڑھے اور کتاب کا مطالعہ دل چسپی اور آسانی کے ساتھ کیا جا سکے۔ چالیس برس کو تین زمانوں پر تقسیم کر کے بیس برس کی ایک اور دس دس برس کی دو دو جلدیں کر دی گئی ہیں۔ پھر بھی ہر جلد کا حجم کافی وقیع ہے۔

اس موقع پر مجھ کو اپنے برادرِ عزیز امداد احمد زبیری سلمہٗ کا بھی جو مسلم یونی ورسٹی میں بی اے کا طالب علم ہے۔ شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ جس نے بعض اصحاب کے حالات انگریزی سے اردو ترجمے میں مجھ کو مدد دی۔ میں مکرمی خاں صاحب میر ولایت حسین صاحب بی، اے اسپرنٹنڈنٹ کانفرنس آفس کا بھی ممنون ہوں کہ جب کسی مدد کی میں نے اُن سے خواہش ظاہر کی تو اس بارے میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ اس کی تیاری اور ترتیب کے متعلق بھی مجھ کو ترغیب دی۔

بلاشبہ اگر یہی کام دوسرے قابل ہاتھوں کی مدد سے سرانجام پاتا تو کسے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ موجودہ حیثیت سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید ہوتا۔ لیکن اتنے عرصے تک جب کسی نے نہ کیا تو نہ ہونے سے ہونا (گو وہ غیر مکمل صورت ہی میں ہی بہتر ہے) اب دھندلے خاکوں میں رنگ بھرنا اور نقش و نگار پیدا کرنا آئندہ اُس مصور کا کام ہے۔ جو تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کا اندازہ داں ہوگا۔

سیر کا ایثار

وہ ملک پہ جان دینے والا
وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

مطلب کا ہر ایک سے تھا طلب گار
ہر خوان سے تھا وہ زلہ بردار

گذرا وہ ہر ایک رہ گذر پر
دی اس نے صدا ہر ایک در پر

کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی
آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہنچی

ہر ایک کو یہ ماجرا سنایا
ہر بزم میں اپنا راگ گایا

نالے کئے داغ دل دکھا کر
رویا کبھی حال غم سنا کر

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں
ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں

ناکام رہا صدائیں دے کر
دشنام سنیں دعائیں دے کر

حنظل پائے شکر کے بدلے
سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے

لعل اس نے دیئے شرار پائے
گل نذر کئے تو خار پائے

کیا تلخ ملے جواب اس کو
کیا کیا نہ دیئے خطاب اس کو

برگشتہ کہا کسی نے دیں سے
لعنت کا صلا ملا کہیں سے

خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کد
زندیق کہا کسی نے مرتد

چرچے تھے یہی ز غرب تا شرق
وہ اپنی ہی دھن میں تھا مگر غرق

علامہ شبلی نعمانی

مسلم یونیورسٹی

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی
سابق آنریری سیکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

۱۹۱۱ء کی آمد مسلمانانِ ہند کے حق میں فصلِ بہار کی آمد تھی۔ اس وقت کے نشاط و انبساط پر خیال کرو تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے جاں فزا مستقبل کا نظارہ دکھلا کر اہلِ اسلام کو فرحت و سرور سے سرشار کر دیا تھا۔ حیاتِ نگار شعراء نے فصلِ بہار اور بہارِ عید کی جو تصویریں کھینچی ہیں اُن کے دیکھنے سے مبالغے کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے لکھنؤ اور لاہور کے آغا خانی خیر مقدموں کا عالم دیکھا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ سارے مبالغے واقعات بن گئے تھے اور خیالی طلسم اصلیت کی صورت میں نگاہ کے سامنے جلوہ گر ہو گیا تھا۔ اس گرمیٔ ہنگامہ کا اصلی باعث یہ نشاط افزا اُمید تھی کہ حضور ملک معظم جارج پنجم کی رونق افزائی کے موقع پر مسلمانوں کی پنجاہ سالہ آرزو بر آئے گی اور مسلم یونیورسٹی کا چارٹر ہلالِ عید بن کر نمایاں ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ

ہر واقعہ گزر جانے اور ہر ایجاد موجود ہو جانے کے بعد عام نگاہوں میں معمولی بات ہونے لگتی ہے۔ لیکن حکمت آشنا طبائع ماضی کے اہم واقعات کے پہلوؤں پر عبرت کی نظر ڈالتی اور حال و مستقبل کی مشکل کشائی میں ان سے مدد لیتی ہیں۔ موجودہ کی مشکلات پر غور کر کے ہمت کا سبق حاصل کرتی اور ترقی و ایجاد کے میدان میں قدم بڑھاتی ہیں۔ اب جبکہ ہم مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں تو مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر نظر ڈالنا سبق آموز ہوگا۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے جب مسلمانوں کی تباہ حالی اور آئندہ کی بہبود پر غور کیا تو ان کی دور بین نظر نے پا لیا کہ تباہی کا باعث جہالت اور آئندہ ترقی کی تدبیر علم کی اشاعت ہے وہ اسی دھن میں ولایت گئے۔ وہاں کی تعلیم گاہوں کو بنظرِ غور دیکھا اور کامل فکر و تدبر کے بعد ایک عظیم الشان تعلیمی منصوبہ لے کر واپس آئے۔ اس منصوبے کی شکل ان کی تحریروں اور تقریروں میں صاف اور دلکش پیرائے میں عیاں ہے اور مجسم تصویر بے نظیر محمڈن کالج ہے۔ سرسید نے خوب سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی اور بہبود وابستہ ہے اس اعلیٰ تعلیم کے ساتھ جو جامع ہو قدیم و جدید علوم کی اور شامل ہو شریفانہ تربیت اور اصولِ صحت کی سازِ ست پر۔ انھوں نے دیکھا کہ سرکاری کالج اور اسکول ان مراتب کے لحاظ سے ناقص ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی تعلیم کا اہتمام خود اپنے ذمے لیا۔ ابتداءً اگرچہ وہ بے یار و مددگار تھے۔ لیکن عزم سچا تھا اور ارادہ پکا۔ تائیدِ غیبی نے دست گیری

کی علی گڑھ کی پرانی چھاؤنی کے وحشت خیز خارستان میں اس
دیدۂ بینا نے امت کو وہ عظیم الشان درسگاہ صاف نظر آرہی تھی
جو آج چشم بد دور نونہالانِ قوم کے دم سے رشکِ چمن
ہے اور جس کی تکمیل کے سامان برابر ہو رہے ہیں۔ لارڈ لٹن
نے جس روز بنیادی پتھر رکھا تھا اسی روز سرسید نے اپنے
ایڈریس میں کہہ دیا تھا کہ یہ بنیاد کسی سکول یا کالج کی نہیں ہے بلکہ
ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے جو مسلمانوں کے درد کی دوا بننے
والی ہے۔ اس وقت کے محمدن کالج کے چھپر دیکھتے ہوئے اس
خیال پر "جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھنے" کی مثل
پورے طور پر صادق آتی تھی۔ لیکن وہ خواب سچا تھا اور آج اس کی
تعبیر ایک عالم کے سامنے ہے سرسید نے باہمہ جوانمردی و ہمت
مسلم یونیورسٹی کا ایک ناتمام نقش زمین پر چھوڑا۔ جو مشہور مخالفین اور
مدعیات کے اثر سے مٹنے پر آمادہ تھا۔ ممالک مغربی و شمالی (حال صوبجات
متحدہ آگرہ و اودھ) کا ایک حصہ، ذرا سا گوشہ صوبۂ بہار کا، ملک
پنجاب، یہ وہ ممالک تھے جو وفات کے وقت سرسید کے زیرِ نگیں تھے
چونکہ جمہور امت محمدیہ سرسید کے مذہبی خیالات سے بیزار تھی اس
لیے تعلیمی معاملات میں کشادہ دلی کے ساتھ ان کی معاون نہیں
ہوئی۔ لیکن ان کے پولیٹیکل خیالات کو امت نے سمع و رضا کے ساتھ
سنا اور نہایت مضبوطی کیساتھ اپنی آئندہ فلاح کا دستور العمل بنایا
یہ وجہ ہے کہ سرسید وفات کے وقت بمقابلہ سابق زیادہ دلعزیز
ہو چکے تھے۔ مرحوم نواب محسن الملک اور مسٹر بیک نے اپنی حذاقت و
فراست سے موقع کی نبض پر ہاتھ رکھا اور یادگار سرسید کے پیرایہ میں
قوم کو یونیورسٹی از سرِ نو یاد دلائی اس تحریک کو کامیابی ہوئی۔ لیکن
آج اس کا ذکر ہے

گل آورد سعدی سوئے بوستاں ÷ بشوخی و فلفل بہ ہندوستان

کا مصداق ہے۔ تاہم اس تحریک کے ذکر کو ہماری تعلیمی کانفرنس نے
گوناگوں کوششوں سے تازہ رکھا۔ کہتے ہیں کہ عالم میں رونق و
گرمی ہنگامہ آفتاب عالمتاب کے دم سے ہے اس میں کلام نہیں
ہوسکتا کہ اس دور میں مسلم یونیورسٹی کی رونق و گرم بازاری صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں کی سرگرم کوشش سے وابستہ رہی۔ اس کوشش کا
انتہائی عروج امرتسر کا وہ پرجوش جلسۂ کانفرنس تھا جس میں یونیورسٹی
کا رزولیوشن پیش ہو کر عہدِ قدیم از سرِ نو تازہ کیا گیا۔ بارہ سال کے عرصے
میں چوبیس لاکھ روپے فراہم کرنا اس عہد کا سرمایہ تھا۔ مگر ہماری کمبخت
کا اس وقت تک یہ رنگ رہا تھا کہ کانفرنس کی کاغذی تجویزات
کی فہرست میں ایک نمبر اور بڑھا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ سرسید نے
نقش ناتمام چھوڑا۔ محسن الملک اور بیک کو پوری کامیابی نہیں ہوئی
کانفرنس کی تجویز نے تکمیل کا منہ نہیں دیکھا۔ لیکن چالیس سال کی
مسلسل کوشش اور کانفرنس کے صوبہ بصوبہ اور شہر بشہر اجلاسوں
نے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک یہ خیال دلوں میں پیدا کر دیا کہ ہمارے مرض
کا علاج ہے تو تعلیم ہے۔ یہ کہنا کہ قومی ولولہ ظہور کا بہانہ ڈھونڈھتا
تھا اور اتفاقاً بشکل مسلم یونیورسٹی ہویدا ہوگیا۔ واقعات کا خون کرنا اور
ہمدردوں کی کوششوں پر خاک ڈالنا ہے۔ علاوہ تعلیم کے کوئی اور
کوشش کرو۔ کبھی وہ جوش پیدا نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے مسلم یونیورسٹی
کے متعلق دور افتادہ دیہات اور حلقۂ مستورات میں خدمت کی
ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ تعلیم اور کالج کو ترقی دینا کوئی
اجنبی کام نہ تھا جس کی نوعیت اور کیفیت اپنی اپنی سمجھ کے مطابق
ان کے مخاطب نہ سمجھتے۔ بلکہ جس وقت مسلم یونیورسٹی کا مفہوم ان
کے سامنے اس پیرائے میں بیان کیا جاتا تھا کہ اس کے حاصل ہونے
سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم کا اعلیٰ انتظام ہو جائیگا۔ اور
محمدن کالج تکمیل کو پہنچ جائیگا۔ تو وہ اس کو اپنی ایک

مراد کا بڑا نافیل کرتے اور زور آپندہ دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

انسان کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ لیکن کام تائید غیبی سے بنتے ہیں ؎

عنایت حق بہانہ می جوید

چالیس سال کی متواتر سعی کے بعد وہ زمانہ آیا کہ امت کو مایوسی کا دل بار چہرہ دیکھنے کو ملا، جس کے لئے اسلام حضور ملک معظم جارج پنجم کے قدوم میمنت لزوم سے ہندوستان رشک گلستاں بنا چاہتا ہے۔ اور بنگال کے بعد شاہی دہلی کے جلوے پھر اس سرزمین پر نظر آئیں گے۔ سر محمد علی آغا خان کی فراست نے موقع شناسی کی، اور انھوں نے ٹرسٹیان محمڈن کالج کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ بادشاہ سلامت کی رونق افروزی کی یادگار میں وہ سائنس اسکول (جو ایڈورڈ ولیعہدی کی یادگار ہے) دس لاکھ کے چندے سے سائنس کالج بنا دیا جائے۔ یہ تجویز ٹرسٹیوں کے سامنے آئی، لیکن اس پر جس عزم و دلبستگی سے غور ہوا اس کا میں عینی شاہد ہوں اگر جالت میں خود تحریک نہ ہوتے تو اس کا پاس ہو جانا محال تھا۔ تجویز کے پاس ہونے کے وقت خیالات کا رجحان اس طرف تھا کہ دس لاکھ چندہ ہونا تو معلوم، تاہم کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ صبح صادق کا نور تدریجاً عالم میں پھیلتا ہے۔ آخر کار ہز ہائی نس سر آغا خان نے اس عظیم الشان تحریک کا علم ہاتھ میں لیا جس کے پرچم پر مسلم یونیورسٹی کا طغرا نقش تھا۔ شدا نے مسلمانوں کو بتایا اور یقین دلایا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ان کی یہ مرادیں پوری ہوں، اور جس آب حیات کی قوم برسوں سے تشنہ ہے اس کے دریا ملک میں بہہ جائیں اور دولت برطانیہ کے زیر سایہ خود مسلمان اپنی دینی و دنیوی تعلیم کا اعلیٰ پیمانے پر بندوبست کر سکیں مفہوم تھا ان توقعات کا جو ان الفاظ میں پوشیدہ تھیں کہ حضور ملک معظم کے قدوم کی یادگار میں مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کا چارٹر مل جائے گا

اس تحریک کا اہل اسلام نے جس جوش و حوصلے سے خیر مقدم کیا وہ عالم پر آشکار ہے۔ سرمائے کی تعداد کا مطالبہ جوش قومی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا۔ دس لاکھ سے بیس لاکھ ہوئے۔ بیس لاکھ سے پچیس اور پچیس سے تیس، اور یہ واقعہ ہے کہ آج تیس لاکھ سے زائد سرمایہ مسلم یونیورسٹی کمیٹی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر قومی جوش سے پورا کام لیا جاتا تو وصول شدہ رقم کی تعداد دوگنی ہو چکی ہوتی۔ "اذا اراد اللہ شیئاً ھیّأ اسبابہ"

تحریک مسلم یونیورسٹی کی واسطے نہ صرف روپیہ ملا بلکہ بہت سے کام کے آدمی میدان عمل میں سرگرم کوشش نظر آنے لگے۔ سر آغا خاں، راجہ صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک بہادر، مسٹر مبارز خان شوکت علی، ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے بہت سے بزرگوں کے نام مسلم یونیورسٹی کے کتابوں پر صدہا سال تک باقی رہیں گے۔ فراہمی سرمایہ کے ساتھ ساتھ فدائیان امت کی توجہ قواعد و قوانین مرتب کرنے کی جانب بھی مبذول رہی۔ حکام والامقام کے مشوروں سے نفع اٹھایا۔ آزاد اہل الرائے سے مشورہ لیا اور کوشش و مباحثہ کے بعد مسلم یونیورسٹی کے لیے قواعد مرتب کیے اور ایسے مرتب کیے کہ ناقدین بھی حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے۔)

مسلم یونیورسٹی کی موجودہ تحریک کی جان یہ ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ اور سوسائٹی اور مذہب کے تمام طبقوں اور فرقوں نے یکساں ہمدردی اور شوق کے ساتھ باہم مل کر اس کی تکمیل میں کوشش کی ہے۔

موجودہ مشکلات

"ہر جا کہ گل است خار است" ایک پرانا مقولہ ہے جس کو ہزاروں تجربوں کا ست کہنا چاہیے۔ جبکہ قوم اپنی کامیابی کے نشے میں چور اور باغ امید کے نظارے سے مسرور تھی اس کو مایوسی کی شکل نظر آنے

لگی۔ ٹھوکر باندازہ رفتار لگتی ہے۔ اس ٹھوکر نے تمام قوم کو اس
سرے سے دوسرے سرے تک ہلا دیا۔ اب جنبش کو سنبھالنا اور
قوم کو صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکنے دینا رہنمایانِ قوم کا فرض ہے
خداوند تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ مسلمان اس معرکہ سے خیر و خوبی
کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں گے جو سرکاری مراسلے حال میں شائع
ہوئے ہیں ان سے ان تمام توقعات کو صدمہ پہنچا ہے جو مسلم یونیورسٹی
کیساتھ وابستہ تھیں۔ اندرونی انتظام آزاد نہ ہوگا۔ دائرہ الحاق
کا پرہ صرف سرزمین علیگڈھ پر گردش کریگا "مسلم" کا قلم البدل
آگیا یعنی ہوگا اور ہماری یونیورسٹی کا نام بجائے "مسلم یونیورسٹی"
کے "علیگڈھ یونیورسٹی" ہوگا۔ عزیز توقعات کے سدے سے
مسلمانوں پر ایک عالم پریشانی طاری ہے۔ قوم کے کارآزمودہ
ہمدرد ثابت قدم ہیں کوشش کر رہے ہیں کہ اس کو اس کی ظلمات سے
نکال کر پھر امید کے نور میں لے آئیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک
طبقہ ایسا ہے جس کی تحریروں اور رایوں سے اضطراب اور گھبراہٹ
کے آثار نمایاں ہیں ناصحانِ شفیق میں بعض وہ حضرات سب سے
زیادہ بلند آہنگ ہیں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو کامیاب
بنانے میں بہت ہی کم تکلیف گوارا فرمائی تھی (بلکہ ایک حد
تک جدا رہنا پسند فرماتے رہے) اہلِ خرد کے نزدیک ایسے
ناصحوں کی نصیحتیں کیا وقعت حاصل کر سکتی ہیں۔ اس وقت
سب سے اعلیٰ فرض سرکاری تجاویز پر یکسو دلی اور اطمینان کے ساتھ
غور کرنا اور قوم کو صراطِ مستقیم کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔

مسئلہ الحاق کے خلاف سرکاری مراسلات میں حسب ذیل
دلائل پیش کی گئی ہیں:۔

۱۔ موجودہ یونیورسٹیوں کیساتھ منافشہ کا اندیشہ

۲۔ معیارِ تعلیم کا پست و متبذل ہو جانا

۳۔ نگرانی کی عدم قابلیت

ہمارے نزدیک گورنمنٹ نے جن امور کا اندیشہ ظاہر کیا
ہے وہ ضرور قابلِ لحاظ ہیں لیکن مسلمانوں کی یونیورسٹی سے یہ
اندیشہ ظاہر کرنا خلافِ حقیقت ہے تعلیم جدید کے متعلق
نصف صدی اور تعلیم قدیم کے متعلق تیرہ صدیوں کا تجربہ کافی
ضمانت اس امر کی ہے کہ مسلمان ان خطاؤں کے مرتکب نہ ہوں گے
اسلام نے جس وقت اس عالم میں قدم رکھا اشاعتِ علم کا پرچم
اس کے ہاتھ میں تھا۔ قرآن مجید کی جو آیتیں سب سے پہلے نازل
ہوئیں ان میں پڑھنے اور لکھنے کا حکم اور ذکر ہے۔ کلامِ ربانی
اور احادیثِ نبوی میں کثرت سے علم اور اہلِ علم کا فضل و شرف
بیان فرمایا گیا ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مسجدِ نبوی میں
ایک سائبان تھا جس میں صحابہ کرام کا ایک گروہ رہتا تھا جن کی
ضروریات کا اہتمام خود حضرت سرورِ عالم فرماتے تھے اور یہ بزرگ
خدمتِ بابرکت میں حاضر رہ کر علم دین کا فیض حاصل کرتے تھے ان
ہی بزرگوں میں سے ایک صحابی حضرت ابوہریرہؓ تھے جن کی شان
سے اہلِ علم واقف ہیں۔ یہ قدسی گروہ "اصحابِ صفہ" کے نام
سے مشہور ہے۔ یہ ہے بنیاد ان عظیم الشان درسگاہوں کی جو
صدہا سال تک ممالکِ اسلامیہ میں قائم ہوتی رہیں۔ ہر بڑی مسجد
کیساتھ مدرسہ لازم تھا۔ جامع مسجد دہلی کے ساتھ جو مدرسہ تھا اس
کا نام "دارالبقا" تھا اور آج قاہرہ میں اس کا نمونہ "جامع ازہر"
موجود ہے۔ اپنے علوم کے سوا اور قوموں کے علوم کی طرف بھی
مسلمانوں نے نہایت اولوالعزمی سے توجہ کی۔ یونان
ہندوستان و ایران کے علوم ترجمے کے ذریعے مسلمانوں کی
زبانوں میں منتقل کیے۔ جس ملک میں مسلمانوں کے قدم گئے
دولتِ علم سے مالا مال ہو گیا۔ ہماری تاریخ کا یہ شاندار ورق

صدیوں تک مسلمانوں نے علم کو صرف علم کی خاطر حاصل کیا۔ جب مشہور نظامیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو علمائے ماوراء النہر نے ایک ماتم کا جلسہ منعقد کیا اور اس پر ندامت کیا کہ اب علم، علم کی خاطر نہ پڑھا جائے گا بلکہ اس سے ادنیٰ منافع پیشِ نظر رہیں گے۔ یورپ میں صدیوں تک مسلمانوں کے علوم زیرِ درس رہے۔ ابن رشد اور ابن سینا کا فلسفہ بیکن کے اجتہاد تک پڑھایا جاتا رہا تھا۔ جب مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو سر سید احمد خاں مرحوم نے انگلستان کی بہترین درس گاہوں کو نمونہ قرار دیا۔ یعنی کیمرج اور آکسفورڈ کو۔ کیا مسلمانوں کے واسطے یہ مقامِ فخر نہیں بلکہ خود وہ قوم جس کے کارنامے آکسفورڈ اور کیمرج ہیں۔ ہندوستان میں لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ کرنے پر یہ اعلیٰ نمونہ تعلیم قائم نہ کر سکی تھی۔ پچاس برس کے تجربہ کے بعد اب یہ اربابِ تعلیم بالاعلان تسلیم کر رہے ہیں کہ جو چیزیں انھوں نے چھوڑیں وہی دراصل تعلیم کی جڑ تھیں۔

مذہبی تعلیم، تربیت، جسمانی صحت کی نگہداشت، یہ وہ امور ہیں جو ہمارے کالج کی خصوصیات خاص رہے ہیں۔ اور دوسری یونیورسٹیوں کی جگہ جب کہ مسلمان اپنے حسنِ تدبر سے ان کو نباہتے رہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے کالج کے طلباء قابلیت و لیاقت کا معیار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جبکہ ہم بورڈنگ ہاؤس قائم کر رہے تھے اور تربیت کے اسباب میں مصروف تھے دوسرے کالج اس سے بالکل غافل اور بے خبر تھے۔ ان کالجوں میں جو بنگلے یا مکانات طلباء کی سکونت کے واسطے تھے وہاں تربیت کا عدم وجود برابر تھا۔ خود مجھ کو اس صوبہ کے ایک نامور کالج میں پڑھنے کا فخر حاصل ہے۔ اس کے بورڈنگ ہاؤس کے بنگلے ایک وسیع میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ مگر وہ سلسلہ مفقود تھا جو کیریکٹر کا سانچے میں ڈھالنے والا ہے۔ میری موجودگی میں نواب محسن الملک مرحوم نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے ایسے بورڈنگ ہاؤسوں کو "سرائے" سے تعبیر کیا تھا۔ یہ تعریف ایسی جامع و مانع تھی کہ مدت تک کمیشن کے کاغذات میں دائر و سائر رہی جن لوگوں کو ہمارے کالج کے جلسے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ مسٹر بیک ہمارے ہر دلعزیز پرنسپل کس جوش اور فصاحت کے ساتھ سرکاری یونیورسٹیوں کے نقائص علی گڑھ تشریف لانے والے وائسرایوں اور دیگر بلند پایہ وزیٹروں کے سامنے اسٹریچی ہال میں بیان کیا کرتے تھے۔ ان گزشتہ اور موجودہ واقعات کے ہوتے ہوئے ہماری جانب سے یہ اندیشہ کرنا کہ ذی اختیار ہونے پر ہم معیارِ تعلیم پست کر دیں گے کس قدر حیرت خیز ہے۔ ہم نے اور صرف ہم نے چالیس سال تک انگریزی تعلیم و تربیت کا معیار ہندوستان میں بلند رکھا۔ جبکہ ہمارے رفیق اور رقیب پیدا ہو رہے ہیں ہم اس پر ہم کو یہی کہنا ہے "انّ هذا الشیٔ عجاب"۔ رہا دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ منافسہ۔ جب سرکاری یونیورسٹیوں میں باہم مناقشہ پیدا نہیں ہوتا تو مسلم یونیورسٹی کہ ازروئے مثل مذکورۂ بالا یونیورسٹیوں کے اصول و قواعد کی پابند ہوگی ان سرکاری یونیورسٹیوں سے مناقشہ کرنا بعید از قیاس ہے۔ ایک ہی کالج کے طلباء دو دو یونیورسٹیوں میں امتحان دیتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر کبھی مناقشہ پیدا نہیں ہوتا۔ تو جو کالج ایک ہی یونیورسٹی کے ماتحت ہوں گے وہ نزاع کا دنگل بن جائیں گے یہ ناممکن ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی امر اختلافی ہوگا۔ (جیسا اور تمام باقاعدہ جماعتوں میں بھی پیدا ہوتا رہتا ہے) تو اس کو ہمارا عالی مرتبہ چانسلر فیصل کر سکے گا ——!

بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ جبکہ ہمارے پاس اس

وقت متعدد کالج نہیں ہیں تو الحاق پر اصرار بے معنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کالجوں کا ہونا مقتضی ہے اس امر کا کہ الحاق کا اختیار ضرور حاصل کیا جائے۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اسی لیے چند مسلم یونیورسٹی کے متعلق مختصر واقعات گذارش کر دیے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ باوجود سالہا سال کی مسلسل کوشش کے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کا ایک پیادہ پا آدمی کی رفتار چلنا اور ۱۹۱۱ء میں موٹر کی تیزی اور ہوائی جہاز کی پرواز اختیار کر لینا محض اس وجہ سے تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس اتحاد کے قابل ہیں کہ اپنی تعلیم کا اپنی ضروریات کے مطابق خود انتظام کر سکیں۔ اسکا مزید ثبوت کہ لائق ایڈیٹر (مولانا محمد علی جوہر) نے عدداً ثابت کیا ہے کہ سہ روزہ ان کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں نے خود اپنے کالجوں اور سکولوں کو سالہا سال میں اتنا روپیہ نہیں دیا جتنا چند مہینے میں مسلم یونیورسٹی کو دے دیا۔ اس طرح برسوں کی میعاد سمٹ کر مہینوں کی شکل میں آ گئی۔ اس صورت میں اگر الحاق کا اختیار نہیں ملے گا تو سالہا سال تک بھی کالج قائم نہ ہوں گے۔ وجہ یہ کہ قیام کالج کے اصلی دونوں سبب مفقود ہوں گے یعنی امید اور مرکزی قوت۔ لیکن اگر اختیار الحاق حاصل ہو جائے تو یہی دونوں سبب مل کر حیرت خیز عجلت کیساتھ ہر صوبے میں کالج قائم کر دیں گے۔ یہ اندیشہ کہ مختلف صوبوں میں کالج قائم کرنے سے قوت متفرق ہو جائے گی۔ اگر صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ صوبوں میں کالج قائم نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ اس پر بھی غور کرنا چاہئیے کہ جب مرکزی قوت ہر صوبے میں کالج قائم کرے گی تو قوت متفرق نہ ہو گی بلکہ متفقہ کوشش کام کر جائے گی۔ یہ محض بحث یا مناظرہ نہیں ہے بلکہ ایک دقیق پہلو اس معاملے کا ہے جس پر مسلمانوں کو پوری توجہ سے غور کرنا ضروری ہے۔

الحاق کے خلاف ایک دلیل یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ سر سید احمد خاں نے بیرونی کالجوں کا الحاق اپنی اسکیم میں نہیں رکھا تھا۔ اس دلیل پر غور کرنے کے وقت ہم کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سر سید نے اپنی اسکیم میں ایک ہزار طلبہ کی تعداد رکھی ہے۔ ان کے زمانے میں جو حالت جدید تعلیم کی اشاعت اور محمڈن کالج کی مقبولیت کی تھی وہ اب برگذارشں ہو چکی ہے۔ اس کے لحاظ سے ایک ہزار طلبہ کی تعداد کافی تھی اور جو یونیورسٹی صرف ایک ہزار طلبا کے واسطے بنے اس کے واسطے علیگڈھ سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ جس کالج کی بنیاد جس پیمانے پر رکھی گئی وہ ایک ہزار طلبہ کے واسطے کافی تھی۔ آج حالات بالکل متغیر ہو چکے ہیں اور مسلمانوں میں جدید علوم کا شوق اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ایسے مرکز تعلیم میں یا جبکہ مسلم یونیورسٹی ہو گی ایک ہزار طلبہ کی تعداد مضحکہ خیز ہے۔ سر سید احمد خاں کے زمانے میں کالج کا دائرہ بہت ہی محدود تھا۔ اب ہندوستان جنت نشان کے چاروں کونوں میں جو اولو العزم طالب علم آنکھ کھولتا ہے وہ علیگڈھ کی طرف دیکھتا ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے تشنہ لب ترقی مسلمان بھی علیگڈھ کے خواب دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں قدیم اسکیم کے اس حصے کو ایک سند کے کافی دستاویز سمجھ لینا خودکشی کا مرتکب ہونا ہے۔ جو لوگ خود علیگڈھ میں دائرہ یونیورسٹی محدود کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ متعدد کالج قائم کرو۔ ان سے پوچھو کہ سر سید کی اسکیم میں متعدد کالجوں کا علیگڈھ میں بنانا کہاں تھا۔

نگرانی

ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ مسلمان نگرانی کالجوں کی نہ کر سکیں گے۔ اول تو یہ امر یہ ہے کہ جو لوگ علیگڈھ کے متعدد کالجوں کی

کر سکیں گے وہ باہر کے کالجوں کی نگرانی سے کیوں قاصر رہیں گے؟ جو گروہ علیگڈھ کے متعدد کالجوں کے واسطے طریقۂ تعلیم، نصاب، اصولِ تربیت وغیرہ اہم اور عظیم الشان امور تجویز اور مدون کر سکتا ہے امتحان لے سکتا ہے، سندیں دے سکتا ہے وہ یہی کام باہر کیوں نہیں کر سکتا۔ صرف فاصلے کا سوال باقی رہ جاتا ہے جس طرح سرکاری یونیورسٹیاں دور دراز فاصلے پر کالجوں کی نگرانی کر سکتی ہیں اسی طریقے سے مسلم یونیورسٹی کر سکے گی۔ بقدر ضرورت بیش قرار انسپکٹر رکھے جا سکتے ہیں۔ بیرونی کالجوں کی نگرانی کے متعلق جو قواعد ہماری کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے تجویز کیے ہیں ان کے پڑھنے سے واضح ہو سکتا ہے کہ کیسا مفید اور مضبوط طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔ مجوزہ طریقے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں آئندہ تجربے سے ثابت ہوں ان کی اصلاح بتدریج ہوتی رہے گی۔ اب صرف یہ امر باقی رہتا ہے کہ ہم قصداً معیارِ تعلیم پست کر دیں اس کا جواب اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم ایسے رہے تو اپنا اعتبار کھو دیں گے۔ اور گورنمنٹ کو سلب اختیارات کا حق ہر وقت حاصل ہوگا۔ مسئلہ الحاق پر غور کرتے وقت ایک اور پہلو قابلِ لحاظ ہے۔ تھوڑی دیر کو مان لیجیے کہ مسلم یونیورسٹی کا دائرۂ اثر علیگڈھ تک محدود ہو، اس صورت میں وہ کالج اسلامیہ جو مسلم یونیورسٹی کے زیر اثر نہیں آئیں گے ان کی مذہبی تعلیم اور ان کی نگرانی کا کیا اہتمام ہوگا؟ ان کی تربیت (جس میں مذہبی و قومی زندگی کا لحاظ رہے) کس کے متعلق ہوگی ظاہر ہے کہ سرکاری یونیورسٹیاں (جو مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے بری ہیں اور جدا رہیں گی) یہ بار اپنے ذمے نہیں لے سکتیں دوسری شکل یہ ہے کہ خود ان کالجوں کے مہتمم ان امور کے نگراں بنیں اور ضرور یہی ہوگا۔ تو اس صورت میں غور کرنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی کی نگرانی ناقص خیال کی جائے اور اس سے متفرق اشخاص کی نگرانی اعلیٰ ہو، یہ کیسا خیال ہے! ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی اور قومی تعلیم و تربیت صرف اسلامی گروہ کر سکتا ہے اور اسلامی گروہ مسلم یونیورسٹی سے بہتر دستیاب ہونا بھی عرصے تک ممکن نہیں۔

نام

نام کی خوبی یہ ہے کہ وہ متعارف اور مسمیٰ کے ساتھ مناسب ہو۔ جو یونیورسٹی مسلمانوں کے واسطے دینی اور دنیوی اعلیٰ تعلیم گاہ ہو اس کا نام "مسلم یونیورسٹی" سے بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے جب مسلمانوں کے واسطے کالج قائم کیا تو اس کا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" رکھا۔ علاوہ کالج کے اس زمانے میں جو اور تحریکیں مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں ان کے نام کے ساتھ بھی "محمڈن" کا لفظ ضرور رہتا۔ مثلاً "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس"، "محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ"۔ چونکہ انگریزی میں اس زمانے میں "مسلم" کے واسطے "محمڈن" کا لفظ تھا اس لیے انگریزی نام میں اس لفظ کا رواج زیادہ تھا۔ ورنہ مسلمانوں نے خود اس لفظ کو اپنے واسطے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ سر سید نے اپنے کالج کا نام ہندوستانی "مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڈھ" رکھا۔ مابعد کی تحریکوں میں یہ رجحان عام رہا اور بجائے محمڈن کے "مسلم" "اسلامی" الفاظ زیادہ رائج ہوئے چنانچہ "انجمن حمایت اسلام لاہور" "اسلامیہ کالج لاہور" "انجمن اسلامیہ پنجاب" "مسلم لیگ" "مسلم ڈیپوٹیشن" جو کالج پشاور میں پشاور میں مسلمانوں کے واسطے قائم ہوا ہے اس کا نام بھی "اسلامیہ کالج" تجویز کیا گیا ہے اسی بنا پر مسلم یونیورسٹی کی کمیٹی نے اس عظیم الشان درس گاہ کا نام مسلم یونیورسٹی تجویز کیا جو ہزاروں

لاکھوں مرتبہ اس عرصے میں پبلک کی زبانوں پر آیا اور بلا مبالغہ لاکھوں ہی مرتبہ قلم بند ہوا۔ اس تحریک کے متعلق اخباروں، کتابوں، رسالوں، اسپیچوں، خط و کتابت اور مراسلت میں بھی یہی نام پبلک سے روشناس رہا ہے اور پبلک کو اس تحریک کے حامیوں نے بتایا ہے کہ جو درسگاہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کی متکفل ہوگی اس کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہوگا۔ کوئی شبہ نہیں کہ پبلک کا عام رجحان اس طرف ہونا اسی وجہ سے تھا کہ ان کو انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی اطمینان دلایا گیا۔ اب اس کا نام بدلنا پبلک میں بدگمانی پیدا کرے گا کہ مقاصد یونیورسٹی میں کچھ تغیر و تبدل ہوا جو یہ نام بدلا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جب ہماری تمام تعلیمی و پولیٹیکل تحریکیں اپنے نام کے ساتھ اسلامی نشان رکھتی ہیں تو اس سارے مجمع میں اس عظیم الشان درسگاہ کا اس نشان سے محروم رہنا کس قدر بدنما ہوگا۔ پبلک میں مذکورہ بالا بدگمانی پیدا ہونا اس عام ہمدردی کو اس تحریک سے جدا کر دے گا جو اب تک اس کے ساتھ ہے۔ یہ محض وہمی اندیشہ نہیں ہے، واقعی اندیشہ ہے ابتداءً اس امر میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں علماء کے شامل نہ ہونے سے جو ناراضی پیدا ہوئی تھی اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نام آخر نام ہے انھوں نے غالباً معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہے۔

اب کرنا کیا چاہیے؟

اب اہم سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو آئندہ کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ہر قسم کوتاہ اندیشانہ جوش و خروش اور شور و غوغا سے احتراز کیا جائے گورنمنٹ کی جانب سے نہ خود بدگمانی کرنی چاہیے اور نہ دوسروں میں پھیلانی چاہیے۔ سربرآوردہ مسلمانوں کا اہم فرض ہے کہ وہ اس نازک موقع پر قوم کی کشتی کو فہم و فراست کے ساتھ کھے کر کنارے پر لگا دیں۔ مع ہذا استقلال و ادب کے ساتھ اپنی ضرورتوں کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرتے رہنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی تحریک کی جان وہی امور ہیں جو اس وقت زیر بحث ہیں اور مسلم یونیورسٹی کے سلسلے کا درہم برہم ہونا حضور ملک معظم کی سات کروڑ رعایا کی تعلیم کے سلسلے کا درہم برہم ہونا ہے اگر سربرآوردہ مسلمان یہ امور گورنمنٹ کے ذہن نشین نہ کر سکے تو وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں قاصر رہیں گے جب تک ایسی یونیورسٹی نہ ملے جو ہمارے مقاصد کو مفید ہو اس وقت تک قبول نہیں کرنی چاہیے سوائے کو برابر ترقی دی جائے جو وعدے ہوں وہ پورے ہوں۔ جو لوگ وعدے پورے کر چکے از سر نو چندہ دیں۔ تیس لاکھ آخر ایک قلیل رقم ہے مسلم یونیورسٹی کی تکمیل کیلئے چندہ پھر ہونا، پھر ہونا۔ وہ اب فرصت میں ہونا چاہیے جس قدر سرمایہ جمع ہوگا۔ ہم منزل کے قریب تر پہنچ جائیں گے۔ جو سرمایہ جمع ہے اس کے یا اس کے منافع کے خرچ کرنے کا اس وقت تک خیال بھی نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ مسلم یونیورسٹی کی منظوری نہ ہو جائے کمیٹی اس سرمائے کی امین ہے۔ اور سب سے بڑی امانت یہ ہے کہ چندہ دہندوں کی شرائط کا لحاظ رہے۔ بدون منظوری مسلم یونیورسٹی محمڈن کالج علیگڈھ میں روپیہ لگانا امانت کے خلاف ہوگا۔ رہا واپسی سرمایہ کا خیال، میرے نزدیک کوئی ذی حیثیت مسلمان اس کا خواب بھی نہ دیکھے گا۔ جب روپیہ بغرض واپسی کیلئے دیا گیا ہے تو اب واپسی کیسی؟ آخر میں ... کہ اس وقت ناصحان مشفق بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ بلکہ ان کی نصیحت سننے سے پہلے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ ... نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں کس قدر جانفشانی کی ...

لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے، وہ پہلے بھی تماشا دیکھتے تھے اب
بھی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ جن دنوں میں اس تحریک کا دور دورہ
صرف ان کی نصیحت قابلِ قبول ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ مورخہ ۲۳ اکتوبر
۱۹۱۲ء بحوالہ مقالاتِ شروانی)

۱۹۱۹ء

رزولیوشن نمبر ۱ متعلق قیامِ مسلم یونیورسٹی
آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے
بیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ سورت میں بماہِ دسمبر گذشتہ
تمام ارکان و حاضرینِ اجلاس کی متفقہ رائے سے پاس ہوا ہے جس
کی نقل اس مختصر گذارش کیساتھ آپ کی توجہ کی غرض سے ارسال
خدمت کرتا ہوں کہ تاخیر قیامِ مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے جو عالمگیر
مایوسی قوم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس حوصلہ شکن حقیقت پر آپ جلد
سے جلد توجہ فرمائیں اور ذیل کے واقعات پر غور کر کے شکرگزاری کا موقع دیں۔
سنہ ۱۹۱۰ء میں جب ناگپور میں یہ تعلیمی کانفرنس منعقد
ہوئی تو ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہٗ انگلستان سے تشریف
لا کر اس قومی مجلس میں شریک ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے خیال کو
پیامِ امید کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کی۔ سنہ ۱۹۱۱ء
اور سنہ ۱۹۱۲ء یہ دونوں سال حسنِ عمل اور جوشِ قومی کے لحاظ
سے نواب وقار الملک بہادر مرحوم کے عہد کے ہمیشہ تاریخی سال
شمار ہوں گے۔ یونیورسٹی کے وجود میں لائے جانے کی کوشش میں
قوم کے ہر بڑے چھوٹے نے حصہ لیا۔ امراءِ قوم نے فیاضی کے ساتھ
ہز ہائی نس ممدوح کی اپیل کا خیر مقدم کیا۔ لاکھوں روپوں سے مدد کی غریب
اور اوسط درجے کے طبقے نے بھی اپنی اپنی ہمت سے کام لیا اور جس سے جس
قدر مالی امداد بن پڑی۔ اس نے مدد کی۔ نہ صرف شہروں بلکہ قصبوں
اور قریوں میں مسلم یونیورسٹی کی صدا لگاتے ہوئے وہ لوگ نظر آئے جن کا اپنی
آرام گاہوں سے قدم باہر نکالنا دشوار معلوم ہوتا تھا
زہاد و اربابِ جماعت سے گذر کر علماء اور صوفیاء کے مقدس
گروہ تک نے تجویز کو قوم کے حق میں آیۂ رحمت سمجھ کر خود اس علمی
کوشش میں شریک ہو کر یونیورسٹی کی ضروریات پر مہر کی جس کا نتیجہ ڈیڑھ
سال کوشش میں یہ نکلا کہ جو مجوزہ رقم قیامِ مسلم یونیورسٹی کے واسطے
قوم سے طلب کی گئی تھی وہ ستائیس اٹھائیس لاکھ نقد کی شکل میں فراہم ہو گئی۔
غرض اس آہنگ عمل نے نوائے عمل کے بیدار کرنے میں اس
سرعت اور تیزی کے ساتھ حصہ لیا کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت و
جہالت سے چونکتا ہوا دیکھ کر ملک کی دوسری زندہ اقوام نے
بھی ان کے طرزِ عمل کو حیرت کے ساتھ دیکھا اور ان کے احساسِ ملی
پر غور کے ساتھ توجہ کی۔
لیکن کوشش اور عمل کا یہ ایک بادل تھا کہ گرجا اور برسا
اور پھر ایسا کھلا جس کے دوبارہ امنڈنے کی مشکل سے امید ہوتی
ہے یا جد و جہد کا ایک طوفان تھا جو آناً فاناً آیا اور نکل گیا۔ یا
قوتِ اتحادی کا ایک سیلاب تھا کہ دفعتاً اٹھا اور اپنے ساتھ دوسری
خصوصیات کو بھی بہا لے گیا۔ اور جس کے پھر اٹھنے کا خیال ہی نہیں
آتا ہے۔
یونیورسٹی کے متعلق جو حوادث وانکار سامنے سے گزرے ان کا
نتیجہ محمڈن یونیورسٹی کی شکل میں ظاہر ہوتا تو مسلمانوں کی گزشتہ اعمال
کی وجہ سے کارآمد تھا ہی ان کی وجہ سے دوسری قومی تحریکوں کو جو
دھکا لگا وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں مسلمانوں
کے دلوں میں مایوسی اور ناامیدی کے خیالات جاگزیں ہو گئے ہیں ان کی حرکت
بند ہو گئی ہے۔ اور جن سوتوں سے کشتِ امید کی آبیاری توقع کی جا سکتی تھی۔ ان
کے منہ تک بند ہو گئے ہیں خود مدرسۃ العلوم علی گڑھ جس کی ترقی
کی کوشش میں آدھی صدی گذر چکی ہے اور جس کو یونیورسٹی کے درجہ

تک پہنچانے کا خیال پچاس برس سے اس کے بانیوں اور اس کے کارفرماؤں کے دل و دماغ میں گردش کر رہا ہے اور جس کے وجود میں لانے کے لئے یہ جد و جہد اور تگ و دو جاری تھی۔ یہ خیال اب ایک مایوسی کی شکل میں آشکارا ہو کر خود کالج کو اس کے درجے سے گرانے کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور جس کی یہ حالت اب مخفی نہیں رہی کہ وہ علیگڈھ جس کی شہرت اور تعلیم کی خوبی نے چار چاند لگا کر قوم کی قوت کو ایک مرکز سمجھ کر اس کے گرد جمع کر لیا تھا۔ اب اس کا شیرازہ منتشر ہونے کے قریب آ لگا ہے اور اس کالج کو (جس کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر نہ صرف قوم کو اعتمادِ کلی حاصل ہو چکا تھا بلکہ حاکمانِ وقت کی رائیں اس کے اوصافِ تعلیم و تربیت کی خوبی کو برملا ظاہر کرتیں اور اس کی مدد کرنے میں پیش از بیش نظر آتی تھیں) اب خود قوم کی توجہ کا یہ حال ہے کہ سیکڑوں طلبا کالج سے جدا ہو گئے جن درسگاہ کے بورڈنگ ہاؤسوں میں قلت تعداد کی ہمیشہ شکایت رہی، جس میں طلبا کی گنجائش نکالنے کی واسطے منتظمان کالج کی کوشش ہر وقت سرگرم نظر آتی تھی، وہاں بیسیوں اور سیکڑوں طلبہ کی سکونت کے مکان خالی پڑے ہوئے جانے والوں کو یاد کر رہے ہیں اور اس بے اعتمادی اور اس کی خرابیٔ تعلیم کی شکایتیں ہر جگہ سنی جاتی ہیں کیا یہ حالت اب اس حد تک پہنچ گئی کہ ہم اس پر غور کر کے اصلی مرض کے دفعیہ کی کوشش کریں؟ حالت یہ ہے کہ بے سر و پا باتوں اور بے بنیاد واقعات کی اصلاح کرنا اور صحیح حالات کا ظاہر کرنا بھی ایک ایسا امر ہو گیا ہے جس کے سننے کے لئے لوگ تیار نہیں ہیں جو خیالات تعلیم کی طرف سے بے توجہی کے پھیلے ہوئے ہیں جس طرح رفتہ رفتہ اس چھ سات سال کے دوران فیاض اور ہمدرد اصحاب نے تعلیمی امداد سے دست کشی اختیار کر رکھی ہے اور جس طرح تمام قوم میں ایک پُر معنی خاموشی طاری ہے نیز بے اعتمادی اور بدگمانی کا جس بلند آہنگی کے ساتھ اعلان ہوا ہے، میری ناچیز رائے میں اس سرد مہری کے دوسرے اسباب فرع ہیں۔ ان اصلی واقعات کے جو اس زمانہ میں پیش آئے ہیں اصلی سبب اور حقیقی بنیاد سراغ لگانے میں اگرچہ توجہ کی جائے گی۔ تو مسلم یونیورسٹی کے امکان کا ظہور میں نہ آنا قوم میں پژمردگی اور تعلیمی جوش کی مانع ترقی کا سبب دیگر اسباب سے قوی تر ثابت ہوگا۔ جن کے حاصل ہو جانے کی بہت سی ذمہ دار تقریروں میں گنجائش نکال کر یونیورسٹی کے امکان کو یقین کے درجے تک حاصل کرنے کی قوم سے ضمانت کر لی گئی تھی۔

مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے کا جوش اور سرگرمی کا زمانہ جو ایک حرکت مذبوحی سے زیادہ ثابت نہ ہوا، گذر گیا تو دوسری طرف ہندو سیٹھ میں کام کا حقیقی جذبہ ہوا۔ ان پر بھی موافق اور ناموافق دونوں حالتیں گذریں۔ لیکن انجام بینی اور مصلحت اندیشی چونکہ ان کے ضمیر فطرت میں داخل ہو چکی تھی انھوں نے اپنی منزلِ مقصود کا راستہ تلاش کر لیا۔ جس منزل کی ان کو تلاش تھی وہ وہاں پہنچ گئے اور پہنچ کر آباد بھی ہو گئے ان کی تمنا کی فصل کی بیل بھی پھلی اور پھولی شروع ہو گئی۔ ہندو یونیورسٹی قائم ہو گئی اس کے کانووکیشن کا جلسہ بھی گذشتہ مہینے میں ہو چکا (جس کی مبارکباد ہم برادرانِ وطن کی خدمت میں پیش کرتے ہیں) اور ہم ابھی تک ہست و نیست کے مباحث سے فارغ نہ ہوئے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

مسلم یونیورسٹی ملتی یا نہ ملتی، یہیں تک خیر تھی ہم نے اس چیز کو بھی متزلزل کر دیا جس کی ترقی میں پچاس برس صرف کئے گئے تھے۔ یہ وہ مظاہرۂ حقیقت ہے جس پر توجہ کرنے

سے ہمارے ضعف اور غفلت کا اصلی راز کھلتا ہے۔ اب تھکے ماندوں کے لیے بستر راحت و عالم سکون کا درجہ باقی تھا جس میں ہم پورے اطمینان و راحت کے ساتھ مبتلا نظر آتے ہیں۔ مولانا حالی کا یہ قول جیسا ہماری حالت پر منطبق ہے شاید ہی دنیا کے کسی خطے کی قوم کے مناسب حال ہو ؎

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ بار سب کھولے کر
ہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر
قوم میں تعلیم پھیلانی تھی سو پھیلا چکے
ہو گیا وہ بیج جو بویا تھا نخل بارور
پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اسی منزل میں ہیں۔
باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرام سفر

مخدومانِ من! قوم میں تعلیمی تحریک کو مسلم یونیورسٹی کے معرض وجود میں نہ آنے سے جو صدمہ پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے اور اس سبب سے جو مایوسی کے خیالات عالم گیر طور پر پھیل رہے ہیں اور جن کا اظہار قومی مجلسوں میں آپس کی ملاقاتوں میں گھروں میں بیٹھ کر کیا جاتا ہے، میں نے اس حالت کی طرف اس لیے جناب کی توجہ چاہی ہے کہ جو وقت گزرنا تھا گزر گیا، اور جو حالت پیدا ہونی تھی وہ ہو گئی۔ میری رائے ناقص میں اس غفلت اور سکون کا علاج اب بھی اگر ہو سکتا ہے تو مسلم یونیورسٹی کے چارٹر سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہی چیز ایسی ہو گی جو بیداری کی پھر حرکت پیدا کرے گی۔

لہٰذا آپ کی قومی ہمدردی اور جوش سے اپیل کر کے رزولیوشن پاس کردہ اجلاس کانفرنس کے آخری جلسے پر اس ناچیز گذارش کو ختم کرتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے واسطے جلد تر قانونی کارروائی کی تکمیل میں کوشش فرمایئے۔ اس کے لیے مناسب ہو گا کہ باہمی مشورے سے فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔ اصل رزولیوشن کی عبارت بغرض ملاحظہ و توجہ درج ذیل ہے۔

(رزولیوشن مذ کورۂ بالا) "بلحاظ اس تاخیر کے جو مسلم یونیورسٹی کے قائم ہونے میں واقع ہوئی ہے اس کانفرنس کا یہ مضبوط خیال ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے جلد تر قانونی کارروائی کی تکمیل میں کوشش کی جائے۔"

علی گڑھ

مرکز علم و ہنر میکدہ سوز و ساز
سجدہ شوق سے آباد ہے رندوں کا حرم
جام در جام ہے صہبائے جنون حکمت
دیکھنا ہو تو کوئی دیکھ لے ساقی کا کرم
میگساری کا یہ انداز نہ دیکھا ہم نے
سب کے دکھ درد کا احساس نشے کا عالم
ایک ہی آگ سے ہر روح جلا پاتی ہے
ہو گئے ایک شعلے میں شرارے مدغم
اپنے ہر درد کی تحریک کا آئینہ لیئے
پھر اٹھاتا ہے علیگڑھ نئی دنیا میں قدم
راہ دشوار میں ایک قافلۂ نکہت و نور
سنگ خارا کی چٹانوں کے مقابل ہے کھڑا

لوٹ جائے گا بہت جلد طلسم امروز
نور فردا کے تبسم میں بدل جائے گا

انجم اعظمی

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کی ایک یادگار تقریر

(پٹنہ ۳ر اکتوبر ۱۹۳۸ء)

جناب صدر و معزز حاضرین! آپ میں سے اکثر بلکہ غالباً سب، اس بات پر متحیر ہوں گے کہ جس شخص کو آپ نے کبھی پٹنہ میں دیکھا ہے وہ آپ کے سامنے یہ دعویٰ کرے کہ پٹنہ میں نے دیکھا ہے، میری مراد آج کے پٹنہ سے نہیں بلکہ ۱۹۰۲ء کے پٹنہ سے ہے جس پر اب ۳۵ - ۳۶ سال کا زمانہ گذر چکا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ ترقی کا ہے اس لیے ہر چیز ترقی پذیر ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم پستی کی طرف جا رہے ہیں اور پٹنہ بجائے ترقی کرنے کے پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اگر وہ پہلے بلندی پر تھا تو آج زمین پر ہے۔

حضرات! میں نے اس پٹنہ میں کیا دیکھا "خدا بخش" کو دیکھا جنھوں نے اپنی ساری دولت، طاقت اور تدابیر اس کام میں صرف کر دی تھی کہ نادر و نایاب کتابیں جس طرح بھی ممکن ہوں حاصل کریں، چنانچہ انھوں نے خود مجھ سے نہایت لطف و فخر سے بہتی وہ عیاریاں ایک ایک کر کے بیان کی تھیں جو کتابیں حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کیں۔ نیز یہ کہ وہ کن کن تدبیروں سے اس قدر نادرالوجود کتابیں جمع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

"خدا بخش مرحوم" کے علاوہ میں نے مولوی حکیم عبدالحمید کو دیکھا جو اس عہد کے ایک نہایت زندہ دل ممتاز عالم تھے، کچھ زمانہ ہوا کہ علیگڈھ میں ایک کمیٹی کے سلسلے میں بہار کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان جنھیں ڈاکٹر کی ڈگری بھی حاصل ہے تشریف لائے۔ جب ملاقات کے موقع پر ان سے پٹنہ اور اسی سلسلے میں حکیم عبدالحمید صاحب کا ذکر کیا تو انھوں نے بےساختہ کہا وہ تو میرے نانا تھے" مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ مرحوم کے نواسے کو دیکھا حکیم صاحب مرحوم کے علاوہ میں نے اس زمانے کے پٹنہ میں مولوی سید شرف الدین صاحب بیرسٹر کو دیکھا تھا، وہ قانون دانی کی قوت سے صوبہ بہار سے لے کر بنارس تک چھائے ہوئے تھے۔

اب اس دور کے بعد والے دور کو لیجیے۔ دور روشن

ستارے افق پر نمایاں ہوئے تھے۔ جو آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، میری مراد مرحوم سید علی امام اور حسن امام سے ہے، ایک اور اہل کمال استاد سخن سید محمد علی شاد مرحوم تھے۔ اہل قلم میں میرے محترم دوست سید ضمیر الدین احمد تھے، جو جامع تھے قدیم و جدید ادبی مہارت کے اور جن کی تصنیف سیرت الشرف آج بھی اپنے فن میں ممتاز ہے، اسی طرح اس زمانہ میں آپ کے پٹنہ میں بہت سی ممتاز ہستیاں تھیں، جن کا وجود پٹنہ کے لیے باعث فخر تھا۔

کیا آج سر سید علی امام اور سید حسن امام کا ترقی یافتہ پٹنہ میں کوئی جواب موجود ہے؟ اگر ہے تو بیان کیجیے۔ غرض پٹنہ سے میری نیاز مندی اور تعلقات دیرینہ ہیں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

حضرات! یہ دوسرا آل انڈیا مسلم جلسہ ہے جو آپ کے پٹنہ میں ہوا، پہلا جلسہ ندوۃ العلماء کا تھا جو بہت کامیاب رہا، اب خدا کرے کہ مسلم لیگ کا جو جلسہ ہونے والا ہے وہ بھی کامیاب ہو۔ لیکن جو حالات میں نے یہاں دیکھے وہ امید افزا نہیں ہیں میں نہیں مان سکتا ان حالات میں یہاں مسلمانوں کی ترقی کا کوئی مفید کام ہو سکتا ہے۔ یہاں پارٹی فیلنگ کا زور ہے اور اور محض چھوٹے چھوٹے اختلافات اور ذاتی اغراض کی بنا پر لوگ آپس ہی میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اور ایک شخص دوسرے کو گرانا چاہتا ہے، کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ جب تک آپ اعلیٰ مقصد کے لیے کوئی مصیبت نہ اٹھائیں اور قربانی نہ کریں، کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ آپ نالاں ہیں۔ اور فریاد کر رہے ہیں کہ واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم مسلمانوں کے لیے مضر ہے۔ لیکن نالہ و فریاد کے سوا آپ عملی طور پر اس کے متعلق کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھیے کہ کوئی غیر شخص مسلمان کو تباہ نہیں کر سکتا بلکہ خود مسلمان ہی مسلمان کو تباہ کر رہے ہیں۔ جس کا کچھ اندازہ آپ اسی جلسے سے کر سکتے ہیں، کیا جو واقعات پیش آئے وہ کچھ حوصلہ افزا ہیں، معاف کیجیے میں نے پہلے ہی آپ سے پوچھ لیا تھا کہ حق بات کہنے کی اجازت دیجیے۔

حضرات! مسلمان وہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے حدیث میں ہے، اور جس کی زندگی تمام تر عملی ہے، میں نے کانفرنس مسلم لیگ اور دوسرے قومی جلسوں کے سلسلے میں ہندوستان کا گوشہ گوشہ دیکھا لیکن علم کی صحیح طلب کسی میں نہیں پائی۔ نہ کوئی حقیقی معنی میں طالب علم ہے نہ علم کا شیدا۔ جو اپنا سب کچھ علم کے لیے قربان کر دے لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اور یہ زمانہ ترقی کا زمانہ ہے۔ وہ ترقی کیا ہے؟ یہ ہے کہ آپ ۱۴۔۱۴ برس تک پڑھتے ہیں اور اپنی صحت تباہ کر دیتے ہیں مگر محض بے نتیجہ، جب یہ حالت ہے تو آئندہ کس بنیاد اور کس امید پر کوئی شخص تعلیم پر اپنی زندگی قربان کرے گا یہ جو کچھ ہو رہا ہے کس کا قصور ہے، ہماری غلط روی کا۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند

سعدی از دست خویشتن فریاد

یہاں بہت سے ماہرین تعلیم بیٹھے ہیں وہ فرمائیں کہ کیا انھوں نے کسی کو علم کا شیفتہ پایا، ایسا شیفتہ جو علم کو علم کے لیے حاصل کرتا ہو اور جس نے اپنا سب کچھ علم پر قربان کر دیا ہو۔ اب تو علم کا مقصد ملازمت اور بے روزگاری کی مصیبت سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت نہ ملی تو اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ "سوٹ" کر لیا، بس یہی ترقی ہے جس کے لیے جان مار رہے ہیں یعنی اگر ملازمت کی رسی یا طوق غلامی گلے

میں نہ پڑا تو جان دیدی۔ حضرات اس سے ملامت کرنا مقصود نہیں
میں دوسروں کو کیا ملامت کروں، خود گنہگار و خطا کار ہوں۔

حضرات! نافرمانی اور صحیح راستے سے لغزش کا انجام
ہمیشہ برا ہوتا ہے اور تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اُحد
کی لڑائی کا حال پڑھیئے جو عہد رسالت کا واقعہ ہے۔ اس جنگ میں
حضرت سرورِ عالمؐ اور اکابر امت موجود ہیں، مسلمانوں کو پوری فتح
ہو چکی ہے لیکن اس کے بعد کی ایک لغزش کی وجہ سے شکست ہو جاتی ہے
اور اتنی شدید کہ جس کی کیفیت پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ قرآن مجید میں اس کو آپس کے اختلافات و تنازع نیز احکام
الٰہی کی خلاف ورزی اور نافرمانی کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد
ہوتا ہے۔ "حتیٰ اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من
الامر وما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم
من یرید الآخرۃ ثم صرفکم عنہم لیبتلیکم" یعنی جب تم نے
نامردی کی اور جھگڑا ڈالا کام میں اور بے حکمی کی۔ بعد اس کے
کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز، کوئی تم میں سے چاہتا تھا
دنیا، اور کوئی تم میں چاہتا تھا آخرت پھر تم کو الٹ دیا ان پر
سے اس واسطے کہ تم کو آزماوے۔

غرض اگر ہمارے اعمال اور کردار یہی رہے تو کیا ہم
ترقی کر سکیں گے؟ کیا یہ ہماری کچھ کم شامت اعمال ہے کہ آپس
ہی میں لڑ کر اپنی قوت و طاقت کو کمزور کر رہے ہیں۔

قرآن میں صاف ارشاد ہے کہ "ولا تنازعوا فتفشلوا
وتذہب ریحکم" یعنی آپس میں نہ جھگڑو ورنہ نامرد
ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔

اگر مسلمانوں کے آپس میں جھگڑا نہ ہو تو ان کے لیئے
کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نہ ان کے سامنے قلت و کثرت کا کوئی
سوال ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ ایک
دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں مدینہ طیبہ
کے مسلمانوں کی مردم شماری کرائی گئی تو یہ معلوم ہوا کہ مردان کا
چھ سو ہیں، یہ معلوم کر کے مسلمانوں نے نہایت جوش و مسرت کے
ساتھ کہا آج روئے زمین پر کون سی قوت ہے جو ہمیں فنا
کر سکتی ہے۔

واللہ اعلم، یہ کس حریف نے مسلمانوں کے کان میں ڈال
دیا ہے کہ تمہاری فی صدی تعداد چونکہ کم ہے اس لئے تم ہر وقت
خطرے کی حالت میں ہو اور کمزور رہو۔ کیا صاحب عزم اور کام کرنے
والے کثرت سے مرعوب ہوتے ہیں۔ جب آصف جاہ نے نربدا کو
دکن کی فتح کے ارادے سے عبور کیا تو کیا مخالف کی تعداد کثرت وقلت
کا اندازہ کیا تھا، اور کیا جب محمود غزنوی "خیبر" سے نکلا
تو اس نے مردم شماری کرائی تھی کہ ہندوستان میں مسلمان کتنے ہیں
اور حریف کی کیا تعداد ہے؟ اور کیا اس نے کسی خطرے کا احساس
کیا تھا؟ کیا آپ ان اسلاف کے جانشین نہیں ہیں؟

آپ تاریخ پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ یہی بہار اور یہی پٹنہ
پہلے کیا حیثیت رکھتا تھا، پرسوں انیس امام صاحب نے اپنے
خطبے میں بختیار خلجی کا ذکر کیا تھا کہ وہ دہلی فتح کرتا ہوا بہار پہنچا تو
اس خطۂ زمین کی قسمت نے نئی پلٹا کھایا اور پھر مسلمانوں نے اس کو
آباد کیا۔ اسی ایک واقعے سے اسلام کے عزم و ہمت کا اندازہ ہو سکتا
اور چلیئے حضرت خواجہ غریب نواز کے مزار مبارک پر آپ کو معلوم
ہے کہ حضرت کس شان سے اجمیر تشریف لاتے ہیں۔ آپ کے پاس
نہ تلوار تھی، نہ تیر تھا، لیکن عزم و استقلال کا یہ حال تھا کہ جب
کفرستان میں آ کر بیٹھ گئے، کوئی قوت انھیں وہاں سے اٹھانے کی
جرأت نہیں کر سکتی تھی، خود مہاراجہ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ اس

ملکش کو نکالیں ۔ یہ اسی عزم واستقامت کا نتیجہ ہے کہ یہاں اسلام کی روشنی پھیلی اور کیسے کیسے جلیل القدر سلاطین برابر اس آستانہ پر حاضر ہوتے رہے، بلکہ آج بھی آپ اجمیر شریف کے آستانے پر کھڑے ہوکر یہ نظارہ دیکھ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق کہاں کہاں سے سفر کرکے آستانے پر آتی رہتی ہے۔ یہ قوت وجرأت ان بزرگوں میں اس لیے تھی کہ انھیں خدا پر بھروسہ تھا، خدا پر یہ اعتماد اور بھروسہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو مسلمان میں استقامت اور قوت ایمانی پیدا کرتا ہے حضرت عمرؓ کے عہد کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ منادی کرائی گئی کہ کوئی دودھ میں پانی نہ ملائے۔ اسی زمانے میں پچھلی شب کو ایک ماں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ دودھ میں پانی ملا دے، اس نے جواب دیا کہ، کیا خلیفہ کا حکم نہیں سنا کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے؟ ماں نے کہا۔ کیا خلیفہ دیکھتا ہے؟ بیٹی نے کہا! خلیفہ نہیں دیکھتا تو خدا تو دیکھتا ہے؟

غرض جسے خدا پر بھروسہ اور اعتماد ہو اس کی قوت و استقامت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، یہی اعتقاد تھا جو مسلمانوں کو برابر آگے بڑھاتا رہا، مسلمان جہاں جاتے تھے اسی قوت واعتقاد کو لے کر جاتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کا نمائندہ سپاہی شہنشاہ ایران کسریٰ کے دربار میں کس طرح پہنچا دربار شاہی میں ایران کے قیمتی قالینوں کا فرش تھا ایسے قیمتی کہ اگر آج کہیں ہاتھ آجائیں تو امریکہ لاکھوں روپیے دے کر خرید لے، یہ بزرگ ان قالینوں پر اس طرح چلتے ہیں کہ برچھا ہاتھ میں ہے یہ برچھا فرش پر جہاں جہاں لگتا ہے اس میں سوراخ ہوتے جاتے ہیں۔ ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ اس ملک پر کیوں حملہ آور ہوئے؟ وہ جواب دیتے ہیں، اس لیئے کہ خدا کے بندوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر زندگی کی فراخی میں پہنچا دیں۔

اسلامی تعلیم کی نمایاں خصوصیات ہیں کہ اگرچہ مسلمانوں کو دولت اور ہر قسم کی دنیوی نعمتیں دی گئیں، اور وہ انھیں استعمال کرتے ہیں لیکن ایک سچے مسلمان کے قلب کا تعلق ان چیزوں سے نہیں ہوتا یہ تعلق اسے خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔

حضرت شیر خدا کرم اللہ وجہہ کی چالیس ہزار سالانہ کی آمدنی تھی جو آجکل کے حساب سے کئی لاکھ سالانہ کی ہوئی۔ لیکن یہ آمدنی ضرورتمندوں کے لیئے تھی۔ خود حضرت، حضرت فاطمہؓ اور حضرت امام حسن اور حسین کے لیئے فاقہ ہی تھا۔ رضی اللہ عنہم شرافت نفس اور وسعت نفس کا یہ عالم تھا کہ جب واقعہ شہادت پیش آیا۔ یعنی حضرت شیر خدا زخمی ہوئے تو حضرت امام حسن نے شربت بنا کر حضرت کے سامنے پیش کیا، آپ نے فرمایا، بیٹا پہلے قاتل کے پاس لے جاؤ، قاتل کو پیاس زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن قاتل نے پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس ذریعے سے تم مجھ کو زہر دینا چاہتے ہو۔ ناچار حضرت امام حسن شربت کا پیالہ واپس لے آئے اور کیفیت بیان کی۔ حضرت شیر خدا نے فرمایا کہ قسم ہے رب کی اگر وہ میرا شربت پی لیتا تو کل علی جنت میں اس وقت قدم رکھتا جب اول وہ داخل ہو لیتا۔

حضرات! یہ تھا ہمارے اسلاف کا اخلاق۔ لیکن آپ کی یہ حالت ہے کہ اگر آپ کے مجمع میں اور آپ کے یہاں مخالف رائے رکھنے والا آتا ہے تو اتنا ذلیل کیا جاتا ہے کہ جو اس کو جاننے اور بلانے والے ہیں وہ بھی پشیمان ہوتے ہیں، کیا یہ اسلام کی تعلیم ہے۔؟ حضرات! یاد رکھیئے کہ اسلام میں اعتدال ہے اور اس کا راستہ وہی ہے جو صراط مستقیم ہے اور وہ ایک ہی ہو سکتا ہے، کئی راستے نہیں ہو سکتے، جس طرح خط مستقیم ایک ہے۔ خط منحنی بہت ہیں۔

حضرات! اسلام ایک خالص عملی مذہب ہے اس لیئے وہ ہر مسلمان سے عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلے کانفرنسیں نہ تھیں، رزولیوشن اور تجویزیں نہیں پاس کی جاتی تھیں لیکن "عمل" موجود تھا اور اس کی برکت ساری دنیا میں تھی، آج قومی، ملکی اور شہری اغراض کے لیئے انجمنیں بھی قائم ہیں، جدید تعلیم بھی پھیل رہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عمل کس قدر ہے اور کام کتنا ہوتا ہے۔

حالت یہ ہے کہ جب لوگ جلسوں کے موقع پر سبجیکٹ کمیٹی میں بیٹھتے ہیں تو ایک ایک نقطے اور شوشے پر بحث کرتے ہیں ــ اور ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ گویا کام کرنے کے لیئے بیتاب ہیں۔ لیکن صبح کو اٹھ کر دیکھیئے تو "عملی قوت" کا پتہ نہیں۔ جلسوں میں گلے کو اس طرح پھاڑیں گے کہ ایسا معلوم ہوگا کہ یہ آسمان کو گرادیں گے، لیکن نتیجہ کچھ نہیں، تو پھر گلے کے غدود کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ!

آپ نے کانفرنس کے صدر مولوی فضل حق صاحب کا استقبال کیا لیکن اس شور و ہنگامے کے ساتھ کہ استقبال کے بعد جب وہ قیامگاہ پر پہنچے تو میں نے انھیں نیم مردہ حالت میں پایا۔ فرمانے لگے کہ بس دم نکلنے کی کسر رہ گئی تھی۔ آپ نعرے لگاتے تھے کہ زندہ باد "فضل حق" ان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ آپ نے غور کیا کہ ایک چھپتر برس کا آدمی اس ہنگامے اور شور کو کہاں تک برداشت کرسکتا ہے، آجکل بس اسلام کی یہ خدمت رہ گئی ہے کہ جھنڈے نکالے جاتے اور نعرۂ تکبیر بلند کیئے جاتے ہیں، لیکن کیا نعرہ لگانے والوں کے دل میں بھی اس نعرۂ تکبیر کا کوئی اثر اور عظمت ہے، ان نعروں اور ہنگامہ آرائی کے لیئے آپ نے نئے نئے الفاظ تجویز کیئے ہیں، جو اخباروں میں شائع کیئے جاتے ہیں، جیسے "آسمان شگاف" "سنسنی خیز" مگر اس کا عملی نتیجہ ہیچ۔

استقبال اور اسی قسم کے نام و نمود کے کام آپکی زندگی کی جان ہیں، واللہ اعلم خدا کے کتنے بندے ان استقبالوں کی بدولت تباہ ہوچکے ہیں، انھوں نے سمجھا کہ ادھر ہمارا استقبال ہوا ادھر ہم بھی کچھ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر پڑجاتے ہیں۔

غرض استقبال تو اس شان سے ہوتا ہے لیکن جب اس کے بعد عملی خدمت اور قومی اغراض کے لیئے فنڈ جمع کرنے کا وقت آتا ہے تو یہ سارا جوش و خروش کافور ہوجاتا ہے اور اس وقت وہ معمولی عذر کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے کسی کو الزام دینا مقصود نہیں، بلکہ یہ عرض کرتا ہے کہ جب تک ہماری انجمنیں اور کانفرنسیں نمائشی چیزوں کو چھوڑ کر اس عملی راستے پر نہیں آئیں گی جو اسلام نے دکھایا ہے قوم کو کسی قسم کی فلاح اور بہبودی حاصل نہ ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ اخلاص کے ساتھ آپ کی اجازت کے بعد عرض کیا گیا ہے وہ آپ کو ناگوار خاطر نہ ہوگا۔

اب اس کے بعد میں بزرگان بہار کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نہایت اخلاص اور مہربانی سے کانفرنس کے سالانہ اجلاس کو مدعو کیا اور میزبانی کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیئے۔

اس سلسلے میں مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر محمود صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے، ان کی میری ایک عرصے سے رسم ہے، ان کے دل میں اخلاص ہے اور علیگڈھ سے محبت ہے، اگرچہ ہمارے سیاسی خیالات باہم مختلف ہیں۔ وہ کانگریس میں ہیں اور میں نہیں ہوں، گویا میں مشرق میں ہوں اور وہ مغرب میں اس لحاظ سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن ہمارا اخلاص اس سے بالا ہے، جب میں نے ممدوح کو ذاتی خط لکھا اور پٹنہ میں اجلاس کانفرنس کی تحریک کی تو انھوں نے اپنی عالی ظرفی اور اخلاص کی بنا پر خیالات کے اس اختلاف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ اس تعلیمی خدمت کیلئے تیار ہوگئے اور آمادگی ظاہر فرمائی۔ اس مقصد کے لئے معزز مسلمانوں کو اپنے مکان پر مدعو فرمایا اور استقبالیہ کمیٹی کی بنیاد رکھی جس نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور کام کیا اس بنا پر سب سے پہلے آنریبل ڈاکٹر سید محمود کا شکریہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر سید محمود کا شکریہ ضروری ہے۔

اس کے بعد خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ شکریہ لیڈی انیس امام صاحبہ ایم۔ایل۔اے، صدر جماعت استقبالیہ کا ہے۔ جن کی مسلسل کوشش اور توجہ سے پٹنہ کا یہ پہلا اجلاس کامیاب ہوا اور جو کام اب تک مرد انجام نہ دے سکے تھے وہ اس معزز خاتون نے انجام دیئے، اکبر نے تو اپنے مخصوص انداز میں حافظ شیرازی کے مصرع میں تصرف کرکے ظرافت پیدا کی تھی۔ لیکن اس موقع پر وہ تصرف حقیقت بن کر عیاں ہوا ہے

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

میں ذاتی واقفیت کی بنا پر اس کی شہادت دے سکتا ہوں کہ اگر ان کی ہمت شریک کار نہ ہوتی تو اجلاس اس پیمانے پر نہ ہوتا۔ اس لیئے میں آپ صاحبوں نیز اپنی ناچیز ہستی کی طرف سے لیڈی صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس کے بعد میں نواب سید مبارک علی صاحب ایم ایل اے سیکرٹری جماعت استقبالیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو ابتداء سے آخر تک اجلاس میں عملی دلچسپی لیتے رہے اور ان کے اثرات اور کوشش سے بہت سی سہولتیں اجلاس کے انتظامات کے سلسلے میں حاصل ہوئیں اسی سلسلے میں مجھے نواب محمد اسمٰعیل صاحب ایم ایل سی نائب صدر جماعت استقبالیہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن کو اجلاس کی کامیابی سے خاص دلچسپی رہی، اس کے بعد خان بہادر مرزا اختر حسین صاحب۔ ایم۔اے اسسٹنٹ رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی، جوائنٹ سیکرٹری استقبالیہ کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کے میدان میں آنے کے بعد اجلاس کا کام خاص سرگرمی سے شروع ہو گیا اور کارکنوں نے ان کے تجربے اور واقفیت سے فائدہ اٹھایا، ہم کو دلی شکریہ ڈاکٹر سچدانند سنہا، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کا بھی ادا کرنا چاہیئے جن کی مہربانی و اجازت سے یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں اجلاس ہو سکا۔ اس سے علاوہ مصارف کی بچت کے اجلاس کی شان میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا اور کارکنوں کی بہت سی دقت کم ہو گئی۔

اسی سلسلے میں مجھے مسٹر علی حسن خاں بار ایٹ لا، ٹریژرر استقبالیہ کمیٹی کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے، جنھوں نے اپنا فرض محنت و ہمدردی کے ساتھ ادا کیا۔

اسکے بعد شرف الدین احمد صاحب اور منور الہدیٰ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ان دونوں صاحبوں نے بحیثیت اسسٹنٹ سکریٹری استقبالیہ کمیٹی اپنے فرائض خوش اسلوبی اور مستعدی سے انجام دیئے۔

اس کے بعد میں انکوائری آفس کے سب کارکنوں اور ریسپشن کمیٹی کے سب ممبروں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ کانفرنس کا کام کیا، نیز ان صاحبوں کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے جلسہ گاہ کی آرائش ترتیب اور دوسرے انتظامات میں سرگرمی سے حصہ لیا اور دل لگا کر کام کیا۔

اب میں اپنے عزیز نوجوانوں یعنی رضا کاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے مہمانوں کی راحت و آسائش کیلئے ہر قسم کی محنت و مشقت برداشت کی اور مختلف اوقات میں ریلوے اسٹیشن پر مہمانوں کی مہمانی کیلئے موجود رہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انکی زندگی کو کامیاب بنائے اور انہیں ہر قسم کی ترقیاں عطا کرے۔

حضرات! ہر قومی جلسے کے سلسلے میں کچھ خاموش اور کارگزار ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو نگاہ کے سامنے نہیں آتیں، اگر میں اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ایسے اصحاب کا شکریہ نام لے کر نہ ادا کر سکوں تو وہ مجھے معاف فرمائیں۔ اور ناسپاس نہ سمجھیں، ہمارا دل شکریہ سے معمور ہے۔

اب آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر میری غلطی سے یا دفتر کے نظم کی غلطی سے آپکو کوئی تکلیف ہوئی یا ہم سے کوئی بدتمیزی ہوئی ہو تو اپنی عالی ہمتی سے معاف کرکے درگزر فرمائیں گے۔

علی گڑھ تحریک کے معمار

خان بہادر ڈاکٹر مولوی بشیر الدین بانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

سرسید کا نام زبان پر آتا ہے تو حوصلوں، امنگوں اور مخلصانہ جہد و عمل کی ایک تابناک دنیا تصور میں گردش کرنے لگتی ہے۔ اپنی طویل زندگی میں بڑے بڑے انسانوں سے ملا ہوں۔ بہت سی تحریکوں کا عروج و زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے قومی رہنماؤں، لیڈروں اور کارکنوں سے برابر واسطہ رہا ہے۔ لیکن آج جب تصور میں جائزہ لیتا ہوں تو سرسید کی پوزیشن بالکل منفرد نظر آتی ہے۔ وہ صرف بڑا انسان ہی نہ تھا بلکہ اس نے اپنے فیضان سے بڑے انسان پیدا کر دیئے۔ یہ ہے اس کا حقیقی مرتبہ۔ اس کی رہنمائی نے ایک پریشان حال، بھٹکی ہوئی قوم کو زندگی اور ترقی کی راہ دکھائی اور اس کی مسلسل کوششوں نے ایک زبردست اصلاحی تحریک کو کامیاب کر کے دکھایا۔

سرسید سے میرے تعلقات کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ علی گڑھ تحریک کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کالج قائم ہو گیا تھا۔ معدودے چند۔ روشن خیال لوگوں کو چھوڑ کر باقی پوری قوم سرسید کی تدلیس و تکفیر پر کمر باندھے ہوئے تھی۔ میں بھی سرسید کے مخالفین میں تھا۔ زمانہ جوانی کا طبیعت میں جوش بھی تھا اور کام کرنے کا حوصلہ بھی۔ مخالفت میں بہت شدت برتتا تھا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجتماع میں شریک ہوا۔ سرسید کے معتقد اور نیازمند کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معترض اور ناقد کی حیثیت سے۔ میں نے ایک تجویز پیش کی کہ ڈبلیو ورلا کی تاریخ ہندوستان جس میں تعلیمات رسول کو مسخ کر کے اہانت آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ اس کتاب کو نصاب سے خارج کر دے۔ میں نے اپنی حد بساط تک بڑی پرجوش تقریر کی لیکن سرسید بولنے کھڑے ہوئے تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ ایک ایک لفظ میں دینی حرارت سمائی ہوئی تھی۔ اور جوش اسلامی کا دریا تھا جو امنڈ رہا تھا۔ میں کچھ ہکا بکا سا رہ گیا۔ سرسید کی جو شخصیت اس تقریر سے نمایاں ہوئی وہ اس سے بالکل مختلف تھی جس کا نقشہ میں نے تصور میں قائم کر رکھا ہے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ شخص ناموس رسول کا، اسلام کا سچا محافظ ہے۔ دین رسالت مآب کا سچا پیرو اور قوم کا سچا ہمدرد ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس زمانے میں صرف یہی ایک شخص ہے جس کے جوش عمل سے قوم کے دن پھر جائیں گے اور مغربی تہذیب و تمدن کے دور فروغ میں مسلمان قوم ایک نئی شان کے ساتھ زندگی حاصل کرے گی۔ دیہوں کے تعصبات کا غبار چھٹا۔ ذہن صاف ہوا اور میں دلی گرم جوشی کے ساتھ سرسید کے پیروؤں کی صف میں آ گیا۔ اس کے بعد سرسید سے بڑے قریبی روابط قائم ہو گئے۔ بعض چیزوں میں میں نے ان کی مخالفت بھی کی۔ ان کی پالیسی سے واضح اختلاف بھی کیا۔ لیکن ان کی شخصیت کی عظمت کا جو اثر ہوا تھا وہ برابر ترقی کرتا گیا اور آج بھی میرے دل و دماغ میں اس کا نقش محفوظ ہے

بیان کرنے کی ہمت ہو اور وقت ہو تو سرسید سے اپنے تعلقات

کے سلسلے میں سینکڑوں واقعات لکھے اور پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ سرسید میں لاکھ دوسری خوبیوں کے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ہر نیازمند کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے تھے مخالفانہ اظہار خیال سے کبھی نہ گھبراتے تھے۔ اور اس کی کوشش کرتے تھے کہ جو کام بھی ہو زیادہ سے زیادہ اتفاق سے ہو جس مخالفت کے متعلق انھیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سچائی کے ساتھ ان کے مشن کی مخالفت کر رہا ہے تو اس کی مخالفت کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے . . . . اور بڑے اہتمام سے تسکین بخش انداز میں اس کے اعتراضات کے جوابات دیتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نجم الاخبار میں ان کی تحریک کے خلاف لکھا کرتا تھا تو کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ نجم الاخبار کی تحریروں کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں اور اس کا جواب کیوں لکھتے ہیں تو انھوں نے کہا یہ شخص ہر بات دل سے کہتا ہے۔ میں سرسید سے برابر ملتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے مختلف معاملات میں مشورے کرتے تھے اور مشفقانہ انداز میں پیش آتے تھے۔ ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مسلمانوں میں تعلیم جدید رائج کرنے کا جو کام شروع کیا ہے یہ تو بہت اچھا ہے مگر یہ بتایئے کہ مذہبی معاملات کو کیوں چھیڑ دیا۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان مذہب کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ ہنسے اور فرمایا کہ بھائی اگر میں یہ سوال نہ چھیڑتا تو مسلمان کبھی کالج کی طرف توجہ نہ کرتے۔ میرے اور سرسید کے درمیان ایک بڑا اختلاف یہ بھی تھا کہ سرسید ساری قوتیں مدرسۃ العلوم علی گڑھ پر صرف کر دینا چاہتے تھے۔ میری پالیسی یہ تھی کہ جگہ جگہ اسکول کھولے جائیں تاکہ جدید تعلیم کی روشنی سے ملک ملک کا گوشہ گوشہ منور ہو جائے۔ ہمارے درمیان اختلاف کا ایک بڑا مسئلہ کالج کا انتظام بھی تھا۔ کالج میں روز بروز انگریز اساتذہ کو اقتدار حاصل ہوتا جا رہا تھا اور مولوی سمیع اللہ اور ان کے ہمنوا یہ محسوس کرتے تھے کہ کالج کے اندر یہ انگریزی اقتدار مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہے۔ میں اس معاملے میں مولوی سمیع اللہ کا ہمنوا تھا اور شدت کے ساتھ رائے رکھتا تھا کہ کالج تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے

سرسید کی زندگی ایک حقیقی رہنمائی کی زندگی تھی۔ انھوں نے اپنی کوششوں اور فیض صحبت سے بہت سے باحوصلہ اور جواں ہمت کارکنوں کی ایک زبردست جماعت تیار کر لی۔ ان کی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اسلامی ہند میں جہاں کہیں جوہر قابل تھا ان کے حلقۂ اثر میں سمٹ آیا تھا۔ ان کے رفیقوں میں ادیب، شاعر، ریفارمر اور علمی انتظامی صلاحیت رکھنے والے غرض ہر قسم کے لوگ تھے۔ غالباً دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر کو بھی اس سے زیادہ بہتر رفیق نہیں ملے سرسید کا نورتن فضائل و کمالات کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھا۔ اس انجمن کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں تو یہ عالم ہوتا ہے کہ

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

جی تو چاہتا ہے کہ سرسید کے تمام ساتھیوں کے متعلق کچھ بیان کروں لیکن زوال سن و سال نے تاب گفتار ہی باقی نہ رکھی۔ اس سعادت افروز بزم کے چند افراد کے متعلق جو کچھ حافظے میں رہ گیا ہے پیش کئے دیتا ہوں

مولوی سمیع اللہ خان | علی گڑھ تحریک کے تعلیمی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پیش قدمی کرنے والوں میں مولوی سمیع اللہ خان کا نام سرفہرست ہے۔ مولوی سمیع اللہ

پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ گورے چٹے، خوب رو
داڑھی باندازِ حسن و شائستگی زینت چہرہ تھی۔ علی گڑھ تحریک
کا یہ اثر ہوا کہ سوٹ اور ترکی ٹوپی پہننے لگے لیکن مصر سے واپسی
کے بعد ترکی ٹوپی اور شیروانی اور پاجامہ پہنتے تھے۔ مجھے ان کی
خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ میں برابر حاضر ہوتا۔ مسائل پر
تبادلۂ خیال کرتا اور اپنی ذہنی الجھنوں میں ان سے رہنمائی حاصل
کرتا۔ وہ بہت سنجیدہ اور باوقار علمی ذوق رکھتے تھے۔ اور ان کی گفتگو
میں طبیعت کے وقار اور شرافت، ذہن کے صاف اور سلجھے ہوئے
انداز، فکر کی گہرائی اور فکر کی پختگی کی نمایاں جھلک ہوتی تھی۔ غدر
کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر جو تباہی آئی، اس کا
مولوی سمیع اللہ کے دل پر گہرا اثر تھا۔ وہ نئے حالات کے مطابق
اصلاح کے دل سے خواہاں تھے۔ سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی
قائم کی تو وہ ابتدا ہی سے اس کے ممبر ہوگئے۔ سرسید نے لندن سے
واپسی کے بعد جب مدرسۃ العلوم قائم کرنے کی تجویز پیش
کی تو مولوی سمیع اللہ اس تجویز کی حمایت میں جوشِ طبیعت، خلوص
نیت اور سرگرمی عمل کے ساتھ پیش پیش رہے۔ سرسید مدرسہ کی
اسکیم کو اسی وقت عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے جب کافی سرمایہ
جمع ہوجائے۔ لیکن مولوی سمیع اللہ اس معاملے میں تاخیر کو مناسب
نہیں سمجھتے تھے۔ سرسید بنارس ہی میں تھے کہ مولوی سمیع اللہ
نے ۱۸۷۵ء میں اللہ کا نام لے کر مدرسہ کی بنا ڈال دی۔ وہ
اس زمانے میں علی گڑھ میں سب جج تھے۔ مدرسے کے لئے چندے
کی فراہمی میں مولوی صاحب نے اپنے اثر و رسوخ سے بے انتہا
کام لیا۔ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ علی گڑھ اور بلند شہر کے
رئیسوں سے بلا بلا کر کہتے تھے کہ تم اسے رشوت سمجھو یا جبر لیکن
میں مدرسے کے لئے تم سے روپیہ لے کر رہوں گا اور یہ بات وہ
بڑی دل سوزی سے کہتے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کچھ تو ان کا رسوخ و
اثر اور کچھ طبیعت کا خلوص، ان کی بات بہت کارگر ہوئی۔
جب ۱۸۷۷ء میں مدرسہ کے باقاعدہ افتتاح کا وقت آیا تو اس
زمانے کا ایک بہت ہی موثر واقعہ خود مولوی سمیع اللہ نے مجھ
سے بیان کیا کہنے لگے " میں اور سرسید نمازِ تہجد کے وقت اٹھ
کر میدانِ تعمیر میں گئے، سہانا وقت پر درد رات تھی۔ فضا کی خاموشی
طبیعتوں میں قومی ہمدردی اور دینی حمیت جوش زن، ایک
عجیب کیفیت طاری تھی، سرور انگیز بھی تھی۔ رقت آمیز بھی اور
عبرت خیز بھی۔ مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ارضِ ہند پر
ملتِ اسلامیہ کی یہ پہلی بنائے تعمیر تھی۔ زندگی اور ترقی کے
خواب کی پہلی تعبیر جوشِ طبیعت میں گریہ طاری ہوگیا۔ ہم
دونوں روتے جاتے تھے۔ رب ذوالجلال کے سامنے اپنے
گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے اور اس کے فضل و
بخشش کے لئے ہماری زبانوں پر دعا تھی۔ سرسید مجھ سے
اصرار کرتے تھے کہ میں سنگِ بنیاد رکھوں اور میں سرسید سے اصرار
کرتا تھا۔ آخر میں سرسید کا اصرار غالب آگیا۔ میں نے انتہائے
رقتِ قلب کے ساتھ یہ فریضۂ مسعود انجام دیا۔ اللہ اللہ کیسا
خلوص تھا اور کس بلا کی نیک نیتی۔ ان چیزوں کا خیال آجاتا
ہے تو تصور کی دنیا غیبی روشنیوں سے جگمگا اٹھتی ہے۔
مولوی سمیع اللہ نئی تعلیم کے یقیناً قائل تھے لیکن اس معاملے
میں وہ اتنی دور جانے کے لئے تیار نہ تھے جتنے سرسید احمد خان
وہ پکے مذہبی آدمی تھے اور مذہبیت ان کی طبیعت کا جزو غالب
تھی، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تعلیم ضرور انگریزی ہو، لیکن طلبہ
کی تربیت خالص اسلامی ماحول اور تمام تر مسلمانوں کی نگرانی
میں ہو۔ ایم اے کالج میں انگریز اساتذہ کے بڑھتے ہوئے

رسوخ کو مولوی سمیع اللہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے انھوں نے صاف صاف مجھ سے کہا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ کالج میں انگریز استاد رہیں لیکن وہ ہمارے ملازم ہو کر رہیں۔ مربی اور رہنما ہو کر نہیں۔ سرسید یہ محسوس کرتے تھے کہ انگریزوں کی پوری مدد کے بغیر اور انگریزی نظام تعلیم کو بہ تمام و کمال رائج کیے بغیر ہندوستانی مسلمان وقت کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں کے قدم بہ قدم نہ چل سکیں گے مولوی سمیع اللہ اور سرسید کے درمیان اس دوران کچھ خانگی نزاع بھی پیش آ گئی تھی۔ اس دور کا یہ بہت ہی غم انگیز واقعہ ہے ٹرسٹی بل کے سلسلے میں مولوی سمیع اللہ اور سرسید احمد خان میں جو اختلاف ہوا وہ یہاں تک بڑھا کہ آخر ترک تعلقات پر نوبت آ گئی۔ بات بالکل اصولی تھی اور کم از کم آج تو کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولوی سمیع اللہ کی رائے تمام تر نظر انداز کر دینے کے قابل تھی۔ میں نے ٹرسٹی بل کے سلسلے میں مولوی سمیع اللہ کا ساتھ لیا اور نواب وقار الملک نے بھی ہماری حمایت کی، اس افسوسناک صورت حال کے بعد مولوی سمیع اللہ کالج کے انتظامی امور سے بہت حد تک دست کش رہے لیکن کالج کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اس دور میں بھی باقی رہیں۔ کالج کے جو طلبا ان سے ملنے چلے جاتے۔ دل کھول کر ان کی مدد کرتے۔ ان کو بہت مخلصانہ مشورے دیتے۔ اور خیر و ترقی کی تلقین فرماتے۔ مولوی سمیع اللہ بڑے علمی مرتبہ کے آدمی تھے، انھوں نے مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی مملوک علی اور مولوی سید محمد جیسے مشاہیر عصر سے اکتساب علم کیا تھا۔ ان کی زندگی خدمت و ایثار کا ایک روشن نمونہ پیش نگاہ کر دیتی ہے۔ الہ آباد کا مسلم ہوسٹل ان کی قومی حمیت اور فیاضی کی زندہ مثال ہے۔

نواب محسن الملک

نواب محسن الملک کے نام اور کام کی بلندی اور برگزیدگی کا بچہ بچہ قائل ہے، ان کی ذات میں سرسید کو ایک سچا جان نثار دوست، علی گڑھ تحریک کو ایک انتھک اور پرجوش مبلغ اور رہنما۔ اور کالج کو ایک فیاض طبیعت مربی اور محسن مل گیا تھا۔ وہ بڑے زندہ دل فراخ مشرب خوش مزاج آدمی تھے۔ جیسے اپنی بات کے دھنی تھے ویسے ہی کام کے بھی دھنی تھے انھوں نے جس خلوص اور انہماک اور جوش و مستعدی سے سرسید کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ میں نے محسن الملک کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھیں۔ اور ان کی تقریریں سنی ہیں، سفر و حضر میں بھی ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے میرے دل و دماغ پر ان کی شخصیت کی عظمت کا نقش اتنا گہرا قائم ہے کہ میں انھیں علی گڑھ تحریک کے افراد میں سب سے خاص آدمی (THE MAN) سمجھتا ہوں

محسن الملک نے اپنی زندگی کی ابتداء بہت معمولی حیثیت سے کی۔ اٹاوہ میں وہ دس روپے کے محرر ہوئے۔ ذہانت قوت کارکردگی اور اعلیٰ سوجھ بوجھ نے ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کرائیں۔ اور حیدرآباد میں ایک منصب جلیل پر فائز ہو گئے وہ ایک سیلف میڈ (SELE MADE) آدمی تھے اور یہی چیز ان کی عظمت کردار کے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ محسن الملک بچپن ہی سے مذہبی ماحول میں رہے اور مذہبیات گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حافظہ بلا کا پایا تھا حدیث۔ تفسیر اور عربی ادب پر اچھی نگاہ تھی۔ ہزارہا اشعار ورد زبان تھے اور قوت تقریر میں تو شروع ہی سے اعلیٰ درجے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ اور اپنی ذاتی تحقیق اور مطالعے کی بنیاد پر

مذہب شیعہ کو چھوڑ کر مسلک اہل سنت اختیار کر لیا۔ ان کی مشہور کتاب "آیات بینات" ان کے زور قلم اور سنجیدہ نگاری پر پوری طرح دلالت کرتی ہے، سرسید کی ان سے ملاقات کی ابتدا بھی مذہبی دلچسپی کی وجہ سے ہوئی، سرسید کے مذہبی خیالات سے محسن الملک نے اختلاف کیا۔ رد و قدح ہوئی۔ آخر ابہام تفہیم اور تصفیہ مسائل کے لیے سرسید کی دعوت پر بنارس گئے، سرسید کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہ واقعہ انھوں نے خود مجھے بتایا ہے، سرسید سے خاصی بحث رہی۔ رات میں سو رہے تھے کہ گریہ وزاری کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا کہ سرسید احمد خاں رو رہے ہیں، پوچھا گھر سے کوئی تار آیا ہے، سرسید نے جھلا کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہو گئی ہے اور تم پوچھتے ہو کہ گھر سے کوئی تار آیا ہے۔ اس واقعے کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ سرسید کے جاں نثار اور فدائی ہو گئے۔ اور مرتے دم تک ان کے معین و مددگار رہے۔

محسن الملک کی کئی حیثیتیں ذکر و بیان کے قابل ہیں

(۱) سرسید اور محسن الملک کے تعلقات (۲) محسن الملک کی خدمات کالج (۳) محسن الملک کی خطابت (۴) محسن الملک کی انشا پردازی

سرسید کی تحریک میں محسن الملک کی رفاقت ہمہ جہتی حیثیت رکھتی ہے۔ تہذیب الاخلاق کے صفحات پر ان کے قلم نے تحریک اصلاح کی حمایت میں جولانیاں دکھائیں۔ ان کی کوششوں سے کالج فنڈ میں زبردست اضافہ ہوا۔ انھوں نے دورے کر کے کالج کو ملک کے گوشے گوشے میں مقبول بنایا اور ان کے زور خطابت نے علی گڑھ تحریک کے مخالفوں کی قوت توڑنے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

میں نے محسن الملک کی تقریریں بارہا سنی ہیں، ان کا ایک ایک لفظ بہت جاندار ہوتا تھا۔ جب خطابت جوش پر آتی تو ادبیت کے رنگ عجیب شان و کمال کے ساتھ ابھرتے۔ رنگون کے دورے میں میں ان کے ساتھ تھا، جب ہندوستان تیمور کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی قبر کی زیارت کی بعد میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ ایک دریا ہے جو موجیں مار رہا ہے۔ خطابت اپنے شباب پر پہنچی تو زبان یوں گل افشاں ہوئی کہ سلطنت کا آفتاب ہندوستان سے طلوع ہوا اور رنگون میں آکر غروب ہوا۔ اب علم کا آفتاب رنگون سے اٹھے گا اور اس کی کرنیں چار دانگ ہند کو منور کر دیں گی۔ بمبئی میں اردو کی حمایت میں جو تقریر انھوں نے کی وہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ میں اس جلسے میں موجود تھا۔ عجیب رقت و کیفیت کا عالم تھا۔ تقریر ختم کرتے ہوئے جب انھوں نے موثر اور پرسوز لہجے میں یہ مصرعہ پڑھا۔

"عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

میں گویا کہرام سا مچ گیا۔ میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ محسن الملک بلبل ہزار داستان ہے۔ یہ واقعہ ہے ان کی نوا سنجیاں اسی شان و کمال کی تھیں۔

محسن الملک کے ساتھ گویا علی گڑھ کا لطف صحبت ہی گیا۔ ان کی صحبتیں باغ و بہار ہوتی تھیں، بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ ادب و انشا کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ بڑے لطف و دلچسپی سے گفتگو کرتے تھے۔ بات بات میں علمیت، ذہن کا نکھار اور طبیعت کا ظریفانہ انداز نمایاں رہتا تھا۔ میں نے کم لوگوں کو دیکھا ہے جن کی گفتگو باوقار ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر لطف انگیز بھی ہو۔ دینی عقاید میں پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے آزاد خیال آدمی تھے۔ پردے کا مذاق اڑاتے تھے۔ انگریزی طرز معاشرت کی بہت حمایت کرتے تھے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ محسن الملک بہت ابتداء سے سرسید کے کاموں میں شریک اور ان کے رفیق دم ساز تھے۔ کالج کی کامیابی کے سلسلے میں ان کی کوششیں نمایاں امتیاز و اہمیت رکھتی ہیں۔ سرسید کے انتقال کے بعد ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں جسٹس محمود کچھ دنوں کالج کے سیکرٹری رہے اور جب وہ اپنی علالت کے سبب اس عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہوئے تو قوم نے یہ بوجھ محسن الملک کے کاندھوں پر ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ محسن الملک نے جانفشانی تندہی اور دلسوزی کے ساتھ یہ کام انجام دیا وہ ان کے خادمین وابستہ کے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ کالج کے لیے یہ زمانہ بڑے ابتلا و آزمائش کا دور تھا۔ محسن الملک نے صرف انتظامی امور کی انجام دہی میں سرگرمی دکھائی بلکہ طویل دورے کرکے سرسید میموریل فنڈ میں بیش بہا اضافہ کیا۔

وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اکثر دوروں پر مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ غائبانہ طور سے لوگوں سے کہتے تھے کہ مسلمانوں کے دو سچے ہمدرد ہیں، بڑے انسانوں میں سرسید اور چھوٹوں میں بشیر الدین، اخباروں میں ایک زمانے میں مجھے "چھوٹا سرسید" کا لقب ملا۔ لطف انگیز مزاح کے ساتھ فرمایا۔ جس وقت عشق و صداقت کی تقسیم ہو رہی تھی۔ اس وقت بشیر الدین موجود تھا اور مہدی علی غائب اور جب عقل تقسیم ہو رہی تھی، اس وقت بشیر الدین کا حصہ بھی مہدی علی کو مل گیا۔"

میرے پاس ان کے بہت سے خطوط ہیں ان میں محبت و معذرت، غضب و ناراضگی سب ہی کچھ ہے ایک آئینہ ہے جس میں کبھی شانِ جلال ہے اور کبھی نمودِ جمال۔ بڑے نرم طبیعت انسان تھے۔ میری طرز تنقید پر اکثر تنبیہ کیا کرتے تھے ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔ "یہ طریقہ یعنی جس سختی سے آپ تحریر کرتے ہیں مجھ کو تو پسند نہیں، آپ ہی شاید اس کو پسند کرتے ہوں، رائے ظاہر کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ سختی سے کام لیا جائے بلکہ خوبی اسی میں ہے کہ اپنا مطلب نرم لفظوں میں ظاہر کیا جائے اور انسانیت اور اخلاق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے لیکن مجھ کو اس سے کوئی مطلب نہیں، نہ میں آپ کا ناصح ہوں اور نہ آپ کسی کی سننے والے ہیں۔" کالجوں کے کاموں میں کبھی کبھی مجھ سے خفا ہو جاتے اور جذبات غضب میں ڈوب کر خط لکھ دیتے میں اپنی حمایت میں ذرا سختی سے عذر پیش کرتا تو فوراً نرم پڑ جاتے۔ اور سراپا اخلاص و محبت بن کر پیکرِ معذرت میں ڈھل جاتے ایک ایسے ہی خط میں لکھتے ہیں۔ "جو رنج آپ کو پہنچا، اس کی معافی چاہتا ہوں آپ کی وقعت و محبت جس قدر میرے دل میں ہے وہ میرا ہی دل جانتا ہے" اللہ اللہ کیا انسان تھا۔ محسن الملک بلند اقبال، فراخ مشرب، مجموعۂ صفات برگزیدہ اور پیکرِ اخلاق و انسانیت ۱۹۰۷ء میں اس جہانِ فانی کو خیر باد کہہ دیا۔ کہنے والے نے بالکل صحیح کہا تھا۔

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اس کو وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

وقار الملک | سرسید کے رفیقوں میں محسن الملک اور وقار الملک کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں علی گڑھ تحریک کے بہت بڑے ستون تھے لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وقار الملک کی زندگی میں سخت قسم کی مذہبیت تھی۔ وہ ضابطہ و آئین کے بہت پابند تھے اور اس معاملے میں قطعاً مروت اور رعایت کو دخل نہ دیتے تھے۔ وہ بڑے بڑے نقصان جھیل سکتے تھے لیکن ان کے

لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی سوچی سمجھی رائے سے ہٹ جائیں۔ سرسید کی مذہبی پالیسی سے ان کو اختلاف تھا اور یہ تادمِ آخر قائم رہا۔ تعلیم اور قومی اصلاح کے کام میں وہ سرسید کے بڑے حامی تھے اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ خدمات قومی میں مصروف رہے۔ ان کی شخصیت قدیم و جدید کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھی۔ اور ان کی ضابطہ پسندی، کیرکٹر کی بلندی، سچی مذہبیت اور دیانت رائے کا یہ اثر تھا کہ وہ علما اور انگریزی خواں طبقہ دونوں میں یکساں مقبول تھے۔ علما ان کو پیر سمجھتے تھے اور انگریزی خواں نوجوان ان کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے تھے۔ قدیم مکتبوں میں تعلیم و تربیت حاصل کر کے دورِ جدید میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والے اکابرین کے سلسلے کی وقارالملک آخری کڑی تھے۔ محسن الملک کی وفات کے بعد وہ ایم اے او کالج کے سیکرٹری ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی عملی سیاسی زندگی کا بھی آغاز ہوا، ان کے دورِ قیادت میں، قدیم خیال اور جدید خیال کے لوگ ایک سٹیج پر جمع ہو گئے۔ وقارالملک قومی غیرت و حمیت کا بہت واضح اور ابھرا ہوا شعور رکھتے تھے اور ان کی کوششوں کا منتہائے نظر یہ تھا کہ مسلمانوں میں حقیقی اسلامیت کی بنیاد پر گہرا اور مضبوط ربط واتحاد پیدا ہو اور وہ ملکی زندگی میں اپنے قومی مرتبے کے شایانِ شان وقار اور عزت حاصل کریں۔

وقارالملک نے بہت چھوٹی حیثیت سے ترقی کی تھی۔ ان کی ایمانداری، استقلال، جفاکشی اور ذہانت کا سکہ ہر اس شخص کے دل پر بیٹھا ہوا تھا جو ان سے واقف تھا۔ سر سالار جنگ کو ان کے نام کی سفارش کرتے ہوئے سرسید نے لکھا تھا کہ اگر میں کسی کو اپنے سے زیادہ ایماندار سمجھتا ہوں تو وہ وقارالملک ہے۔ ملازمت، قومی زندگی، اور کالج کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریوں میں ایک دنیا نے دیکھا کہ یہ وہ شخص تھا جو ہر چیز کو اصول کے پیمانے پر ناپتا تھا اور مصلحتوں کو کبھی اور کسی حالت میں اصول پرستی پر غالب نہیں آنے دیتا۔ ان کے کردار کا حیرت انگیز مظاہرہ ٹرسٹی بل کے معاملے میں ہوا۔ وہ اس معاملے میں مولوی سمیع اللہ کے حامی تھے اور سرسید کے مخالف۔ سرسید کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود انھوں نے اپنی رائے میں فرق نہ آنے دیا اور کھلے طور پر ان کی مخالفت کی۔ البتہ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب اکثریت نے اس کو پاس کر دیا تو انھوں نے خندہ پیشانی سے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس کے بعد بھی اصولی حیثیت سے وہ سرسید کے اقدام کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔ ۱۸۹۹ء کے ایک خط میں محمد کو لکھتے ہیں کہ "کھلے ہوئے ووٹ کے ذریعے سے میں اپنے لیے کسی بادشاہت کو بھی پسند نہ کروں گا۔ ووٹ مخفی ہونا چاہیئے تاکہ ہر شخص کی آزاد رائے معلوم ہو سکے۔ اور اس کے بعد فیصلہ ہو۔ البتہ جن کوششوں سے آجکل ووٹ حاصل کیے جاتے ہیں یا جس طرح جناب سید صاحب مرحوم و مغفور نے سید محمود کے لیے ووٹ حاصل کیے، اس پر تو بالکل "رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت" کی مثل صادق آتی ہے۔ ایسے ووٹوں کے ذریعے سے میں کسی چیز کے حاصل کرنے کو اپنی ذلت سمجھوں گا۔"

مسلم لیگ کے بانیوں میں پیش پیش ہونے کے باوصف وہ اپنی مذہبیت اور سخت اصول پرستی کی بنیاد پر ہرگز اس کے روادار نہیں تھے کہ ہندوؤں کے معاملہ میں کوئی غیر اخلاقی یا سخت بات کہی جائے۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۳ء کے ایک خط میں "البشیر" کی پالیسی پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا کہ:

"ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو ایسی خراب فیلنگ اختیار نہیں کرنی چاہیئے جیسی کہ "البشیر" میں پائی جاتی ہے۔ گو ہندو اس کے خلاف ہی کرتے ہوئے پائے جائیں مگر مسلمانوں

کو اپنا اسلامی اخلاق ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔"

۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک کی کوششوں سے مسلم لیگ قائم ہوئی، میں اسی جلسے میں شریک تھا اور وقار الملک نے جو سیاسی قدم اٹھایا تھا، اس کا حامی تھا، بعد میں خود غرضیوں نے لیگ کی سیاست کو داغدار کر دیا تو میں اس کے خلاف ہو گیا۔

وقار الملک مجوزہ یونیورسٹی کے بارے میں بالکل واضح رائے رکھتے تھے وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی انگریزوں کے تابع رہے وہ دل سے اس کے خواہاں تھے کہ یونیورسٹی ایسی آزاد قومی ادارہ ہو، وہ مادری زبان میں تعلیم کے حامی تھے اور اردو کی بیش از بیش ترقی کے خواہاں تھے۔

اسلامیت ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آتا ہے، حیدرآباد میں ان کی کوٹھی میں ایک کوٹھری تھی جس میں ایک اندھا فقیر رہتا تھا۔ اس کو کھانا نواب صاحب ہی کے مکان سے جاتا تھا ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی، انھوں نے نوکروں سے کہا کہ اندھے کو کھانا پہنچا دیا جائے۔ بارش کے سبب سے نوکروں نے تعمیل ارشاد میں تامل کیا اور گویا بات ٹال گئے۔ نواب صاحب خاموشی سے اٹھے۔ کھانا لے کر اس اندھے کے پاس گئے اور بڑی محبت سے اسے کھانا کھلایا۔

مجھ سے بہت شفقت و عنایت سے پیش آتے تھے اور میں بھی ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا قومی مسائل اور کالج کے معاملات پر میری ان کی برابر خط و کتابت رہی ہے اور اکثر خطوط تو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ اپنے تعلقات کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے کہ وقار الملک نے اپنے لڑکے کو ندوہ میں داخل کرا دیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے ندوہ میں کیوں داخل کرا دیا۔ کہنے لگے۔ کچھ مذہبیت آجائے گی۔ میں نے فوراً کہا آپ دوسروں کے لڑکوں کو علیگڑھ بلا کر لامذہب بناتے ہیں۔ چپ ہو گئے۔ لڑکے کو ندوہ سے بلا لیا اور علیگڑھ کالج میں نام لکھا دیا۔

وقار الملک بڑے وضع دار آدمی تھے۔ مولوی سمیع اللہ سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے، سر سید اور مولوی سمیع اللہ میں اختلافات ہو جانے کے باوجود وقار الملک سمیع اللہ کے یہاں برابر جاتے رہے اور ساتھ ساتھ سر سید کے احترام میں بھی فرق نہ آنے دیا۔ آخر عمر میں ان پر احتراق کا زور رہنے لگا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں محسن الملک کے انتقال کے بعد ایم اے او کالج میں سیکرٹری ہو گئے اور ۱۹۱۲ء میں اس اہم قومی خدمت سے عزت و نام وری کے ساتھ سبکدوش ہوئے ۱۹۱۷ء میں وقار الملک نے عالم جاودانی کی راہ لی۔

زین العابدین | مولوی زین العابدین کی ذات محبت و فداکاری کا پیکر جمیل تھی۔ یہ گویا سر سید میں اس قدر محو ہو گئے تھے کہ من تو شدم تو من شدی کا نقش ابھر آیا تھا۔ سر سید بھی ان کو بے انتہا چاہتے تھے۔ زینو کہہ کر پکارتے تھے اکثر نوک جھونک قسم کا مذاق بھی ہوتا تھا۔ سر سید سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ جب سر سید کا انتقال ہوا اور ان کا مزار بننے لگا تو یہ دھوپ میں بجری کا ڈھیر لیے بیٹھے رہتے تھے۔ اور سارا سارا دن اسی طرح گزار دیتے تھے۔ مولوی زین العابدین نے اپنی دولت قوت عمل اور محبت سے سر سید کے کاموں میں جو آسانیاں پیدا کیں وہ ان کی فداکاری کا ایک روشن نمونہ پیش کرتی ہیں۔

مولوی زین العابدین کے سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ جی چاہتا ہے اسے بھی کہہ دوں۔ ۱۸۹۳ء میں جسٹس محمود نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں تعلیم پر وہ معرکہ آرا لیکچر دیا، جس کا ہندوستان بھر میں دھوم مچ گئی۔ محسن الملک

تبصرہ کرنے اٹھے تو زورِ فصاحت کا دریا بہا دیا۔ جولانی طبیعت رنگ پر آئی تو مزاح میں کہنے لگے کہ محمود اس برات کے دولہا ہیں اور ہم سب اس کے براتی۔ سرسید دولہا کے دادا جان ہیں اور زین العابدین گویا اس برات کے نائی۔ پورا مجمع قہقہوں میں ڈوب گیا اور زین العابدین کے عامیانہ پہ یہ پھبتی چپک کر رہ گئی۔

زین العابدین دبلے پتلے تھے قد لمبا تھا۔ داڑھی لمبی تھی۔ بڑے خوش مزاج وضعدار اور شریف طبیعت انسان تھے۔ ان کا ذکر آتا ہے تو محبت و شرافت کی زندہ تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

سرسید کا نورتن اسلامی ہند کی وہ بہار تھی جس پر آنے والی نسلیں صدیوں تک فخر و ناز کریں گی۔ حالی جیسا شاعر و ناقد، شبلی جیسا مورخ و محقق، نذیر احمد اور محسن الملک جیسے خطیب، جسٹس محمود کے مرتبہ اور پایہ کا ذہین اور دراک طبیعت انسان، وقار الملک جیسے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ ذہن حکیم برکت علی خان، سردار محمد حیات خان اور خلیفہ محمد حسن اور محمد حسین جیسے قومی غیرت و حمیت سے بہرہ ور افراد، کون سی خوبی تھی جو اس انجمن میں نہ تھی اور انسانی فضل و کمال کی کونسی روشنی تھی جو اس شمع کی لو میں جذب ہو کر وجہ نمود انجمن نہ بن گئی تھی۔ کہانی طویل بھی ہے اور انتہائی دلچسپ بھی۔ کاش کچھ کا ہکت دیا ہوتا۔ ع

داستان عہد گل را از نظیری تشنو ید
عندلیب آشفتہ تر گفتست این افسانہ را

عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

قوم کے غم کے داغ کا ماہ تمام اور ہے — سوزشِ خام اور ہے سوزِ دوام اور ہے
ذوقِ عمل کا اک پیام آپ کے نام اور ہے — "اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے"

"عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے"

میکدۂ فرنگ سے جام نہ لے حجاز کا — سارا طلسم میکدہ، کھیل ہے شیشہ باز کا
تجھ کو سرور چاہیئے بادۂ خانہ ساز کا — "جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا"

"اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے"

لذتِ سجدہ جب نہیں کیسا قیام کیا نماز — آہ نہیں ہے دل شکن، نالہ نہیں جگر گداز
سوزِ تمام کے بغیر عشق طلسم غم مجاز — "شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز"

"غمکدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے"

دل ہی نہیں کچھ اور ہے غم کا جہاں گذر نہ ہو — گردشِ خون سے فائدہ آنکھ کبھی جو تر نہ ہو
لطفِ حیات کیا جہاں آنکھ مآل پر نہ ہو — "موت ہے عیش جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو"

"گردشِ آدمی ہے اور، گردشِ جام اور ہے"

معیث الدین فریدی

سرسیّد احمد اور زندگی کا نیا شعور

از شیخ ممتاز حسین جونپوری

دنیا کی مختلف قوموں، مختلف ادوار اور مختلف
آب و ہوا میں ایسی قابل ذکر ہستیاں ملتی ہیں جو کسی نہ کسی کمال اور
کارنامے کی وجہ سے ادب، مذہب، سیاست اور معاشرت میں
انتہائی یادگار صورتیں صفحۂ تاریخ پہ شاعر، پیغمبر، بادشاہ اور مصلح
بنکر کبھی فردوسی، کبھی رسولِ عربی، کبھی سکندرِ اعظم، کبھی
جلال الدین افغانی کے روپ میں پیش کر رہی ہیں۔ بعضوں کی
زندگی کے کام ان کے صرف امورانہ نشان باقی رکھتے رکھتے جھلملا
کر رہ گئے۔ اور دنیا میں ان کی زندگی کے کوئی نیا شعور پیدا نہ ہوا
اور صرف نام ہی نام باقی رہ گیا۔ بعض کے پیغمبرانہ کام نے دنیا کی
زندگی میں ایسا شعور پیدا کر دیا کہ زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ اور ان کا
مشن برابر اپنی صداقت اور افادیت سے پھولتا پھلتا چلا جا رہا ہے۔
اس عام کلیہ اور حالات پر نظر کر کے جب ہم سرسید احمد کی زندگی پر
نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم پر راز حقائق منکشف ہوتا ہے کہ سرسید احمد ایسے
آخری دور زمانے میں پیدا ہوئے کہ ان کو صحیح طور پر سمجھنے اور
سمجھانے میں کچھ ایسا وقفہ نما پا گئے۔ اور اس قومی جنرل کو بیک
وقت ادب، مذہب، سیاست، معاشرت چار الگ محاذوں
سے جم کر لڑنا پڑا۔ ان کے ہر ایک مورچے سے زندگی کا نیا
شعور پیدا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ سرسید کا کام اس آتش بازی کے
انار کی طرح کا نہیں جو بھڑ بھڑا کر بجھ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اس کی گل افشانیوں
سے تھوڑی دیر فضا کا دامن جگمگا اٹھا اور پھر کچھ نہیں۔

سرسید کو پہچاننے کے لیے ان کا خاندانی پس منظر جاننا کافی نہیں۔ وہ دہلی
کے ایک علمی اور تاریخی خاندان میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی
اور اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کر کے صدر الصدور کے عہدے سے
۱۸۷۶ء میں پنشن لی۔ اور مسلم کالج علی گڑھ کی بنا ڈالی اور ۱۸۹۸ء میں
انتقال فرمایا۔

سرسید احمد کے ساتھ ساتھ اپنی خود عقل و سمجھ کے ساتھ انصاف کرنے
کے لیے سرسید سے پہلے اور اس وقت تک ہندوستان اور خصوصیت سے ہندوستان
کے مسلمانوں کی زندگی اور ان آفات و مصائب پر بڑی گہری تاریخی نظر
ڈالنی ضرورت ہے جس میں سرسید نے جنم لیا۔ اور ہوش سنبھالتے
ہی ان کی پیغمبرانہ تحقیق اور ان کی شیکسپیری ادبی جدت طرازی ان کے
مدبرانہ خیال ان کے مصلحانہ جذبات کے ہر پہلو میں ایک نیا درد
اور ایک نئی بے چینی اور کرب کے آثار ملتے ہیں جس نے زمانے کا دکھ
دیکھ کر ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ مسلمانوں کی بقا اور ترقی کے لئے مذکورہ
بالا چار قسم یعنی مذہب، ادب، سیاست اور معاشرت میں نئے شعور
پیدا کیے جائیں۔

سرسید کے زمانے سے پہلے سے انگریزوں کا اثر ہندوستان
میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور مذہبی، ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی
اس سے متاثر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مسلمان بڑے سخت کٹر مولویوں اور
نیم ملاؤں کے مذہبی پنجوں اور شکنجوں میں ایسا کسے ہوئے تھے کہ وہ ہل
نہ سکتے تھے۔ عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ملک کے گوشے گوشے

یہ ٹڈی دل کی طرح پھیلتے چلے جا رہے تھے علماء کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ انگریز ایک نئی لام مشرق کی طرح مسلمانوں کی مذہبی شخصی اور شاہی قوت کو روز بروز کمزور کرتے جا رہے تھے۔ سرسید پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سب سے پہلے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ سیلاب اب کسی سے روکے رک نہیں سکتا اور اس کا علاج انگریزی اور نئے طرز کی تعلیم ہے۔ اس لئے جہاں جہاں سرسید ملازمت سرکاری کے دوران گئے۔ یا جہاں ان کا بس چلا چھوٹے چھوٹے پیمانے پر اسکول کھولنے کی تحریک کی۔ چنانچہ غازی پور اور بنارس کے مدرسے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور سرسید کا ذکر تذکرہ نگاروں نے جہاں بھی کیا ہے یہاں تک کہ تاریخ ادب اردو میں بھی جہاں ان کے نئے ادبی رجحان کا تنہا ذکر کرنا مقصود تھا وہاں بھی ان کے مدارس کا ذکر ملتا ہے گویا یہ سرسید کا مسلمہ عقیدہ تھا کہ تعلیم پر قابو پا لیا جائے تو ادب مذہب سیاست اور سماج چاروں طرح کی زندگیوں کے عقدے حل ہو جائیں گے۔

انگریزی تعلیم کی تحریک شروع کرتے ہی سرسید جیسے سچے اور سچے مسلمان یعنی پٹھے اور کٹر اور معزز گھرانے میں پیدا ہونے والے مسلمان اور عام طبقۂ علماء اور ان سے متعلق مستقل اثر رکھنے والے مسلمانوں میں سرسید کو طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار بنا دیا گیا اور وہ بات جس کی صفائی خود زمانہ مدتوں کے بعد کر سکا اور اب علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے فوائد سے سمجھ میں جو بات آئی وہ پہلے نہ آ سکتی تھی نہ آئی۔ یہاں تک کہ سرسید کو بے دینی پھیلانے میں انگریزوں کا ایجنٹ اور گماشتہ خیال کیا گیا۔ سرسید کے لئے ایک نیا لفظ نیچری کا ایجاد کیا گیا۔ اور ان کے تحریک تعلیم اور دیگر جائز اور مفید مقصد سیاسی کے مددگاروں کو بھی بدنام لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور دھڑا دھڑ ان پر کفر اور بے دینی کے فتوے مدتوں جاری کئے گئے اور سب سے زیادہ کھلا ہوا ۱۸۸۸ء کا وہ فتویٰ تھا جو علمائے دیوبند اور دیگر علماء کے دستخط سے اس صراحت کے ساتھ جاری ہوا کہ کوئی مسلمان سرسید کا ساتھ نہ دے۔

اس بات کو سب جانتے ہیں کہ انگریز برابر مسلمان زمینداروں اور حکمرانوں کو کمزور اور بے دخل کرتے جاتے تھے۔ دوسری ان کی خود غرضی یہ تھی کہ ان لوگوں اور خصوصاً جہلا کو عیسائی بناتے جا رہے تھے۔ اور مذکورۂ بالا چاروں قسم کی زندگی متاثر ہوتی چلی جا رہی تھی علماء نے انگریزوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں سب سے پہلے جنگ آزادی لڑنے میں حصہ لیا۔ اور جتنی تکلیف اس اسلامی طبقے نے اٹھائی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ علماء کی جنگ نواب کے خلاف انگریزوں سے جنگ تھی۔ سیاسی طرز کی جنگ نہ تھی۔ اس لئے وہ بے قصور ہیں۔ علماء ایک شاہراہ قائم کر گئے جس پر بعد کو آنے والے گامزن ہوئے۔ غدر اور غدر کے کارتوس کا قصہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ سرسید کی زندگی کی سب سے بڑی بات دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید جنگ آزادی کے بعد بہت آگے نکلے اور معدالحق طنزاً ان سے لڑے اور علماء بیچارے مذہب کا درد لے کر بے دھڑک ہو کر لڑے۔ علماء ہار گئے اور انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ مگر سرسید کو ایسی فتح ہوئی کہ باید و شاید۔ سرسید نے مسلمانوں کی عزت اور مسلمانوں کی جان و مال اور رہی سہی ہستی کو مٹنے سے بچایا۔ بلکہ لکھنے اور اتنے استقلال سے کام لیا کہ پیغمبر اسلام کے عمل و اخلاق کا سچا نمونہ پیش کر گئے۔ سرسید کو صرف یہی ایک دھن تھی اور یہی ان کا والہانہ شعار تھا کہ تعلیم عام ہو اور اس کے لئے انھوں نے بڑے بڑے جہاد نفس کئے۔ مسلمانوں کی قومی دلیری سے انگریز خوب واقف تھے صلاح الدین کی صلیبی جنگ سے ہیبت ان کے دلوں میں تھی وہ ہندوؤں کو رام اور سیدھا کر کے اپنا کام نکالنے کا آلہ بنا لیتے تھے۔ سرسید

اس زد اور چالاکیوں سے باخبر ہو کر مسلمانوں کو باہمی منافرت کے پھیلانے والے جذبات سے بچا رہے تھے۔ جس سے سرسید کا ہندوؤں میں بدنام کیا جانے لگا۔ عدم چشم دید باتیں جو کہ میں سرسید کی تاریخی زندگی کے لیے از سر نو پیش کی جاتی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ جاہلانہ اور کم عقل مسلمانوں نے سرسید کو کیا کیا دکھ دیئے اور کس صبر اور پیغمبرانہ تحمل اور حسینی صبر و استقلال سے سرسید نے جہاد نفس کیا۔ مسلمانوں کی تعلیم، ترقی اور فلاح کی سعی کے لیے سرسید کو علما الگ مشکوک نظر سے دیکھتے تھے اور ہندوؤں کی نظر میں اس سعی کو ان کے تنگ نظر و متعصب ہونے پر محمول کیا گیا۔ ہم نے بچشم خود وہ خط دیکھا ہے جو ایک رئیس نے سرسید کی دعوت میں شرکت کے لیے ایک بڑے عالم کو لکھا تھا۔ اسی خط پر انھوں نے بڑے غیظ و غضب سے تحریر فرما دیا کہ میں اس کافر کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنا اسلام سمجھتا ہوں۔ دوسری چشم دید بات سرسید کے عالمانہ استقلال کی ہے جو تعلیمی درسگاہ خاص عنوان کی قائم کیے جانے کے بارے میں ان کا مطمح نظر تھا۔ وہ اپنا کام ہوتا سنتے ہوتے تھے۔ اور درسگاہ کھلواتے جاتے تھے۔ جب سرسید احمد کے بیٹے سید محمود رائے بریلی میں جج تھے۔ تو ان سے ملنے کے لیے سرسید رائے بریلی آئے اور وہاں ایک اسلامی مدرسہ اپنے مشن اور اصول کے انداز کا کھلوا دیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب بسلسلہ سرکاری ملازمت میرا تبادلہ رائے بریلی میں ہوا تو سرسید کے وقت کی روئداد اور کارروائی اور مدرسے کے ابتدائی زمانے کے کاغذات اور مدرسے کی جگہ مجھے خود دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن اب مدرسہ باقی نہیں رہا میرے زمانہ قیام رائے بریلی تک وہ مدرسہ اسلامی مکتب کی صورت میں اس طرح زندہ رہا جیسے بڈھا و ضعیف آدمی دنیا میں جیتا رہتا ہے۔

سرسید کی کامیابی کا بڑا راز یہ تھا کہ وہ خود بہت خوش دماغ اور بڑے جری اور مستقل مزاج تھے اور جب ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ وہ ولایت گئے تو وہاں کے لوگوں کی ترقی اور حریت فکر اور بلند خیالی سے انھوں نے بڑے مفید سبق حاصل کیے اور ۱۸۷۰ء میں انھوں نے اپنا مشہور و مفید رسالہ تہذیب الاخلاق اس نظر سے شائع کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں کے ادبی، مذہبی اور سیاسی زندگی میں نیا شعور پیدا ہو اور ایسے شعور پیدا کرنے کے لیے ان کی اسکیم میں تین بنیادی چیزیں تھیں۔

سوسائٹی اور جماعت کا قیام :- اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ۱۸۶۶ء میں سرسید نے ایک سائنٹفک سوسائٹی انجمن قائم کی اور اس کا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا۔ اس انجمن کے اثر سے انھوں نے ان لوگوں کو گوشے گوشے سے ڈھونڈ کر نکالا جن کے دماغ روشن اور دل کدورت سے صاف تھے، قابل تھے اور وہ سب انسانی درد دوسرے لفظوں میں اسلامی اصلاح کے متمنی تھے مگر ان کی شخصیتیں ابھری نہ تھیں اور وہ ملک اور قوم کے تاریک ماحول میں دب کر آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے۔ اور سامنے آنے کی بہت زیادہ ان کو ضرورت نہ تھی۔ ان محسن رفقاء کے نام یہ ہیں۔ (۱) مولوی چراغ علی (۲) مولوی سید احمد (مؤلف فرہنگ آصفیہ) (۳) سید مہدی علی محسن الملک (۴) مولوی مشتاق حسین وقار الملک (۵) مولوی ذکاء اللہ (۶) مولانا الطاف حسین حالی (۷) مولانا محمد شبلی نعمانی، (۸) مولانا نذیر احمد (۹) مولوی زین العابدین۔ ان لوگوں کے زبردست کارناموں سے دنیا خوب واقف ہے۔ ان کا ذکر تحصیل حاصل ہے البتہ کم سن رفیق کہوں جو ہونہار اور بلند خیال فرزند کی شکل میں سرسید کے بڑے بڑے مقاصد میں دست راست اور عصائے پیری کا کام

برابر دیتے رہے وہ جواں بخت سید محمود ہیں جو جامع الصفات اور مشہور روایت یہ ہے کہ ان کے جوہر سر سید کے تمام اسکیم میں عمل میں لائے گئے۔ انھیں کی دور میں اسکیم کا نتیجہ مسلم یونیورسٹی کو سمجھنا چاہیے لیکن ان کی قابلیت، عالمانہ عدالتی فیصلوں اور قانونی بحث میں قصص و حکایات ہو گئے اور شاید الگ الگ ان کے جوہر ذاتی اور صفات قلم بند ہو کر شاہراہ عوام پر نہ آسکے۔ مسٹر محمود کے جونیر کی حیثیت سے ایک بنگالی بیرسٹر مسٹر دت تھے جو مر گئے۔ لکھنؤ اور بہار جنگی میں میرا اور ان کا بہت ساتھ رہا۔ ان سے بہت سے حالات سید محمود کے معلوم ہوئے۔ اور کچھ اور جگہوں سے ملے۔ ان میں سے ضروری اور مختصر سر سید کے کارناموں کی کڑی سے کڑی ملانے کے لیے بمصداق قیاس کہ نوشتہ بماند سیہ بر سفید سپرد قلم کر دیئے جاتے ہیں۔

مسٹر دت کہتے تھے کہ بعض فیصلے محمود نے ایسے کیے ہیں کہ عدالت ماتحت ججوں کے فیصلے کو اگرچہ بحال ہی رکھا تو جو استدلال کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ججوں نے لکھے تھے ان کو مسترد کر کے بڑی حیرت ظاہر کی کہ ان استدلال سے نتیجہ اتفاقاً صحیح نکل آیا ہے مگر استدلال کی کڑیاں بالکل غلط ہیں اس کے ساتھ خود نئے نئے استدلال لکھتے تھے۔ ان کی قانونی نکتہ چینیوں سے انگریز بہت بھاگتے تھے۔

محمود کی جب انگریزوں سے نوک جھونک بڑھتی گئی تو موہ بدری پرشاد صاحب ایک انگریزی خط کے خوشنویس کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنی تجویز کی نقلیں انگریزوں کو بھیج کر بتاتے تھے کہ تجویز اس طرح لکھی جاتی ہے۔ مولانا جسٹس سید کرامت حسین مرحوم فرماتے تھے کہ محمود کی قانونی قابلیت، خوش دماغی اور تبحر علمی کی یوں تو بڑی تعریف سنتے تھے لیکن جب علی گڑھ میں قانون کی تعلیم کے لیے ان کو انتخاب کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے کئی نشست میں اُن سے باتوں باتوں میں دوستانہ طور پر بہت سے مختلف علمی اور قانونی مسائل پر گفتگو فرمائی اور ان کی رائے اس طرح معلوم کی کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ امتحان لے رہے ہیں یا جانچ کر رہے ہیں۔ بالآخر انھوں نے جو خیال اور اپنی تحریری اور آزاد رائے سر سید کو مولانا مرحوم نے قانونی اور علمی تبحر کے بارے میں ظاہر کی اور اکثر لوگوں نے تعریف کی۔ اس سے ایک طرف مولانا کرامت حسین کے کمالات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایسے لوگ کمتر پیدا ہوئے۔ دوسری طرف جسٹس محمود کی عدیم المثال قابلیت کا ثبوت ملتا ہے کہ ایسے قابل کا پرکھنے والا کیسا شخص ہو سکتا ہے۔

محمود نے اپنی رائے بریلی کی ججی کے زمانے میں ایک بڑا معرکۃ الآرا فیصلہ تعلقہ داری کے تنازعات کا کیا ہے۔ اور اپنی قابلیت اور قلم کا پورا پورا زور دکھلا گئے ہیں۔ یہ جانکی کنور کا مقدمہ ہے اور محمود نے اس کا نام فیصلہ جانکاہ رکھا تھا۔ بجائے ضروری صراحت مقدمہ لکھنے کے صرف فیصلہ جانکاہ کہنے سے آج تک یہ مقدمہ برآمد کیا جاتا ہے۔

سر سید کے اور رفقائے کار اور علی گڑھ تحریک میں ساتھ دینے والوں کے تصانیف اور ان کے زور قلم و زبان سے جو کچھ تحریر اور تقریر یعنی تحریراً اور تقریراً انھوں نے مسلمانوں اور کالج کو فائدہ پہنچایا، اس سے دنیا آگاہ ہے۔ محمود نے سر سید کے صحیح جانشین کی حیثیت سے سر سید کی زندگی میں اور ان کے مرنے کے بعد جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر تفصیل سے کرنے کی ضرورت نہیں۔ محمود کی بعض تصانیف اور مسودات شاید طبع نہیں ہوئے۔ اس لیے عام طور پر لوگوں کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اور اس وجہ سے ان کے متعلق کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا لیکن محمود کی قابلیت بہر حال مسلم ہے۔

محمود صاحب ہائیکورٹ کی ججی پر جانے سے پہلے رائے بریلی

میں جج تھے۔ اس کے بہت دنوں بعد ترقی کر کے میں رائے بریلی
کی کچہری کے محکمہ دیوانی میں محافظ دفتر مقرر ہوا۔ یہ فروری ۱۹۱۳ء
سے مئی ۱۹۱۵ء کے درمیان کا زمانہ ہوگا۔ اسی دوران میں ایک برہمن
پنڈت وانیسی دست آویز کے لیئے محافظ خانہ میں آتے۔ ان کو
ہندی کے بڑے اچھے اچھے دوہے یاد تھے۔ ذرا سی بات پر ایک
ہندی دوہا پڑھ دیتے تھے۔ میں نے اُن سے فرمائش کی کہ کچہری کے اوقات
کے بعد کچھ اچھے دوہے لکھ دیں۔ انھوں نے اسے منظور فرمایا۔
اسی سلسلہ میں انھوں نے محمود صاحب کی علم دوستی کا ذکر کیا کہ
بہت زمانہ ہوا جب محمود صاحب یہاں جج تھے تو میں ایک مقدمہ
میں ان کے سامنے حاضر ہوا اور کسی بات پر دو ایک دوہے
پڑھے تو مجھ کو یہ حکم ہوا کہ شام کو سواری پر ان کو بنگلے پر لایا
جائے۔ بنگلے پر حاضر ہوا۔ ایک کمرہ رہنے کو دیا گیا اور رسوئی بنانے
والا ملا اور اچھے اچھے کھانے کے سامان فراہم ہوتے اور شب
کو محمود صاحب کے ساتھ بیٹھ کر شعر و شاعری کا خاصا مشغلہ
ہفتوں رہا۔ محمود صاحب ایک دوہے کا ادھ یعنی مطلب اس
طرح بیان کرتے اور کبھی کبھی زبانوں کی گیتا پڑھ پڑھ کر سمجھاتے
تھے۔ کہ وہ باتیں اپنے گرو اور کسی پنڈت سے بھی میں نے نہیں
سنی تھیں۔ قرآن، وید، شاستر اور انجیل کی باتیں اس طرح بتاتے
تھے کہ اتنی زندگی بیتنے پر اسی طرح کہیں سننے میں نہ آسکیں۔
جب جج صاحب دن کو کچہری یا اور کام میں لگ جاتے تھے۔ تو میں
رات کی ساری کتھا ہندی میں لکھتا جاتا تھا۔ اور کبھی جج صاحب کو
سنا دیتا تھا اور وہ کچھ اس میں بڑھا دیتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے
سونے پر سہاگے سے چمک دمک پیدا ہو گئی۔ پنڈت جی کہتے تھے کہ
محمود صاحب اس بے تکلفی سے ملتے اور باتیں کرتے جیسے ہم گاؤں
گھر میں اپنے کسی دوست سے ملتے ہیں۔ وہ کسی مذہبی بات کی پوچھ کچھ

لکھا اعتراض کو برا نہ مانتے تھے۔ اور میں کبھی اُن کو کسی بات میں
ہرا نہ سکا۔

محمود کے زمانے میں رائے بریلی کی کچہری میں بڑے بڑے
قابل وکلا کام کرتے تھے اور باہر سے بڑے نامور انگریز بیرسٹر
اور وکلا یہاں آکر علم و فن کے جوہر دکھاتے اور داد سخن پاتے
تھے۔ رائے بریلی کے نامور اور اردو داں بڑے قابل وکیل میر فدا
حسین مرحوم میرے بھی بڑے کرم فرما تھے۔ شام کو اکثر میری نشست
ان کے یہاں ہوتی تھی۔ محمود کے زمانے میں بھی ان کی وکالت
شاندار شباب پر رہی ہوگی۔ وہ فرماتے تھے کہ ایک بار کسی اپیل میں
بحث اور پیروی کرنے محمود کی عدالت میں ایک بڑے قابل انگریز بیرسٹر
آئے۔ دوسری طرف ایک اردو داں وکیل تھے۔ انگریز بیرسٹر نے
انگریزی زبان میں بحث کرنا چاہی۔ دوسری طرف کے وکیل نے
عذر کیا کہ میں انگریزی نہیں جانتا۔ میں جواب کیسے دے سکوں گا۔
انگریز بیرسٹر نے کہا میں انگریز ہوں۔ میری مادری زبان انگریزی
ہے۔ میں اپنے خیال اردو میں ادا نہیں کر سکتا۔
اردو داں وکیل۔ "میں نہ انگریزی سمجھ سکتا ہوں نہ انگریزی
بحث کا جواب دے سکتا ہوں۔ اگر بیرسٹر صاحب کو اس پر ناز ہے
کہ وہ انگریز ہیں۔ اور ان کی زبان انگریزی ہے تو مجھے بھی اس
کا فخر حاصل ہے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اور میری مادری زبان اردو
ہے اور انھیں کے حکمراں قوم نے اردو کو ملک اور اس صوبہ
اودھ اور عدالت کی عام زبان اردو تسلیم کیا ہے۔"
انگریز بیرسٹر۔ "اردو میں انگریزی خیالات کے ادا کرنے
کے لیئے سب طرح کے الفاظ نہیں۔ پھر جج صاحب خود انگریزی
داں ہیں، ان کو انگریزی بحث پر غور کرنے میں سہولت ہو گی۔"
اردو داں وکیل۔ "شاید تمام عدالتی اور اصطلاحی و

قانونی انگریزی الفاظ کے لیے اردو زبان میں لفظ موجود نہیں رہا بلکہ صاحب کے سمجھنے اور سہولت کا مسئلہ وہ تو عربی فارسی اور بعض اور زبانوں سے بھی واقف ہیں پھر بہتر ہے کہ فارسی ایسی غیر زبان میں کیوں نہ بحث کی جائے۔

انگریزی میں مسٹر (رحمت اللہ) کہا کہ پوسٹ کارڈ کا ترجمہ کیا ہے؟

محمود صاحب نے پوسٹ کارڈ اور اس طرح کے بہت سے لفظ جزو اردو زبان ہو گئے ہیں ان کے لیے خواہ مخواہ اردو لفظ گھڑنا حماقت ہے۔ اردو زبان کو مشکل تر بنانا ہے مثلاً اگر کسی غیر خواندہ یا پڑھے لکھے آدمی سے پوسٹ کارڈ کے بجائے پرچہ ڈاک کہا جائے تو اس سے پوسٹ کارڈ باسانی نہ سمجھ سکے گا لیکن پوسٹ کارڈ کہہ دینے سے فوراً وہ چیز سمجھ لے گا جو واقعی پوسٹ کارڈ ہے۔ اس بحث مباحثہ سے کیا حاصل۔ دونوں فریق کے بیرو کار اردو میں بحث کریں۔"

بات ختم ہوئی اور بحث اردو میں ہونے لگی۔

محمود صاحب کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ ان کو مختلف زبانوں کے ہزارہا شعر یاد تھے۔ شعر و شاعری کی صحبتوں کے بے شمار قصص و حکایات کی معلومات کا گنجینہ خود ان کا دل تھا وہ خود شاعر نہ تھے۔ مگر شعر و سخن کے بڑے دلدادہ اور شاعری و ادب کے بڑے سخن فہم قدر دان تھے۔

محمود کی شاعرانہ دلچسپیوں کا ایک واقعہ ان کی استدلالی قوت کی تائید میں بہت مشہور ہے جس میں قاتل کی آستین پر خون کے دھبے کا ذکر کرتے ہوئے محمود نے اپنی تجویز میں یہ شعر لکھ دیا تھا

قریب ہے یار، روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اٹھارویں صدی عیسوی کے مشہور شاعر فردوس مرحوم رائے بریلی کے رہنے والے نواب باندہ کے دربار سے متوسل تھے۔ انھوں نے ایک عدیم المثال مثنوی اسی طرز شاعری میں نظم کی تھی۔ جیسے مثنوی گلزار نسیم ہے۔ افسوس کہ وہ کہیں نا پید ہو گئی اگر آج ہوتی تو خدا جانے کیا چیز ہوتی۔ غیرت زن ایک کنیز پر بیگم کا غیظ و غضب اس مثنوی میں یوں ظاہر کیا گیا ہے۔

سرگرم جلال ہو رہی تھی   زردہ پہ لال ہو رہی تھی

محمود نے اس مثنوی کی شہرت سنی۔ فردوس مرحوم سے اس کے اشعار سنانے کی خواہش ظاہر کی فردوس نے چلتے چلتے ایک قصیدہ محمود کی شان میں کہہ لیا۔ جب شرف باریابی حاصل ہوا تو یہ شعر سن کر محمود نے گردن جھکا لی۔

نماند خسرو عنصری و رفت فردوسی

کنوں ندمانہ فردوس را تو ئی محمود

محمود نے بڑی قدر کی اور بہت انعام اکرام سے رخصت کیا

ایک بار محمود کے اجلاس میں ایک عورت سوسن نامی گواہی کے لیے آئی۔ ایسی طرار اور زبان دراز کہ الٰہی توبہ محمود بار بار اس کو دیکھتے اور اس کی ہزار داستانی اور بے محل طراری کو رد کرتے رہ رہ جاتے تھے۔ تماشائیوں سے اجلاس بھرا ہوا تھا محمود نے میر فدا حسین وکیل کی طرف دیکھ کر کہا میر صاحب سنتے ہیں

سوسن نے زبان درازیاں کیں

میر صاحب نے فرمایا۔ دوسرا مصرع لگا ہوا ہے۔ سنیے

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں

اپنی زندگی کے آخری دور میں پنشن کے بعد کچھ عرصے جسٹس محمود نے جب لکھنؤ میں قیام فرمایا تو گرمی کے موسم میں ایک صبح کو یہ دیکھا گیا کہ سکندر باغ کے سبزہ زار پر پالتی مار کر محمود صاحب بیٹھے زبانی کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے یہاں رہنے والے ایک

صاحب سے معلوم ہوا کہ اُن کو قرآن شریف کا ایک پارہ زبانی یاد ہے۔ کچھ دنوں سے اکثر یہ صبح کو تنہائی میں رب العالمین کا معیان دل میں رکھ کر اسے پڑھتے ہیں اور اس کے بعد چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے جو انھیں یاد ہیں پڑھ کر رو دیتے ہیں۔ میں صبح کو ٹہلنے نکلا تھا دور سے میں نے خود یہ سماں ایک بار دیکھا کہ محمود صاحب آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ حامد علی خاں مرحوم بیرسٹر یا جسٹس کرامت حسین اعلی اللہ مقامہ سے ذکر آیا نے یہ معلوم ہوا کہ الم کا پارہ اور کسی ایرانی شاعر کے یہ فارسی اشعار ہیں جو وہ پڑھتے ہیں۔

سر سید کا ہاتھ بٹانے والوں میں محمود کا خاص حصہ ہے اس لیئے ان کی کچھ باتوں کا ذکر عام معلومات کے لیئے کر دیا گیا اگرچہ ان کا تعلق علی گڑھ تحریک سے نہیں مگر یہ دیکھا جائے کہ سرسید کے رفقائے کار کی عام صلاحیتیں کس قدر بلند پایہ ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ وہ رفقا جو اپنے ذوق اور قابلیت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان میں ایک محمود بھی ہیں۔

تصانیف اور رسائل کا اجراء

سرسید کی دوسری اسکیم جو زندگی میں نیا شعور پیدا کرنے کی تھی وہ رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجراء اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور دیگر رسائل کے لیئے مضمون نگار پیدا کرنے کے تصنیف و تالیف اور تحریکوں کے ذریعے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کرنا تھا۔ سوسائٹی بن چکی تھی، قلمی مجاہد اور نڈر مجاہد سے سہارا پا چکی تھی۔ سب کچھ سننے پر بھی ان مجاہدوں کے قدم دُگمگے اور معاشرت و تمدن و ادب میں خوشگوار اصلاحات ہوئیں۔ اور ان کا سلسلہ اب تک رسائل سے اور ادب اور معاشرت و مذہب کی باتوں کو زمانہ کے عنوان سے سوچنے کا شعور پیدا ہوا اور ہوتا چلا جا رہا ہے

اسکول اور کالج کا قیام

تیسری بنیادی چیز جس کا خاکہ سرسید کے دماغ میں پہلے سے ہی تھا اور اسی میں اور رچا ہو گئی جب وہ اپنے بیٹے مسٹر محمود کو لے کر ۱۸۶۹ء میں ولایت گئے اور آکسفورڈ اور کیمبرج کے رہائشی کالج دیکھ کر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے چھوٹے چھوٹے مدرسے وہ جا بجا قائم کرتے ہی رہے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں انگریزی اسکول مرادآباد میں اور ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں اسکول کھولا اور جہاں کہیں بھی موقع ملا چھوٹا موٹا مدرسہ اور اسکول کھلاتے کھلواتے رہے۔ جب دنیا کی بہت سی ذمہ داریوں سے نجات پائی اور فضا کچھ سازگار دیکھی تو علی گڑھ میں پھوس کے چھپر تلے وہ ہائی سکول کالج کھول دیا۔ اور جب ۱۸۷۶ء میں سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے تو سارا وقت اور ساری قوت سے مستعد اور ہمہ تن سرگرم ہو کر علی گڑھ مسلم کالج کی ترقی میں لگ گئے۔ اور یونیورسٹی کی اسکیم اگرچہ سرسید کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی مگر اس کا خاکہ خیال کے آئینے میں تھا۔ اور اس خواب کی تعبیر بھی پوری ہو کے رہی۔

یہ علم و ادب پروری کی اگلی پچھلی داستانیں ریسرچ کے لیئے تشنہ چھوڑ کر اس لیئے آگے بڑھنا ہے کہ رات تھوڑی اور قصہ طولانی۔ کہنا یہ ہے اور بہت اختصار سے کہنا ہے کہ ایسے کتنے معرکے جھیل کر بد نصیب زمانے نے مسلمانوں میں شعوری زندگی سرسید اور ان کے رفقائے کار کی بدولت پھیلائی۔ بدقسمتی سے سرسید کو ایک ایسا زمانہ ملا جب اعلیٰ اعلیٰ ذہنیتیں کیسے کیسے تاریک غلافوں میں روپوش تھیں۔ اور مسلمانوں کا مستقبل ان کے دائمی وقار کے قیام کے لیئے پہلے چینی اور سرسید کو نکتہ رس اور دقیقہ شناس سمجھ کر کچھ کرنے کے لیئے کتنے پاپڑ بیلنے متقاضی تھا۔

اچھوت اور جانور کا چھوا ہوا کھانا گوارا تھا مگر سرسید کے ساتھ

ایک دسترخوان پر کھانا کھانا ان کی صحبت میں بیٹھنا بھی حرام تھا۔
مگر جتنا بوڑھا ہو جس طرح ایک مصلح اور ایک نبی اور ایک مدبر کی
نگاہ دوررس ہوتی ہے۔ اکثر اس کی حیات میں اس کی قدر نہیں
ہوتی اسی طرح سرسید اپنے عہد کے اکثر مفکر اور مصلح تھے جن کی
قدر اب زمانہ برابر کرتا چلا جائے گا جس جس طرح دنیا ترقی کرتی جائے
گی جب ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ نازک دماغوں پر سوچنا اور
غور کرنا بار ہو اور فضا داخل درس رہے یہ سوال اس طرح ذہن پر
جیسے رستوگیوں مہاجنوں اور بنکوں میں زیور رہن ہوتا ہے تو پھر

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں
حالیؔ سید کو کچھ ڈرانے ہیں

سرسید جانتے تھے کہ مغرب کے سمندر سے جو خیالات اور علم
کا سیلاب امڈتا ہوا ہندوستان کی طرف آرہا ہے اس میں مسلمان
بہہ جائیں گے اگر کوئی مضبوط بند پہلے سے نہ باندھ دیا گیا ہو۔ یہ
باندھ بھی علی گڑھ کی تحریک تھی۔ اس کی بنیاد تعلیم پر تھی۔ مگر اس کے بہت
سے پہلو تھے اور سب عملی۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق کا رسالہ کتنی دوراندیشی کے ساتھ
نکالا تھا۔ ایک طرف اردو ادب میں نئے پیرائے اور زمانہ پسند رنگ
کی داغ بیل ڈالی تو دوسری طرف اسلام جیسے سچے دین کو جس پر توہم
پرستی کا سایہ پڑ رہا تھا اس کو بچانے کے لیے عقل سلیم سے کام لینے
پر آمادہ کرنا مقصود تھا۔ سرسید نے اس راہ میں جو کچھ کیا بڑی نیک
نیتی پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے خم ٹھونک
کر اور کچھ سپاہی لے کر میدان عمل میں کود پڑے اور بالکل نہیں
جھجکے کہ لوگ کیا کہتے ہیں وہ اور ان کے رفقاء ایک نمونۂ عمل قائم
کر گئے اور ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئے جس پر یہ قوم گویا آج بھی
بڑھتا اور چلتا ہے۔

علی گڑھ کالج چاہے اب وہ جیسا ہو اور وہ پہلی روح
اور اسپرٹ مدھم اور سو پڑ گئی ہو مگر فی نفسہ اس چیز کو دیکھئے کہ وہ کالج
جو آج یونیورسٹی کی شکل اختیار کر چکا ہے اگر نہ ہوتا تو آج مسلمان
لٹی ہوئی سرکار اور کھوکھلے دماغ سے زیادہ اور کیا ہو سکتے۔

شعوری زندگی جتنے دماغوں نے گھبراہٹ میں نہیں
بڑی سنجیدگی سے مدتوں سوچا اور غور کیا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے
ہیں کہ علی گڑھ تحریک کا نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت پر عظیم
احسان ہے کہ مذہب پر سوچنے کے لیے نئی شاہراہ تہذیب و
اخلاق کے زمانہ پسند جادے پر گامزن ہونے اور علم و ادب و
تخیل، سوسائٹی فرض شناسی اور پیکر انسانیت میں ایک تازہ
اور نئی روح پھونکنے میں علی گڑھ تحریک کا بڑا حصہ ہے۔ اس علی گڑھ
کے مختلف موضوعات کے مضامین اور نامور فرزندان جو علی گڑھ
نے پیدا کر کے مختلف دیار اور اطراف عالم میں بھیجے اور گوشے
گوشے میں پھیلائے۔ ان سے بہت انبساط کے ساتھ اس کا ثبوت بہم
پہنچتا ہے کہ علی گڑھ کی جامعیت نے ایسی شعوری زندگی پیدا کر
دی ہے جو کسی اور طرح شاید ممکن نہ ہو سکتی۔ علی گڑھ نمبر کے دامن
میں سمٹ کر وہ تمام بہاریں وہ ساری فضائیں کیسے جلوہ گر ہو سکتی
ہیں جو تقریباً تین چوتھائی صدی کے لمبے دور اور دنیا کے گوشے
گوشے میں پھیل چکی ہیں۔ بعض نوٹوں میں کچھ منفرد خصوصیات ہوتی
ہیں جن کا ذکر لفظوں میں نہیں سما سکتا۔ بعض پھولوں کا حسن ورڈس
ورتھ (WORDS WORTH) شاعر کی گل چینی اور بار
بار ان کو دیکھ کر لکھتے وقت قلم سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ نہ ان کا
رس خامے سے کاغذ پر ٹپکایا جا سکتا ہے۔ یہی حال اس شعوری زندگی
کے کارناموں کے اظہار کا ہے جس کا بیج سرسید لگا گئے ہیں۔ اور
ہر شعبۂ حیات میں اس کی آج جلوہ گری ہے۔ علی گڑھ تحریک نے

انسان اسد باہمی انسان پیدا کیئے، اسکی نفضا لے انسانی اخوت اور مساوات اور بھائی چارے کی وہ روح پیدا کی جو اسلام کا اصلی مقصد تھا۔ اسی نے ملک و قوم میں سچی ایمان داری کی روح پیدا کی چنانچہ مجملہ میں جہاں انقلابی عہد کے پہتالی خوردہ سامان دا یمان دار سچے اور جتنے فرزند ان کالج میں ملیں گے جن کے نام اسد عہدوں اور سلام کوئی عظیم جلدوں میں ہمار سے قدیم کر منعرا اور کالج کے اولڈ بلیک مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم نے تیار کرکے چھپوا دیا ہے۔ اس کی مثال شاید مشکل ہے کوئی کالج یا یونیورسٹی پیش کر سکے۔ ہاں اس چھے ادیب شاعر لیکچرار، اچھے خطیب اچھے مدبر بھی تو اس نے پیدا کیئے اس کے زیر سایہ سید احمد کے خیالات اور کمالات پر مشتمل ہوکی عمل کی گرواہ تحریک بن گئی۔ ایک مشن کی تھی جس میں تہذیب و تمدن برود حق ہو تو اور عظمت بر سر کمالات انسانی در بغل انسان برابر ڈھلتے چلے آئے۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے جو کچھ کیا اور جس طرح کام کیا وہی مقتضائے وقت تھا نہ وہ بے دین تھے نہ بے ایمان کچھ نظریات کا کچھ لوگوں کے نظریات سے اختلاف ضرور تھا اور جب نزدیک سے اور ہمدردی کی نگاہ سے اس کو تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو بہت سے راز سربستہ خود کھل جائیں گے :۔

مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی

خیر مقدم

سر سید احمد خاں بمقام لاہور ۲۔ فروری ۱۸۸۴ء

آگیا وہ سید والا ہمم
اس کے استقبال کو جاتے ہیں ہم
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

قوم پر جس نے کیا لطف و کرم
گا رہے ہیں یہ ہی نغمہ دمبدم
سید احمد خاں بہادر ویلکم

خیر مقدم اے حکیم دردمند
قوم غم میں ہو چلی تھی یاس بند
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

خیر مقدم نیک خو نیکی پسند
دستگیری کر، نہیں پہنچے گزند
سید احمد خاں بہادر ویلکم

اے رسول اللہ کے لخت جگر
اے مسلمانوں کے بوڑھے دل میر
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

اے بتول پاک کے نور نظر
ہم سبھوں کو لانے والے راہ پر
سید احمد خاں بہادر ویلکم

ہاں بہت کچھ غم سے تھی بیمار قوم
آپ آئے ہو گئی ہشیار قوم
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

ہو گئی تھی عاجز اور لاچار قوم
تھنک یو کہتی ہے سو سو بار قوم
سید احمد خاں بہادر ویلکم

اولڈ فیشن نے ستایا ہے بہت
کافر و ملحد بتایا ہے بہت
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

نیچری کہہ کر رلایا ہے بہت
اب تو سید تیرا سایہ ہے بہت
سید احمد خاں بہادر ویلکم

اے مرے دلی کے دل والا تبار
آپ کے ہمراہ جو ہیں چار یار
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

اے مرے ہندوستان کے افتخار
ان پہ ہو میرا سلام اور چار بار
سید احمد خاں بہادر ویلکم

خیر خواہ ملک و ملت زندہ باش
زندہ باش اے نیک طینت زندہ باش
ویلکم اے عالیجناب ذی حشم

با ہمہ خوبی و صحت زندہ باش
بر سر ما تا قیامت زندہ باش
سید احمد خاں بہادر ویلکم

ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رنگون

(۱۹۰۹ء)

۱۹۰۸ء میں جب کانفرنس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا تو اس میں بزرگان پشاور بھی شریک ہوئے تھے اور بعض باثر اور روشن خیال اصحاب کی اس وقت یہ رائے ہوئی تھی کہ سال آئندہ میں کانفرنس کا اجلاس پشاور میں کیا جائے اور اس وقت اجلاس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک یہ خیال قائم رہا کہ پشاور ہی میں آئندہ اجلاس ہوگا۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد کسی وجہ سے بزرگان پشاور کا وہ خیال باقی نہ رہا۔ اس کے بعد مسٹر رفیق الفاقی سے علیگڑھ میں تشریف لائے اور انھوں نے رنگون و برما کے مسلمانوں میں تعلیمی تحریک پیدا کرنے کی غرض سے یہ خیال ظاہر کیا کہ ۱۹۰۹ء کا اجلاس کانفرنس، رنگون میں کیا جائے، ان کی رائے تھی کہ مسلمانانِ رنگون کی تعلیمی ضروریات کے لحاظ سے اس امر کی بجید ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو کانفرنس کا وہاں اجلاس کیا جائے مسٹر رفیق نے رنگون جانے کے کچھ عرصے بعد اور عالیجناب سیٹھ عبدالکریم صاحب جمال، ملک التجار و رئیس رنگون نے جن کے دل میں مسلمانوں کی خراب حالت کا حقیقی درد موجود ہے اور جو قوم کی بہتری کیلئے ہر قسم کی محنت، کوشش اور سب سے بڑھ کر اپنی کثیر دولت کا حصہ قربان کرنے کیلئے موجود رہتے ہیں۔ بذریعہ تار بنگلن رنگون کی جانب سے کانفرنس کو دعوت دی جس کو سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے دلی شکر گزاری کے ساتھ قبول کیا۔

قومی اخبارات کے ذریعے سے رنگون میں کانفرنس کا اعلان ہونے پر ہر گوشۂ ملک سے مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ دعوت کی باضابطہ منظوری کے بعد اس مقصد کے خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام پانے کیلئے جناب سیٹھ حاجی عبدالکریم صاحب کی سرپرستی میں ریسپشن کمیٹی قائم کی گئی۔

رنگون تجارتی شہر کی حیثیت سے ایسا مقام نہیں، جہاں مہمانوں کے قیام کا انتظام ایک جگہ نہیں ہوسکتا۔ نہ وہاں کوئی ایک وسیع قطعۂ اراضی ملنا آسان تھا جس کے چاروں طرف خیمے آسانی کے ساتھ لگاکر علیحدہ کیمپ کی صورت قائم کی جاتی۔ ماسوا اس کے مکانات کی قلت اس درجہ ہے جو شمالی ہندوستان کے رہنے والوں کے لیے حیرتناک ہے جہاں ایک ایک مکان کی قیمت اور لاگت ہندوستان کے بڑے بڑے علاقوں کی قیمت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے عام مہمانوں کا کسی ایسے مقام پر فروکش ہونا کہ ایک جگہ رہیں، سب ایک جگہ کھائیں پئیں۔ ایک کمپاؤنڈ میں اجلاس کریں بہت دشوار تھا اس لیے کمیٹی کی توجہ اور کوشش سے متعدد عالیشان مکانات تھوڑے تھوڑے فاصلے سے، مہمانوں کی آسائش اور قیام کے لیے تجویز کیے گئے تھے۔ ہر مکان برقی روشنی، برقی پنکھوں، عمدہ اور ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ جس میں تمام مہمان آسائش کے ساتھ ٹھہرائے گئے تھے، ہر مکان کے دروازے پر بڑے بڑے جھنڈے

اور پھر بڑے دُور سے ہوا میں اُڑتے نظر آتے تھے اور ہر شخص کو اس
امر کا پتہ دیتے تھے کہ اس مکان میں کانفرنس کے مہمان فروکش
ہیں۔ والنٹیروں کی جماعت اپنے اپنے حلقوں کے مکانات پر متعین
تھی جو مہمانوں کی ضروریات کی نگراں تھی۔

تمام مکانات کے وسط میں ایک وسیع مکان ڈائننگ ہال کی
کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے آراستہ کیا گیا تھا۔ جس کے وسیع ہال
میں دو تین مہمان ایک وقت میں میز پر کھانا کھاتے تھے۔ صبح
شام چائے کی بسکٹ اور توس کے ساتھ تواضع کی جاتی تھی۔ باقی
کھانا ادھر دن کو دس بجے اور ادھر بعد مغرب کھلا دیا جاتا
تھا۔ ہر وقت دو تین قسم کا کھانا ہوتا تھا۔ کھانے میں سادگی
تھی اور ہونی بھی چاہئے تھی لیکن جس سیر چشمی کے ساتھ اور محبت
کے ساتھ رنگون کے میزبان اپنے مہمانوں کو کھانا کھلاتے تھے
اس سے ان کی دلی محبت اور خوشی کا ثبوت ملتا تھا۔

رنگون ایک ایسا شہر ہے جہاں کھانے پینے کی اشیاء
بہت گراں ہیں۔ وہاں کی زندگی نہایت مہنگی ہے۔ ایسی صورت میں
جہاں ہندوستان کے مقابلے میں اشیائے خوردنی کی قیمت ایک اور
چار کی نسبت ہو، مسلسل چھ سات دن تک ایسی عظیم الشان مہمانداری
کرنا جیسی کہ مسلمانانِ پنجاب مقیم رنگون نے کی۔ عالی ہمتی اور زندہ دلی کی
بین مثال ہے۔

ڈائننگ ہال کے پہلو کا ایک بڑا کمرہ ڈرائنگ روم کے طرز
پر عمدہ قسم کی کرسیوں، آرام چوکیوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور جس کے
چاروں طرف کی دیواروں پر عمدہ کتبے، خوشنویسی کی وصلیاں، مشاہیر
مسلمانانِ عالم کے فوٹو، موجودہ مسلمان بادشاہوں کے گروپ،
مقدس اور مذہبی عمارات کے نقشے کثرت کے ساتھ آویزاں کیے
گئے تھے

کھانا کھانے سے قبل اور کھانا کھانے کے بعد مہمان اس
کمرے میں آرام کرتے، ایک دوسرے سے ملتے اور آپس میں
تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

پنڈال اجلاس کانفرنس کے واسطے جوبلی ہال کی
عظیم الشان بلڈنگ تجویز ہوئی تھی۔ یہ عمارت
رنگون کی خوشنما عمارتوں میں سے ایک عمدہ اور خوش منظر
تعمیر ہے۔

بیچ کا ہال نہایت وسیع، چھت بلند اور شاندار۔ سامنے
کے رُخ پر فراخ اور بلند پلیٹ فارم اور اوپر کی منزل پر تین سمتوں
میں کشادہ گیلریاں، غرض تمام ہال کی ساخت اور بناوٹ، فنِ
تعمیر کا بہترین نمونہ ہے مخصوص لکڑی کی چھت جس میں نقاشی
اور کھدائی کا کام دیکھنے کے لائق تھا۔

تمام ہال میں برقی قمقمے اور جھاڑ، رنگ برنگ کے
آویزاں تھے۔ شب کے جلسوں میں جب یہ قمقمے روشن ہوتے
تو ان کی صاف اور ہلکے نیلے رنگ کی روشنی، ہال کی رونق کو
دوبالا کر دیتی تھی۔ برقی لمپوں کے ساتھ برقی پنکھے بھی آویزاں
تھے۔ دسمبر کے مہینے میں ہندوستان میں خوب سردی ہوتی ہے اور
مکانات کو انگیٹھیوں کے ذریعے گرم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے
لیکن رنگون میں موسم کی حالت نہایت معتدل تھی اور کسی کسی وقت
ہلکی ہوا کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اجلاس کے وقت برابر پنکھے
چلتے رہتے تھے اور دھیمی ہوا فرحت بخش ہوتی تھی۔ ہال میں اور
گیلریوں میں دو ہزار کرسیوں کا انتظام تھا اور تمام کرسیاں ہر وقت کے
اجلاس میں بھری نظر آتی تھیں۔ جوبلی ہال کے سامنے برقی ٹرامویے
ہر وقت گزرتی رہتی ہے۔ ٹرامویے کی وجہ سے ڈیلیگیٹس کو دن اور رات
کے جلسوں میں آنے جانے کی نہایت آسانی تھی۔

مہمانوں کے قیام کے انتظام کی کیفیت لکھنے کے بعد
آنریبل پریسیڈنٹ صاحب اور دیگر معزز مہمانوں کی آمد اور اُن کے
ریسپشن کی کیفیت حسب ذیل ہے ۔

۲۴ دسمبر کو سب سے پہلا جہاز جس میں آسام اور ہندوستان
وغیرہ کے ڈیلیگیٹس شامل تھے کلکتہ سے چل کر رنگون پہنچا۔ اس کے
بعد دوسرا جہاز ۲۰ دسمبر کو آیا جس میں ہندوستان پنجاب اور اودھ
اور دیگر مقامات کے بہت سے معزز اصحاب کے علاوہ آنریبل صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لاء آنریری جوائنٹ سکریٹری
آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور جناب مسٹر جے۔ ایچ۔ ٹول صاحب
بہادر پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ بھی تشریف لائے ریسپشن
کمیٹی کے اکثر معزز ممبران نے لب دریا آنریبل صاحبزادہ صاحب اور
پرنسپل صاحب کا استقبال کیا۔ تیسرا جہاز ۲۸ دسمبر کو ۲ بجے دن کے
رنگون لیوس اسٹریٹ جیٹی پر لنگر انداز ہوا ۔

اس آخری جہاز سے عالیجناب سر راجہ علی محمد خان صاحب
بہادر سی۔ آئی۔ ای پریسیڈنٹ و عالی مرتبت نواب وقار الملک
بہادر آنریری سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ و آل انڈیا محمڈن
ایجوکیشنل کانفرنس، مع سو، سوا سو ڈیلیگیٹس کے جن میں مختلف
حصص کے معزز مہمان شامل تھے اُترے ۔

دو بجے دن سے جیٹی پر عمائدین شہر اور ریسپشن کمیٹی کے معزز
ارکان آنے شروع ہو گئے تھے ۔ ان کے علاوہ ہزاروں تماشائیوں سے
جیٹی کا وسیع اور فراخ پلیٹ فارم آناً فاناً میں بھر گیا ۔ آدمیوں
کا اس قدر ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور ہر شخص کی
نگاہ بنگالہ نامی جہاز کو دیکھنے کو متجسس نظر آتی تھی جس میں
آنریبل پریسیڈنٹ اور نواب وقار الملک بہادر تشریف لا رہے تھے
جیٹی کے باہر تقریباً سو گاڑیاں جن میں لینڈو، فٹن،
موٹر کار شامل تھیں ۔ مہمانوں کے انتظار میں ترتیب کے ساتھ
کھڑی تھیں ۔ ان کے علاوہ ایک موٹر ٹرین، پھولوں اور مختلف
قسم کی جھنڈیوں اور قندیلوں سے آراستہ کی گئی تھی اور جس پر
۲۰۰ کرسیاں بچھائی گئی تھیں ۔

جس وقت دور سے جہاز نظر آیا ہر شخص کے چہرہ سے
خوشی اور مسرت کے آثار نمایاں تھے ۔ لوگ ایک دوسرے کو اشارہ
کے ذریعہ سے جہاز کا نشان دیتے تھے ۔ بیسیوں شخص دوربین
کے ذریعہ سے ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے ۔ جس وقت جہاز کنارے
کے قریب آیا ۔ چیرز اور خوشی کے نعروں سے تمام پلیٹ فارم
گونج اٹھا اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے آنریبل
پریسیڈنٹ اور نواب صاحب بالقابہ سے مصافحہ کرے ۔ ہجوم
خلائق کی وجہ سے انتظام قائم رکھنے اور دریا میں گرنے کے خوف
سے افسران پولیس کو بار بار لوگوں کو صفوں میں ترتیب کے
ساتھ کھڑا کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی ۔

الغرض ایسے جوش اور کئی ہزار آدمیوں کے ہجوم میں
آنریبل پریسیڈنٹ صاحب و نواب وقار الملک بہادر کو مع
دوسرے معزز مہمانوں کے جناب سیٹھ عبدالکریم صاحب پریسیڈنٹ
ریسپشن کمیٹی نے جہاز کی سیڑھیوں سے پھولوں کی بارش
میں اُتارا ۔

محترم اور ذی وقار مہمانوں کے اترتے ہی لوگ عقیدتمندی
کے جوش سے، شوق استقبال میں آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر
مہمانوں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ۔ گلدستے نذر
کئے ۔ حاجی سیٹھ عبدالکریم صاحب نے معزز مہمانوں کا شرفا
رنگون سے تعارف کرایا ۔

کانفرنس کے پریسیڈنٹ اور آنریری سکریٹری کا ریسپشن

بست موقعوں پر اس جوش اور اہتمام کے ساتھ ہوا کہ وہ دیکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ لیکن رنگون میں جس شاندار طریقے سے رسم پیشوائی کی رسم عمل میں آئی اور اس کی زینت کیلئے جو قدرتی اسباب علاوہ دیگر سامانوں کے رنگون میں موجود ہیں، ان کا لطف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ عظیم الشان دریا کا پر لطف منظر، جہازوں کی قطاریں، چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا اِدھر اُدھر پانی میں پھرنا، ایک طرف بلند اور شاندار سبزے سے ڈھکی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ، ناظر اور بام کے سرو قد درختوں کی چوٹیوں کا دور سے نظر آنا، لبِ دریا سبزے کے کھیت، پلیٹ فارم پر کئی ہزار آدمیوں کا چشم براہ کھڑا ہونا۔ ایک ایسا دلکش اور پر جوش منظر تھا کہ جس کی کیفیت بیان کرنے کیلئے الفاظ کافی نہیں۔

الغرض معانقہ اور مصافحہ کی رسم ادا ہونے کے بعد تمام مہمان گاڑیوں میں سوار ہوئے اور تمام جلوس بینڈ کے ساتھ شہر سے گذرتا ہوا اپنی اپنی فرودگاہوں کو روانہ ہوا۔ بازاروں میں جہاں تک نظر جاتی تھی تماشائیوں کے غول کے غول نظر آتے تھے۔ سرِ راہ تمام مکانات کی کھڑکیاں اور چھجے آدمیوں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے رنگون کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور اس لحاظ سے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ لوگ جن کو اس تعلیمی پالیسی سے خاص دلچسپی ہے وہ تک بھی اس مرتبہ شریک ہو سکیں گے علاوہ مصارف سفر کی گرانی کے ایسے اصحاب جو ملازمت پیشہ ہیں اور جن کو کرسمس کے ایام کی معمولی تعطیل کے علاوہ اور زائد رخصت نہیں مل سکتی تھی تاکہ وہ آسانی کے ساتھ آ جا سکیں، ان کا جانا سخت دشوار تھا اور پہلے سے یہ خیال تھا کہ رنگون کا اجلاس باعتبار ڈیلیگیٹس کے اس شان کا نہ ہوگا جو کانفرنسوں کے اجلاسوں سے مخصوص رہی ہے مگر تقریباً ڈھائی سو معزز مہمان ہندوستان کے دور دراز مقامات سے آکر شریک اجلاس ہوئے۔

رنگون میں کانفرنس کے اجلاس سے قبل بہت سے اصحاب نے یہ خبر اخباروں میں پڑھی ہوگی کہ اہلِ رنگون کو کانفرنس کے اغراض سے ہمدردی نہیں۔ وہ اس کے مخالف ہیں لیکن جنھوں نے کانفرنس کے اجلاسوں کو بچشم خود دیکھا ہے اور جن کو اس کے مابعد کی حالت کی اطلاع ہے ان کو اس بات کا یقین ہے کہ کانفرنس کو اس کے اصلی مقاصد میں حسب دلخواہ کامیابی ہوئی۔ یعنی جن خیالات اور قومی اغراض کی اشاعت اور جن قومی تحریکوں کا مسلمانوں کے دل و دماغ میں جاگزین کرنا کانفرنس کا اصلی مقصد ہے، ان کی اشاعت اور مقبولیت برہما کے مسلمانوں میں اس اجلاس کی وجہ سے بخوبی ہو گئی اور جس کے عملی نتائج آئندہ زمانے میں یقینی طور پر ظہور پذیر ہوں گے

امسال اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا کہ اجلاسہائے کانفرنس کی کارروائی کی اطلاع رنگون سے بذریعہ تار ہندوستان کے نامی روزانہ اخبارات کو بغرض اشاعت بھیجی جاتی تھی۔

ع اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں — چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے

لالہ کاروں سے تری بادِ خزاں کے باوصف — اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے

یہ تری تلخ نوائی ہے کہ گمراہوں میں — اپنی منزل پہ پہنچنے کی للک باقی ہے

کون سمجھے ترے پرسوز تخیل کے سوا — اب بھی برفاب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

آل احمد سرور

علی گڑھ میگزین کے مُدیر

انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۵ مئی ۱۸۹۱ء کے ضمیمہ کی حیثیت سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کا اجراء ہوا۔ اس وقت انگریزی اور اُردو کے حصے مشترک شائع ہوتے تھے۔ مدیر اعلیٰ کالج کے پرنسپل تھیوڈر بیک تھے (پروفیسر) شبلی نعمانی اردو سیکشن کے ایڈیٹر تھے۔ ہم کو ۱۸۹۶ء کی جلد دستیاب ہوئی ہے۔ شمارہ ۱ جلد ۳ اشاعت ماہ جنوری ۱۸۹۶ء میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"تقریباً چار برس ہوئے اس نام کا ایک رسالہ انگریزی اور اُردو ملا ہوا۔ علی گڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا۔ اول اول وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ (گزٹ) کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا لیکن (۸ مئی ۱۸۹۴ء کی اشاعت کے بعد) ۱۸۹۴ء میں اس نے مستقل رسالے کی صورت اختیار کی۔

(خالص رسالے کی حیثیت سے اس کی اشاعت کا یہ چھترواں سال ہے (۱۹۶۹ء) جب یہ موجودہ غالب نمبر پیش کیا جا رہا ہے)

۱۸۹۸ء سے شبلی کے بعد حصہ اُردو کی ادارت کا بار اُس کے منیجر خواجہ محمد حسین اور نائب منیجر پر رہا۔

۱۸۹۹ء ستمبر میں ایڈیٹر تھیوڈر بیک کا انتقال ہو گیا۔ میگزین شائع تو ہوتا رہا مگر اشاعت میں کوئی پابندی نہیں رہی۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں ولایت حسین آنریری منیجر ہوئے نام بدل کر "علی گڑھ منتھلی" ہو گیا۔

۱۹۰۸ء میں پروفیسر محمد شفیع آنریری منیجر ہوئے

۱۹۱۲ء میں ڈی آکٹرلونی منیجر ہوئے۔

۱۹۱۴ء ہی میں اُردو سیکشن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جلال الدین ہوئے۔

۱۹۱۹ء میں مسٹر اے سالیف رحمٰن (پروفیسر) علی گڑھ منتھلی کے پبلشر ہوئے۔

۱۹۲۱ء کی اشاعت نومبر دسمبر میں رشید احمد صدیقی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے بجائے پبلشر رحمٰن صاحب کے شائع ہوا۔ اس کے بعد سلسلہ یوں ہے۔

نام	مدت
پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء
پروفیسر خواجہ منظور حسین	۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء
اشفاق حسین بے خود	۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۵ء
بشیر احمد صدیقی	۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء
پروفیسر عبدالباسط	۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء
محمود الحسن صدیقی	۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۸ء
انیس الدین احمد رضوی	۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۹ء
محمد زکریا فیاضی	۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء
حکیم ماجد حامدی	۱۹۳۰ء
ممتاز احمد بسمل	۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء
عبدالاحد خان خلیل	۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء

نام	سنہ
سید وحید اکبر آبادی	۱۹۳۲ء
دلشاد بی	۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء
پروفیسر آل احمد سرور	۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء
پروفیسر ظفر احمد صدیقی	۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء
جاں نثار اختر	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء
محمد معین الدین دردائی	۱۹۳۷ء
پروفیسر ابو اللیث صدیقی	۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء
آفتاب احمد صبحی ردولوی	۱۹۳۹ء
سید محمد صادق صفوی / رشید احمد سہروردی	۱۹۴۱ء
سید مجتبیٰ حسن	۱۹۴۱-۴۲ء
راز مراد آبادی	۱۹۴۳ء
ملک حامد حسن	۱۹۴۴ء
محمود فاروقی	۱۹۴۷ء
پروفیسر مختار الدین احمد آرزو	۱۹۴۸-۴۹ء
سید شبیہ الحسن نونہروی	۱۹۵۰ء
ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی / اے کے آفتاب زبیری	۱۹۵۱-۵۲ء
جمیل احمد صدیقی	۱۹۵۳ء
نسیم قریشی	۱۹۵۳-۵۴ء تا ۱۹۵۴-۵۵ء
عبد الحفیظ صدیقی	۱۹۵۵-۵۶ء
قیصر رئیس	۱۹۵۷ء
انور صدیقی	۱۹۵۸ء
حسن مثنیٰ انور	۱۹۵۹ء
سید امین اشرف	۱۹۵۹-۶۰ء تا ۱۹۶۰-۶۱ء
شہریار	۱۹۶۲ء
محمد اسلم رضوی	۱۹۶۶-۶۷ء
بشیر بدر	۱۹۶۸-۶۹ء

اس تفصیل سے یہ چند باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ہمارے میگزین کا اجرا ۵ مئی ۱۸۹۱ء کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر ہوا۔ مئی جون ۱۸۹۲ء سے اس نے مستقل رسالے کی صورت اختیار کی مگر ہم کو یکم مئی ۱۸۹۵ء کا ایک شمارہ دستیاب ہو سکا ہے۔

پروفیسر شبلی نعمانی سے پروفیسر ایف اے رحمٰن تک ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۰ء اس کی ادارت کالج کے اساتذہ کرتے رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی پہلے طالب علم ہیں جو دوران طالب علمی (۱۹۲۰ء) اس کے ایڈیٹر ہوئے اور تب سے طالب علم ہی اس کے ایڈیٹر ہوتے ہیں۔ رشید صاحب سے لے کر موجودہ شمارے کے مرتب تک انتالیس ایڈیٹروں نے اس کو ایڈٹ کیا۔

(علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء)

انا

انسان بھی کتنا عقل سے عاری ہے — جب دیکھو انا کی گرم بازاری ہے
کشفی کوئی اس کی خود فریبی دیکھے — مجبور رہے اس پہ زعم مختاری ہے

علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو

پروفیسر سید احتشام حسین

انیسویں صدی کا ہندوستان اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے سترھویں اور اٹھارویں صدی کا زائیدہ تھا لیکن ہر زمانی تسلسل کی طرح نہ تو خالص ارتقائی، نہ خط مستقیم کی طرح سیدھا روایتوں کی سمت جانے، تہذیبی اثرات کے اختلاط، معاشی تغیرات اور سیاسی حالات نے ایسے پیچیدہ، مرکب اور متضاد عناصر پیدا کر دئے تھے کہ تصورات اور اقدار کے نئے نئے سلسلے بن گئے تھے جو زوال پذیر معاشی صدوں کے اندر اپنی بیداری رکھتے تھے۔ یہ ہل چل اور اضطراب بننے اور بگڑنے کی یہ جد و جہد و کشمکش نہ بے معنی تھی اور نہ اتفاقی بلکہ اس کے اندر مرنے اور پیدا ہونے کا کرب تھا کسی سانچے میں ڈھل جانے کی بے چینی تھی بگاڑنے کا غم اور خوف اور بنانے کا احساس اور ولولہ تھا اور یہ سب کچھ صدیوں کے کچلے ہوئے ارمانوں اور خوابوں، مشرق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس حرکت اور ذوق نمود کی ایک شکل وہ تحریک تھی جو "علی گڑھ تحریک" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ تحریک ہندوستان کے اس عام دور بیداری کا ایک جزو تھی جسے کبھی کبھی نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ گیری اور نئے شعوری اثرات اور مطالبات کے لحاظ سے یہ دور تغیر ہندوستان کی کسی اور تحریک سے مماثلت نہیں رکھتا تھا بلکہ، اگر کہہ سکیں تو "نشاۃ اولین" تھا جسے عام گفتگو میں دور جدید کہتے ہیں۔

اب ہم اگر علی گڑھ تحریک کی ایک بڑی تحریک کا "جزو" قرار دیتے ہیں تو منطقی زبان میں گفتگو کرنے کے لئے ہمیں "کل" کی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ تحریک کے ہر پہلو پر نگاہ جا سکے اور محرکات کے سرچشموں کا پتہ چل سکے۔ عمرانی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس دور بیداری اور تہذیبی تحریک کی بنیادوں کا مطالعہ ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ تعلیمی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی تاریخ کے تمام پہلوؤں کے مطالعے پر حاوی ہے اسی لیے اس کو اتنی اہمیت حاصل ہے اس مختصر سے مقالے میں علیگڑھ تحریک کی تاریخ، اس کی وسعت یا اس کے اثرات مابعد سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے وجود میں آنے اور عہد جدید کے دور اولین میں ایک انقلاب خیز اور عہد آفریں قوت بن جانے کا تجزیہ ہے۔ تجزیہ خیالوں کا بھی ہوتا ہے اور مادی حقائق کا بھی لیکن اولیت مادی حقائق ہی کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ

خیال کے دائرہ عمل کے لیئے زمان ومکان کے حدود لازمی ہیں، انہیں حدود کے اندر رہنے، میں چھو لینے یا ان سے باہر نکلنے میں خیال بنتا ہے۔ اس لیئے پہلے حقائق کی مادی بنیادوں کو سمجھنا چاہیئے تاکہ وہ تصورات بھی سمجھ میں آسکیں جو ان کا عکس ہیں۔ اس طرح جو خیالات وجود میں آتے ہیں وہ مادی حقائق کو بدلنے یا بہتر بنانے میں معاون ہوتے ہیں لیکن ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک مادی حقائق کا تعلق ہے انہیں گرفت میں لانا بھی بہت آسان نہیں ہے کیونکہ مسلسل حرکت ان کو بدلتی اور دوسرے حقائق سے ان کے رشتے میں تغیر پیدا کرتی رہتی ہے۔ کوئی شخص جو تغیر لانے والے تمام اہم عناصر پر نگاہ نہیں رکھتا اور ان عناصر کے منفی اور مثبت رشتوں کو سمجھنے میں ایک معروضی نقطۂ نظر اختیار نہیں کرتا وہ حقائق کی صحیح توجیہہ نہیں کر سکتا واقعات کے آگے بڑھنے میں رشتوں کی ترتیب بدلتی ہے۔ بعض عناصر کی نفی ہو جاتی ہے، بعض نئے عناصر داخل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح حقیقت اپنے مادی مفہوم میں نئی ہو جاتی ہے اور خیالوں کے لئے نیا مواد فراہم کرتی ہے

علیگڈھ تحریک کی حقیقت کو سمجھنے کے لیئے اس مختصر تمہید کی ضرورت تھی کیونکہ ہر تحریک ایک مسلسل تہذیبی عمل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں قدروں کی آزمائش ہوتی ہے اور نتائج کے لحاظ سے اس کی قدر وقیمت کا تعین ہوتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس نے نئے حالات کی طرف رہنمائی کی وہ تاریخی واقعات کی وہ ترتیب ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان میں رونما ہوئی اور جو خود گذری ہوئی صدیوں کا خمار اپنے وجود میں رکھتی تھی۔ مختصراً اس کی شکل یہ تھی کہ ہندوستان میں صدیوں سے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم تھی جو ایک مفہوم میں تو ضرور اسلامی حکومت کہی جا سکتی تھی لیکن درحقیقت وہ دنیا کی ہر اس حکومت سے ملتی جلتی تھی جس کا مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی ہے جس میں کسی نہ کسی شکل کی جاگیرداری، باجگذاری یا ایسا ہی نظام محاصل وجود میں آتا ہے۔

سولھویں صدی میں مغل حکومت کے قیام سے لے کر اٹھارویں صدی میں نادر شاہ کے حملے تک، یعنی دو صدیوں سے زیادہ تک ہندوستان بیرونی مداخلت سے محفوظ رہا۔ پھر اندرونی انتشار بھی شروع ہوا اور بیرونی حملے بھی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت کمزور ہو رہی ہے۔ اندر وہ قومی عناصر مختلف شکلوں میں ابھر رہے تھے جنہیں [illegible] رہنما مل رہے تھے یا مختلف طوائف سے جنہوں نے کسی علاقے میں اپنی معاشی تنظیم کر لی تھی۔ اگرچہ بعض مورخین نے اسے مسلمان حکومت کے خلاف ہندو قوم کی بیداری کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی یہ نوعیت نہیں تھی۔ انفرادی طور پر یہ خیالات کچھ لوگوں کے یہاں پائے جاتے رہے ہوں تو اور بات ہے ورنہ قومی سطح پر ان کی حیثیت فرقہ وارانہ یا مذہبی نہیں تھی۔ اندرونی کشمکش نے یہ شکل بعد میں اختیار کی۔ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جس نئی طاقت نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی وہ انگریز تھے جو امر بیل کی طرح ہندوستانی

زندگی پر چھائے جا رہے تھے۔ اہمیت کا مرکز ثقل اب مغل حکومت نہیں تھی۔ بنگال، نہ اودھ، نہ مرہٹے، نہ نظام، نہ ٹیپو، نہ سکھ اور نہ کوئی اور، اب سیاسی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی حقیقی طاقت رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کے اولین نصف حصے میں بڑی بڑی تاریخی تبدیلیاں نہیں ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ یہ ساری قوت انگریزی کمپنی کے ہاتھوں میں سمٹتی گئی۔ اس قوت کا سرچشمہ اگر صرف اندرونی لڑائیوں اور ان میں فتوحات کو قرار دیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی کیونکہ اس طرح کی لڑائیاں اور خانہ جنگیاں پہلے بھی ہوتی رہتی تھیں، لیکن ان سے ہندوستان کا معاشی نظام اس طرح نہیں بدلتا تھا کہ توازن قوت میں اس کی وجہ سے فرق آجائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ہندوستان کی معاشی اور اقتصادی زندگی میں بالکل نوعیت کا تھا۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ انگلستان کا اقتصادی نظام کیا تھا ہندوستان کے نقطۂ نظر سے جاگیردارانہ نظام ٹوٹ رہا تھا۔ دیہی معیشت جو صدیوں سے ہر انقلاب کے ریلے کو برداشت کرتی آئی تھی متغیر ہو رہی تھی۔ تھوڑی بہت دستکاری اور صناعی جو کسی بڑے صنعتی سانچے میں نہیں ڈھل سکتی تھی ختم ہو رہی تھی اور ہندستان کچے مال کی منڈی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی سرمایہ داری سے شروع کیا تھا اور دوسری بیرونی سرمایہ دار کمپنیوں سے مقابلہ کر کے ہندوستان میں برطانوی استحکام کی تکمیل کی تھی خود برطانیہ کا صنعتی انقلاب کس حد تک ہندستان

خود برطانیہ کا صنعتی انقلاب کس حد تک ہندوستان کی دولت اور خام پیداوار کا رہین منت تھا اور کس حد تک خود وہاں کی رفتار ارتقاء کا نتیجہ تھا یہ بھی برطانیہ کی سماجی تاریخ کا اہم مسئلہ تھا لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی صنعت کو ختم کر کے اس کی ترقی کی فطری رفتار کو بھی روک دیا۔ یہاں کے بادشاہوں نوابوں، امیروں اور حاکموں کا یہ حال تھا کہ وہ زوال کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہونے کی وجہ سے نہ صرف میدان جنگ میں شکست کھا رہے تھے بلکہ اقتصادی بساط پر بھی بازی ہارتے جاتے تھے۔ زر کشی کی یہ داستان بڑی طویل ہے، اس کی تاریخ کا بیان کرنا مقصد ہی نہیں ہے، صرف ان نتائج پر نظر ڈالنا ہے جو یہاں کے معاشی اور اسی کے اندر رہ کر تہذیبی ارتقاء پر اثر انداز ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد معاشی استحصال کے نقطۂ نظر سے دنیا کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے مکمل طور پر جاگیرداری اور زمینداری کے نظام کو ختم کر دیا ہوتا تو ہندوستان ترقی کی راہ میں کئی قدم آگے بڑھ گیا ہوتا لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر برقرار رکھا تاکہ اس کے ذریعے سے بھی استحصال ہوتا رہے۔ کاشتکاری جس سے ملک کا ایک بڑا حصہ وابستہ تھا، تباہ ہوئی

کیونکہ ایک طرف تو محاصل کا بوجھ غیر معمولی طور پر بڑھ گیا دوسری طرف اس کی وصولیابی میں فوجوں نے وہ مظالم اور بے اعتدالیاں کیں جن کی کوئی مثال نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ زمینوں کی زرخیزی ختم ہو گئی اور بہتر نظام حرفت اور کاشتکاری وجود میں نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا اور زمینداری اس لئے برقرار رکھی گئی کہ وفاداروں کا ایک گروہ ہر وقت مدد کے لیے موجود رہے۔

کاشتکاری کی اس ابتری کے ساتھ صنعتوں کی ابتری بھی ہوئی گویا ہندوستان اس حالت میں پہنچ گیا جہاں تباہی اور افلاس کی ساری صورتیں بھیانک شکل میں نمودار ہو گئیں۔ یہ معاشیات کے طالب علموں کے لیے ایک بحث طلب مسئلہ ہو سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصال سے پہلے ہندوستان میں جو صنعتی ترقی ہوئی تھی وہ مشینی دور کی صنعتی ترقی سے کس قدر مختلف تھی یا یہ کہ اگر ہندوستان کو اپنے ہی حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کیا اس میں صنعتی ترقی کی منزل اپنے فطری ارتقاء کے نتیجے کے طور پر آ جاتی، لیکن یہاں یہ بحث نہیں ہے، کہنا صرف اتنا ہی ہے کہ یہاں کی صنعت جس منزل میں بھی تھی تباہ ہو گئی اور اس کی جگہ بہت دنوں تک مشینی صنعت نے نہیں لی، نتیجہ وہی ہوا کہ ہندوستان کی ترقی برطانوی سرمایہ داری کی ترقی کے لیے روک دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کچھ بنیئے ساہوکار بن گئے اور معمولی طور پر سرمایہ داری یہاں بھی شروع ہوئی، یہ سرمایہ داری اپنی ابتدائی منزل میں برطانوی سرمایہ داری سے ٹکر لینے یا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کی نگاہ کرم کے سائے میں پنپ رہی تھی۔ یہ سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے انگریزوں کی ایجنٹ بن کر معمولی نفع پر خوش تھی اور انگریزوں ہی کے بل بوتے پر خود اپنے ابنائے وطن کو لوٹنے اور لٹوانے کا جرم کھلے بندوں کر رہی تھی۔

اس طرح لوٹنے کے ساتھ ساتھ انگریز ملازمین اپنی ذاتی تجارت بھی کرتے تھے یا ہندوستانی جاگیرداروں نوابوں اور راجاؤں کے ٹھیکہ دار بن جاتے تھے اور عوام اور جاگیرداروں کے درمیان واسطہ بن کر غیر معمولی لوٹ کھسوٹ کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کمپنی کے پچاس ساٹھ روپے کے ملازمین جب چند سال کے بعد انگلستان واپس جاتے تھے تو وہاں لاکھوں کی جائداد خریدتے اور نوابوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ انگریزوں کے یہ ایجنٹ اور انگریز ملازمین آبرو داروں کی بے عزتی کرتے، ان کے گھروں میں گھس جاتے اور مارنے پیٹنے کے علاوہ انہیں خوب ذلیل کرتے، اس سلسلے میں بلوے اور خونریزیاں بھی ہوتی تھیں لیکن دشواری یہ تھی کہ ہندوستانی عدالتیں انگریزوں کے خلاف مقدمہ کی سماعت کر ہی نہیں کر سکتی تھیں، یہی نہیں بلکہ دیسی عیسائی تک ہندوستانی عدالتوں کی زد میں نہیں آتے تھے۔ اس کے راجہ رام موہن رائے اور دوسرے لوگوں کے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

حکومت کی توسیع کے ساتھ یہ معاشی اقتدار

ہندوستان کے ہر طبقے کو کمزور اور تباہ حال بنا رہا تھا۔ خواص سے لے کر عوام تک سب مادی حیثیت سے پست اور پسپا ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں بھی اپنی چند مذہبی اور اخلاقی قدریں عزیز تھیں، جن کو وہ محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور گویا جن کے ذریعے زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن برطانوی اقتدار نے آہستہ آہستہ ان پر بھی ضرب لگائی۔ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ سولہویں صدی ہی سے شروع ہو چکی تھی اور عیسائی بنانے والے پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی مشن بڑے جارحانہ انداز میں کام کر رہے تھے، ملک کے گوشے گوشے میں چرچ قائم ہو رہے تھے اور یہاں کی مختلف زبانوں کے ذریعے مسیحیت کی برتری کا ڈنکا بجایا جا رہا تھا مختلف مشن اپنے اپنے اسکول اور تعلیمی ادارے بھی قائم کر رہے تھے اور افلاس کے مارے ہوئے ہندوستانی مختلف قسم کی مراعات کے لالچ میں دین مسیحی قبول کر رہے تھے

اس پر طرہ یہ ہوا کہ خود انگریزی حکومت نے اس مذہبی تبلیغ میں مدد دینا شروع کر دیا۔ انگریزی فوجی افسروں نے فوجوں کے اندر عیسائیت کی تبلیغ کی ابتدا کی اور کمپنی بہادر کے ملازمین مسیح کے سپاہی بن کر مذہبی جہاد میں مصروف ہو گئے۔ فوجوں میں عہدوں کی ترقی کا انحصار بہت کچھ مذہب کی تبدیلی پر رہ گیا اور یہ تحریص ایسی نہ تھی جس کا شکار بہت سے لوگ نہ ہو جاتے ہوں۔ مشن کے پادریوں کو عام اجازت تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً فوجی چھاؤنیوں اور بیرکوں میں جا کر دین مسیحی کی خوبیاں بیان کریں اور تبدیل مذہب پر دینی اور دنیوی فلاح کی بشارت دیں۔

یہ تو ایک مشہور حقیقت ہے کہ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ مشن اسکولوں کا جال بچھ رہا تھا لیکن انیسویں صدی کی ابتداء ہوئی تو انگریزی حکام انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں دو اہم بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں ایک تو یہ تھی کہ انگریزی تعلیم دی جائے یا نہ دی جائے۔ دوسری بحث تھی مذہبی تعلیم کے بارے میں۔ اب تک جو کالج مشرقی علوم کے لئے جاری تھے ان میں انگریزی کے درجے بڑھا دیئے گئے لیکن انگریزی تعلیم کو پوری طرح جاری کرنے کے متعلق بحث مباحثے جاری رہے۔ سرکاری اسکولوں میں براہ راست مذہبی تعلیم کے متعلق البتہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اجازت نہیں دی لیکن اس کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو اپنے برابر نہیں پہنچنے دینا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر زیادہ تر ہندوستانی عیسائی ہو گئے تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائیگا اور ہندوستان کا وہی حشر ہوگا جو امریکہ کا ہوا یعنی ہندوستان پر حاکمانہ قبضہ رکھنا مشکل ہو جائیگا۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کا یہ خوف ٹھیک تھا یا غلط، اس سے بحث نہیں لیکن ہوا یہ کہ براہ راست مذہبی تعلیم دینے کے بجائے انگریزی ماہرین تعلیم نے انگریزی علم و ادب کے ذریعے اس کمی کو پورا کرنا چاہا۔ اس کی تفصیلات سیکڑوں کتابوں میں مل جائیں گی لیکن اس سلسلہ کا انقلاب انگیز اقدام وہ تھا جس کی تکمیل لارڈ میکالے کے ہاتھوں ہوئی۔ انگریزی زبان میں تعلیم

دیئے جانے کے متعلق مکالے نے اپنی مشہور رپورٹ میں لکھا کہ "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروروں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" یہ الفاظ غیر مبہم ہیں لیکن مکالے کے دل میں جو کچھ تھا وہ رپورٹ میں نہیں بلکہ اس خط میں تھا جو اس نے اپنے باپ کو لکھا تھا اور جس میں یہ الفاظ ملتے ہیں "اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی والا ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہو تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔"

اس کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے مختلف شکلوں میں اس کے خلاف احتجاج کیا کیونکہ آہستہ آہستہ یہ طے ہو گیا کہ سرکاری ملازمتوں میں انگریزی جاننے والوں کو ترجیح دی جائے گی، قدیم مشرقی علوم بالکل بے معنی اور بے سود ہوتے جا رہے تھے اور ان کی طرف سے بے اعتنائی بڑھ رہی تھی، دوسری طرف نئے علوم اور انگریزی تعلیم مذہب اور اخلاق کے لیئے خطرہ بنتے جا رہے تھے مختصر یہ ہے کہ نئی تعلیم نے مادی اور روحانی زندگی

شدید کشمکش پیدا کر دی تھی۔ سارے مادی وسائل چھین لینے کے بعد ہندوستانیوں سے ان کا مذہب بھی چھینا جا رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً ایسے احکام بھی فوجوں میں نافذ ہوتے تھے کہ فوج کے سپاہی ماتھے پر کوئی نشان نہ لگائیں۔ داڑھیاں منڈوائیں اور کان میں کچھ نہ پہنیں۔ اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی بغاوتیں بھی ہوئیں۔ اس تعلیم سے بہت سے انگریز حکام اور ماہرین تعلیم کی یہ اُمیدیں وابستہ تھیں کہ اس سے تمام ہندوستانیوں میں مسیحی اخلاق اور برطانیہ سے وفاداری کا جذبہ پیدا ہو گا۔ ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ جو معاشی اور اقتصادی نظام وجود میں آ رہا تھا اس میں یہ جذبات دیرپا نہیں ہو سکتے۔

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق کر کے معاملات کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ بہت دنوں تک مسلمانوں نے جدید نظام تعلیم سے فائدہ نہیں اُٹھایا کیونکہ ان کے خیال میں وہ ان کی روایات اور ضروریات کے خلاف تھا انگریزی حکومت میں تعلیم حاصل کرنے اور ملازمتیں اختیار کرنے کا مسئلہ علماء کے یہاں زیر بحث تھا اور جب تک اجتماعی طور پر کوئی نقطۂ نظر دلوں میں گھر کرے، مسلمان تعلیم میں پیچھے ہوتے گئے۔ ان کو جو مذہبی تعلیم ملتی تھی، وہ بھی اوقاف کے ضبط ہو جانے کی وجہ سے کم ہوتی گئی۔ یہی نہیں تھا بلکہ جو مسلمان انگریزی پڑھ بھی لیتے تھے بعض اوقات انہیں صرف اس بناء پر نوکریاں نہیں دی جاتی تھیں

کہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ صورت حال پہلے بھی تھی لیکن غدر کے بعد اس نے ایسی شدت اختیار کرلی کہ ان کی زندگی دشوار ہوگئی اور بقول ڈاکٹر ہنٹر اڑلیسہ کے مسلمانوں نے اس قسم کی عرضداشت پیش کی۔

"بہ حیثیت وفادار رعایا حضور ملکہ معظمہ ہمیں سرکاری ملازمتیں پانے کا یکساں حق ہے۔ اصل یہ ہے کہ اڑلیسہ کے مسلمان اس قدر پیس دیے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ نسل کے اعتبار سے شریف، پیشہ کے اعتبار سے غریب، سرکاری سرپرستی سے محروم۔ ہماری حالت ان مچھلیوں کے مانند ہے جو پانی سے نکال کر پھینک دی گئی ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بدترین حالت ہے جو حضور کے سامنے اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ حضور ملکہ معظمہ کے قائم مقام ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بلا لحاظ رنگ و ملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے گا۔ سرکاری ملازمتوں سے خارج ہونے کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر بیس[2] روپے ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے دور دراز مقامات تک سفر کرنے، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبیریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بھی خوشی سے تیار ہیں۔" یہی حال کم و بیش اور علاقوں کا تھا۔ امیروں اور غریبوں کی حالت تو خراب تھی ہی وہ متوسط طبقہ بھی مصیبت کا شکار ہو گیا جو نئے حالات میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی کیا حالت تھی اور انگریزی اقتدار نے اس میں کیا پیچیدگیاں پیدا کی تھیں، اس کا اندازہ مندرجہ بالا صفحات کے مطالعے سے ہوا ہوگا لیکن یہ تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے پہلوؤں میں بھی رنگ نہ بھرا جائے۔

انگریزی حکومت کی برکتوں میں جو چیزیں گنی جاتی ہیں وہ سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظر انداز کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ انگریزی عہد ہی میں ہندوستان ریل، تاربرقی، بجلی اور پریس سے آشنا ہوا۔ ہندوستان ریاضی، ہیئت، نجوم، ہندسہ، فن تعمیر وغیرہ میں صدیوں سے ترقی کی غیر معمولی منزلیں طے کر چکا تھا، ذرائع نقل و حمل میں، ڈاک اور خبر رسانی میں اپنے طور پر دنیا کے بہت سے ممالک سے آگے تھا۔ لیکن مشینی ایجادات اور ان سے فوائد حاصل کرنے کے لیے اُسے دوسروں کا دست نگر ہونا پڑا۔ جہاں تک پریس کا تعلق ہے اگرچہ ہندوستان میں پرتگالیوں نے اس کا استعمال سولھویں صدی ہی میں شروع کر دیا تھا لیکن عام ہندوستانی اس سے بالکل بے خبر تھے۔ برطانوی اثر کے ماتحت کلکتہ اور بمبئی میں متعدد پریس اٹھارویں صدی میں قائم ہو گئے لیکن کلیسائی اور سرکاری ضروریات کے باہر پریس کا اصل استعمال انیسویں صدی کے ابتداء میں شروع ہوا اور بعد کی ہندوستانی زندگی پر اس کے اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بجلی، ریل اور تاربرقی، جس نے مرزا غالب تک کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں، ہندوستان کے لیے عہد آفریں وسائل ترقی کہے جا سکتے ہیں۔ انگریزوں نے ان چیزوں کو اپنی ضروریات کے پیش نظر ہندوستان میں استعمال

کرنا چاہا تھا لیکن ان سے جو فوائد مرتب ہوئے وہ عام تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر اور بہت سے دوسرے انگریز حکام جس طرح انگریزی تعلیم کے اجراء سے مخالف تھے کہ ان سے ہندوستانیوں کا ذہن یورپ کے جذبہ قومیت اور احساس آزادی سے واقف ہو کر انھیں خود بیرونی حاکموں کے خلاف استعمال کریگا اسی طرح وہ پریس کے عام ہونے سے بھی خوف زدہ تھے کہ کہیں اس کے ذریعے سے کسی وقت انگریز دشمنی اور وطن پرستی کے جذبات کی اشاعت بڑے پیمانے پر نہ ہونے لگے۔ یہی حالات اور واقعات کے وہ پہلو ہیں جو ناگزیر طور پر اپنی ضد بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

خیر تو ریل، تار اور پریس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ یہ چیزیں باہر سے لائی گئی تھیں اور ان کے پیچھے وہ سائنٹیفک شعور نہیں تھا جو ان کی ماہیت اور نوعیت کو سمجھتا ہے اس لئے عام طور سے ہندوستانیوں کے ذہن میں ان کی جگہ پوری طرح نہ بن سکی۔ سائنس کی تعلیم معمولی طور پر ہو رہی تھی اور کچھ کتابوں کے ترجمے بھی انیسویں صدی کے وسط تک ہو چکے تھے لیکن پھر بھی سائنس ابھی عام شعور کا جز نہیں بنی تھی اور ان ترقی یافتہ وسائل سے عام، ہندوستانی کو فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل نہ تھا۔ جس چیز نے فوری طور پر اس شعور کے بننے میں مدد دی وہ پریس تھا کیونکہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات کافی تعداد میں نکلنے لگے تھے اور سیاسی بیداری میں مدد کر رہے تھے۔

جو لوگ سماجی علوم سے واقف ہیں وہ اسے جانتے ہیں کہ مخصوص قسم کے معاشی نظام میں مخصوص قسم کا شعور وجود میں آتا ہے، مخصوص قسم کے سماجی، فلسفیانہ، ادبی اور تعلیمی ادارے وجود میں آتے ہیں اور جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ گہرے معاشی اور تاریخی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جن تاریخی اور معاشی حالات کا تذکرہ ہوا وہ کسی خلاء میں نہیں ہوئے اس لیے انھوں نے مروجہ اور روایتی مذہبی اور فلسفیانہ اقدار کے لیے چیلنج کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے تجزیہ کی سب سے زیادہ واضح اور موثر صورت تو یہ ہوگی کہ پہلے مذہبی، فلسفیانہ اور سماجی علوم اور موقف کا خاکہ پیش کیا جائے پھر تاریخی عمل نے جو تغیرات پیدا کیئے ہیں ان پر نگاہ ڈالی جائے اور اسباب وعلل کا رشتہ تلاش کرنے کے ساتھ ان کی تعبیر اور توضیح بھی کی جائے لیکن یہ طریق کار تفصیل کا مطالعہ کرتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن چند اشارے ضروری ہیں۔

مختصراً اس دور کی مذہبی صورت حال پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اٹھارویں اور ابتدائی انیسویں صدی تک ہندو مذہب میں بھگتی تحریک کے بعد کوئی قابل ذکر تغیر نہیں ہوا تھا۔ بھگتی تحریک کئی قسم کے تصورات کا مجموعہ تھی، وہ برہمنی نظام کے خلاف ایک عوامی ردعمل کی حیثیت بھی رکھتی تھی اور بدھ مت اور اسلام کی متعدد خصوصیات کو جذب کر کے ہندو مت کو ان دونوں نظاموں میں جذب ہونے سے بچانے کا آلۂ کار بھی تھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس کی نوعیت

ایک سماجی احتجاج کی تھی جس کا مقصد ایک خاص طرح کی روحانی مساوات قائم کر کے اعلیٰ اور ادنیٰ کے فرق کو مٹانا تھا۔ بھگتی تحریک کی بنیادیں تو ویدانتک فلسفہ پر تھیں لیکن اس کے اظہار میں اسلامی تصوف اور افکار کے واضح اثرات شامل تھے۔ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندو مسلم اختلافات نے سیاسی اہمیت کبھی اختیار نہیں کی اس لیے ہندو ذہن اور فکر کو مسلمانوں کے آنے اور ہندوستان میں پھیل جانے کے وقت تصادم کی جو شکل نظر آئی تھی اب اس سے اندیشہ نہ تھا لیکن (اٹھارویں صدی) کی بات اور تھی مغربی اثرات کا ردِ عمل کہیں تو شدید مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوا کہیں اسے مکمل طور پر تسلیم کر لینے کی صورت میں ان کے علاوہ ایک متوازن شکل بھی تھی جو ہندو مذہب کی لچک کو برقرار رکھتے ہوئے رونما ہوئی مذہب کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے، شعور کی مختلف منزلوں، شعور کی مختلف منزلوں پر جو سوالات شکوک کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب مذہبی نقطہ نظر سے دینے کی کوشش ہر عہد میں ہوتی رہی ہے اس لیے نئے حالات میں ہندو مذہب بھی اصلاح کے دور سے گذرا اور چونکہ اس وقت مسیحی تصورات و اخلاق کا زور تھا اس لیے راجہ رام موہن رائے (ربندرناتھ ٹیگور) اور کیشب چندر سین کی اصلاحی تحریک میں اس کے نقوش نظر آتے ہیں خود ہندوؤں کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ سرکاری تعلیمی کمیٹی نے اپنی رپورٹ ۱۸۳۱ء میں یہ خیالات پیش کیے ہیں۔ اور جن کا خلاصہ سید محمود نے اپنی تاریخ

تعلیم میں لکھا ہے۔ "زبانِ انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے اور اچھے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے بے چینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا علانیہ اظہار کیا جا رہا ہے اور غالباً دوسری نسل میں کلکتے کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات میں بڑی مادی تبدیلی ہو جائیگی"۔ یوں مذہبی اصلاح کے لیے زمین تیار تھی اور عام سماجی حالات اس تبدیلی کے معاون تھے۔ نئے شعور کی بنا پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان میں رہنمائی کی باگ پیشہ ور مذہبی پیشواؤں کے بجائے دانشوروں کے ہاتھ میں پہونچ رہی تھی یہ بات ابھی جب ہم مسلمانوں کے یہاں مذہبی اصلاح کا ذکر کریں گے تو اور زیادہ واضح ہو گی کیونکہ طبقاتی مفاد کی شکل بدل رہی تھی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ وقتاً فوقتاً مذہبی اصلاح کی تحریکیں جنم لیتی رہتی تھیں ان تحریکوں کو کبھی کبھی تجدید یا احیائے دین کہا گیا ہے۔ مغلوں کے عہدِ زوال میں اس کا سب سے اہم مظہر ولی اللہی تحریک تھی جس نے کئی دلچسپ کام کیے۔ ایک طرف شاہ ولی اللہ نے یہ پتہ لگایا کہ اسلام میں غیر اسلامی عناصر، مختلف راستوں سے ہو کر کس طرح داخل ہو گئے ہیں (اس ضمن میں) نے اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا) دوسری طرف اجتہاد مختلف مسلکوں کی تقلید محض کے خلاف ایک اہم اعلانِ جنگ تھا تیسری طرف نے اسلامی عقائد کی بنیاد پر ایک مکمل نظامِ معاشرت اور

معیشت مرتب کرنے کی کوشش کی۔ انہیں چند اہم اور
بنیادی تصورات سے اور خیالات بھی پیدا ہوئے جو
ہندوستانی مسلمانوں کی عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں
یہی نہیں بلکہ محض محققین شاہ ولی اللہ کو جدید علم الکلام
کا بانی سمجھتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے رود کوثر میں حجۃ اللہ
البالغہ کے دیباچے سے یہ فقرہ نقل کیا ہے "مصطفوی
شریعت کے لیے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے
پیراہنوں میں ملبوس کرکے اسے میدان میں لایا جائے"
اور انہیں تقلید کا مخالف قرار دے کر ہندوستان کے علماء
میں سب سے اونچی جگہ دی ہے۔ یہ اٹھارویں صدی کا
ذکر ہے جب مشرق و مغرب کی کشمکش اچھی طرح ظاہر
نہیں ہوئی تھی لیکن مسلمانوں کی مادی اور روحانی
زندگی زوال کی انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ اسلام کو پھر
طاقتور بنانے کی یہ کوشش کوئی اہم مادی بنیاد نہیں
رکھتی تھی پھر بھی جو متخالف اور متصادم عناصر کھلے
یا چھپے طور پر ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے ان کی
وجہ سے مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے اس جذبے کو
دائرہ عمل ہاتھ آگیا۔ اگر ہندوستان کی سیاسی
حالت تغیر کی رو سے نہ گذر رہی ہوتی تو اس اہم اصلاحی
اقدام کی حیثیت بھی متکلمین کی رد و قدح سے زیادہ
نہ ہوتی مگر ہوا یہ کہ شاہ ولی اللہ کے انتقال کے پچاس
سال کے اندر ہی وہ تحریک شروع ہوگئی جسے عام طور پر
وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کا ایک پہلو تو
محض سنتِ رسول کا اتباع تھا لیکن دوسرا پہلو جو
جارحانہ شکل اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا یہ تھا کہ
اس کے لیے مناسب فضا پیدا کی جائے اور اگر اس کی راہ
میں رکاوٹیں پیدا ہوں تو انھیں دور کرنے کے لیے
جہاد کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام سید
احمد شہید اور سید اسمٰعیل شہید کے ہیں جنہوں نے
سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔

اس تحریک کا ایک رُخ انگریزوں سے بیزاری کی
طرف بھی تھا۔ اور ہندوستان کے دارالحرب یا دارالاسلام
ہونے کی فقہی بحث سے اس کا گہرا تعلق تھا اس کے
ساتھ ساتھ بنگال کی اس فرائضی تحریک کو بھی پیش
نظر رکھنا چاہیئے جو مذہبی اصلاح کے بھیس میں ایک
عوامی زرعی تحریک تھی جس کا مقصد مساوات، غریبوں
سے ہمدردی اور زمینداروں کی مخالفت تھا۔ یہاں
ان کی تفصیلات میں جانے کے بجائے محض یہ یاد دلانا
ہے کہ مسلمانوں کے اندر عام بے چینی اور بددلی پھیلی
ہوئی تھی اور اس اہم انقلابی جدوجہد کے لیے فضا
تیار ہو رہی تھی جو ۱۸۵۷ء میں رونما ہوئی۔

اس وقت جو مذہبی اور فلسفیانہ تصورات
وجود میں آئے تھے وہ مشرق و مغرب کے تصادم کا
نتیجہ نہیں کہے جا سکتے نظریاتی سطح پر یہ کشمکش
شروع ہو چکی تھی لیکن اس کا مقابلہ کرنے میں ان
علوم سے کام نہیں لیا گیا تھا جو جدید سائنس اور
جدید استدلالی فلسفے کے ساتھ آئے تھے۔ سائنس
سے انفرادی طور پر دلچسپی کا پتہ دہلی کالج میں تعلیم
پانے والوں کے یہاں، اودھ کے شاہ غازی الدین
حیدر اور شاہ نصیر الدین حیدر کے یہاں یا حیدرآباد کے

شمس الامراء امیر کبیر کے یہاں ملتا ہے، یا پھر اس سے بھی قبل اکبری عہد میں یا اورنگ زیب کے دور حکومت میں دانشمند خاں کے یہاں چلتا ہے جس کے متعلق برنیر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ دانشمند خاں کو ڈیکارٹ اور گسینڈی کے فلسفے اور ہاروی کے نظریۂ دورانِ خون سے دلچسپی تھی اور اس نے بعض مقالات کا ترجمہ کرایا۔ یہ انفرادی دلچسپیاں تھیں لیکن انیسویں صدی کے وسط تک مغربی فلسفہ اور سائنس کے اثرات کافی پھیل چکے تھے سائنس اور مذہب کی کشمکش شروع ہو چکی تھی، عقلیت اور واقعیت کی طرف میلان بڑھ رہا تھا اور جس طرح نشاۃ الثانیہ کے بعد سے یورپ کے لیے یہ کشمکش تھی کہ یا تو مذہب سائنس سے مطابقت پیدا کرے یا پھر دو میں سے ایک کو برتر تسلیم کیا جائے، یہی صورتِ حال ہندوستان کے اس دورِ بیداری میں نظر آتی ہے۔ اسے چاہے جس پہلو سے دیکھا جائے یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جو تحریکات چل رہی ہیں وہ اسی طرح چلتی رہیں گی یا انھیں نئے علوم اور نئے شعور کی روشنی میں کسی نئے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ غدر کے بعد اس کے لیے فضا بہت سازگار ہو گئی کیونکہ غدر نے مادی حیثیت سے مغرب کی برتری کا فیصلہ کر دیا اور نظامِ حیات کے وہ نقوش واضح کر دیئے جو تقریباً سو سال سے ہندوستان کے افق زندگی پر ابھر رہے تھے۔ غدر نے ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے اندر چھپی ہوئی عیش پسندی، کاہلی، انحطاطی کیفیت، نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے بچتے رہنے کی خواہش کو بہت

نمایاں کر دیا اور ان کے لیے فیصلہ کن گھڑی آ گئی۔ انھوں نے جو کچھ کھویا تھا اس کے فوراً واپس ملنے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن اس سے ترکِ موالات اور علیحدگی بھی ممکن نہ تھی۔ اس کو قبول کرنے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے، دونوں صورتوں کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔ انسانی شعور ایسے مواقع پر کوئی نہ کوئی پہلو ایسا پیدا کر لیتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ بنا سکے۔ چنانچہ مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو تغیرات کی بنیادوں کو سمجھنا پڑا، جہاں مقابلہ ہو سکتا تھا وہاں مقابلہ کیا گیا جہاں سمجھوتے سے کام چل سکتا تھا وہاں سمجھوتہ ہوا اور جہاں شکست کے بغیر چارہ نہ تھا وہاں ہار قبول کی گئی۔ یہاں یہ بتا دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں سے بہت کچھ ٹوٹ چکا تھا اور انھیں جو کچھ بھی رہنمائی مل سکتی تھی وہ مغرب سے آئی ہوئی انگریزی سیاست اور انگریزی خیالات کے ذریعے ہی سے مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ تمام اسلامی ممالک آہستہ آہستہ یورپ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو رہے تھے اور جیسے ہی ہر سو بزیر برطانوی اقتدار قائم ہوا برطانیہ کا اثر سارے مشرق قریب و بعید میں پھیل گیا اور ہندوستان پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ یہ ایک طویل کہانی ہے، صرف یہ بات واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ہی ذرائع سے اپنا مستقبل سوچ سکتے تھے اور جو طاقت انھیں اپنے پنجے میں دبائے ہوئے تھی اس کے حوصلے اور ذرائع بہت وسیع تھے۔

انگریزوں نے ابتدا معاشی اور سیاسی اقتدار سے کی تھی اور اب آثار اس کے تھے کہ ہندوستان مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے بھی بالکل غلام ہو جائیگا، اس منزل پر علیگڈھ تحریک نے ایک معین شکل اختیار کی جو درحقیقت اسی دور بیداری کا جزو تھی جس کی ابتدا ہو چکی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تحریک کن حیثیتوں سے بنیادی طور پر ایک ایسی تحریک تھی جس نے ہندوستان خاص کر مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی زندگی کو متاثر کیا۔ تغیرات کا جو پس منظر اوپر دیا گیا اس سے اندازہ ہوگا کہ مقررہ اقتصادی نظام ایک متحرک نظام میں بدلا تھا۔ دولت اب محض جاگیر یا زمین یا ساز و سامان آرائش کا نام نہیں تھا بلکہ نئے طبقات کے ہاتھوں میں پہنچکر یہ نئی شکل اختیار کر رہی تھی اور نئے مسائل اس سے پیدا ہو رہے تھے ریاست اب ایک منظم وحدت اور مضبوط ادارہ تھی جس کی تنظیم اور اصلاح شعوری طور پر حاکم طبقہ اور اس کے حلیفوں کے مفاد کے لئے ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑا تغیر یہ تھا کہ اس وقت تک رہنمائی جاگیردارانہ یا مذہبی عناصر کے ہاتھ میں تھی، اب وہ نکل کر نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ایک طرف تو اپنے مفاد کا تحفظ چاہتا تھا دوسری طرف، حاکم طبقہ سے تعلقات قائم کر کے اپنی حیثیت کو بہتر اور مضبوط بنانے کی فکر میں تھا۔ حاکم طبقہ کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے یہ تعلقات باہمی مفاد کی بنیاد پر آسانی سے قائم ہو سکتے ہیں چنانچہ زندگی کی نئی تشکیل میں تاثیر اور تاثر کے مرکز بدل گئے اگرچہ اس کا رشتہ ماضی اور اس کی روایات سے نہیں ٹوٹا علیگڈھ تحریک کی یہ خصوصیت کہ اس میں ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے کی اویزش اور کشمکش شامل تھی۔ اسے بہت پیچیدہ بناتی ہے۔ اس میں جو بعض تضاد پہلو نظر آتے ہیں وہ بھی اس بات کا نتیجہ ہیں کہ نفع اور نقصان کی حدیں واضح نہیں تھیں۔ فوری مفاد اور دیرپا اخلاقی اقدار میں جنگ تھی اور وفاداریاں بٹ گئی تھیں۔ اس لئے علیگڈھ تحریک کا کوئی مطالعہ کسی بنے بنائے تصور کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا یہاں تک کہ خود سرسید کے سیاسی اور مذہبی اور معاشرتی تصورات میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں آسانی سے ان کی تاویل اور توجیہہ بھی نہیں کی جا سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ علیگڈھ تحریک کے رہنما سرسید تھے اور اس کا نام علیگڈھ کے اس محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی وجہ سے علیگڈھ تحریک پڑا جو سرسید نے ۱۸۷۵ء میں قائم کیا تھا (سرسید اس سے پہلے بھی مدرسے قائم کر چکے تھے اور سوسائٹیوں کی بنیادیں رکھ چکے تھے کیونکہ وہ بدلی ہوئی فضا کا اندازہ لگا رہے تھے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے ساتھ بہت سے مخلص، علم پرور انتھک اور پرجوش کام کرنے والے تھے جو ہواؤں کا رخ پہچانتے تھے اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے اور علیگڈھ کالج محض ایک علامت تھا اس نئی زندگی میں ہونے کا، جو اپنا در کھولے ہوئے آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس دروازے کے اندر مختلف قسم کے کامداں داخل ہو رہے تھے، کچھ یونہی آنکھ بند کیئے ہوئے، کچھ گرد و پیش کا اندازہ لگاتے ہوئے، سرسید جس کارواں کو لیئے ہوئے بڑھ رہے تھے اس میں مختلف قسم کے لوگ تھے لیکن سبہم

طور پر سبھوں کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وقت نے راہ میں جو رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں انھیں عبور کرکے اپنی مادی اور روحانی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ یہی جستجو اور آگے بڑھنے کی یہی کوشش ہے جسے علیگڑھ تحریک کہا جاتا ہے۔ اس میں ترقی کے سنگ میل بھی ہیں اور پسپائی کے نشانات بھی، مصلحت آمیز مفاہمتیں بھی ہیں اور ناروا سمجھوتے بھی اور سرسید کی ہمہ گیر اور عظیم الشان شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ تحریک کے سارے نشیب و فراز ان کے افکار و اعمال میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس لیے سرسید ہی کے آئینے میں اس کے خط و خال کو دیکھنا مفید ہو سکتا ہے۔

سرسید کی زندگی کے ابتدائی چالیس سال بڑی بڑی علمی فتوحات سے خالی ہیں گو ان میں علمی کاموں کی کمی نہیں ہے آثار الصنادید کی تصنیف، آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح خود اپنی جگہ پر اہم کارنامے ہیں لیکن وہ سرسید جو علیگڑھ تحریک کے روح رواں بنے؛ رسالہ اسباب بغاوت ہند، تبیین الکلام، مضامین تہذیب الاخلاق، مجموعہ لکچر خطبات احمدیہ اور تفسیر قرآن کے سرسید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا ابتدائی علمی اور تحقیقی ذوق ہی ان کی بعد کی تصانیف میں کام آیا، سید احمد شہید اور سید اسمعیل شہید کے مذہبی تصورات سے وابستگی ہی نے ان کے ذوق اجتہاد کو پروان چڑھایا اور اشاعت تعلیم اور خدمت خلق کے شوق ہی نے ان سے علیگڑھ کالج قائم کرایا پھر بھی غدر کے عام اثرات کو نظر انداز کرکے سرسید کے ارتقائے ذہن کو سمجھنا مشکل ہے۔

سرسید نے مغل حکومت کا چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، مسلمانوں کی بدحالی اور زوال کا نظارہ کیا تھا۔ زمانے کی بدنظمی اور بدامنی کا مشاہدہ کیا تھا، غدر نے جس طرح رہی سہی آن بھی ختم کردی تھی، اس نے ان کے قلب کو بے حد متاثر کیا اور ان میں جو عملی صلاحیتیں سو رہی تھیں وہ جاگ اٹھیں۔ وہ اس وقت کے مسلمان رہنماؤں میں سب سے زیادہ جری، باعمل، جلد فیصلہ کرنے والے، ذکی الفہم پرجوش، حوصلہ مند، دوربین اور عقل پرست تھے، انہوں نے جب یہ دیکھا کہ غدر نے انگریزی حکومت کو مستحکم کردیا اور اب مسلمانوں کے لیے مستقبل تاریک ہے تو پہلی دفعہ انگریزی سرکار کے ملازم ہونے کے باوجود، غدر کے نازک سیاسی پہلوؤں پر اپنا رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا اس کی ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں داخل ہونے کی پہلی کوشش تھی اور بھرپور تھی۔ انھوں نے دردمندی اور جرأت کے ساتھ انگریزی حکومت کی بعض چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا۔ اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے کبھی ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں کیا اس لیے وہ ان برکتوں کو نہ تو اچھی طرح محسوس کرسکے اور نہ ان سے فائدہ اٹھا سکے جو انگریزی حکومت اپنے ساتھ لائی تھی اس کے بعد سے ہندوستانی سیاست میں سرسید کی جگہ بن گئی اور انھوں نے اپنی ساری قوت اس بات پر صرف کردی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی ہو جائے سیاسی مفاہمت کی تکمیل مذہبی مفاہمت کے بغیر ممکن نہ تھی اس لیے انھوں نے وہ تمام ذرائع اختیار کیے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے مذہبی تصورات، نظام، اخلاق، اہل کتاب ہونے کی وجہ سے آپس کی معاشرت میں یکسانی اور اشتراک

پیدا ہو۔ لیکن اس کوشش کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے بلکہ وہ جب اپنے سیاسی تصورات کی توضیح کرتے تھے تو دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیتے تھے اس زمانہ میں انھوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کی مساوات پر بڑا زور دیا تھا۔ بار بار یہ کہا کہ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں ہندوستانیوں کو بھی ملنے چاہییں۔ کونسلوں اور لوکل بورڈوں کے لیے انتخاب کے اصول کی تائید کی اور ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کریں جو انھیں حکومت کے قابل بنائے لیکن جیسا کہ ذرا سے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتا ہے یہ ساری سیاست متوسط طبقے کے رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے اور متوسط طبقہ اگر اپنے مفاد کے لیے متحد اور متفق ہو سکتا ہے تو اپنے جماعتی یا فرقہ وارانہ مفاد کے لیے آواز بلند کرتے تھے تو دوسری طرف محض مسلمانوں کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انگریزی سیاست اس جذبے کو مسلسل ہوا بھی دے رہی تھی صرف دو اقتباس اسے واضح کریں گے۔ اے۔ سی۔ مزمدار نے اپنی کتاب INDIAN NATONAL - EVOLUTION میں لکھا ہے کہ اوّل اوّل انگریزی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا" جیمس اوکنیلی نے کلکتہ ریویو میں لکھا کہ "ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے، سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا اُنھیں ایسی رعایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے حتیٰ کہ ان کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لئے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جا رہا ہے"۔ اس پالیسی کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اس لیے کبھی "ہندی، ہندو، ہندوستان" کا نعرہ لگایا جاتا تھا۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ لیکن سرسید کی ابتدائی سیاسی زندگی میں اس تنگ نظری کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر وہ مسلمانوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے تو اس لیے کہ انگریز مسلمانوں کو غدر کا بانی سمجھ کر زیادہ بیزار رہتے تھے تاہم اس وقت کا ہندوستان اپنے غیر متوازن اور ناہموار قومی ارتقاء کی وجہ سے مذہبی اختلاف کے جراثیم کی پرورش کر رہا تھا چنانچہ مولانا حالی سرسیّد کے یہاں جب اس بات کا پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کیسے پیدا ہوئی تو یہ واقعہ ان کے سامنے آتا ہے۔

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسیّد کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے"۔ اس سے پہلے تم

ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اس طرح سرسید کے ذہن میں مسلمانوں کی تعلیم ان کے فائدہ حقوق وغیرہ کے خیالات نے جڑ پکڑنا شروع کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ایسی صورتیں پیدا ہوتی گئیں کہ سرسید کا مطمح نظر بدلتا گیا۔

۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد واپس ہوئے۔ اس سفر نے ان کے ذہن میں بہت سے مسائل واضح کر دیئے اور انہیں اپنا نصب العین روشن نظر آنے لگا۔ یوں تو انھیں نے غدر کے بعد ہی سے انگریزی معاشرت اختیار کر لی تھی جس سے مذہب پرست مسلمان ان سے بدظن ہو گئے تھے لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد انھوں نے جب اس کی تبلیغ شروع کی تو پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ معاشرت میں ظاہری تبدیلیاں سرسید کی تعلیمی تحریک کا جزو تھیں لیکن ان کا اصل کام ذہنوں کو بدلنا تھا جو ان کے جذبہ اجتہاد اور تجدد کا نتیجہ تھا، اسی کے لیئے انھوں نے انگلستان سے واپس آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد تہذیب الاخلاق نکالا جو ان کے حوصلوں اور خیالوں کا آئینہ ہے۔ سرسید نے اسلام کے اصل اصولوں سے کس حد تک انحراف کیا کس حد تک معتزلہ انداز نظر اختیار کیا اور کتنا جدید سائنس اور مغربی علوم سے مستعار لے کر اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ کہاں تک یہ سب کچھ تاویل اور نئی تشریح کی حیثیت رکھتا تھا اور کہاں تک مغربی عقلیت کی برتری تسلیم کرنے کے مترادف تھا، ان تمام باتوں پر وہ شخص تفصیل سے بحث کریگا جو ان کے علم کلام کا مقابلہ اسلامی علم کلام سے کریگا۔ لیکن ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ بات آسانی سے سمجھ لے گا کہ وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ذرائع جدید تعلیم، انگریزوں سے وفاداری، معاشرت کی تبدیلی، مذہب اور عقل کی مطابقت، تقلید سے نجات اور اصلاح رسوم ہیں۔ ان کے ہر اقدام میں انہیں ذرائع سے کام لینے کی کوشش نظر آئے گی۔

تہذیب الاخلاق میں سرسید کے مضامین پڑھتے جائیے آپ کو بار بار یہ خیالات واضح یا ڈھکے چھپے الفاظ میں دکھائی دیں گے۔ علم سے مراد صرف علوم دینیہ نہیں ہیں، محض روزہ نماز وغیرہ عبادت نہیں لیکن اگر علوم دنیوی اس لیئے پڑھے جائیں کہ ان سے مذہبی علوم کے سمجھنے میں مدد ملے گی تو ان کا پڑھنا بھی عبادت ہو جاتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امور معاش و تمدن حسن معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر ہوتے جاتے ہیں اور واعظ مولوی صاحب و پیرجی، خدا اور رسول کے دشمن ان کو روز بروز تباہ و برباد کرتے جاتے ہیں، مذہب اسلام کے دوستدار کا کام یہ ہے کہ اپنے تئیں پیرجی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے اور دغابازی سے دنیا

کا نے کے لئے انھیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے بیٹھا ہوا واعظ کہا کرے یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اس کی جگہ اور کوشش کرے۔ مسلمان عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے عقائد خراب ہوتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ فکر ہے کہ انگریزی پڑھنا تو روز بروز ضروری ہوتا جا رہا ہے، مذہب کو کیا کریں اور کیسے بچائیں، ہم (سرسید) اس خیال پر ہنستے ہیں اگر اسلام ایسا ہی بودا مذہب ہے تو اس کا چھوڑ دینا اچھا، ہمیں جدید علوم سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے، اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ شیعوں کا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ ہر عہد میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے شاہ ولی اللہ نے بھی بہت سے حوالوں سے یہی بات کہی ہے، عقائد مذہبی کو ہمیشہ علوم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ہمیشہ ان کوششوں کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل کے زمانے میں یہی ہوا اور خلفائے عباسیہ کے دور میں، جب مسلمان عالموں نے معقول و منقول کی تطبیق کو لازمی سمجھا اور یقین کیا کہ بغیر اس کے ایمان کامل نہیں تو ضرور اس کی طرف مائل ہوئے۔ اس فن میں امام غزالی کی احیاء العلوم، اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سند کی حیثیت رکھتی ہیں، اب ضرورت یہ ہے کہ جس طرح قدما نے یونانی علوم سیکھے تھے ہم آج جدید علوم سیکھیں اور انھیں کی طرح معقول جدیدہ اور منقول اسلامیہ قدیمہ کی تطبیق کی کوشش کریں۔ قدیم یونانی معقولات گمراہ کرنے والے ہیں اور جدید علوم حقیقت اشیاء بتاتے ہیں — یہ چند جملے تہذیب الاخلاق سے بے ترتیب طور پر نقل کر دیئے گئے ہیں لکچروں کے مجموعوں میں بھی یہی باتیں ملتی ہیں مثلاً، دنیوی علوم

اور دنیوی دولت و حشمت سے اسلام کو رونق ہوگی۔ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا ہے ہمارے بزرگوں نے علم کی حقیقت کو اس قدر جانا کہ ایک شے عقلی ہے جو خیال اور حافظہ میں رہتی ہے مگر اس زمانہ میں اصلی علم اسی کو کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربے میں آوے، رسومات متناقصہ کا موجود ہونا اس کا ثبوت ہے کہ رسومات کو توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضروری ہے، مجھے (سرسید کو) تکفیر کے فتووں کا ڈر نہیں کیونکہ ایسا ہی غوث الاعظم، امام غزالی اور مجدد الف ثانی کے ساتھ کیا گیا۔ حکمت مسلمانوں کے لئے گم شدہ چیز کی طرح ہے جہاں کہیں پا دے، لے لے، ہماری (سرسید کی) سمجھ میں کوئی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا یا جو کچھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کسی قدیم یا جدید علم کے برخلاف نہیں ہے۔

طویل اقتباسات سے اور ان پر بحث کرنے کے بجائے یہ چند جملے ادھر ادھر سے دیئے گئے ہیں جو ابھی لکھا ہی کہتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ سرسید وقت کے تقاضوں سے مطابقت رکھنے والا ایک علم الکلام مرتب کر رہے تھے جسے پوری طرح وہ قوم سمجھ نہیں سکتی تھی جس کی وہ رہنمائی کر رہے تھے اس سلسلے میں ان کی مخالفتیں ہوئیں ان کے مختلف پہلو تھے، کوئی انھیں مذہبی خیالات کی بناء پر کافر، غیر مسلم، دہریہ اور نیچری سمجھتا تھا، کوئی اصلاح معاشرت کی وجہ سے کرسٹان اور عیسائی کہتا تھا۔ کوئی مذہبی اصلاح کے اس سارے جوش کو محض ایک سیاسی ڈھونگ سمجھتا تھا جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی

چنانچہ جمال الدین افغانی نے ایک جگہ لکھ ہی دیا کہ "تفسیر کا تجزیہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے اعتقادات کو زائل کرنے کی جو کوشش اس مفسر (سر سید) نے کی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں پر غلامی مسلط کی جائے اور ان کو اغیار میں ضم کر دیا جائے۔" حقیقت یہ ہے کہ سر سید ہندوستانی تاریخ اور عالمی سیاست کے اس دور میں رہنمائی کے لیے آگے جب اسلامی جوش اور خلوص کے باوجود ان کے خیالات نے انگریزی حکومت کے دست و بازو مضبوط کیے اور اگر مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھایا تو چند قدم پیچھے گھسیٹ دیا۔ ان کی ایک دشواری یہ بھی تھی کہ مذہب کے معاملے میں قدیم علماء اور عوام دونوں سے بدظن تھے ہی وہ خود یہ نہیں سمجھ سکے کہ سیاسی مسائل کے حل کرنے میں مذہب سے کس طرح کام لینا چاہیے، چنانچہ وہ ایک طرف تو وہابیت کے بعض پہلوؤں کو سراہتے تھے دوسری طرف یہ کہتے تھے کہ "انگریز اہل کتاب ہیں۔ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، اگر ہو سکتے ہیں تو وہ عیسائی ہیں" یا دوسرے موقع پر ایک لکچر میں انگریزوں کا وفادار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے لیے محض عقلی اور انسانی نہیں، خدا کا حکم ہے، رسول کا حکم ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو۔ اس طرح عقل پرستی اور اجتہاد نے وقتی مصالح سے ساز کر کے انھیں یہ بھی سکھا دیا کہ وہ مذہب کا سہارا لے کر غلامی کو مستحب ثابت کریں۔

علی گڑھ تحریک، جو مکمل شکل میں سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے مودار ہوئی اس وقت تک سر سید کے ذہن میں اس تحریک کے واضح نقوش ہوں تو ہوں، عام طور پر اس کی ہمہ گیری اور ہندوستان کی تاریخ خاص کر مسلمانوں کی ذہنی اور سیاسی تاریخ پر اس کے جو اثرات پڑنے والے تھے اس سے زیادہ لوگ واقف نہیں تھے۔ لیکن نئی زندگی کا جو ولولہ تھا اس نے تھوڑے ہی دنوں کے اندر اس کا رخ معین کر دیا۔ ۱۸۸۵ء تک اس کے مثبت اور مفید پہلو ابھرتے رہے۔ نئے علوم حاصل کرنے، مذہب کو علوم عقلی کی مدد سے قابل قبول بنانے، سماجی اصلاح کرنے اور ہندوستانیوں کو مایوسی کے گڑھے سے نکال کر زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے، اپنی زبان اور ادب کو بلند بنانے اور سنجیدہ علمی اور ادبی کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ہندوستان کے عام بیداری کو دوسری تحریکوں سے زیادہ مضبوط بنایا۔ اس وقت تک سر سید نے ہندوستان کو زیادہ تر ایک قوم کہا اور اگر کبھی ہندو اور مسلمان کے لیے الگ الگ قوم کا لفظ استعمال کیا تو الفاظ دلہن کی دو خوبصورت رسیلی آنکھوں سے تشبیہ دی لیکن جتنا وقت گذرتا جاتا تھا ان کے یہاں ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں کو بھی وہ ایک ہندوستانی قوم کہنے لگے تھے چنانچہ سنہ ۱۸۸۷ء میں اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں کہ صدیوں سے ہندو مسلمان یہاں آباد ہیں، چند سال سے خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ ایک تیسری قوم (انگریز) بھی یہاں آباد ہو، اب یہ تینوں کا ملک ہے اور اس کے تھوڑے دنوں بعد انھیں یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ قوم ہندوستانی قوموں سے برتر ہے، چنانچہ کہتے ہیں "میں کئی جگہ کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کے لیے ناممکن ہے کہ

ہندو یا مسلمان میں سے کوئی حاکم ہو اور امن قائم رہ سکے، پھر یہی ہوتا ہے کہ کوئی دوسری قوم ہم پر حکمراں"

شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مقالہ میں علیگڑھ تحریک کی مکمل تاریخ بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی بلکہ جن حالات نے اسے جنم دیا اور اسے ایک راہ پر لگایا ان کا تجزیہ کیا جائیگا اس لیے ان تمام وجوہ کی جستجو جن سے یہ تبدیلی ہوئی یہاں نہیں کی جا سکتی تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت نے غدر کے بعد اپنے استحکام کے لیے جو کوششیں کیں اور جو ذرائع اختیار کیے ان میں ہندو مسلم اتحاد کو روکنا بھی تھا، دونوں فرقوں میں ان عناصر سے ساز باز کرنا بھی تھا جو اس کے معاون اور حلیف بن سکیں یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ساری رعایا حکومت کی نظر میں یکساں ہے اور اس کے لیے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اس معاشی استحصال اور لوٹ پر پردہ بھی ڈالنا تھا جو ڈیڑھ صدی سے جاری تھا۔ اس طرح غدر کے بعد مغربی اثرات سے پیدا ہونے والی بیداری کے باوجود ہندوستان میں اصل کشمکش یہ تھی کہ یہاں غیر ملکی حکومت ہوگی یا ان قومی عناصر کا اتحاد ہوگا جو ہندوستان کی ترقی انگریزوں کے مفاد کے لیے نہیں، ہندوستان کے مفاد کے لیے چاہتے ہیں۔ اس میں وفاداریوں کی تقسیم واضح نہیں تھی اور سیاسی شعور جس منزل میں تھا اسے دیکھتے ہوئے ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن معاشیات اور تاریخ کے ہر طالب علم کو وہ نشانات نظر آسکتے ہیں جو انگریزی مفاد کے تابوت میں کیلوں پر کیلیں ٹھونک رہے تھے ہندوستانیوں ہی کو نہیں باشعور انگریزوں کو انگریزی دشمنی کے بھوت منڈلاتے نظر آرہے تھے سنہ ۱۸۵۶ء میں "نیک دل" لارڈ کیننگ نے گورنر جنرلی کا عہدہ سنبھالتے ہوئے کہا "میں اپنے عہد حکومت میں امن چاہتا ہوں لیکن میں اس بات کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا کہ کہیں ایسا نہ ہو ہندوستان کے افق پر، جو بہ ظاہر نہایت پرسکون اور خاموش نظر آتا ہے، بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھر آئے، شاید یہ ٹکڑا آدمی کی ہتھیلی سے بڑا نہ ہو لیکن بڑھتا ہی جائے یہاں تک کہ یکایک طوفان کی طرح پھٹ پڑے اور ہمیں برباد کر دینے کی دھمکی دینے لگے" اور سال بھر کے اندر یہ بادل اٹھا، گرجا، برسا اور انگریزوں کے لیے تباہی کی دھمکی بن گیا۔

علیگڑھ تحریک کے ابتدائی دور اور بعد کے ادوار میں جو فرق ہوتا چلا گیا اس کی جڑیں ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ، اس کی خامیوں اور خوبیوں میں دیکھی جا سکتی ہے دو باتیں اکثر کہی جاتی ہیں اور دونوں غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں قومی احساس کانگریس کے قیام ۱۸۸۵ء سے شروع ہوا اور دوم یہ کہ اس کی ابتدا انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی کیونکہ اس کی بنیاد ایلن اکٹوین ہیوم نے رکھی اور وائسرائے لارڈ ڈفرن نے اس کی کامیابی کا پیغام بھیجا۔ گویا اس احساس کے لیے انگریزوں کا ممنون ہونا چاہیے۔ اس خیال میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ قومیت کا احساس انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور یہ ردعمل تھا انگریزوں کے وجود کا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس میں مغربی طرز فکر سے مدد ملی لیکن اسے انگریزوں کی دین سمجھنا غلط ہوگا۔ ہندوستان میں قومیت کا ارتقاء اس معاشی پستی اور غلامی مغرب کی محض سطحی اور سستی نقالی بن کر رہ گئی اور بعض صورتوں میں دیرپا اور دور رس نتائج کی محرک اول ثابت

کے احساس کا نتیجہ ہے جس کا پیدا ہونا لازمی تھا چنانچہ اگر ہم سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی جدوجہد کو نظر انداز بھی کر دیں تو اس احساس کی جماعتی تشکیلیں برٹش انڈیا سوسائٹی (۱۸۴۳ء) برٹش انڈیا ایسوسی ایشن (۱۸۵۱ء) بمبئی ایسوسی ایشن (دنقریباً ۱۸۵۲ء) بنگال نیشنل لیگ، انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ۔ سروجنک سبھا پونا (۱۸۷۰ء) نیٹو ایسوسی ایشن مدراس مہاجن سبھا مدراس (۱۸۸۴ء) جیسے اداروں کی صورت میں نمودار ہو چکی تھیں اور ہندوستان کے کئی سو اخبار نرمی اور گرمی کے ساتھ ہندوستان کے قومی جذبات کا اظہار اور قومی ادارہ کی تشکیل کر رہے تھے اس لیے نیشنل کانگریس کو پہلا قومی ادارہ کہنا درست نہیں، یہ ضرور ہوا کہ اس نے دوسرے قومی اداروں کی اہمیت کم کر دی۔ اب رہا یہ کہ ایک انگریز نے کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ اس کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ مسٹر ہیوم کے سوانح نگار سر ولیم ویڈربرن نے اس کی تفصیلات دی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جب ہیوم نے سات بڑی بڑی جلدیں صرف ان رپورٹوں سے بھری دیکھیں جو گاؤں قصبوں، شہروں، ضلعوں سے اکٹھا کی گئیں تھیں اور جن میں لوگوں کی باغیانہ بات چیت، کچھ کر گذرنے کے ارادے، ہر حالت میں متحد رہنے کے لیے عہد و پیماں، اسلحوں کی درستی اور بغاوت کے علوم کی کہانیاں تھیں تو وہ حیرت زدہ اور خوفزدہ ہو گیا۔ اور اس نے انگریزوں کی مخالفت کے اس جذبہ کو "دستوری" اور "آئینی" شکل دینے کے لیے ایک قومی ادارے کی تجویز پیش کی اس لیے یہ رائے قائم کرنا ٹھیک نہ ہو گا کہ قومی تشکیل کی ابتداء انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے سارے ارتقاء میں ارتقاء بالضد کا اصول کارفرما ہوتا ہے اور تعمیر و تخریب کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے یہاں اس تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ قومیت کی نشو و نما کے لیے فضا تیار تھی اور انگریزی حکومت یا ملکہ وکٹوریہ سے وفاداری کے اعلان کے پردے میں اس کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی نیشنل کانگریس کی عمر دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے اجلاسوں میں وفاداری کے اعلانات کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی کہ حکومت اور اس کے حلیف عناصر نے اس کی مخالفت شروع کر دی کانگریس کی ابتدائی کارروائیوں میں ہندوستان کے ابھرتے ہوئے متوسط اور سرمایہ دار طبقے کے مقاصد اور مفاد کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے معمولی پیمانے پر سہی یہ مفاد غیر ملکیوں کے مفاد سے متصادم تھا اس لیے تھوڑے ہی دنوں کے اندر حکومت نے سرکاری ملازموں کو کانگریس کے جلسوں میں شریک ہونے سے روک دیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ علیگڑھ تحریک یا سر سید کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ ۱۸۸۸ء تک کانگریس کی کارروائیاں دیکھی جائیں تو اندازہ ہو گا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ سر سید جس کے مخالف ہوتے یہ بھی نہیں ہے کہ سر سید کو ہندوستان کی معاشی پستی کا احساس نہ تھا لیکن عملاً ہوا یہی کہ سر سید کا نقطۂ نظر محدود ہوتا چلا گیا، انھوں نے کانگریس کی مخالفت شروع کی، مسلمانوں کو سیاسی امور میں حصہ لینے سے روکا، رئیس اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کی تفریق پر زور دیا، لوکل بورڈ کے انتخاب کی مخالفت کی سیاسی شورش سے خوفزدہ ہو کر مسلمانوں کو سمجھایا کہ ہم

کو الگ رہنا چاہیئے۔ بجز بیہودہ غل کرنے کے ہم کوئی
انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ بنگالی رہنماؤں کی سیاسی
جدوجہد کو مسلمان قوم پر بیجا دست اندازی سے منسوب
کیا۔ اس بات پر زور دیا کہ اگر انگریز چلے گئے تو ملک میں
امن نہ رہیگا۔ مسلمانوں کو بار بار یہ بتایا کہ صرف انگریز
تمہارے دوست ہیں۔ اور یہ سب کچھ تقریباً دو تین سال
کے اندر ہوا۔ بعض حضرات نے اس تبدیلی کو تھیوڈور بک
پرنسپل علیگڈھ کالج کی سیاسی چال کا نتیجہ قرار دیا ہے
اور ایسا نتیجہ نکالنا کچھ بہت غلط بھی نہیں، ہے لیکن
حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی ایک خاص منزل پر غیر کی جادو
بیانی "اس لیئے "کارگر" ہوگئی کہ سرسید نے مسلمانوں کے
صرف نوکری مفاد پر غور کیا، یہ نوکری مفاد سرکاری ملازمت
حاصل کرنا تھا اور سیاسی یا قومی تحریکوں میں شرکت
کے ساتھ یہ بات ناممکن ہوگئی تھی۔ یہ چیز ان کے طبقاتی
مفاد سے بھی ہم آہنگ تھی۔ ترقی کی دوڑ میں مسلمان پیچھے
تھے، دولت میں کم تھے، تعداد میں کم تھے، بڑی دشواریوں
کے بعد حکومت نے ان پر بھروسہ کرنا شروع کیا تھا،
بغاوت اور شورش پسندی کا دھبہ ان کے دامن سے
دھویا گیا تھا اور سرسید جب ترقی کا تصور کرتے تھے تو ان کے
ذہن میں "زرق برق وردیاں پہنے کرنیل اور میجر بنے ہوئے"
مسلمان نوجوان ہوتے تھے، اعلیٰ عہدے حاصل کرنے والے
تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے اس لیئے سرسید نے تعلیم و تربیت
کے ان پہلوؤں پر زور دینا شروع کیا۔ اگر کوئی شخص اس
مسئلے کے طبقاتی پہلو کو سمجھنا چاہے تو اس کے لیئے ان کے ایک
لکچر (۲۸ مارچ ۱۸۸۸ء) کی یہ چند سطریں کافی ہوں گی:۔

"ہم علم میں کم ہیں، دولت میں کم ہیں...... ہندو چاہیں تو
ہم کو چوبیس گھنٹے میں تباہ کردیں۔ اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں
کے ہاتھ میں ہے، بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے۔
جو تجارت ہندوؤں کے پاس ہے وہ انھیں کے ہاتھ میں رہنے
دو کیونکہ نہ ہم دوکان پر بیٹھ کر آٹا دال بیچ سکتے ہیں، نہ
سوت کپاس۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی تجارت جو انگریزوں
کے ہاتھ میں ہے اور جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اس کو
ان کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرو۔ ان سے کہہ دو کہ آپ
تکلیف نہ کریں ہم خود اپنے ملک کا چمڑا انگلستان لے جائیں
گے اور وہاں بیچیں گے، ہڈیاں امریکہ لے جائیں گے، غلہ اور
روئی کی تجارت کریں گے، انگریز اس میں دخل نہ دیں گے،
مگر یہ سب باتیں تعلیم پر موقوف ہیں" یہاں وہ کشمکش
نمایاں ہے جو اس عہد کے دوسرے رہنماؤں کے یہاں بھی
تھی لیکن اس کا لب لہجہ، اس کا مقصد دادا بھائی
نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، لال موہن گھوش، رومیش چندر دت
کے لہجے اور مقصد سے مختلف ہے حالانکہ ان میں سے
کوئی ایسا نہ تھا جو انگریزی حکومت کی برکتوں کا ثنا خواں
نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ سرسید انگریزی حکمت عملی کا
شکار ہوگئے۔ ان کی نگاہ محدود ہوتی گئی، یہاں تک کہ
آہستہ آہستہ صرف مسلمانوں اور وہ بھی ہندوستانی
مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد کو اپنے تمام
اعلیٰ خیالات کا مرکز بنا لیا اور انگریزوں کی حمایت میں
یہ بھی بھلا دیا کہ یہی انگریز مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے
مسلمانوں کا خون بھی چوس لینا چاہتے ہیں۔ علیگڈھ تحریک اس

طرح آہستہ آہستہ تضاد کا شکار ہوتی گئی اور سرسید کے غیرمعمولی
ذہن نے اپنی کمان سے ترقی کے تیر نکال کر رجعت پسندی کے
تیر لگائے جس سے خود ان کی تحریک زخمی ہو گئی۔ جیسا کہ کہا
گیا ہے علیگڑھ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی، یہ ہندوستان کے
دور بیداری کا ایک اہم جزو تھی، اس نے ہندوستان کے مسلمانوں
کو حالات کا ساتھ دینا، وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی
کے جنگل سے نکلنا سکھایا تھا، اس کے اصلاحی مشن نے طرز
کہن پر اڑے رہنے اور تعلیم نو سے ڈرنے سے بچایا تھا۔ اس لئے کسی
حد تک جاگیردارانہ تصور حیات سے نکال کر جدید صنعتی دور
کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن اس کی تعمیر میں خرابی کی جو صورت
مضمر تھی وہ یہ تھی کہ اس میں ضرورت سے زیادہ حاکم طبقے
سے مدد لی گئی اور اسے عوام کی پہنچ سے باہر رکھا گیا، جن
عناصر کی مدد سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش کی گئی
نے اس کے صحت مند پہلوؤں کو دبا کر محض وقتی فائدہ پہنچانے
والے پہلوؤں کو ابھارا۔ لیکن پھر بھی اس سے جو کچھ حاصل
کیا وہ ہندوستان کے تاریخی اور سماجی ارتقا میں سنگ میل
کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کے ادبی کارنامے تہذیب الاخلاق
اور اس کی جاندار نثر، علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث
مباحثے، ڈاکٹر نذیر احمد کے ناول اور لکچروں کے مجموعے
خواجہ الطاف حسین حالی کی شاعری اور تنقیدی بصیرت
محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی
کے ادبی کارنامے، تحریک سے مخالفت کے باوجود شبلی کے ادبی
و علمی شاہکار اور ان سب سے بڑھ کر وہ زندہ تحرک
اور ترقی پذیر ادبی اور علمی فضا جو ان بزرگوں کے کارناموں
سے وجود میں آئی، یہ ساری چیزیں علیگڑھ تحریک کے رد عمل
میں لکھی جائیں گی۔ یورپ کے نشاۃ الثانیہ کے لیے کہا جاتا ہے
کہ اس نے قومی زبانوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا
معمولی بول چال کی زبانوں کو ادبی خزانوں سے مالا مال کر دیا
یہ بات ہندوستان کے ادبی ارتقاء کے لیے بھی کہی جا سکتی
ہے۔ یہاں کی سبھی جدید زبانوں میں شعر و ادب موجود تھے
لیکن اس دور بیداری نے حقیقت پسندی، تنومند اسلوب
بیان، ادب اور زندگی کے رشتے پر زور دے کر ادب کو
جاندار بنایا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں
اردو ادب نے ایک نئی کلاسکی عظمت حاصل کی جس کے حسن
میں رعنائی کم، صحت زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے جن نئی چیزوں
کو قبول کیا اسے محض نقالی یا تقلید نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ
نئی زندگی میں داخل ہونے کا شعوری احساس تھا جس نے
ادب کو سماج اور تہذیب کے ارتقاء کا ایک اہم آلۂ کار
بنا دیا۔ شعر و ادب کے گیسو ہمیشہ ہی شانے کے منت پذیر
رہتے ہیں۔ آرائش خم کاکل کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن
سرسید کے دور میں اور علیگڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب
کی ایک منزل آئی اور ایک نئی منزل کی طرف ادب کا ارتقا
روانہ ہو گیا۔ نئے یقین نئے حوصلوں کے ساتھ نئے امکانات
اور نئے جذبے کے ساتھ۔ علیگڑھ تحریک کی یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے
جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس
تحریک کی بہت سی خامیوں کا کفارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔
ان تمام پہلوؤں کو پیش نگاہ رکھ کر علیگڑھ
تحریک کے وجود میں آنے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا
کہ جن عناصر نے اس کی تشکیل میں مدد کی ان میں سے بعض
دور تک اس کے ساتھ نہیں چلے، بعض صورتوں میں یہ تحریک

ہوئی۔ ایسی ہر تحریک تاریخی جبر و محدودیت کا شکار ہوتی ہے، یہ بھی اس سے بچ نہ سکی لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جس عقلیت اور صنعتیت، جس اصلاحی جوش اور ترقی کے ولولے کو لے کر اس نے اپنی ابتدا کی تھی وہ آہستہ آہستہ ظاہری چمک دمک، ملازمتوں کے لیے جد و جہد انگریزوں کی رضا جوئی کے جذبے کے نیچے دبتے چلے گئے۔ پھر بھی علیگڑھ تحریک اپنے اساسی پہلوؤں میں ہندوستان کے اس عالمگیر دور بیداری کا ایک حصہ تھی جس نے مسلمانوں کو جگایا اور ان میں نئی راہوں کی طرف چلنے کی سکت پیدا کی۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب مسلمان قومی زندگی کے مقام انفصال پر پہنچ کر راستہ ڈھونڈنے کی ہمت کھو چکے تھے۔ نہ پیچھے پلٹ سکتے تھے نہ آگے بڑھنے کی جرأت تھی اس وقت علیگڑھ تحریک نے انھیں آگے بڑھنا سکھایا لیکن پوری طرح یہ نہ بتا سکی کہ کونسا راستہ کدھر جاتا ہے۔ سرسید نے جدیدیت کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ انگریزوں سے دوستی، تعاون یا وفاداری کا جو سبق پڑھایا وہ اس حالت میں بھی جاری رہا (بلکہ زیادہ شدت اختیار کر گیا) جب حالات بدل رہے تھے اور ہندوستان کا سیاسی مزاج کسی اور سانچے میں ڈھلنے اور سیاست کا کارواں کسی اور منزل کی طرف بڑھنے پر آمادہ تھا۔ اسی تضاد کی حالت میں علیگڑھ تحریک سرسید کے آخری زمانے میں پھر ایک دوراہے پر پہنچ گئی جہاں راستہ سنبھالنے والوں نے اسے تضاد سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے نتائج بیسویں صدی میں ظاہر ہوئے اور علیگڑھ تحریک کے پیرو دو راہوں کے انتخاب میں تقسیم ہو گئے۔ اس مقالے میں اس عہد سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔

(علیگڑھ نمبر علی گڑھ میگزین ۱۹۵۴ء-۵۵ء)

سید کا خیر مقدم

آج کیا بحرِ ہدایت کا وہ گوہر آیا — دست بندِ چمنِ شرعِ پیمبر آیا

ظلمتِ جہل کو سچ ہے جس نے کیا ہند سے دور — آسماں پر سے وہ خورشید زمیں پر آیا

فیضِ مقدم سے ہوا جس کے منور پنجاب — آج وہ صاحبِ اقبال و خوش اختر آیا

یاد خاموش ابھی جاہل و ملّا سن کر
تجھ کو کہہ دیں گے کہ یہ امتِ نیچر آیا

حافظ صدر الدین یاد

۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء لدھیانہ میں سرسید کا خیر مقدم

عہدِ اسلامی میں علمی و تہذیبی ترقی

مولانا سید ہاشمی فرید آبادی

پاکستان بننے کے کئی سال بعد تک ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی پرانی کتابیں ہی پڑھائی جاتی رہیں۔ ایک ایسی تاریخ جو مخصوص پاکستان کے جغرافیائی حدود اور وجود پر بھی روشنی ڈالتی ہو موجود نہ تھی۔ مولانا ہاشمی نے اس کمی کو پورا کیا۔ اور "مسلمانان پاکستان و بھارت کی تاریخ" کو اس طور پر ترتیب دیا کہ پاکستان کی تاریخ بھی صاف طور پر علیحدہ نظر آنے لگی۔ واقعات سب پرانے ہیں صرف ترتیب میں مفید چابک دستی سے کام لیا گیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے دوسرا اچھا کام یہ کیا کہ اپنی کتاب کو محض جنگی وقائع اور بادشاہوں کے رزمیہ کارناموں تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ خاتمۂ ابواب میں عہد بعہد کی علمی تعلیمی اور تہذیبی ترقیوں کو بھی موثر انداز میں اجاگر کرتے چلے گئے جن کا مطالعہ تاریخ کے طالب علموں۔ پاکستانی قوم اور اس کے حاکموں کے لیئے از بس ضروری تھا۔

ہاشمی صاحب کی تاریخ کو پڑھتے وقت ہم ان حصوں پر نشان کرتے گئے جو ثقافتی عہد بعہد سے متعلق تھے ان نشان زدہ حصوں کا جب ہم نے یکجائی مطالعہ کیا تو عہد اسلامی کی علمی ترقیوں کی ایک مکمل تصویر آنکھوں میں پھر گئی اپنی اسی پسندیدہ تصویر کو ہم بجنسہ ناظرین "العلم" کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ ماضی کی اس شاندار یادگار کو حال و مستقبل کے لیئے نشان راہ بنایا جا سکے۔

متفرق مضامین کو مربوط کرنے کے لیئے ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور چند سطروں کا مختصر سا اضافہ کیا گیا ہے۔ دو مقام محل نظر تھے ان کو حوالوں کے ساتھ حل کر دیا ہے۔

الغرض ہاشمی صاحب کی "متھوک کی کوٹھی" سے "خردہ کی یہ دوکان" اچھی خاصی سج گئی ہے۔ کاش اسے خریدار بھی پسند کریں۔ اس مضمون کا مطالعہ ان دانشوروں کے لیئے بھی ضروری ہے جو ہم پاکستانیوں کو ہمارے شاندار ماضی سے بے تعلق کرنا چاہتے ہیں اور ٹی۔ وی، بالخصوص لاہور ٹی۔ وی کے ذریعے عہد اسلامی کو صرف بربریت اور خون خرابہ کا حصہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

— x —

اسلامی مذہب و معاشرت کا اہل سندھ پر جو اثر پڑا اس کا مختلف زمانوں کے حالات پر بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ محمد ابن قاسم نے جس وقت یہ ملک فتح کیا تو قومیں کی قومیں خانہ بدوش، نامتمدن زندگی بسر کرتی تھیں، رہزنی علم تھی۔ ان کے وحشیانہ خصائل کی بنا پر برہمن راجہ نے بعض نہایت سخت قوانین بنائے تھے اور معمولی چوری پر مجرم کے زن و بچہ کو آگ میں جلوا دیتا تھا۔ مگر دو تین صدی کے بعد انہی علاقوں میں ہمیں جا بجا شائستہ شہر آباد نظر آتے ہیں جو صنعت و تجارت کی بدولت خوش حال اور تمدن و تہذیب میں عراق و مصر کے قریب قریب مماثل بن گئے۔

عربی عہد

یہ تبدیلی تدریجی ہوئی فتح سندھ کے تقریباً سو برس بعد پہلا عرب جغرافیہ جو ہم تک پہنچا ابن خردادبہ کی کتاب "المسالک والممالک" ہے اس میں شاہراہوں کی مختصر کیفیت اور شہروں کی مسافت درج ہے۔ تاہم اتنا پتہ چل جاتا ہے کہ ممالکِ اسلامیہ سے سندھ کی آمد و رفت اور تجارت چل پڑی تھی چین، روس اور افریقہ تک کے قافلے یہاں آنے جانے لگے تھے۔ سندھ سے عود ہندی اور بانس خاصی بڑی مقدار میں دساور جاتے تھے۔ ابن خردادبہ سے قریب قریب ایک صدی بعد الاصطخری نے ممالک اسلامیہ کی سیر کی اور "المسالک والممالک" ہی کے نام سے اپنا سفر نامہ تحریر کیا۔

سندھ میں نئے شہر

بلاد سندھ کے ذکر میں لکھتا ہے کہ منصورہ جسے سندھی میں برہمن آباد کہتے ہیں ایک میل کے قریب لمبا اور اسی قدر چوڑا شہر ہے۔ مہران کی ایک کھاڑی میں ٹاپو پر آباد ہے یہاں کے رہنے والے سب مسلمان ہیں اور اہل عراق کا سا لباس پہنتے ہیں ان کی اور مضافات کے باشندوں کی زبان عربی اور سندھی ہے اسی طرح ملتان میں لوگ عراق عرب کی وضع کی شلواریں وغیرہ پہنتے ہیں۔ مگر یہ بستی منصورہ سے آدھی اور ال رور کے برابر ہے۔ سندھ کا تجارتی مرکز دیبل۔ مہران کے مغرب میں ساحل بحر پر واقع ہے قریب قریب یہی کیفیت اسی زمانے کے دوسرے جغرافیہ نویس ابن حوقل نے تحریر کی ہے اس نے سندھ کے عربی مدارس کا زیادہ توجہ سے معائنہ کیا۔ اور بتایا ہے کہ ان میں عراق و شام کے سند یافتہ علما حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ منطق و فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مقدسی سندھ آیا اور اپنے جغرافیے میں یہاں کے چند مشہور محدثین اور مصنفین کا تذکرہ کرتا ہے۔

ان فاضل سیاحوں کی کتابیں پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دو صدی کی عربی حکومت نے ملک سندھ کی حالت بدل دی تھی۔ اسلامی تمدن کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ بہت سے بارونق شہر و قصبات تھے جہاں دولت مند تاجر، خوشحال زمین دار، ہنر مند اہل حرفہ آباد تھے۔ سیاسی طور پر دیکھئے تو یہی چوتھی صدی وہ زمانہ ہے جس میں خلافت بغداد کو زوال آیا یمنی اور نزاری قبائل خوں ریزی خانہ جنگی اور فرقہ باطنیہ کی شورش نے عربی حکومت کی وحدت و قوت کو پارہ پارہ کر دیا۔ خود ملک سندھ دو جداگانہ ریاستوں میں بٹ گیا۔ بہ ایں ہمہ مدنیت کا قدم پیچھے نہیں ہٹا اور تجارت و صنعت کے ساتھ علم و فن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس موضوع پر ہمارا آخری ماخذ ادریسی کا جغرافیہ ہے جس نے چھٹی صدی ہجری میں اسلامی دنیا کے حالات بڑی محنت اور تحقیق سے جمع کئے تھے۔ بلاد سندھ میں وہ سب سے پہلے دیبل کا ذکر

کرتاہے کہ گو اس کی زمین قابل زراعت نہیں ہے لیکن یہ شہر خوب آباد اور سندھ کی بحری تجارت کا مرکز ہے ایک طرف چین اور ممالک ہندوستان دوسری طرف عمان و عراق سے اجناس کے جہاز یہاں پہنچتے رہیں اور مقامی تاجر انھیں خرید کر اندرون ملک بھیجتے اور بہت نفع کماتے ہیں۔ دیبل سے تین دن کے راستے پر نیرون کا قلعہ بند شہر واقع ہے۔ باشندے آسودہ حال ہیں۔ تین دن کی مزید مسافت پر منصورہ ان چار شہروں میں سب سے بارونق و فائق ہے جو خلیفہ منصور عباسی کے نام پر بسائے گئے تھے۔ اس کے بازار شہریوں سے اور گودام مال تجارت سے بھرے رہتے ہیں یہاں کے عوام ایرانی لباس اور امراء ململ کے کرتے پہنتے اور بڑے بڑے بال رکھتے ہیں، چاندی اور تانبے کے سکے رائج ہیں مچھلی بہ افراط، گوشت ارزاں ملتا ہے۔ ملکی اور بیرونی پھلوں کی کچھ کمی نہیں۔ منصورہ سے دو دن میں کالری پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مہران کے کنارے بہت خوبصورت قلعہ بند شہر ہے۔ تجارت کی ترقی نے شارع عام سے دور ہونے کے باوجود اسے مرجع عام وخاص بنا دیا ہے الرور کا دلکش شہر مہران کے دونوں طرف آباد اور ملتان کے برابر ہے۔ ثمونا اپنی وسعت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتا ہے کہ بہت سی نہریں اور دھارے بہتے ہوتے ہیں۔ پیداوار نہایت عمدہ اور تجارت پر نفع ہوتی ہے۔ اسی طرح منجابری کے خوش سواد شہر میں ہر طرف نہریں بنائی ہیں جن کے گرد بہت سے باغ ہیں ملتان وسیع شہر ہے جہاں ہر قسم کی اجناس بہ کثرت ملتی ہیں سرکاری محاصل کم ہیں لوگ عموماً خوشحال ہیں مضافات شہر میں ایک ندی سے آبپاشی کی جاتی ہے جو مہران میں جا ملی ہے۔ شہر میں قلعہ موجود ہے۔ مگر اس سے ایک میل کے فاصلے پر چند دور میں مضبوط قلعوں کا سلسلہ بنا دیا گیا ہے اور سب میں نہر کا پانی پہنچایا گیا ہے۔ ملتان کا امیر تعطیل کا زمانہ اور بہار کا موسم یہیں گزارتا ہے

اسی طرح ادریسی نے اور بیس پچیس مشہور شہروں کا سندھ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔ مگر ان میں سے بعض گجرات کے ساحل پر اور بعض مکران میں واقع تھے۔ اکثر شہروں کے موجودہ نام یا مقام کا تعین کرنا دشوار ہے۔ اور پوری عبارتوں کو نقل کرنا بھی طوالت سے خالی نہیں۔ مگر یہ جغرافیہ جو اپنے افادے اور صحت بیان میں معتبر تاریخوں کا درجہ رکھتا ہے اسلامی سندھ کا ایک دل پسند مرقع پیش کرتا ہے اور اسے پڑھ کر یہ ماننے میں کچھ تامل نہیں رہتا کہ تین صدی کی حکومت میں مسلمانوں نے ان ملکوں کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ مکران کے صحرائی علاقوں تک میں متعدد شہر بسائے تھے۔ جہاں تجارت کی منڈیاں لگی تھیں ہر قسم کا سامان تمدن افراط سے ملتا تھا۔ وسیع پیمانے پر زراعت اور باغبانی کی جاتی تھی۔ لوگ خوشحال، دنیا کے معاملات سے باخبر خلیق و مہمان نواز تھے۔ انھوں نے اسلامی ملکوں کی معاشرت اور گردو پیش کے لئے وہی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

(سندھ میں اگرچہ عرب اپنی غیر مستقل پالیسی کی بنا پر کوئی مستحکم حکومت قائم نہ کر سکے۔ مگر تہذیب و تمدن کے کچھ نقوش ضرور چھوڑے چنانچہ جب محمود غزنوی نے ہندوستان فتح کیا تو ان نقوش میں مزید رنگ آمیزی کر کے ایک نئی جھلک پیدا کر دی)

غزنوی عہد

تقریباً بتیس برس کی انقلاب آفرین حکومت کے بعد محمود نے سنہ ۴۲۱ھ (سنہ ۱۰۳۰ء) میں وفات پائی اور غزنی کی چھوٹی سی مملکت کو اس جلیل القدر فاتح نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور قومی

سلطنت بنا دیا۔ جس میں موجودہ افغانستان، خراسان، ایران و ترکستان کے وسیع قطعات۔ کرمان اور مغربی پاکستان شامل تھے۔ ہندوستان میں ایک طرف قنوج دوسری طرف گجرات تک اکثر راجہ مہاراجہ خراج گزاری کا دم بھرتے تھے سلطان کو ممالک ہند اور یہاں کے نوادر سے خاص دلچسپی تھی اس کی کئی مثالیں تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان میں یہ نقل کرنے کے قابل ہے کہ قنوج کی دوسری مہم سے واپس آکر جب غزنی میں ایک عظیم الشان مسجد اور اس کے ساتھ بہت بڑا کتب خانہ اور دارالعلوم تیار کرایا۔ تو ان عمارتوں کے لیئے اعلیٰ درجے کا سنگ مرمر و رخام تک ہندوستان سے منگایا۔ اور انکے باغوں کے لیئے بھی پاکستان و ہند کے بڑے بڑے پرورش یافتہ درخت اکھڑوا کر لائے گئے اور غزنی میں نصب کرائے گئے تھے

ہندوستان کی ایک اور جیتی جاگتی پیداوار ہاتھی ہے جس کا محمود نہایت قدردان تھا۔ یہ دیو پیکر جانور سیکڑوں کی تعداد میں غزنی لائے گئے اور ان کی داشت و پرداخت کے لیئے ایک مستقل محکمہ سب سے پہلے اسی مسلمان بادشاہ نے قائم کیا اس کی فیل پسندی کی حکایتوں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ بندیلکھنڈ کے ایک زبردست ہاتھی کی تعریف سن کر محمود نے بڑی سے بڑی قیمت پیش کی۔ لیکن وہاں کا راجہ انکار کرتا رہا۔ حسن اتفاق سے وہ ایک رات اپنے لشکر سے نکل کر از خود سلطانی خیمہ گاہ میں چلا گیا۔ محمود نہایت خوش ہوا۔ ہاتھی کا نام خداداد تجویز کیا اور اس کی آمد کی خوشی میں ایک پرتکلف ضیافت کی گئی۔

کہتے ہیں سامانی بادشاہوں کو فخر تھا کہ ان کے عہد عروج میں ان کے پاس سات رطل یعنی کوئی تین سیر وزن کے ہیرے جمع ہو گئے تھے۔ یہ روایت سن کر محمود سجدہ شکر بجا لایا کیوں کہ خود اس کے خزانے میں ان گراں قدر جوہرات کی مقدار سو رطل سے بھی زیادہ تھی۔ سلطان کے تزک و احتشام کی ایک دلچسپ تصویر صاحب روضۃ الصفا نے الفاظ میں اتاری ہے یہ اس مجلس مصالحت کا بیان ہے جسے محمود نے ایک خان اور اس کے بھائی کے نزاع کے فیصلہ کرنے کی غرض سے غزنی میں منعقد کی تھی۔

ایوان مجلس کے راستے پر دو رویہ دو ہزار غلام زریں لباس پہنے صف بستہ تھے۔ ان کے آگے پانچ سو غلامان خاصکی قطار تھی جن کی سنہری پیٹیاں جواہرات سے مرصع تھیں شاہی کے گرد حاجبوں کے گروہ میں ہر فرد قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے اشارۂ سلطانی کا منتظر استادہ تھا۔ باہر میدان میں سات سو کوہ پیکر ہاتھی جنگی ساز و یراق و دراور زریں جھولوں سے آراستہ جھوم رہے تھے پیادہ سپاہ اور زرہ پوش سواروں کی قطاریں بہترین اسلحہ سے مسلح تلواریں کھینچے نیزہ تانے کھڑی تھیں جس ایوان عالی شان میں سفیروں کو کھانا کھلایا گیا وہ جوہرات کی چمک سے جگ مگ کر رہا تھا۔ اس کی آرائش دیکھ کر سفیر و وزیر دنگ رہ گئے۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ کسی زمانے میں ایسے نوادر عجم کے اکاسرہ، روم کے قیاصرہ، ہندوستان کے رائے راجہ اور عرب کے خلفاء کے پاس جمع نہ ہوئے تھے۔

مگر اتنی کثیر دولت اور ایسی حیرت انگیز فتوحات حاصل کرنے سے بھی بڑھ کر سلطان محمود کی عظمت کا باعث یہ ہے کہ فارسی علم ادب کو اسی نے پروان چڑھایا اور مشرق کی تہذیب پر وہ احسان کیئے جو اس کے نام کو قرن ہائے دراز تک زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔ نظامی سمرقندی نے اپنے مشہور

قطعے میں یہی مضمون ادا کیا ہے۔ ؎

بسا کاخا کہ محمود شں بنا کرد
کہ از رفعت ہمی با مہ مرا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت بر پائے
مدیح عنصری ماند ست بر جائے

محمود کی علم دوستی

یاد رہے کہ چوتھی صدی ہجری تک اسلامی دنیا کی مشترک علمی اور ادبی زبان عربی تھی۔ محمود کی تخت نشینی تک فارسی میں گنتی کی چند کتابیں لکھی یا عربی سے ترجمہ کی گیئں۔ ترک امیروں کی قدر دانی سے فارسی قصائد اور سیدھی سادی غزلیں کہی جانے لگی تھیں اور نوح بن منصور (سامانی) کی فرمائش سے دقیقی نے شاہ نامہ نظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ فارسی شاعری گھٹنوں چلنے لگی تھی۔ مگر دوڑنے کی اس میں طاقت نہ آئی تھی۔ یہ عجیب اتفاق زمانہ ہے کہ اس بچے کی پرورش وطن اصلی سے دور غزنی کے پہاڑوں میں آل سبکتگین کے ہاتھوں ہوئی۔

اصل میں محمود جنگجوئی اور سپہ گری کی مہارت کے ساتھ نہایت بامذاق فاضل بادشاہ تھا۔ فارسی تاریخوں اور تذکروں میں اس کے طبع زاد چند شعر منقول اور فقہ کی ایک کتاب کی تصنیف اس سے منسوب ہے لیکن اس کی علم دوستی کا سب سے اچھا ثبوت غزنی کا دارالعلوم اور وہ کتب خانہ تھا جس کے لیئے دور دور سے بیش قیمت مخطوطات جمع کیئے اور سالانہ مصارف کے واسطے بہت بڑی جاگیر وقف کر دی تھی۔ مشاہیر علما کو خاص اہتمام سے بادشاہ بلواتا اور بڑے اعزاز و اکرام سے غزنی میں رکھتا تھا۔ ان میں ابوریحان بیرونی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ ہیئت و ریاضی میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ ان علوم پر اعلیٰ درجے کی تصانیف اس کی یادگار ہیں مزید برآں کئی سال مغربی پاکستان کے علاقوں میں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندی علوم اور مذاہب پر ایک بے مثل جامع کتاب (الہند تالیف کی) سلطان کی معارف نوازی کے سلسلے میں طبقات ناصری سے جس کی ثقاہت مسلم ہے یہ جزو روایت نقل کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ایک رات سلطان محل سرا سے پیادہ جا رہا تھا۔ فراش طلائی شمع دان لیئے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں ایک غریب طالب علم کو دیکھا کہ کسی دکان کے چراغ کے سامنے کھڑا کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے معلوم ہوا کہ خود چراغ بتی کی مقدرت نہیں رکھتا۔ محمود نے اسی وقت اپنا شمع دان اسے بخش دیا؟ پچھلی شب خواب میں نبی کریم علیہ التحیاۃ والتسلیم کی زیارت ہوئی کہ اس علم پروری پر تحسین اور دعائے خیر ارشاد فرماتے ہیں۔

اہل علم و فضل کے علاوہ سلطان کی قدر دانی اور داد و دہش نے صدہا ادیب و شعرا کو غزنی کھینچ بلایا تھا۔ ان میں عنصری، ارسدی، فرخی، منوچہری وغیرہ مشہور اساتذہ شامل ہیں جن کی عرق ریزی نے فارسی ادب کی آبیاری کی۔ خود بادشاہ سخن فردوسی اپنی لاجواب مثنوی (شاہ نامہ) لکھ کر دربار غزنی میں لایا۔ اور سلطانی سرپرستی میں اس کی نظر ثانی اور بعض داستانوں کا اضافہ کیا۔ لیکن کچھ مدت بعد درباری سازشوں اور مذہبی بدگمانیوں سے ڈر کر اپنے وطن چلا گیا اور جب محمود نے اس کی کتاب کا ایسا صلہ دیا جو دنیا کے کسی مصنف کو غالباً کسی بادشاہ نے کبھی نہ دیا تھا۔ وطن ہی میں اسے بھجوایا تھا تو وہ انتقال کر چکا تھا۔ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے دیکھا جائے تو محمود کا مرتبہ بادشاہوں میں اور بھی بلند نظر آتے

کہ اتنی بڑی سلطنت اور قوت قاہرہ حاصل ہونے کے باوجود وہ آخر تک نہایت سادہ مزاج خلیق و شائستہ ضابطہ و حلیم بادشاہ رہا۔ اس کی خطاکاروں سے درگزر ناتوانوں سے ہمدردی فریادیوں کی دادرسی ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اہل لشکر کے ساتھ حسن سلوک اور شاہانہ انعام واکرام نے سپاہیوں کو اسکا شیدا اور جاں نثار بنا دیا تھا عام رعایا اسے عدل و انصاف کا سرچشمہ جود و کرم کا بہتا دریا سمجھتی تھی جس نے کہ و مہ کو اپنی عطا۔ پاشیوں سے سیراب کر دیا تھا۔ فردوسی کا یہ لطیف شعر اسی لئے زبان زد خاص و عام ہے کہ بادشاہ کی یہی ہر دلعزیزی کی گواہی دیتا تھا۔ ؎

چو کودک لب از شیر مادر بشست
بہ گہوارہ محمود گوید نخست

لاہور مرکز علم

صوبہ سرحد و پنجاب کے الحاق اور سلطان محمود کی آباد کاری نے دو تین پشت ہی کے اندر ان علاقوں پر اسلامی رنگ چڑھا دیا اور یہاں جگہ جگہ صدہا مدارس اور مساجد تعمیر ہو گئیں عربی فارسی تعلیم پھیل گئی۔ عوفی کو اپنے تذکرے میں ایک علیحدہ باب شعرائے غزنیہ و لاہور کے لئے قائم کرنا ضروری معلوم ہوا۔ ان شعراء میں استاد ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان اس عہد کے نامی سخنور گزرے ہیں۔ سعد سلمان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ عربی فارسی کے علاوہ ایک دیوان ہندی زبان میں اپنی یادگار چھوڑ گیا تھا۔ غزنوی سلاطین کا دارالحکومت بننے کے بعد لازماً لاہور میں بہت سے مسلمان امراء اور علماء نے مستقل سکونت اختیار کرلی ہوگی۔ مگر چھٹی صدی کے عمرانی اور تہذیبی حالات ابھی تک تاریکی میں ہیں۔ ورنہ محمود اور مسعود کے زمانے میں یہ شہر ایک اسلامی مرکز بنتا جاتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں شیخ حسین زنجانیؒ کا لاہور آنا اور علوم روحانی کی تعلیم و تلقین کے شواہد موجود ہیں۔ ان کے انتقال پر ہی ان کے پیر بھائی شیخ علی ہجویریؒ نے ۴۳۱ھ میں مسند ارشاد سنبھالی اور معارف کے وہ خزانے لٹائے کہ آج تک داتا گنج بخش کہلاتے ہیں۔ حضرتؒ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سب سے مقبول کشف المحجوب ہے کہ غالباً لاہور آنے سے پہلے تکمیل کو پہنچی۔ اس میں تصوف کے ضروری مسائل بہ طریق جواب لکھے ہیں اور بزرگان صوفیہ کا مختصر تذکرہ شامل کر دیا ہے آپ نے شیخ ابوالقاسم قشیری کا زمانہ پایا جن کا رسالہ قشیریہ تصوف کی امہات کتب میں شمار ہوتا ہے اور ان سے استفادہ فرمایا ہے۔ ایک دیوان اشعار بھی لکھا ہے مگر اس کا مسودہ کوئی صاحب مانگ کر لے گئے اور کچھ رد و بدل کر کے اپنی ملکیت بنا لیا۔ نفحات الانس میں جامی نے شیخ ہجویری کے شمائل و فضائل بیان کئے اور ایک قطعے میں لفظ سردار سے تاریخ وفات ۴۶۵ھ نکالی ہے۔

چوں کہ سردار ملک معنی بود
سال وصلش برآید از سردار

عہد سلاطین

(ہندوستان میں اگر ایک طرف محمد بن قاسم محمود غزنوی اور محمود غوری نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں نئے نئے شہر اور قصبے آباد کئے)

تو دوسری طرف ان اسلامی سپہ سالاروں کے پیچھے پیچھے علمائے اسلام قضاۃ اور بزرگان صوفیہ کا گروہ ممالک پاک و بھارت میں داخل ہوا۔ غزنوی عہد کے دو تین بزرگوں کا جو لاہور میں آئے اوپر ذکر آ چکا ہے۔ چھٹی صدی ہجری

(بارہویں عیسوی) کے آخر میں جب ایبک آپنے نئے پائے تخت دہلی کی تعمیر کر رہا تھا خواجہ معین الدین اجمیری نے سلطنت کے جنوبی سرے کو اپنا مسکن بنایا۔ اور بت پرستی کے اس گڑھ میں بیٹھ کر توحید کی وہ آگ سلگائی جس کی حرارت ابھی تک اہل شوق کے دل گرمانی ہے۔

صوفیائے کرام کی خدمات

حضرت کے بہت سے خلفانے بھی آپ کی پیروی کی جن میں قاضی حمید الدین ناگوری شیخ بدرالدین غزنوی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہم کے اسمائے گرامی قطب تارے سے زیادہ روشن ہیں۔ ملوک شمسی ہی کے دور میں شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتان میں اور شیخ فریدالدین گنج شکرؒ پاک پٹن میں تزکیۂ نفوس اور معرفت الٰہی کی وہ تعلیم دینے میں مصروف رہے جس کے فیوض شمالی بھارت اور پاکستان کے ہر گوشے میں پھیل گئے۔ اسی دور کے آخر میں شیخ نظام الدین اولیاؒ کی بابرکت مجلس پائے تخت دہلی میں مرجع انام بنی اور ہزاروں اشخاص عام و خاص آپ کے روحانی کمالات سے فیض یاب ہوئے۔ اس روحانی فیض کا دائرہ مسلمانوں ہی میں محدود سمجھنا چاہیئے۔ غیر مسلموں میں دین کی تبلیغ کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ایک طرف اس بات کا بھی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ ہمارے علما یا صوفیہ براہ راست بھارتی باشندوں میں جاتے اور ان سے رابطہ پیدا کرتے تھے۔ اس کام میں بھارتی زبانوں سے ناواقفیت بڑی رکاوٹ تھی اور جہاں تک معلوم ہو سکا ابھی یہ مذہبی پیشوا نہ یہاں کی مقامی بولیاں اچھی طرح جانتے تھے نہ سیکھنے پر کوئی خاص توجہ فرماتے تھے۔ البتہ ان بزرگوں کا ہندوستان کے شہروں میں توطن اور متعدد عادات و اطوار کا اثر پڑے بغیر نہ رہتا تھا جس کے بالواسطہ نتائج آئندہ ظہور میں آئے۔ بزرگان صوفیہ کے حالات میں بہت سی کتابیں اور تذکرے لکھے گئے اور خود ان کی کئی تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔ کشف المحجوب کا ذکر آچکا ہے۔ ساتویں صدی کے چشتی اولیا کے ملفوظات اور اشعار کے چند مجموعے ملتے ہیں۔ ان کی صحت مشتبہ ہے۔ بجز چند رسائل کے جو قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے لکھے تھے۔ ان میں "لوائح اور طوالع شموس کافی مشہور ہیں قاضی صاحب بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ مگر مشرب وجد و سماع ان پر غالب تھا۔ اپنی کتابوں میں معارف تصوف بھی بہ زبان عشق و ولولہ بیان کرتے ہیں۔

فوائد الفوائد میں حکایت لکھی ہے کہ ایک مرتبہ شیخ فریدالدینؒ کو قوال نہیں ملے تو حکم دیا کہ قاضی حمید الدینؒ کا مکتوب لا کر پڑھا جائے پہلی ہی سطر سنائی گئی تھی کہ شیخؒ پر وجد طاری ہو گیا اور بار بار یہ رباعی جو مکتوب میں تھی دہراتے تھے۔

آں عقل کجا کہ در کمال تو رسد
آں روح کجا کہ در جلال تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی زجمال
آں دیدہ کجا کہ بر جمال تو رسد

فوائد الفوائد

یہ کتاب زیر نظر عہد کے بعد لکھی گئی لیکن سلطان المشائخ، شیخ نظام الدین اولیاؒ کا ابتدائی زمانہ ملوک شمسی کے دور میں گزرا ہے انھیں کے ملفوظات امیر حسن دہلوی نے اس نام سے جمع کئے ہیں۔ کتاب شروع سے مقبول رہی۔ اسی لیئے بہت ممکن ہے مطبوعہ نسخوں میں اغلاط یا الحاق ہو گئے ہوں۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی صحت مسلم ہے۔ امیر حسنؒ دہلوی اکثر جمعہ کے جمعہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان صحبتوں

میں حضرت جو گفتگو فرماتے اسے گھر آکر قلم بند کر لیتے تھے۔ دو تین مرتبہ یہ مجموعے خود حضرت کی نظر سے گذرے اور آپ نے لکھنے کی اجازت دے دی۔ یہ سلسلہ ۷۰۷ھ سے شروع ہوا اور کئی طویل وقفوں کے ساتھ ۷۲۲ھ تک جاری رہا۔ مؤلف اپنے زمانے کے نامور شاعر اور صاحب قلم تھے۔ پیر کی بابرکت صحبت کا حال اور سبق آموز اقوال جن میں جگہ جگہ مفید تاریخی یا سوانحی روایات آجاتی ہیں اس خوبی سے نقل کیے کہ آنکھوں میں نقشہ پھر جاتا ہے۔ آیئے ہم ان کی زبان سے حضرت سلطان المشائخ رح کے کچھ ارشاد سنیں۔

آدینہ پنجم ماہ شوال ۷۰۷ھ بعد از نماز دولت پائے بوس حاصل شد۔ سخن در ترک و تجرید افتاد و در اثنائے آں فرمود کہ درویشے بود در غایت فقر و سکنت۔ شکم او از غایت گرسنگی با پشت چسپیدہ در راہے می رفت۔ خواجہ محمد پسوڑہ کہ یار ماست یک دانگ پیش او نہاد۔ او جواب داد کہ من امروز کنجارہ علے سیر خوردہ ام۔ مرا امروز بدیں دانگ حاجت نیست بعد ازاں خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) در رغبت صدق او تعجب می کرد و می فرمود کہ زہے قناعت و قوت و صبر۔

دو شنبہ بست پنجم (جمادی الاول ۷۰۸ھ) دولت پائے بوس حاصل شد۔ سخن در فضیلت اطعام افتاد بر لفظ مبارک راند کہ نیکو چیزے ست طعام بہ خلق دادن۔ در اثنائے آں فرمود کہ خواجہ علی پسر خواجہ بزرگ رکن الدین (حشر ہم اللہ بالخیر اجمعین) در خروج کفار تتار گرفتار شدہ۔ او را پیش چنگیز خان بردند یکے از مریدان آں خانوادہ آں جا حاضر بود۔ ہمانا کہ آں جا مکنتے داشت چوں خواجہ علی را اسیر دید۔ حیراں ماند۔ باخود اندیشید کہ طریق خلاص او چگونہ باشد او را بچہ نوع پیش چنگیز خاں ذکر کنم۔ اگر گویم کہ از دودمان کرامت و بزرگی ست او چہ داند۔ واگر ذکر طاعت و عبادت کنم۔ ہم موثر نیامد۔ بعد از تامل بسیار پیش چنگیز خاں رفت و گفت پدر ایں مرد بزرگے بود طعام بہ خلق دادے او را اخلاص باید کرد۔ چنگیز خاں گفت طعام خلق خود را دادے یا خلق بیگانہ را۔ آں مرد گفت خلق خانہ را ہمہ کس طعام دہد اما پدر ایں خلق بیگانہ را طعام دادے۔ چنگیز خاں ازیں خوش شد کہ بزرگ کسے بودہ کہ خلق خدا را طعام می داد پس در حال فرمود کہ او را مخلص کنند۔ خلعتے ہم بہ داد و عذر خواست بعد ازاں خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) فرمود کہ طعام دادن در کل مذاہب پسندیدہ است۔

چہارم ماہ مبارک رمضان میانہ ۷۱۰ھ بسعادت پائے بوس رسیدہ شد۔ متعلمے بیامد۔ خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) از حال او استکشافے کرد۔ گفت من تحصیل کردہ ام۔ بہ در سرائے آمدہ شدہ کنم تامرا نانے و فراغتے میسر آید چوں او بازگشت خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) ایں دو مصرع بر زبان مبارک راند۔

شعر در وصف حال بس سرہ ایست

چوں بہ خواہش رسید مسخرہ ایست

آں گاہ گفت شعرے چیزے لطیف است تا چوں مدح می کنند و بر کسے می برند سخت بے ذوق است و علم ہم چناں بہ نفس خویش بس شریف چیزے است اما چوں آں را کسب می سازند و بہ در ہا می روند عزت آں می رود در میں میاں غلامے ہم از مریداں رسید دیگ ہندوئے برابر خود آوردہ گفت کہ ایں برادر منست چوں ہر دو بہ نشستند خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) ازاں غلام پرسید کہ ایں برادر تو ہیچ میلے بہ مسلما

دارد و عرض داشت کرد کہ بہ جہت این معنی آوردم تا بہ برکت مخدوم مسلمان شود خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) چشم پرآب کرد و فرمود کہ این قوم چنان بہ گفت کسے در دل نہ گردد اما اگر صحبت صالحے بیابد امید باشد کہ بہ برکت او مسلمان شود

علوم شریعت یہ سالکان طریقت نہایت راسخ العقیدہ عابد و زاہد مسلمان تھے اور ابھی تک یہ منصب ارشاد کا اہل انھیں حضرات کو سمجھا جاتا تھا جنھوں نے علوم شریعت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کا یہ قصہ تاریخوں میں مذکور ہے کہ نوجوانی میں خواجہ قطب الدینؒ سے ملتان میں ملے تو جوش میں آکر فوراً ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ مگر حضرت نے روک دیا اور تاکید کی کہ پہلے علوم دین کی تکمیل کر لو پھر طریقت کے کوچے میں قدم رکھنا۔ کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ۔

"مرید بے علم مسخرہ شیطان است" زہد و تقویٰ کے ساتھ علمی فضیلت کا یہ بلند معیار تھا صوفیا اس پر پورے اترتے ان کی بڑی عزت و حرمت کی جاتی تھی ان کی خدمت کرنا ثواب دارین کا موجب سمجھا جاتا تھا ان کی خانقاہیں روحانی تعلیم کے بارونق مدارس بن گئی تھیں اسی کے ساتھ مسلمان سلاطین و امراء علوم ظاہری کی تعلیم کا نہایت فیاضی سے اہتمام کرتے کہ ہر طالب علم بلاخرچ دینی علوم حاصل کر سکتا تھا درسگاہیں عموماً مسجدوں میں یا طوق تعمیر کی جاتیں۔ ان کی نگہ داشت اور معلمین و طلبہ کے ضروری مصارف مدرسہ بنانے والوں کے ذمے ہوتے اور اکثر بڑی بڑی جاگیریں اسی غرض سے وقف کر دی جاتی تھیں۔ ذی ثروت افراد اپنے گھروں میں معلمین کو مقرر کر لیتے اور ان کی اولاد کے ساتھ دوسرے

لڑکے بھی ان خانگی مدارس میں تعلیم پاتے تھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں تعلیم کی مقدم غرض یہ تھی کہ آدمی صحیح اخلاق و عقائد سے بہرہ مند ہو لہٰذا مدارس عام ہوں یا خانگی ان میں بیشتر علوم دین اور اخلاقیات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ممالک بھارت میں بستے ہی جنگ آزما مسلمانوں کا تقریباً ہر شہر میں بڑی بڑی درسگاہیں قائم کرنا اور ان سے مسلم علماء و فقہا کا تعلیم پاکر ہر طرف پھیل جانا۔ لائق تعجب اور اس بات کی دلیل نظر آتی ہے کہ ابھی تک مسلمانوں میں علم کی کتنی وقعت اور تحصیل کا کیسا شوق تھا۔ تاریخوں میں آگرہ کے دارالعلوم۔ فیروزی دہلی۔ کے شاہی مدرسہ ناصریہ۔ ملتان۔ بدایوں۔ کڑہ۔ لکھنوتی کے بڑے مدارس کا تذکرہ آتا ہے جہاں اس زمانے کی اعلیٰ تعلیم اور فضیلت کی سند دی جاتی تھی۔ ان سند یافتہ بھارتی مسلمانوں میں بعض مشہور استاد فقہا اور صاحب تصنیف علماء گذرے ہیں اور اسلامی حکومت کی اس پہلی صدی کے بھارتی مصنفوں میں امام رضی الدین صنعانی خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ کہ ان کے علم و فضل کو اسلامی ملکوں میں دور دور تسلیم کیا گیا۔ وہ بھی حضرت سلطان المشائخ کی طرح بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ قاضی بڑی عمر میں بغداد جاکر علوم دین کی تکمیل کی اور وہاں حدیث کا درس بھی دیتے رہے۔ ان کی تالیف مشارق الانوار، حدیث کی نہایت مفید و معتبر کتاب مانی جاتی ہے قبولیت کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ دسویں صدی ہجری تک اس کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔ جو بجائے خود مستقل کتابیں۔ ان کی اور بھی کئی تصانیف تھیں۔ ۶۵۰ھ میں وفات پائی۔

اس عہد کا تاریخی ماخذ "طبقات ناصری" ہے

تاریخ کی چند نادر کتابیں

ہر مسلمان کشور کشا کے علم کے ساتھ کسی نہ کسی مورخ کا قلم چلتا تھا۔ جو بادشاہ زیادہ عرصے تک حکمران وکامران رہے ان کے حالات بھی عموماً زیادہ وضاحت سے محفوظ ہیں مگر یہ تاریخیں بیشتر تشنگی وقائع کی شکایت رکھتی ہیں۔ جن میں بادشاہوں کے رزمیہ کارنامے درج ہیں کہیں رفاہی کام، درباری جشن وجلوس بادشاہ کے ذاتی اوصاف ومشاغل کا بھی ذکر آجاتا ہے غیر معمولی حادثات، قحط یا زلزلے ضمناً مذکور ہیں۔ عام اہل ملک سے مورخ سروکار نہیں رکھتا۔ ملکی تجارت، صنعت وحرفت بلکہ حکومت کے نظم ونسق پر بھی ان کتابوں سے بہت کم روشنی پڑتی ہے اور عمومی طور پر ان سے زمانہ حال کے تاریخی ذوق کی سیری نہیں ہوتی۔ بلکہ سطح بین ناظرین غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انگریز کے عہد حکومت میں ہندوستان کی جو تاریخیں لکھی گئیں اور مدارس کے نصاب میں داخل ہیں ان میں کشت وخون کی مسلسل روایتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ انگریز تاریخ نویس دوسری ہم عصر تصانیف کی تلاش و مطالعے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ بعض نے یہ غضب کیا کہ جن ماخذوں سے اپنی تاریخیں مرتب کیں انھیں بھی صحت یا دیانتداری سے نقل نہیں کیا نتیجہ یہ کہ ان انگریزی کتابوں میں جابجا فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ اکثر ایسے اجنبی سیاح کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں جو نہ ملک سے واقف ہے نہ اہل ملک سے بلکہ محض چند روزہ گشت لگا کر ترسماعی روایات ذاتی تاثرات قلم بند کرتا چلا جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ انقلابات روزگار نے عہد گذشتہ کی صدہا قلمی کتابوں کو نابود کر دیا اور ان کے صرف نام اور حوالے بعد کی کتابوں میں باقی رہ گئے۔ دوسری خرابی یہ ہوئی کہ جو مخطوطات بچ رہے ان میں کتابت کی ایسی غلطیاں اور بے احتیاطیاں ہوئیں کہ صحیح پڑھنا اور سمجھنا مشکل ہو گیا زیر نظر عہد کی مشہور تاریخ "طبقات ناصری" ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے تصحیح کے اہتمام سے شائع کی۔ پھر بھی اغلاط و اسقام سے پر ہے۔ البتہ میجر راورٹی نے اس کا انگریزی ترجمہ بڑی عرق ریزی سے کیا اور مختلف نسخوں کے علاوہ تقریباً ساٹھ دوسری تاریخوں سے مقابلہ کر کے حتی الامکان تصحیح کا حق ادا کیا۔ ان کے فاضلانہ حواشی نے ترجمے کی قدر اور بڑھا دی اور ہم نے جا بجا ان سے استفادہ کیا ہے۔

طبقات ناصری کے مولف قاضی منہاج الدین سراج (جوزجانی) ہرات کے ایک ضلع کے ممتاز خاندان علماء سے تھے سلاطین غور سے ان کا رابطہ تھا۔ اور سلطان معز الدین کا لاہور پر قبضہ ہوا تو مولف کے باپ کو وہاں غوری افواج کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اسی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے قیاس کر لیا کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ لیکن خود مولف کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ پہلی مرتبہ تیس برس کی عمر میں پاکستان آئے۔ ناصر الدین قباچہ والی سندھ نے بڑی مدارات کی اور اچھ کی مشہور درس گاہ۔ فیروزی کا صدر معلم مقرر کر دیا (۶۲۴ھ) مگر دوسرے ہی سال سلطان التمش نے سندھ پر فوج کشی کی اور اچھ فتح کر کے دہلی واپس گیا۔ تو قاضی موصوف بادشاہ دہلی کے ہم رکاب تھے۔ وہ پہلے گوالیار کے قاضی پھر دہلی کے مدرسہ ناصریہ کے صدر، سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں قاضی القضاۃ اور خطاب صدر

جہاں سے مشرف ہوئے ۔

طبقات ناصری اور ایک مثنوی (ناصر نامہ) جو اب مفقود ہے اسی فیاض و حلیم بادشاہ کے نام پر تصنیف کی۔ علوم ظاہری، قوت تقریر و وعظ گوئی کے علاوہ یہ فاضل مولف طریقت و تصوف میں بھی خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور فوائد الفوائد میں سلطان المشائخ ان کے عارفانہ کلام اور وجد و حال کی چشم دید کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اپنے منصب اور عہدے کی وجہ سے انہیں تاریخی واقعات جمع کرنے کا عمدہ موقع ملا۔ اور گو وہ تاریخ کے نقاد نہیں تاہم اول سے بہت ثقہ اور باوقعت مورخ مانے جاتے ہیں اور چونکہ فارسی زبان کے قدیم نثر نگاروں میں داخل ہیں۔ پروفیسر براؤن نے بھی تاریخ ادبیات ایران میں بطور خاص ان کا تذکرہ کیا ہے دستور زمانہ کے مطابق قاضی منہاج ابتدائے آفرینش سے اپنی تاریخ کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن سب سے کارآمد ابواب یا طبقات وہ ہیں جن میں سلاطین غزنی و غور ملوک معزی۔ سلاطین اور ملوک شمسی کے حالات درج ہیں۔ آخر میں ایک مفصل باب فتنۂ مغول پر جو مولف کی زندگی میں برپا ہوا۔ کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ تاریخ ۶۵۸ھ میں مکمل ہوئی۔

(۱) تاج المآثر (۲) عوفی کی تالیفات اور دوسری تاریخیں

ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی زمانے کی مختصر تاریخ تاج المآثر۔ پرتکلف انشا پردازی کا نمونہ ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ شاید یہ نادر کتاب ان کے علم میں نہیں آئی اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں تھا۔ راقم الحروف نے مطالعہ کیا۔ اور اس پر مجلس مخطوطہ فارسی میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ غیر معروف ہونے کا ایک سبب یہ ہو گا کہ کتاب دوسری جنگ تمش کے ابتدائی زمانہ حکومت کے احوال پر ختم ہو گئی ہے سر ہنری الیٹ نے اس کا ایک قدیم نسخہ بہم پہنچایا۔ اور اپنی جلد دوم میں اقتباس دیا ہے۔ تاج المآثر کا مصنف صدر الدین محمد بن حسن نظامی چہار مقالہ کے مشہور مولف نظامی سمرقندی کا فرزند تھا۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان آیا اور اسکی تاریخ بھی طبقات ناصری سے کوئی تیس برس پہلے لکھی گئی۔ اس اعتبار سے وہی ہندوستان کا پہلا مسلمان مورخ ہے جس کی اصل کتاب محفوظ رہی۔ مگر تاریخی قدر و قیمت کے لحاظ سے وہ طبقات ناصری کے ایک طبقے کے بھی برابر نہیں۔ بلکہ شوق انشا پردازی کی بدولت نثریہ شاعری کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔ جنگ کے اسلحہ۔ بزم کے لوازم۔ قدرتی مناظر۔ اور موسموں کے بیان میں ورق کے ورق رنگ دیئے ہیں تحریر میں طرح طرح کی صنعتیں دکھائی ہیں لیکن واقعات کی تفصیل کی طرف مصنف کو چنداں توجہ نہ تھی۔ اسی لیئے یہ کتاب مورخ کے زیادہ کارآمد نہیں۔ البتہ یہ مرصع تحریر اس عہد کے ادبی مذاق کا نمونہ دکھاتی ہے اور کبھی کبھی غور و خراسان کے شہسوار بھی چشم تصور کو ہندوستان کے میدانوں میں جولانیاں کرتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ کتاب جو پائے تخت دہلی میں تکمیل کو پہنچی۔ جامع الحکایات (جوامع الحکایات و لوامع الروایات) ہے اس کا مولف نور الدین عوفی ساتویں صدی ہجری کے فارسی ادیبوں میں ممتاز تھا۔ اس کا تذکرۂ شعراء "لباب الالباب" قدیم فارسی شعراء کے احوال میں مجمل

مگر خاصی مستند معلومات فراہم کرتا ہے لیکن اسے جامع الحکایات جیسی شہرت نہیں حاصل ہوئی جو اول سے فارسی علم و ادب کی نہایت مقبول و منتخب کتاب مانی گئی ہے عوفی کا وطن بخارا تھا۔ کفار مغول کی یورشوں نے ان علاقوں میں تباہی پھیلائی تو بہت سے اہل علم و فن ترک وطن پر مجبور ہوئے وہ بھی پھرتا پھراتا سنہ ھ آ کر قباچہ کی سرکار میں جامع الحکایات لکھنے پر مامور ہوا۔ کتاب تمام نہ ہوئی تھی کہ وہ حکومت ہی ختم ہو گئی قاضی منہاج الدین کی طرح عوفی بھی التمش کے دربار میں دہلی آ گیا۔ یہیں یہ ضخیم کتاب سنہ ۶۲۰ھ (۱۲۳۲ء) میں مکمل اور اپنے مربی نظام الملک جنیدی کے نام سے معنون کی جو ان دنوں سلطنت دہلی کا علم دوست وزیر تھا۔

کتاب میں انبیاء، اولیاء، ملوک و امرا کے قصے جمع کئے ہیں۔ بہت سی روایات تاریخ نگار کے لئے بہترین مصالحہ ہیں۔ اگرچہ ان کی ترتیب مختلف ابواب میں اس طرح کی ہے کہ ایک ہی مضمون یا شخص کے حالات متفرق ہو گئے ہیں اصل کتاب دوسری عالمگیر جنگ سے قبل چند ضخیم جلدوں میں چھاپی جا رہی تھی۔ مگر یہ کام ادھورا رہ گیا۔ اردو میں پروفیسر شیرانی مرحوم کی مدد سے اس کا ایک بہت اچھا انتخاب انجمن ترقی اردو نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ خاندان شمسیہ کے خاتمے کے چند سال بعد کی ایک تاریخ خزائن الفتوح (یا تاریخ علائی) امیر خسروؒ کی یادگار ہے لیکن اس میں علاؤ الدین خلجی کے چند معرکے الفاظ کی ضیا کاری میں چھپ بن گئے ہیں۔ برخلاف اس کے امیر کی تاریخی مثنویاں سچے واقعات کی سچی تصویریں ہیں اور ان سے سنین اور جزئیات کی صحت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کسی آئندہ عنوان میں ہم پھر ان پر نظر ڈالیں گے۔

ایک اور نثری تاریخ ضیاء الدین برنی کی فیروز شاہی ہے کہ ملوک شمسی کے خاتمے کے بہت سال بعد فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ مگر مورخ کو دعویٰ ہے کہ طبقات ناصری نے ہندوستان کی تاریخ کو جہاں چھوڑا تھا اس نے وہاں سے شروع کیا۔ اور اپنے زمانے تک پہنچا دیا ہے برنی بڑی عمر پا کر فوت ہوا۔ اس کے بزرگ بلبن اور خلجی سلاطین کے وقت میں معزز عہدوں پر مامور تھے اور وہ انھیں کی روایتیں نقل کرتا ہے۔ لیکن شاید پیرانہ سالی میں کتاب لکھنے بیٹھا تو سنین واقعات کی تحریری یادداشتیں موجود نہ تھیں۔ حافظے کی مدد سے تاریخ لکھی اور کئی جگہ غلطی کھائی یا ضروری واقعات نذر نسیان ہو گئے۔ بعض انگریز اسے پسند کرتے اور بعض اہل تحقیق یہ بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ معلومات کی کوتاہی ذاتی رائے زنی سے پوری کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے زمانے خاص کر محمد تغلق کے حالات میں اس کے ذاتی تعلقات اتنے دخیل ہیں کہ انھیں بجنسہ قبول کرنے میں احتیاط کرنی چاہیئے

برنی کا ہم عصر عصامی تھا۔ جس کی منظوم تاریخ فتوح السلاطین چند سال ہوئے آگرہ میں چھپی اور حال میں محمد یوشع صاحب کی تصحیح و تحشیہ سے مدراس یونیورسٹی نے الگ شائع کی ہے۔ مصنف کے ذاتی حالات بلکہ پورا نام تک کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ البتہ اس کے جد امجد فخر الملک عصامی (وزیر بغداد) کا التمش کے زمانے میں دہلی آ کر بسنا تاریخوں میں مذکور ہے۔ مصنف بھی ان لوگوں میں تھا جو دہلی سے دولت آباد منتقل کیئے جانے پر محمد بن تغلق سے سخت بیزار ہوئے۔ مثنوی نظم کرنے کے وقت (یعنی سنہ ۷۵۱ھ میں)

دکن آزاد مملکت بن چکا تھا۔ شاعر کو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں کسی کا خوف نہ تھا۔ لیکن اس پہلو سے قطع نظر اپنے زمانے کی بہت سی روایتیں عصامی نے وہ لکھی ہیں جو برنی یا اور جگہ نہیں ملتیں۔ اس کی مثنوی شاعری کے اعتبار سے معمولی سہی ہمارے تاریخی مصادر میں یقیناً بہت اچھا اضافہ ہے۔

ادبا اور شعرا

قوم کے ذہنی اور ذوقی مدارج کا پیمانہ ادبیات ہوتی ہیں۔

ملوک شمسی کے عہد میں بہت سے قادر الکلام شعرا اور اعلیٰ درجے کے فارسی انشا پرداز دربار دہلی میں جمع ہو گئے تھے اور جہاں جہاں مسلمانوں کے بڑے شہر بسے وہاں ہم شعر و سخن کا چرچا سنتے ہیں۔ اہل قلم اور شعرا کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے فراہم کرنے کا ملا عبدالقادر بدایونی نے خاص اہتمام کیا تھا متاخرین میں آزاد بلگرامی کی کتابیں ان کا تذکرہ سناتی ہیں۔ زمانہ حال میں چند اردو اور انگریزی تذکروں میں قدیم فارسی گو شعرا کا نام آجاتا ہے۔ مگر ان کی تصانیف اور اشعار کے مجموعے اکثر تلف ہو چکے۔ تاہم سلطان شمس الدین کے عہد میں ناصری اور امیر روحانی فارسی مشہور ہیں۔ فتح رنتھنبور کی تہنیت میں روحانی کے قصیدے کا ذکر اوپر آچکا ہے ناصری کے قصیدہ مدح کا مطلع صرف اس لیے چمکتا رہ گیا کہ اسی کو سن کر سلطان شمس الدین نے فی شعر ہزار تنکہ (روپیہ) کے حساب سے ترپن ہزار تنکہ شاعر کو صلہ دیا تھا۔ حقیقت میں مطلع غضب کا کہا ہے۔

ای فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ
تیغ تو نیل و عدل ز کہسار خواستہ

یہ دونوں شاعر پایۂ سخن آشنا تھے۔ ان کے مقابلے میں شہاب مہمرہ بدایوں میں پیدا ہوا اور بڑا فاضل ادیب مانا جاتا تھا۔ امیر خسرو ایک جگہ تعلّی فرماتے ہیں کہ میرے زمزمے مہمرہ کی قبر سے اٹھا بٹھائیں گے۔

در بداؤں مہمرہ سرمست برخیزد ز خواب
گر برآید غلغلہ مرغان دہلی زین نوا

ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کے چند قصیدے اپنی تاریخ میں نقل کر کے ہم وطنی کا حق ادا کیا ہے۔ فرہنگ جہانگیری میں جابجا شہاب کے شعر سنداً دیے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا کوئی دیوان یا مجموعۂ کلام کہیں نہیں ملتا۔ یہی کیفیت شمس الدین دبیر کی ہے کہ فضلا اور لغت نویس اس کی سند لاتے ہیں۔ مورخ سخن سنجی کی ستائش کرتے ہیں۔ مگر تصانیف زمانے کی آندھیوں میں اڑ گئیں۔ دو ایک ورق ملا عبدالقادر بدایونی نے ڈھونڈ لیے تھے وہ ہم تک پہنچ گئے۔ یہ بلبن کے فرزند بغرا خان والیٔ بنگال کی مدح میں قصیدہ ہے جس کے آخر میں شاعر سے اپنی خودستائی کے بغیر نہ رہا گیا۔

خسروا شمس دبیر است قوی پختہ سخن
نیست چوں دفتریاں سوختہ دل از خصم
ہست آویختہ شعر شمس چو در ریختہ نیست
سخنش چوں سخن پختۂ خاقانی خام

ایک اور ادیب جسے بدایونی ملک الملوک والکلام کے خطاب سے یاد کرتا ہے امیر فخر الدین عمید (تولکی) تھا کہ اپنی فضیلت و وجاہت سے مستوفی ممالک (یعنی وزیر خزانہ) مقرر ہوا۔ ملا عبدالقادر ہی کے وقت میں اس کا کلام عزیز الوجود ہو گیا تھا۔ لہٰذا ملا صاحب نے واقعی احسان کیا کہ ۶، ۷ قصیدے جو مل سکے تمام و کمال اپنی تاریخ میں درج کر دیے۔ مورخ ضیاء الدین برنی شاعر کا قریب العصر اور

ہے اس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ عمید کے گرد فارسی شعرا کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو ایران و توران کی بجائے ہندوستان کو فارسی شاعری کا آزاد مرکز بنانا چاہتے تھے۔ بہر تقدیر کچھ شک نہیں کہ قدرت کلام اور فصاحت بیان میں عمید اول درجہ کے فارسی شعرا میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ شاید غزل گوئی جس کا ان دنوں ایران میں چرچا بڑھتا جاتا تھا اسے ناپسند تھی۔ ایک قصیدۂ حمد کا اس طرح آغاز کیا ہے۔

برخیز عمید ار نہ فسرد است دل تو
بگذر ز غزل حمد خداوند جہاں گو
مداحی درگاہ خدا کن کہ برافراشت
بے زحمت آلات چنیں گنبد مینو

ایک اور قصیدے کی اٹھان دیکھیے۔

ای زیب حکم تو خم زدہ قامت فلک
خطبہ کبریائے تو وحدک لاشریک لک
ملک تو ملک ثابت است ملک تو ملک لایتیں
ملک نہ ملک منقلب ملک نہ ملک مشترک

انھیں ایام فضیلت کے پہلو بہ پہلو جو کہ مناصب جلیلہ پر فائز تھے کئی اور اہل علم و قلم کے نام آتے ہیں جیسے مؤید جاجرمی ارسلان کاتبی سعد منطقی قاضی مغیث ہانسوی وغیرہ لیکن اس مختصر تبصرے میں ہم صرف چند سطریں امیر حسن دہلوی پر اور لکھ دیتے ہیں جن کی لطیف تالیف فوائد الفواد کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ وہ اپنے ہم مذاق پیر بھائی امیر خسروؒ سے عمر میں بڑے تھے لیکن تصوف کے کوچے میں بہت دیر بعد داخل ہوئے خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ای حسن توبہ آں زماں کردی   کہ ترا طاقت گناہ نہ ماند

حسن غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا سلیس و شیریں کلام ایران میں بھی داد پائے بغیر نہیں رہا چند سال ہوئے دیوان حیدرآباد دکن کے مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ نے شائع کرا دیا ہے۔

طوطیٔ ہند امیر خسروؒ

مگر اقلیم سخن کی بادشاہی امیر خسروؒ کے نصیب میں آئی تھی ممالک ہند کے جملہ شعراء کا کلام ان کی شہرت کے نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو گیا ان کے والد امیر سیف الدین مضافات بلخ سے ہندوستان آئے اور پٹیالی میں آباد ہوئے جو اب ایٹہ کے ضلع میں واقع ہے ان دنوں بدایوں کے تابع تھا۔ وہیں کے نومسلم رئیس یا راوت کی بیٹی سے شادی کی اور اسی پیوند سے ۶۵۱ھ میں امیر خسروؒ پیدا ہوئے۔ باپ کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ نانا دہلی لے آئے یہاں فطری ذہانت کو اہل علم و ادب کی صحبت نے ایسا چمکایا کہ لڑکپن ہی میں غزلوں کا پورا دیوان مرتب ہو گیا۔ یہ تحفۃ الصغر تھا بعد میں تین دیوان اور جمع کیے ان میں غرۃ الکمال آپ کی شاعری کا نصف النہار ہے۔ اس کے دیباچے میں امیر نے ذاتی حالات بھی اجمالاً لکھ دیے ہیں۔ خزائن۔ الفتوح۔ چہار درویش (فارسی) اور اعجاز خسروی۔ انشا پردازی کی یادگار ہیں۔ مگر دنیائے شاعری میں سکۂ خسروی کو پنج گنج نے رواج دیا ہے۔ یہ خمسہ نظامیؒ کے جوڑ کی پانچ مثنویاں ہیں۔ ہزال شاعر عبید نے امیر کی اسی جسارت پر گرفت کی تھی کہ۔۔۔

نمی زیبد خسرو را زفافی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

مگر ہمارے لیے سب سے مفید ان کی چار تاریخی مثنویاں ہیں۔ (۱) قرآن السعدین (۲) خضر خان دول رانی

(۳) نہ سپہر اور (۴) تغلق نامہ ان میں اپنے زمانے کے مختلف
واقعات کو اس خوبی اور صحت سے نظم کیا ہے کہ شاید دنیا کی
کسی زبان میں بھی ان کی نظیر ملنی دشوار ہوگی۔ سنین کی
صحت اور جزئیات کے سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے وہ
دہلی کے کئی بادشاہوں کے ندیم تھے اور ان کے اکثر واقعات
چشم دید بیان کرتے ہیں۔ اس عہد کی معاشرت کے مرقع
دیکھنے ہوں تو اصل مثنویاں مطالعہ کرنی چاہئیں یہ چند
سال ہوئے بڑے اہتمام کے ساتھ مدرسۃ العلوم علیگڑھ
کی طرف سے شائع کی گئی تھیں تغلق نامہ دو صدی سے مفقود
تھا۔ اتفاقاً دستیاب ہوا اور مجلس مخطوطات حیدرآباد کی
طرف سے راقم نے چھپوایا ہے۔ فارسی کی طرح امیر خسرو عربی
ترکی اور ہندی میں بھی شعر کہتے تھے میر تقی میر اور دوسرے
تذکرہ نگاروں نے انھیں ریختہ کا پہلا شاعر بلکہ موجد بتایا ہے
اور دو شعر بھی منسوب کئے ہیں جنھیں اردو کہنا غلط نہ ہوگا
لیکن ابھی مستقل زبان کی حیثیت سے اردو وجود میں نہیں
آئی تھی۔ امیر خسرو کے ہندی آمیز اشعار کو واقعی ان کے
ہوں تو بھی تفنن طبع سمجھنا چاہیئے۔ کتاب خالق باری ان کی
تصنیف مشہور تھی وہ عہد شاہجہانی کے ایک دوسرے خسرو کا
کارنامہ ثابت ہوئی ہندی گیت۔ پہلیاں وغیرہ ممکن ہے انھیں
کے ہوں لیکن انھیں تحقیق کی کسوٹی پر گھسنا باقی ہے۔

امیر خسرو فن موسیقی میں مہارت کامل رکھتے تھے
اور ہندی گویوں نے کہتے ہیں ان کو اٹھواں نائک۔ یعنی
اس فن کا امام مانا ہے۔ خیال۔ قوالی وغیرہ چند راگنیوں کی
ایجاد اور ستار کی اختراع بھی ان سے منسوب کرتے ہیں۔
راہ طریقت میں وہ خانوادہ چشت کے محرم رکن اور سلطان
المشائخ کے عزیز ترین مرید تھے انکی پیر سے ارادت مندی
اور پیر کی ان سے محبت صوفیوں میں ضرب المثل ہوگئی ہے
ان کی نسبت یہ لطف آمیز رباعی بھی حضرت رحمۃ اللہ ہی
بتاتے ہیں۔

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن آں خسرو راست
ایں خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

سلطان المشائخؒ کا انتقال دہلی میں ہوا۔ تو امیر خسروؒ
غیاث الدین تغلق کے ہمراہ بنگال گئے ہوئے تھے کہتے ہیں
خبر سنتے ہی برہنہ پا چل کھڑے ہوئے اور یہاں پیر کی قبر سے
لپٹ کر اتنا روئے کہ چند ہی روز گھل کے تسلیم ہو گئے۔۔۔
(۷۲۵ھ م ۱۳۲۵ء) مولانا شہاب معمائی نے "طوطی شکر
مقال" سے تاریخ وفات نکالی ہے سلطان المشائخؒ کے عرس
کے چھ مہینے بعد ان کا عرس یا چھوٹی سترہویں منائی جاتی
ہے ان کے تقریباً دو سال بعد امیر حسن دہلوی نے دولت آباد
میں وفات پائی ان کی قبر وہیں قصبہ خلدآباد کے باہر ہے۔
حضرت جامی دونوں کے انتقال پر یک جا اظہار غم فرماتے ہیں۔

آں دو طوطی زلو خیزی شاں
بودہ در ہند شکر ریزی عیاں
آخرش سخرۂ افلاک شدند
خامشاں قفسِ خاک شدند

(محمد تغلق کے زمانے میں جونپور کے علاقے کا صوبیدار خواجہ
جہاں تھا۔ امیر تیمور کی واپسی کے بعد وہ جونپور کا خود مختار
بادشاہ بن بیٹھا۔ اس خاندان نے ۱۴۷۷ء تک حکومت کی۔

ابراہیم حسین شرقی اس خاندان کا مشہور حکمران گذرا ہے۔ یہ
حکمران سلاطین شرقی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان حکمرانوں کے
زمانے میں جونپور اور اودھ کے علاقے میں علم و فن کی بڑی ترقی ہوئی
رعایا خوش حال ہوگئی۔)

عہد سلاطین شرقی جونپور

مگر عمرانی ترقی سے بڑھ کر سلاطین
شرقی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سارے ملک میں بیسیوں مدرسے
بنوا دیئے۔ تعلیم کا بڑا مرکز شہر جونپور رہا۔ صدہا علما اور مشائخ کو
دیہات جاگیر میں دیئے گئے تھے کہ وہ اور ان کے شاگرد اطمینان
سے وہاں رہ کر علمی مشاغل میں زندگی بسر کریں۔ اہل علم کی
یہی نو آبادیاں تھیں کہ شاہجہاں جیسا عالی نظر بادشاہ فخریہ
کہتا ہے کہ "پورب شیراز ماست" انگریزوں کے دور تک سلطنت
شرقی کے یہ اسلامی قصبات مردم خیزی اور علمی مذاق میں امتیاز
رکھتے تھے۔

ٹھٹہ سے پنڈوہ اور دہلی سے بیدر تک صدہا درسگاہیں
اور خانقاہیں قائم ہوگئی تھیں۔ بہت سے اہل تصنیف علما اور
صدہا صاحب ارشاد صوفیہ کے نام تذکروں میں آتے ہیں۔
ملک العلما قاضی شہاب الدین (دولت آبادی ثم جونپوری)
شیخ علی (مہائمی) اور شیخ علی متقی (برہان پوری) کی فاضلانہ
تصنیفات اسی دور لامرکزیت میں شائع ہوئیں اور بعض اب
تک اسلامی دنیا میں مقبول ہیں۔ مشائخ صوفیہ پر نظر کیجئے تو
بنگال میں شیخ علاء الحق۔ بہار میں شرف الدین یحیٰی منیری۔ دو
آب میں سید بدیع الدین مدار صاحب بہار میں۔ سید جہاں گیر[1]
اشرف سمنانی دکن میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز۔ گجرات میں
قطب عالم۔ کشمیر میں امیر سید علی ہمدانی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)
جیسے نامی گرامی حضرات اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جو اہل
ہند کا مسلمانوں سے رابطہ بڑھانے اور دین اسلام پھیلانے کا مؤثر
ذریعہ بن گئے۔ تذکروں میں ان کے کشف و کرامات اور کہیں
کہیں تبلیغ و دعوت کے قصے تحریر ہیں۔ خود ان صاحبوں کی
بہت سی تصانیف ابھی تک محفوظ ہیں۔ یہ روحانی مکاشفات
اور ذاتی مشاہدات کے علاوہ تصوف کے اسرار و معارف بیان
کرتی ہیں۔ اکثر حضرات پر فلسفۂ وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا
رنگ چڑھتا نظر آتا ہے سخت مجاہدات اور ترک تعلقات کی تعلیم
رہبانیت کا میلان دکھاتی اور ضمناً شریعت ظاہر کا وزن [illegible]
گھٹاتی ہے۔ قلندریہ۔ مجاذیب۔ ملامیہ وغیرہ چند صوفی فرقے
علانیہ قیود شرعی سے آزادی کے طلبگار معلوم ہوتے ہیں ممکن
ہے فلسفۂ تصوف ہی کا یہ اثر ہوا کہ نویں صدی ہجری کے
علمائے ظاہر میں تفسیر و حدیث کی بجائے منطق و فلسفہ پر زیادہ
زور دیا جانے لگا۔ عملی زندگی کے مسائل کی طرف توجہ نہ رہی۔
علم کلام کی باریکیاں اور فقہی موشگافیاں دلچسپی کا سامان بن
گئیں۔ اچھے اچھے مولوی اس قسم کی بحثوں میں وقت ضائع
کرنے لگے کہ کالی بلی کے جھاگ پاک ہیں یا ناپاک صوفیہ کی آزاد
روی علماء کی ظاہر پرستی اور عوام کے بدعات اور فاسد عقائد
کا فوری ردعمل سید محمد جونپوری کی تحریک مہدویت کو سمجھنا چاہیئے
جس نے نویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اسلامی ہند
کے اکثر اقطاع میں خاصی ہل چل ڈال دی تھی۔ سید موصوف
(ولادت ۸۴۷ھ وفات ۹۰۵ھ) مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ
کرتے تھے۔ اس لئے علماء کو ان کے خلاف بھڑکنے بھڑکانے کا

[1] حضرت جہانگیر اشرف سمنانی رح کا مرکز تبلیغ و ہدایت بہار نہ تھا بلکہ جونپور اور اودھ تھا۔ آپ نے حضرت علاؤ الحق بنگالی کے پاس سے واپس

اچھا حصہ مل گیا اور اپنے وطن ردولی میں ان کی تحریک سرسبز نہ ہوسکی۔ ورنہ ان کی تعلیم و تلقین کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بدعات کج روی سے روکا جائے اور سنت نبوی کے راستے پر لایا جائے۔

فارسی شاعری

کسی دل جلے نے تصوف کو طعنہ دیا تھا۔ کہ برائے شعر گفتن خوب است لیکن ہندوستان میں تصوف کا فروغ کم سے کم آٹھویں نویں صدی ہجری میں شعر گوئی کے حق میں کچھ بہت سازگار نہ تھا۔ صوفیہ شعر سے کام لینے لگے ہوں تو بھی شعراء (امیر خسروؒ کے بعد) تصوف سے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ ہندوستان کی بزم ادبیات پر اوس پڑ جانے کا ایک سبب یہ ہوگا کہ مغلوں کے استیلا نے ایران و خراسان سے ان کے روابط منقطع کردیئے تھے۔ پاکستان و ہند میں جن مسلمان خاندانوں کی کئی پشتیں گذر گیئں اور وہ نومسلم ہندی جن سے اسلامی آبادی میں روزافزوں اضافہ ہوا۔ فارسیت سے طبعی مناسبت نہ رکھتے تھے۔ تاہم قوم کی ادبی زبان فارسی ہی تھی اور لکھنے والے اس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے آٹھویں صدی میں خاندان تغلق کے ایک شہزادے، مسعود بک کہ دنیا چھوڑ کر فقیر ہوگئے تھے نثری تصانیف کے علاوہ ایک دیوان شعر یادگار چھوڑ گئے ہیں انھیں کے ہم عصر مطہر تھے جن کا وطن کڑہ اور تربیت گاہ دہلی تھی۔ ایک اور شاعر آزیر دہلوی کو ملا عبدالقادر بدایونی ماقبل مغل زمانے کا خاتم الشعرا لکھتے ہیں جمالی کنبوہی دہلوی کی شہرت کا سبب یہ تھا کہ حضرت دباوی کے شاگرد اور سلطان سکندر لودھی کے استاد تھے۔ خود یہ لودھی بادشاہ گل رخ تخلص کرتا اور شعر کہتا تھا۔ پر تصنع شاعری کی مثال میں ملا صاحب نے اس کا یہ مطلع

آ کر جونپور اور اودھ میں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ اول محمد آباد گہنہ (اعظم گڈھ) پہونچے۔ محمد آباد سے ظفر آباد آئے ظفر آباد سے جونپور تشریف لیگئے اور وہاں قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے ملاقات ہوئی اور ان کو ملک العلماء کا خطاب اور خلافت دی۔ اس کے بعد پنڈی اور پھر وندہ (بحوالہ لطائف اشرفی) پہونچے۔ ملک الامراء محمود نے آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا کچھوچھہ میں ایک ہندو جوگی نے مغلوب ہوکر اسلام قبول کیا۔ اس کی منڈھی میں خانقاہ تعمیر ہوئی کچھوچھہ کا نام روح آباد رکھا گیا یہاں ایک خانقاہ بنی جسکا نام کثرت آباد رکھا گیا ایک حجرہ تعمیر ہوا۔ اس کا نام وحدت آباد رکھا گیا۔ ایک جگہ حضرت اصحاب خاص کے سامنے سلوک و عرفان کے رموز بیان فرماتے تھے۔ اس جگہ کا نام دارالامان مشہور ہوا حضرت نے کچھوچھہ کے آس پاس مختلف قصبوں اور قریوں میں اسلام پھیلایا۔ اجودھیا میں بہت سے امرا آپ کے معتقد ہوئے۔ ردولی میں شیخ صفی الدین نے آپ سے بیعت کی۔ قصبۂ انہونہ اور سدھورہ میں بھی آپ نے تبلیغ فرمائی۔ ایک دفعہ بنارس گئے وہاں بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ خود اودھ کا حاکم آپ کا مرید ہوا۔ غرض کہ آپ کا مرکز رشد و ہدایت جونپور و اودھ تھا۔ بہار نہ تھا۔ ۲۷ محرم ۸۰۸ھ کو کچھوچھہ شریف میں انتقال ہوا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔

(بزم صوفیہ مرتبہ صلاح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے۔ شجرہ اشرفیہ۔ مرتبہ اشرف حسین سجادہ نشین کچھوچھہ شریف، تاریخ سید سالار مسعود غازیؒ)

نقل کیا ہے ؎

سروے کہ صحن پیرہن وگل بدن نقش
روح ست مجسم کہ دراں پیرہن نقش

(ہندوستان میں مغلیہ عہد اسلامی حکومت کا ایک زریں دور ہے تہذیب و تمدن، حکمت و فلسفہ، صنعت و حرفت غرض ہر شعبہ علم و فن کو ترقی حاصل ہوئی بادشاہ علماء اور فضلا کے بڑے قدردان تھے۔ ہر بادشاہ نے علم و فن کی ترقی میں حصہ لیا بابر نے اپنے مختصر زمانہ حکومت میں علم و فن کی جو سرپرستی کی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہمایوں کی معارف پرستی اظہر من الشمس ہے اسکے بعد اکبر کا شاندار دور دراصل علم و فن کا دور ہے)

مغلیہ عہد

اکبر کا زمانہ سلطنت کی وسعت و استقامت میں جس قدر ممتاز ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ اہل کمال کی کثرت سے تاب ناک ہے ہمعصر تاریخیں ان کے تذکروں سے معمور ہیں۔ انھیں پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ہند نے قدر شناسی کے دربار میں اپنے نادر جواہرات اگل دیئے اور ولایات خارجہ کے چمکتے ہوتے موتی اسی فیض کے دامن میں ڈھلک آئے تھے۔ ان سب کو کتاب کے آئینہ خانے میں سجانا اکبری مورخ کا کام ہے مگر بعض ایسے مشاہیر ہیں جن کے نام ہماری تہذیبی تاریخ میں مستقل مقام رکھتے ہیں۔ زمانہ حاضرہ میں ان پر انگریزی اردو میں کتابیں اور بہت سے مضامین چھپ چکے ہیں۔ ان کی شہرت اس تاریخ میں جگہ پانے سے مستغنی ہے لیکن ہماری تاریخ ان سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔ لازم ہوا کہ چند چیدہ مرقعوں سے ان اوراق کی تزئین کی جائے۔

بابر کی علمی فضیلت

اکبر خود پڑھا لکھا نہ تھا۔ مگر ذوق سلیم فطرت کی سرکا ہے! ور علم دوستی باپ دادا سے وراثت میں پائی تھی دادا کی انشا پردازی کا ایک گذشتہ باب میں ہم نمونہ دیکھ چکے ہیں۔ وہ ترکی زبان کا اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان اور دو ہزار شعر کی مثنوی رہبین، کہ مذہبی رنگ میں لکھی تھی۔ ابھی تک محفوظ ہیں۔ بابر کے حاشیہ نشینوں میں ایک بزرگ شیخ زین الدین وفائی نے اس مثنوی کی شرح اور تزک بابری کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ بابر کبھی کبھی فارسی شعر کہتا تھا مگر ہمایوں کو اس زبان میں شعرگوئی کی پوری قدرت حاصل تھی اس کا قلمی دیوان چند سال ہوئے۔ بہار کے ایک نجی کتب خانہ میں بھی ملا جس پر پٹنہ کالج میں فارسی کے استاد حافظ شمس الدین صاحب نے اردو میں تبصرہ شائع کیا تھا۔ علم ہیئت و ریاضی میں اس کی تحقیقات اور اسطرلاب اور کروں کے بنانے میں بعض اختراعات قانون ہمایونی میں درج ہیں۔ یہ رسالہ بنگال ایشیائک سوسائٹی نے چھپوایا تھا۔ اور اس عہد کے نامی مورخ اخوند میر صاحب حبیب السیر کی تصنیف ہے۔ اخوند میر آخر زمانے میں ہرات چھوڑ کر ہمایوں کے پاس چلا آیا تھا اور تخت گاہ دہلی ہی میں رحلت کی۔ اسی عہد میں قاسم کاہی نے نشو و نما پائی۔ اس کا حال آئندہ اوراق میں ہم پڑھیں گے۔ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری بھی صاحب تصنیف بزرگ تھے جنھیں ہمایوں کی سرپرستی نے مسند صدارت پر بٹھایا تھا۔ عہد اکبری میں ان غریب پر

جو کچھ بیتی وہ عبرت کی کہانی گذشتہ باب میں ہماری نظر سے گذر چکی ہے۔

شیخ مبارک ناگوری

مولانا عبداللہ کا مشہور حریف شیخ مبارک ناگوری تھا۔ اگرچہ اس کی کوئی کتاب یادگار نہیں رہی مگر فیضی اور ابوالفضل جیسے اہل قلم کا باپ تھا۔ اور شاگردوں میں شیخ عبدالقادر بدایونی جیسا نقاد یہ سند دے گیا ہے کہ اس جامعیت کا ملا دیکھنے میں نہیں آیا۔ پھر وہ محضر جس کی رو سے اکبر امام عادل اور مجتہد قرار پایا۔ شیخ مبارک ہی نے تحریر کیا تھا اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ورق کی تصنیف پچاس کتابوں پر بھاری ہے۔ شیخ مبارک ۹۱۱ھ میں بمقام ناگور پیدا ہوئے باپ سندھ کے کوئی نو وارد بزرگ تھے کہ چند سال بعد واپس چلے گئے پھر پلٹ کر خبر نہ لی۔ بچے کی پرورش ماں نے کی وہ غالباً کوئی باندی یا غریب خادمہ تھی لیکن لڑکے کا شوق اور ذہانت دیکھ کر خود محنت مشقت کرتی اور اسے تعلیم دلاتی رہی ان دنوں اعلیٰ تعلیم کچھ مہنگی نہ تھی شیخ نے ناگور میں علوم رسمی کی تکمیل کی پھر احمد آباد گجرات کا رخ کیا۔ وہاں معقول و منقول کے بڑے بڑے استاد جمع تھے ان علوم کے ساتھ بزرگان صوفیہ سے طریقت کے سبق لیے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی مشہور کتابیں مطالعہ کیں حجاز اور اسلامی ممالک کی سیر کا قصد تھا لیکن ایک بزرگ کے مشورے سے آگرے چلے آئے اور جمنا پار چار باغ کے محلے میں قیام کیا (۹۵۰ھ) علم و فضل سے بڑھ کر زہد و تقویٰ میں مشہور تھے کہ کوئی سونے کی انگوٹھی ریشمی لباس یا ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہن کر ملنے آتا تو پائنچہ ترواد دیتے تھے۔ انگوٹھی اتروا دیتے تھے۔

اکبر کی معارف پرستی

یہ وہ زمانہ تھا کہ مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری امور مذہبی کے وزیر بلکہ امیر بنے ہوئے تھے۔ مہدویت اور بدعت کی سرکوبی کرتے کرتے ایسی قوت حاصل کر لی تھی سوری بادشاہ اور امرا تک ان سے دبتے تھے ہر مقدمے میں جہاں مذہب کی لاگ ہوتی۔ ان کا فیصلہ قطعی اور فوری اٹل مانا جاتا تھا۔ ان کے اقتدار کے سامنے دوسرے دلوں ملا زبان نہ کھول سکتے تھے لیکن مثل مشہور ہے کہ معاصرت سے رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ مبارک اپنے حلقے میں سرکاری علماء کے فتاوی پر خفیہ نکتہ چینی کیا کرتے تھے شیخ علائی کے مناظرے میں دبی زبان سے شیخ کی تائید کرنا بھی مذکور ہے۔ غرض مخدوم الملک ان سے ناراض اور بدگمان ہو گئے۔ جب سوریوں کا شیرازہ بکھرا اور دوبارہ مغلوں کا جھنڈا گڑا تو مخدوم الملک نے ان پر عقائد کے فساد اور غالباً ہیمو بقال سے ساز باز کا الزام لگا شیخ مبارک چھپ کر بھاگے۔ اور مدتوں تک ادھر ادھر جان بچاتے پھرے آخر مرزا عزیز نے اکبر بادشاہ سے سفارش کی جان بخشی کرائی پھر وہ ایک زمانے تک اپنے بچوں سمیت دہلی کی مختلف درگاہوں میں مقیم رہے آخر ۹۷۴ھ میں فرزند اکبر ابوالفیض فیضی نے شاعری کے زینے سے شہ نشین شاہی تک رسائی پائی اور چند سال بعد دارالانشا کی بساط پر ابوالفضل کا قدم ایسا جما کہ سارے قدما لڑکھڑا گئے مولویوں سے بادشاہ دل برداشتہ ہو رہا تھا جب کہ بیٹوں نے شیخ مبارک کو حضور میں پیش کیا اور دل نشین کر دیا کہ وہ مولویت میں مخدوم الملک اور

صدر صدور سے کسی طرح کم نہیں ہے شیخ مبارک کو درباری
آداب سے آگہی نہ تھی۔ لیکن بادشاہ کو خوش کرنا اور اپنے
رقیبوں سے انتقام لینا آتا تھا۔ بادشاہ کے امام عادل ہونے
کی دستاویز تیار کی۔ سرکاری مولویوں سے جبراً دستخط لیے
گئے حقیقت میں یہ مولویت کے قتل کا محضر تھا جس نے دربار
دربار میں ان کے اقتدار کا خاتمہ کرا دیا۔ شیخ مبارک نے
بڑھاپے میں بڑا میدان جیتا لیکن اس کے علم و فضل کی شہرت
بھی لعن و طعن و ملامت کی آندھیوں میں اڑ گئی اور عجیب
واقعہ یہ ہوا کہ زہد اور تجاہلات کی بجائے زندگی دوسرے سانچے
میں ڈھل گئی۔ یا حرمت سماع کے قائل تھے۔ سرود ہمسایہ
سن کر کانوں میں انگلیاں دیتے تھے اور یا وقت کا بڑا حصہ
ہی موسیقی سے لطف اٹھانے میں گذرنے لگا۔ آخر میں صحت
خراب بصارت کمزور ہو گئی تھی۔ لاہور آ رہے تھے مگر درس و
تدریس کے ساتھ تصنیف کا شغل جاری رہا۔ ایک ضخیم تفسیر
منبع نفائس العیون تحریر کی۔ کہ اب اس کا نام تک مشکوک
ہے ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ اس میں مجددیت کی
ضرورت پر تقریر تھی۔ اور یہ اشارہ بھی نکلتا تھا کہ دسویں
صدی ہجری کا مجدد خود مصنف ہے حالانکہ بادشاہ کو امام
عادل اور مجتہد کی کرسی پر بٹھانے کے بعد کسی مجدد کے واسطے
جگہ نکالنا جمع نقیضین کی مثال معلوم ہوتا ہے۔ اواخر ۱۰۰۱ھ
میں انتقال کیا۔ لاش کچھ عرصے بعد لاہور سے لا کر باغ آگرے
میں دفن کی گئی۔ فیضی ابوالفضل کے علاوہ کئی بچے چھوڑے جن
میں سے دو شیخ کی وفات کے چند روز بعد پیدا ہوئے تھے۔

مصنفین صوفیہ

جیسا کہ پہلے بیان ہوا دسویں
صدی ہجری میں ممالک ہند و
پاکستان میں بزرگان صوفیہ کا ہر طرف ہجوم تھا مختلف اقطاع
اور تمام بڑے بڑے شہروں میں حال و قال کی محفلیں گرم
رہتی تھیں تذکروں میں صدہا بزرگوں کے حالات مذکور ہیں
ان میں بھی زیادہ نمایاں ملا ہاشم سنبھلی شیخ محمد غوث گوالیاری
شیخ سلیم چشتی شیخ نظام الدین امیٹھی والے۔ شیخ احمد مجد خیر آبادی
شیخ داؤد جہنی وال (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام نامی ہیں۔ ان میں
کوئی صاحب تصنیف تھے جن کا ترکہ خلف اولاد نے تلف
کر دیا انھیں اہل قلم صوفیہ میں ایک بزرگ شیخ امان پانی پتی
تھے کہ فلسفے کے ٹھوس مسئلوں کو بیان کی لطافت سے پانی
کر دیتے تھے ان کا رسالہ اثبات الاحدیہ جو رسالہ [illegible] کہلاتا
تھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریات پر نہایت صاف
اور واشگاف تحریر ہے جس کی اشاعت نے اہل رسوم میں
خاصی ہلچل ڈال دی تھی کئی رد لکھے گئے لیکن اس کی قبولیت میں
فرق نہ آیا۔ ایک ضخیم شرح ملا جامی کی سوانح پر لکھی تھی
(۹۵۷ھ) میں انتقال ہوا۔ اور معتقدین کا ایک بڑا گروہ
وارث چھوڑ گئے جن میں شیخ تاج الدین، مولانا رکن الدین
اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے والد شیخ سیف الدین جیسے
فضلا کے نام شامل ہیں۔

اسی دور کی ایک کتاب جواب تک سر سبز ہے۔ سبع
سنابل سید عبد الواحد بلگرامی کی یادگار ہے۔ اس میں مسائل
اخلاق و تصوف کو بزرگان دین کی تمثیلات سے روشن کیا
ہے۔ مصنف بڑے عالی خاندان صاحب حال و قال بزرگ
تھے۔ شاعری اور موسیقی میں ماہرانہ دخل تھا۔ ایک ضخیم کتاب
شرح نزہۃ الارواح لکھی تھی۔ علم و فضل کی تعریف سن کر
اکبر بادشاہ نے مشتاقانہ طلب کیا اور آگرے میں ملاقات

کی سو سال سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔ مزار بلگرام میں ہے

ایک اور جامع کمالات شیخ یعقوب کشمیری صرفی گذرے ہیں کہ کشمیر کے چک رئیسوں کے خلاف محضر لکھنے اور مغل بادشاہوں کو فتح کشمیر کی تحریک دلانے میں ان کا نام پیش پیش تھا۔ وہ شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ اور شیخ ابن حجر جیسے نامور استاد حدیث کے شاگرد تھے۔ اسلامی ممالک میں دور دور سفر کیا اور مشاہیر علم سے مستفید ہوئے ان کی خانقاہ مرجع خاص و عام تھی۔ ہمایوں اور پھر اکبر بادشاہ کمال عزت سے پیش آتے تھے اور آگرے کے علمی حلقوں میں ان کی شرکت نعمت سمجھی جاتی تھی تفسیر، حدیث اور تصوف پر کئی اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھیں اور فارسی شعر و معمہ گوئی میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کی تعریف میں ان کا قطعہ فاضل موصوف کی فضیلت پر مہر کا رتبہ رکھتا ہے ۱۰۰۳ھ میں وفات پائی بدایونی نے شیخ امم بود سے تاریخ نکالی۔ اور اس شعر سے ماتم کا حق ادا کیا۔

درباری شعرا

اکبر جیسے فیاض اور بلند اقبال بادشاہ کے دربار میں شاعروں کی کثرت ہونا لازمی بات تھی۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور شیخ ابوالفضل ہی نے ایسے بیسیوں سخن گروں کے نام اور نمونہ کلام اپنی تاریخوں میں درج کیے ہیں ہم صرف چند منتخب درباری شعرا کے اجمالی تذکرے پر قناعت کریں گے۔

غزالی مشہدی۔ غالباً پہلا شخص ہے جسے ہندوستان کے مغلیہ دربار سے ملک الشعرا کا خطاب ملا کئی دیوان۔ اعلیٰ درجے کی مثنویاں اور قصائد لکھے تھے کہ اب ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ ایک قصیدے میں پہلے ہندسے سے سو تک جملہ اعداد کو نادر تر ین تشبیہات سے سجایا ہے مطلع یہ تھا

بہ یک سخن ز دو لعلت سہ فیض یافتہ‌ایم
حیات باقی و نطق فصیح و نشاۃ احیا

آزاد خیالی کی بنا پر وطن سے بھاگ کر دکن آیا وہاں سے خان زمان خان نے خلعت و سفر خرچ بھیج کر جونپور بلایا پھر دربار اکبری میں مزید انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ شعرائے ہمعصر میں قاسم کاہی اور قاسم ارسلان وغیرہ سے خوب نوک جھونک رہتی تھی ۹۸۰ھ میں بمقام احمد آباد گجرات انتقال ہوا۔ الحاد میں بدنام ہونے کے باوجود یہ مشہور عارفانہ شعر اسی سے منسوب ہے ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

ملا قاسم کاہی ہمایوں بادشاہ کے ہمرکاب کابل سے آیا تھا وطن کی تعریف میں ہندوستان کی مذمت کرتا ہے۔

کاہی تو بلبل چمن آرائے کابلی
زاغ و زغن نئی کہ بہ ہندوستاں شوی

لیکن یہیں رہا اور غالباً عہد اکبری میں اسے بھی ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ہمایوں کے انتقال کی مشہور تاریخ ع

ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

اسی کا کارنامہ ہے۔ خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ ایک غزل جس میں فیل کا تلازمہ ہے۔ فیل پسند اکبر کو بہت پسند آئی ایک لاکھ تنکہ صلہ عطا کیا۔ مطلع یہ تھا۔ ؎

تا بہ فیلان میل دیدیم دل ستانِ خویش را
صرف راہ فیل کردم نقد جانِ خویش را

کلام معمولی مگر نغمہ انگیز ہے کہ موسیقی میں کامل دخل رکھتا تھا

دو غزلیں جن کا لحن خود نکالا۔ ہندوستان بھر میں گائی جاتی تھیں۔

۱۔ مرغ تا بر فرقِ مجنوں پر زدن انگیز کرد
آتشِ سودائے لیلیٰ بر سرا د تیز کرد

۲۔ چوں زعکس عارضش آئینہ پر گل شود
گر دراں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

آخری بیماری کی خبر سن کر ایک دوست درد پلے باوجود کاہی کی عیادت کے لیے خیرآباد سے آگرے آئے ملا نے اسی حال میں فی البدیہہ ایک غزل کہی اور اس کی خاص راگنی تیار کی ؎

ماتمی قدم زناز بروئے نیاز من
دردے مباد پائے ترا سر و ناز من

شیری سیال کوٹی۔ موضع کوکووال کا رہنے والا اور ایک فاضل باپ کا نہایت ذہین بیٹا تھا اسے قدرتِ شعر گوئی پر فخر تھا کہ چار دیوان لکھ کر چناب میں ڈبو چکا ہوں۔ حقیقت میں اس کا فارسی کلام کسی اہل زبان سے کسی اعتبار سے کم نہ نکلے گا اور شکویات میں ملا عبدالقادر بدایونی کا قول ہے کہ کوئی ہمعصر اس سے بازی نہ لے جا سکا۔ اکبر کے دعوئے اجتہاد پر اس کا قطعہ انہی دنوں زبان زد ہو گیا تھا اور ہم نے گزشتہ باب میں نقل کیا ہے۔ زمانے کی حالت پر یہ قطعہ منتخب بدایونی سے انتخاب کرتے ہیں۔

گزشتگان ہمہ عشرت کنید کا سود دید
ازاں کہ عیش برافتاد از میانہ ما
ایا کساں کہ پس از ما رسید فاتحہ
بہ شکر آں کہ بتو دید در زمانہ ما

شریں کا دیوان عہد اکبری میں نہایت مقبول و مروج تھا۔ اب بھی بعض قلمی اجزاء ہندوستان اور برطانیہ کے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔

نور الدین ترخان

پاکستان کا ایک اور خوش گفتار شاعر نورالدین محمد ترخان (سفیدونی سرہندی) تھا۔ اگرچہ اس کی شعر گوئی کی شہرت فقط ایک ہجو سے قائم رہی جس میں حکام دہلی کا خاکہ اڑایا اور اپنا نام چھپایا تھا۔ مطلع یہ ہے۔ ؎

آہ زدہلی و مزارات | وہ زخرابی عمارات

صاحب علم و امتیاز شخص تھا اور ملا نورالدین باقی کی ہم نامی کے ساتھ ہم مقامی کا ادعا کرتا تھا اسی شیخی نے لوگوں میں ملعون کیا۔ ایک مرتبہ چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گرا سخت ضرب آئی۔ عیادت کرنے والوں سے کہنے لگا آپ حضرات گواہ رہیں۔ میں نے اس تشویش میں کئی باتوں سے توبہ کی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کن باتوں سے توبہ کی اس کا جواب نہ دیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی ستم ظریفی دیکھیے کہنے لگے: صاحب مناسب یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ شعر گوئی سے توبہ کریں۔

ملک الشعرا فیضی

لیکن جملہ شعرائے عصر میں خود بادشاہ کا عزیز ترین شاعر و ندیم ابوالفیض فیضی تھا ۹۵۴ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوا۔ بیس اکیس برس کی عمر میں دربار شاہی تک پہنچا اور اتنی ہی مدت کے بعد غالباً ۹۹۶ھ میں ملک الشعرا کا خطاب پایا۔ علمی مشاغل کی وجہ سے دو تین سفارتوں کے علاوہ کوئی مستقل عہدہ قبول نہیں کیا۔ لیکن بادشاہ کی خلوت کا

مقیم تھا اور اکثر شہزادوں کی تعلیم اسی کے سپرد کی جاتی تھی فارسی دیوان محفوظ و مشہور ہے۔ حسن بیان میں بعض غزلیں اساتذۂ پیشیں سے کمتر نہیں۔ بادشاہ کی فرمائش سے خمسۂ نظامی کا جواب لکھا۔ اس کی سب سے نفیس مثنوی نل دمن درسیات میں داخل تھی۔ اور ایران کے ادبیات عالیہ میں شمار ہونے کی مستحق ہے۔ فن ریاضی پر سنسکرت کی کتاب لیلاوتی اور مہا بھارت کے دو جز کا ترجمہ کیا تھا۔ مگر ان سب سے بڑھ کر علمی کارنامہ قرآن مجید کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام ہے۔ کہ لکھنے والے اور موضوع اور زبان عربی تینوں کا اعجاز کہیئے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایک اور کتاب بچوں کی پند و نصیحت کے لیئے بے نقط لکھی تھی اس کا تاریخی نام موارد الکلام سلک درالکلم ہے اگرچہ اسی سال ۱۰۰۴ھ کے شروع میں مصنف۔ علام نے وفات پائی اس لیئے ممکن ہے تاریخ کسی اور نے بعد میں نکالی ہو۔

فیضی کو اپنے علم و دانش پر ناز تھا اور اکبر جیسا جلیل القدر بادشاہ جس کی ناز برداری کرے وہ ناز نہ کرے تو کون کرے گا ایک موقع پر لکھتا ہے: ۔

آنم کہ فنون ذو فنونان دارم
انوار چراغ رہ نمونان دارم
ایں کالبدم زخاک ہندست ولے
در پیرہن موہزار یونان دارم

ملک الشعرا کا خطاب ملنے سے چند روز پہلے اور ممکن ہے بادشاہ کا یہ ارادہ سن کر ہی ایک قصیدہ تیار کیا جس کی تشبیب یہ تھی:۔

آں روز کہ فیض عام کردند　　مارا ملک الکلام کردند
از بہر صعود فکرت ما　　آرائش ہفت بام کردند

کہتے ہیں آخری مرض میں دمے کا سخت دورہ پڑا تو یہ رباعی لکھی جو عبرت کے احساس کا مرقع ہے:۔

دیدی کہ فلک بہ من چہ نیرنگی کرد
مرغ دلم از قفس بد آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے در و می گنجید
تانیم نفس برآ درم تنگی کرد

ملا عبدالقادر بدایونی

فیضی اور ابوالفضل کے ہم درس و ہم عصر ملا عبدالقادر بدایونی تھے جن کی تاریخ (منتخب التواریخ) کی ہمہ گیر شہرت نے ان کی علمی فضیلت کو ماند کر دیا ورنہ علوم دین اور فنون رائجہ میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں جیسا کہ ملا محمد یعقوب کشمیری کے بیان میں ہم اوپر دیکھ آئے ہیں ۹۴۷ھ میں اجمیر[1] کے ایک موضع میں پیدا ہوئے۔ خاندانی وطن بدایوں

---

[1] ملا عبدالقادر بدایونی (ابن ملوک شاہ ابن حامد فاروقی النسل) موضع ٹونڈہ میں پیدا ہوئے جس کو ٹوڈا بھیم بھی کہتے ہیں جو کہ بساور کے قریب ہے یہ صوبہ اجمیر سے متعلق نہیں تھا بلکہ صوبہ آگرہ سرکار آگرہ سے متعلق تھا جس کا تفصیلی حال آئین اکبری میں موجود ہے۔ اس سے بہتر کوئی دوسری شہادت نہیں ہو سکتی۔ آگرہ سے ٹونڈہ چھٹی منزل پر ہے۔ آج کل یہ قیام ریاست جے پور میں ہے) (آئین اکبری جلد اول (حصہ دوم) منتخب التواریخ - دربار اکبری - اکمل التواریخ قلمی (سوانح ملا عبدالقادر بدایونی) تاریخ سادات بھیتہ در)

تھا آخر عمر وہیں گزری۔ وہیں ۱۰۰۴ھ میں تاریخ کی تکمیل کے ساتھ حیاتِ مستعار کی تکمیل ہوئی۔ تیس اکتیس برس کی عمر میں آگرے آئے اور بادشاہ کے ساتھ اماموں میں شامل اور حاشیہ نشینوں میں داخل کیئے گئے۔ اکبر کے حکم سے پہلے سنگھاسن بتیسی کا ایک پنڈت کی مدد سے ترجمہ کیا جو نامۂ خرد افزا کے تاریخی نام سے موسوم و مقبول ہوا۔ پھر مہابھارت، راماین راج ترنگنی وغیرہ کئی کتابوں کے ترجمے میں شریک غالب رہے معجم البلدان کے چند اجزا عربی سے فارسی میں منتقل کیے تاریخ الفی کی ترمیم و تصحیح کی۔ بادشاہ آزاد خیالی کے دور میں ملا صاحب سے کھٹک گئے تھے مگر ان کی تالیف اور ترجموں پر اکثر انعام دیتے اور خوش ہوتے تھے حتیٰ کہ خود ملا صاحب دربار کی فضا سے بیزار اور بادشاہ پرستی کے باوصف اکبر کی وسعت پرواز سے تنگ دل ہو کر زمانہ لطین ہو گئے۔ آخری زمانہ اسی تنگی ترشی میں گزار کر ملک بقا کی راہ لی۔

ان کی تاریخ کا پہلا حصہ سلاطین دہلی کے احوال میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ قدیم اہل علم اور شعرا کا کلام بڑی تلاش سے جمع کرتے ہیں۔ بابر کی آمد کے وقت سے کتاب اور بھی متنوع ہو گئی ہے اکبری واقعات لکھنے میں زیادہ تر نظام الدین بخشی کی تاریخ طبقات اکبری سے مدد لی تھی۔ لیکن اصلی دل کشی لوگوں کے شخصی احوال و اقوال سے پیدا ہوئی کہ وہ چار سو برس پہلے کی صحبتیں پڑھنے والے کی آنکھوں میں اسطرح پھرنے لگتی ہیں گویا وہ خود اسی عہد میں موجود اور اکبر کے امرا، علما اور شعرا کی باتیں سن رہا ہے یہ کمال غالباً کسی فارسی تاریخ نویس کے حصے میں نہیں آیا۔ ملا صاحب تبحر علمی کے ساتھ راسخ العقیدہ سنی مولوی ہیں اور اپنے زمانے کی بدعات والحاد کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ فطری ذہانت نے انھیں ایسا بیباک نقاد بنایا تھا کہ اچھے اچھے مدعی ان سے جھینپتے اور جھجکتے تھے مگر اپنے نفاق و تصنع کو ان سے چھپا نہ سکتے تھے۔ ایسے ریاکار مشائخ اور دنیا ساز علما کی انھوں نے خوب قلعی کھولی اور سخت مذمت کی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اکابر دین و بزرگان دین کی شان میں بے ادبی کرتے تھے۔ ملا صاحب نے ان کے ڈھیلوں کے جواب میں پتھروں کی بارش کر دی۔ بایں ہمہ ان کی راست گوئی اور دیانت پر کسی کو حرف زنی کی مجال نہیں ہوئی۔ اور محمد حسین آزاد کو بھی عہد اکبری کا کوئی ماخذ انکی کتاب سے بہتر نہیں مل سکا۔

علامی ابوالفضل

ملا اکبر کا خاص شاہی مورخ فیضی کا بھائی ابوالفضل تھا ۹۵۸ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوا بچپن سے اتنا ذہین تھا کہ لوگ تعجب کرتے تھے۔ ملا مبارک جیسا ذی علم باپ پڑھانے کو ملا۔ چند ہی سال میں علوم رسمی کی تکمیل کر لی فیضی کی سفارش سے سنہ ۹۸۱ھ میں حاضر دربار ہوا اور بہت جلد بادشاہ کا ایسا تقرب حاصل کیا کہ قدیم امیروں کو رشک آتا تھا بیستی سے چل کر سب سے بڑے منصب پنج ہزاری تک ترقی کی لیکن اس سے بھی بڑھ کر اعتماد و رسوخ کا یہ درجہ ملا کہ اکبر کا کوئی کام بغیر اس کے مشورے کے سرانجام نہ پاتا تھا۔ میر منشی یا وزیر خاص کی حیثیت سے جملہ احکام شاہی اسی ملائے مکتبی کے قلم سے نکلتے تھے۔ تمام نئی اصلاحیں اور جدید آئین اسی کی رائے سے مرتب ہوتے تھے شاہی محکمے اور کارخانے کیا فوجی کیا دیوانی سب کی نئی تنظیم اور مناصب وغیرہ کی مفصل تقسیم اور درجہ بندی اسی کے قلم سے ہوئی اور چھوٹے سے لے کر بڑے عہدوں کے نام تک اس کی ذہانت نے بدل ڈالے

اگرچہ بہت سے رواج عام نہ پا سکے مگر اکبر نامے میں محفوظ ہیں۔

ابوالفضل عربیت اور شعر گوئی میں فیضی کی مثال نہ تھا۔ لیکن فارسی انشا پردازی میں نظیر نہیں رکھتا تھا اور اسکی تاریخ اکبر نامہ نثر کا ایسا کارنامہ ہے جس کی ممالک ہند و ایران میں کوئی نقل تک نہ کر سکا انشائے ابوالفضل جو مکاتیب کا مجموعہ ہے فارسی کی اعلیٰ درسیات میں اب تک پڑھائی جاتی ہے یہ لفظوں کی دقیق صناعی کا نمونہ ہے۔ مصنف کی نگارش کا اصلی کمال وہی اس کی تاریخ نگاری ہے کہ واقعات کو ایسی ندرت اور خوبی سے لکھتا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اسی کتاب (اکبر نامہ) کا تکملہ دفتر آئین اکبری عام معلومات کا خزانہ اور ابوالفضل کی عالی دماغی کی لافانی یادگار ہے۔ کلیلہ دمنہ کے فارسی ترجمے انوار سہیلی کو بادشاہ کے حکم سے سادہ عبارت میں ازسرنو لکھا تھا یہ عیار دانش کے نام سے مشہور ہے ابوالفضل کے دنیاوی اعزاز و جاہ کا بڑا سبب اس کی بادشاہ پرستی تھی۔ اکبر کی خوشنودی کو اس نے گویا زندگی کا مقصد و مآل بنا لیا تھا اسی سے وہ ہمعصروں میں محسود و مطعون ہوا بلکہ اپنی جان سے گذر گیا۔ بے لاگ نقادوں نے اس کی سیرت کی بڑی کمزوری یہی بتائی ہے کہ جدھر بادشاہ کا رخ دیکھتا تھا اسی طرف دوڑتا ہوا چلنے لگتا تھا جب اکبر نے تقلید چھوڑ کر مذہبی آزادی کے صحرا میں قدم رکھا تو ابوالفضل ہی اس کا رفیق طریق تھا۔ دین الٰہی کے عقائد اور قواعد اسی نے قلم بند کیے اور نئے مذہب کا خلیفہ اول قرار پایا حالانکہ بعض رقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر وہ ان عقائد کو مہمل یا غلط سمجھتا تھا یہ ثبوت ہے کہ جو لوگ اسے ریاکاری اور دنیا سازی سے بادشاہ کو غلط راستے پر لے جانے کا الزام دیتے تھے وہ بے بنیاد نہ تھا۔

مشہور ہے کہ امرا نے اسے اکبر سے دور پھینکنے کی خاطر دکن کی مہمات پر بھجوایا تھا۔ (۱۰۰۶ھ) وہاں کا انتظام عبدالرحیم خان خاناں اور شہزادہ مراد کے ہاتھ میں تھا ابوالفضل نے بعض معرکوں میں بہادری کے جوہر دکھائے اور ثابت کیا کہ ملازادہ قلم کی طرح تلوار چلانا بھی جانتا ہے۔ لیکن خان خاناں نے اسے بہت زچ کیا اور بادشاہ کے نام ملا کی کئی عرضیاں مقامی حکام کی شکایت سے لبریز ہیں۔ چار سال بعد اکبر نے واپس طلب کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ جہانگیر کی سرکشی سے اکبر ناراض تھا اور بادشاہ کا یہ رجحان دیکھ کر ابوالفضل نے اس شہزادے کی نسبت اکبر نامے اور بعض رقعات میں ایسے الفاظ لکھے جو اس عہد کے آداب کے سراسر خلاف نظر آتے ہیں جہانگیر غصے سے بیتاب ہو گیا۔ بندیل کھنڈ کے راج کمار بیر سنگھ دیو کو جو ان دنوں قزاقی کرتا پھرتا تھا پیغام بھیجا کہ اگر ابوالفضل کو واپس آتے میں مارا تو آئندہ راج پاٹ کا تجھی کو وارث بنا دوں گا بیر سنگھ گھات میں رہا۔ ابوالفضل کو بھی خبر ہو گئی تھی لیکن بادشاہی تقرب کے بھروسے پر کسی مشیر کی بات نہ مانی اور مختصر جمعیت سے سفر جاری رکھا۔ گوالیار کے قریب بندیلوں نے چھاپا مارا۔ ابوالفضل بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا (۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) بیر سنگھ دیو نے سر کاٹ کر شہزادے کو الٰہ آباد بھیجا۔ جہاں اس کی اور تذلیل و تشہیر کی گئی۔ اکبر کو اس سانحے کی آگرہ میں اطلاع ملی تو کئی دن تک سخت ماتم کیا اور کئی بار کہا کہ بادشاہی لینی تھی تو مجھے قتل کرنا تھا ابوالفضل کو ناحق مارا۔

حکیم ابوالفتح اور شاہ فتح اللہ

اکبری دربار کے کئی حاذق حکیموں کا ذکر آتا ہے مگر ان میں حکیم ابوالفتح گیلانی کو امتیاز خاص حاصل تھا یہ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ ایران سے آئے اور بہت جلد بادشاہ کے معزز ندیموں میں داخل ہوگئے شیخ بوعلی سینا کی کتاب قانون پر اعلیٰ درجے کی شرح لکھی ہے۔ حدیث اور اخلاق کے چند رسالوں کے علاوہ مکتوبات کا ایک مجموعہ چار باغ انشاپردازی اور تبحر علمی کی یادگار ہے۔

ایک اور یگانۂ روزگار شخص فتح اللہ شیرازی تھے کہ علم و فضل کی شہرت سن کر بادشاہ نے دربار بیجاپور سے مستعار لیا اور عضد الدولہ امین الملک خطاب دے کر بڑے بڑے عہدوں و عہدیات پر مقرر کیا۔ انھیں علوم رسمی کے علاوہ ریاضیات جر ثقیل طبیعیات و ہیئت میں کمال حاصل تھا۔ زیچ اکبر شاہی تیار کی جو آئین اکبری میں شامل ہے۔ بعض کلیں اور نئی قسم کی توپیں بندوقیں بنائی تھیں ایک مبسوط تفسیر لکھی جس کا صرف نام ملتا ہے۔ اصل کتاب مفقود ہوگئی۔ ۹۹۷ھ میں انتقال کیا۔ فیضی نے قطعۂ وفات لکھا جس کا مطلع مشہور ہے ؎

شہنشاہ جہاں را در وفاتش دیدہ پر نم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطون زعالم شد

خان خانان عبدالرحیم خان

مغل امرا میں بڑے بڑے صاحب ذوق علم دوست امیر گزرے ہیں۔ خان خانان بیرم خان فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھا۔ خان زماں خاں والی جونپور جیسا تلوار کا دھنی تھا ویسا ہی شاعری کا دلدادہ تھا خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کبھی کبھی شعر کہتا۔ مگر خوب کہتا تھا ان خوش مذاق امیروں میں بھی جو شہرت عبدالرحیم خان کو حاصل ہوئی وہ کسی کے نصیب میں نہ آئی اور بلا شبہ وہ اس کا مستحق تھا۔ اس کی ذات علم و ادب کا مخزن و مامن تھی جس کے سائے میں ارباب کمال پرورش پاتے اور علم و فن سرسبز ہوتے تھے ان آثار خیر و برکت کی گواہ مآثر رحیمی ہے کہ خان خاناں کی شان میں بہت سے شعرا نے جو قصیدے لکھے ان کا انتخاب تعریف و تعارف کے ساتھ جمع کیا ہے۔ وہ بیرم خان کا فرزند تھا۔ میواتی بیوی سے ۹۶۴ھ میں پیدا ہوا اور نہایت حسین و جمیل نوجوان تھا۔ بہترین تعلیم پائی عربی۔ فارسی ترکی زبانوں کے علاوہ ہندی (اور سنسکرت) سے عمدہ واقفیت بہم پہنچائی۔ چنانچہ ہندی دوہے فارسی اشعار سے زیادہ تعداد میں زبان زد ہوئے تزک بابری کا مکرر فارسی ترجمہ اس کا علمی اور تاریخی کارنامہ تھا جو اب تک مقبول ہے بڑا وصف یہ کہ داد و دہش میں کوئی امیر و بادشاہ اس کا عدیل نہ تھا۔ ایک ایک شعر پر ہزار، ہزار اشرفی اور معمولی حسن خدمت پر دولت کے انبار عطا کرنا معمولات میں شامل ہو گیا تھا جس کے عجیب عجیب قصے تاریخوں میں مذکور ہیں۔ بہت سے اہل علم اور شعرا کے منجملہ نظیری نیشاپوری اور آخر میں عرفی شیرازی کی وہ سرپرستی کی جو شاہی درباروں میں بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ یہ ایرانی اساتذہ کے صف اول کے شاعر ہیں۔ نظیری رئیس المتغزلین کہلاتا ہے۔ عرفی انوری اور خاقانی کی ٹکر کا قصیدہ نگار ہے اول دربار اکبری میں آیا تھا فیضی نے بہت خاطر مدارات کی مگر وہ فیضی ہی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس کی مدارات کو کیا مانتا۔ کچھ مدت فتح اللہ شیرازی کا ندیم رہا۔ پھر عبدالرحیم خان

خانان کی سرکار میں وہ عزت و راحت پائی جو اور کہیں میسر نہ آئی تھی عبدالرحیم خان خاناں نے ہفت ہزاری منصب تک ترقی کی جو پہلے کسی امیر وزیر کو نہ ملا تھا۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں انتقال کیا اور دہلی کے قریب ایک مقبرے میں جو ٹوٹنے کے باوجود عظمت کی خاص شان دکھاتا ہے مدفون ہوا۔

ہندی شاعری

ادبیات فارسی کی طرح اسی دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) برج بھاشا کی شاعری نے فروغ پایا اسے وسطی ہندی کے دور سے منسوب کرتے ہیں۔ صدی کے آغاز میں اس کا آغاز ولبھ آچاری نے کیا۔ یہ دکن سے آیا اور گوکل یعنی متھرا کے قریب چھاؤنی رمائی۔ کرشن اور رادھا کے عشق و محبت کا یہی مقام تھا اسی محبت کے فلسفے پر ولبھ چاری نے اپنی مذہبی تعلیمات کی بنیاد رکھی تھی بہت لوگ اس کے مرید ہوئے اور ان کے بھجن شمالی ہند کے اقطاع میں جگہ جگہ گائے جانے لگے۔ ان کی زبان برج ہی کی بولی تھی بھجن کہنے والوں میں آٹھ استاد مشہور ہوئے جن میں سورداس ممتاز تھا۔ وہ اکبری عہد میں گزرا اور ایک بڑی کتاب سور ساگر یادگار چھوڑ گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی برج بھاشا کی شاعری کا سب سے بہتر نمونہ تھا اس پر کسی شاعر کو فضیلت حاصل ہوئی تو وہ تلسی داس ہے جسے ہندی کا بہترین شاعر مانا جاتا ہے۔ وہ بھی اکبر کے زمانے میں پھولا پھلا اور عہد جہانگیر میں اس کا کلام نہایت مقبول ہوا۔ ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء میں وفات پائی رام چرت مانس جسے عرف عام نے رامائن تلسی داس معروف کیا اسی کا شاہکار تھا۔ جس میں والمیکی رامائن کو مروجہ زبان کا لباس پہنایا اور ایسے دلکش انداز میں رام چندر جی کے حالات سنائے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی مشہور نظم کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے

عہد جہانگیر

حکومت میں استقلال اور عام سیاسی اطمینان کا زمانہ ہے۔ اسی مناسبت سے ہم عقائد میں استحکام و استقامت کا رنگ دیکھتے ہیں اور اس دور کی اصلاحی تحریکات کا شاہی نمائندہ عالمگیر کو کہہ سکتے ہیں۔ اکبر کے اکثر مسلم آزار احکام کو جہانگیر نے منسوخ کر دیا لیکن عقائد کی عام پراگندگی اور بے راہ روی کا سدباب زیادہ گہری اصلاح کا محتاج تھا۔ اس خدمت کا جن علمائے حق نے صدی کے آغاز میں بیڑا اٹھایا ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نام نامی سب سے زیادہ روشن ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ کا خاندان سلاطین خلجی کے عہد میں بخارا سے آیا اور پائے تخت دہلی میں بس گیا تھا۔ ان کے والد ماجد شیخ سیف الدین صاحب حال بزرگ تھے۔ شیخ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے علم کی تشنگی تھی علوم رسمی کی تکمیل کے بعد چند سال اکبر کی علمی صحبتیں دیکھیں۔ بدایونی نے علمائے عصر میں ان کا تذکرہ کیا ہے پھر حجاز گئے اور بڑے بڑے اساتذہ سے حدیث کی سند اور بزرگان صوفیہ سے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ واپس وطن آکر درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا اور پچاس سال سے زیادہ دین کی آبیاری کی کہ ایسی توفیق الٰہی کسی کو کم نصیب ہوتی ہے۔ ان خدمات عالیہ کا جیتے جی علمی دنیا میں اعتراف شاہی درباروں میں اعزاز کیا گیا۔ قضا و قدر نے بھی عمر میں وسعت عطا کی ۹۴ سال کے سن میں انتقال

ہوا۔ فخر العالم تاریخ وفات (۱۰۵۲ھ) ہے۔

شیخ کی تصانیف کی کل تعداد سَو سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ ان میں مشکوٰۃ کی شرح (عربی پھر فارسی) تاریخ مدینہ (جذب القلوب) مدارج النبوۃ شرح سفر السعادۃ تکمیل الایمان اخبار الاخیار آج تک نہایت مقبول و متداول ہیں۔ سلاطین اور علمائے دہلی کے حال میں ایک مختصر تاریخ ذکر الملوک لکھی تھی۔ تصوف اور عقائد میں بہت سے رسالے محفوظ ہیں مگر آپ کا اصلی کارنامہ حدیث کی تعلیم و اشاعت سمجھا جاتا ہے۔ کلام یا فقہ کے نزاعی مسائل میں شیخ عموماً وسطی راہ اختیار کرتے ہیں اور سخت اختلاف کی صورت میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ علوم دین کی نشر و تدریس کا سلسلہ آپ کی اولاد نے ایک زمانے تک جاری رکھا اور اس خاندان کے شاگردوں نے اسے ہند و بیرون ہند میں دور دور تک توسیع دی۔

حضرت محدث دہلوی نے اعلیٰ درجے کا تعلیمی کام کیا

حضرت مجدد الف ثانی

لیکن دماغوں میں فلسفۂ وحدت وجود کی حدت از رہائے عقائد کی شرارہ انگیزی سے جو فساد پک رہے تھے ان کا علاج ٹھنڈی تدبیر اور ملکی تدبیر سے نہ ہو سکتا تھا بہت تیز تنقیہ کی ضرورت تھی اس عمل کے لیے حکیم مطلق نے ایک صوفی عالم کو پیدا کیا جو صدی کے بجائے ایک ہزار سال کی اصلاح و تجدید کا دعویٰ کرتا ہے اور بڑے بڑے اہل علم و عرفان تائل و اختلاف کے بعد اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ بزرگ شیخ احمد سرہندی تھے ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم دین کی تعلیم سیالکوٹ و لاہور میں پائی چشتیہ سلوک کا راستہ والد نے (جو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مرید تھے) طے کرایا۔ صدی کے آخری سنین میں آگرہ صاحبان علم و فضیلت کا بین الملّی مرکز بن گیا تھا۔ کچھ زمانہ وہاں گزرا اور معتبر تذکروں میں لکھا ہے کہ ابو الفضل و فیضی نے آپ کی علمیت اور ذہانت کی داد دی بلکہ تفسیر (سواطع الالہام) کے لکھنے میں کہیں کہیں مدد لی۔ لیکن روحانی قوا کا نشو و نما خواجہ باقی باللہؒ کی توجہات سے نقشبندیہ طریق میں مقدر تھا۔ اسی نسبت نے آپ کو مدارج عالیہ تک پہنچایا اور تجدید ملت کا بزرگ منصب دلوایا۔

اکبری اور جہانگیری دربار میں ایرانی امراء چھائے ہوئے تھے ان کا سایہ شیعہ فلسفے کو پروان چڑھاتا۔ اندر ہی اندر دور تک جڑیں پھیلاتا تھا۔ موروثی بادشاہ یا روسا سنیوں کی خلافت میں انتخابی شرط سے طبعاً گھبراتے ہیں۔ کہ ان کے حق وراثت پر ضرب لگتی ہے طریق امامیہ اور عقائد خواص کے مزاج اور عوام (اہل ہند) کے جذبات سے بظاہر موافقت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہر طبقے پر ایران کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا تھا حضرت مجددؒ نے پہلے انھیں کے رد میں ایک رسالہ تحریر کیا۔ اور خاص خاص درباری امیروں کی دشمنی مول لی کہتے ہیں آگے چل کر نورجہاں بیگم انھیں دشمنوں میں شریک ہو گئی اور بالآخر اس گروہ نے بادشاہ کو حضرت مجددؒ سے بدگمان کر دیا۔ جب دربار میں طلب ہوئے تو دوستوں کے کہنے سننے کے باوجود آپ نے زمین بوسی نہیں کی اور بادشاہ کے سوالات کا جواب بھی ایسے لہجے میں دیا کہ اس نے بگڑ کر آپ کو قلعہ گوالیار میں قید کیا۔ اور (تزک میں) ناروا الزام لگائے (۱۰۲۸ھ) دوسرے سال رہائی کے بعد آپ دو تین برس اور شاہی لشکر میں رہے اور معلوم ہوتا ہے رفتہ رفتہ جہانگیر آپ کی فضیلت و بزرگی کا معترف ہو گیا عمر کے آخری ایام وطن مالوف

میں گزارے (۱۰۳۴ھ) میں وہیں انتقال کیا۔

حضرت مجددؒ کی تصنیف سے دو تین رسالے اور (پانسو سے زیادہ) مکتوبات کے تین دفتر مرتب ہوئے۔ ان میں سے کئی مکتوب مستقل مقالات کی شان رکھتے ہیں۔ یہ دفتر بہت جلد اسلامی ممالک میں شائع ہو گئے تھے اور فارسی کی ان گنی چنی کتابوں میں ہیں جن کا عربی میں ترجمہ مقبول مطبوع ہوا لیکن روحانیات کے باریک رموز اور بلند معارف سے قطع نظر یہاں ہمارے مطلب کے مکتوبات وہ ہیں جن میں فاسد عقائد و بدعات کا اس قوت سے بطلان کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی روح شاد ہو گئی ہو گی ایسی جامع انشا پردازی غالباً فارسی زبان کی کسی دینی تصنیف میں نہ ملے گی۔ بڑا کارنامہ یہ کہ وحدت وجود کو طریقت کی محض وسطی منزل قرار دیا۔ اور ثابت کیا کہ مسلمان صوفی کی منتہا وحدت شہود ہے جہاں عبد و معبود کا امتیاز اور کفر و اسلام کا فرق بدیہی ہو جاتا ہے قرآن و سنت کی پابندی لازمۂ حیات بن جاتی ہے۔ شریعت کا یہی اتباع ایمان و عرفان کی کسوٹی ہے جو اس راستے سے ہٹا اس کے کشف و کرامت خرق عادت سب شعبدے ہیں۔ ضمناً مجدد صاحبؒ نے محی الدین ابن عربی اور وحدت وجود کے دوسرے داعیوں پر شدید تنقید کی اور بیباک صوفیوں کا مسکت دلائل سے ایسا منہ بند کیا کہ پھر کسی صاحب علم شخص کو تاویل و تجدید کے بغیر یہ فلسفہ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تصوف کا ایک نیا مشرب مجددی نقش بندی کے نام سے اکثر اسلامی ملکوں میں جاری ہو گیا صدہا علمائے دین آپ کے یا آپ کے خلفا کے حلقۂ ارشاد میں آئے۔ اور علمی عملی دونوں اعتبار سے یہ فرقہ ایسا چمکا کہ دوسرے ماند پڑ گئے۔ حضرت مجددؒ کے خلف ارشد خواجہ محمد معصومؒ سے عالمگیر نے کسب فیض کیا اور ان کے صاحبزادے اکثر آتے اور بادشاہ کے پاس غائبانہ قیام فرماتے رہے۔

دوسرے علمائے عصر

پچھلے انقلابات کی آندھیوں نے ہزاروں کتابیں ورق ورق برباد کر دیں۔ پھر بھی گیارہویں صدی کی باقیات کا ایک بڑا ذخیرہ ممالک ہند و فرنگ میں بکھرا پڑا ہے جو علم کے عام شوق و اشاعت کی دلیل ہے۔ فارسی کے حیرت انگیز فروغ کا ثبوت ہے جو ان دنوں مسلم و غیر مسلم سب کی تعلیمی اور تصنیفی زبان بن گئی تھی۔ فارسی تاریخوں اور تذکروں میں صدہا اہل قلم کے نام آتے ہیں اور زمانۂ قریب میں کئی اردو رسائل و کتب میں اکثر مشاہیر کے حالات شائع ہوئے ہیں۔ ہم کتاب کی مناسبت سے معدودے چند افراد کی صرف یاد تازہ کرنے پر قناعت کریں گے۔

جہانگیر و شاہجہاں کے عہد میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بڑی ناموری پائی۔ عام انعام و معاش کے علاوہ دو مرتبہ شاہجہاں نے ہم وزن روپیہ علمی خدمات کا صلہ پیش کیا۔ سو برس بعد علامہ آزاد بلگرامی نے سفر حجاز سے واپس آ کر گواہی دی تھی کہ ملا صاحب کی متعدد تصانیف بلاد عرب و عجم میں دائر و سائر ہیں۔ ہمارے زمانے میں حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری نے ممالک اسلامی کی سیر کی تو ڈھائی سو برس گزرنے پر بھی ان کی افادیت و قبولیت میں فرق نہ آیا تھا۔ ۱۰۶۷ھ میں انتقال ہوا انہیں کے ہمعصر ملا محمود جونپوری گزرے ہیں۔ (وفات ۱۰۶۲ھ) کہ علم ہیئت میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے ان کی کتاب شمس بازغہ قدیم مدارس میں اب تک داخل نصاب تھی۔ ایک صوفی مصنف شیخ

محب اللہ الہ آبادی نے نصوص الحکم کی ضخیم شرحیں لکھیں لیکن زیادہ شہرت ایک مختصر رسالے تسویہ کی اشاعت سے ہوئی جس پر عالمگیر کے عہد میں دار و گیر کی گئی تھی۔ ان کے بہاری ہم نام کا کچھ مدت بعد معقولات میں نام بلند ہوا۔ ان کی دو کتابیں سلم العلوم (منطق میں) اور مسلم الثبوت (اصول فقہ میں) ایک زمانے تک درسیات میں شامل رہیں۔ اسی اواخر صدی کے میر محمد زاہد اور شیخ احمد عرف ملا جیون لائق ذکر ہیں۔ میر زاہد عالمگیر کے محکمۂ احتساب کے سب سے پہلے محتسب منتخب ہوئے زہد و تمدین کے ساتھ کئی علمی حواشی ان کی یادگار ہیں۔ ملا جیون تفسیر احمدی اور (اصول فقہ میں) نور الانوار کے مصنف تھے۔ مگر علمی فضیلت اور استادی سے بڑھ کر ان کی سادہ دلی اور گنوارپن کے قصے گھر گھر مشہور رہے۔

فتاوی عالمگیری

زیر نظر صدی بلکہ عہد مغلیہ کا ایک علمی ملی کارنامہ فتاوی عالمگیری کی تدوین ہے کہ بیس اکیس ممتاز علما کی مشترکہ محنت سے عمل میں آئی۔ یہاں بھی اکبر و عالمگیر کی افتاد طبع کا فرق نظر آتا ہے کہ وہ تاریخ الفی کی تالیف یا مہابھارت وغیرہ سنسکرت کتابوں کے ترجمے کے لیے اہل علم کو جمع کرتا تھا۔ اور یہ پوتے نے فقہ اسلامی کی یہ مفید و جامع کتاب لکھنے کے لیے جماعت علما کی تنظیم کی۔ آٹھ سال تک مسلسل کام اور دو لاکھ روپے خرچ ہوئے تیاری اور نظر ثانی کے بعد خود عالمگیر کو مسودات سنائے جاتے تھے اور کئی مثالیں محفوظ ہیں کہ معمولی فرو گذاشت بھی اس نقاد بادشاہ کی گرفت سے نہ چھوٹتی تھی۔ جماعت کے صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے اور ان کے ماتحت چند حصوں میں الگ الگ ذیلی جماعتیں کام کرتی تھیں۔ فقہ کی حتی الامکان تمام معتبر کتابیں مہیا کی تھیں۔ ایک ایک مسئلے کی اچھی طرح چھان بین کر کے سابقہ فتوے ضروری توضیح و تصریح اسناد کے حوالوں سے قلمبند کیے جاتے تھے تدوین کرنے والوں میں اکثر حضرات بہار اور اودھ کے مشہور فاضل تھے۔ تین چار نام دہلی لاہور اور دو ٹھٹہ (سندھ) سے نسبت رکھتے ہیں۔

مورخ اور شعرا

فارسی کی بہت سی تاریخیں انشا کی کتابیں شعرا کے بیسیوں دیوان گیارہویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ابو القاسم فرشتہ کی خوش قسمتی کہ شروع سے انگریز حاکموں میں مقبول ہو گیا تھا۔ مگر تاریخ ہند کی بدنصیبی کہ اس کے غلط ترجموں نے کئی انگریز تاریخ نویسوں کو گمراہ کیا۔ فرشتہ کی قبولیت کی وجہ اس کی تحقیق سے بڑھ کر انشا پردازی قرار دی گئی ہے شمال میں جہانگیر نے سنت بابری کی تجدید کی۔ بعض مورخ ابو الفضل کے راستے پر چلتے رہے مگر دونوں کوششیں اصل و نقل کا فرق رکھتی ہیں تاہم عبد الحمید لاہوری کا شاہجہاں نامہ اور ملا محمد صالح کی عمل صالح اس دور کی مشرح اور مسجع رودادیں جن کے مقابلے میں بعد کے سادہ نگار کچھ وزن نہیں رکھتے ان ہی میں دو ہندو تاریخ نویس قابل ذکر ہیں۔ بندرا بن داس صاحب لب التواریخ اور سجان رائے صاحب خلاصۃ التواریخ جو بٹالے کا رہنے والا تھا۔ یہ دونوں کتابیں عالمگیر کے آخری سنین میں خافی خان کی تاریخ سے پہلے لکھی گئی تھیں شعرائے دربار میں جہانگیر نے طالب آملی کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا اس کی تعریف میں اس کا ایک قصیدہ ملک و امرا کی مدح سے زیادہ پسندیدہ ٹھیرا۔ تین شعر یہ ہیں۔

گاہے در دو ئمیں سیف لسان الشعرای

گاہے ششم انگشت کرام النورای

زیر قدمت فرش ورق ہائے زر افشاں
از جنس سمرقندی واز قسم خطائی
یا آن کہ بریدہ است سر بر درِ زبانت
صد نغمہ سرائی ہمہ رمزی درادای

ایک مزے کا قطعہ وہ ہے جس میں بادشاہ کی ڈاڑھی منڈانے کی فرمائش پر عذر کیا تھا۔

سفر می کنم صاحبا ورنہ من
چہ سر بلکہ گردن تراشیدمے

طالب جوانی میں انتقال کر گیا (۱۰۳۶ھ) ایک اور شاعر حیاتی کاشی کی شہرت کا سبب یہ ہوا کہ امیر خسرو کی تاریخی مثنوی تغلق نامہ کے ابتدائی ورق مفقود ہو گئے تھے۔ جہانگیر کی فرمائش سے حیاتی نے حمد و نعت اور مدح بادشاہ سے آغاز کتاب کی رسمی تکمیل کر دی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر زر سرخ و سپید میں تلوایا۔ اور چھ ہزار اشرفی اور روپیہ صلہ دیا۔ سعیدائے گیلانی نے ایک قطعے میں یہ واقعہ نظم کیا اور شاعر سنجیدہ شاہ سے تاریخ نکالی ہے کچھ مدت ہوئی مثنوی تغلق نامہ (حیاتی کے اشعار کے ساتھ) حیدرآباد دکن سے شائع کی جا چکی ہے۔

شاہ جہاں کے عہد میں قدسی اور اس کے انتقال کے بعد کلیم ملک الشعرا بنائے گئے دونوں کو ہم وزن روپیہ انعام ملا۔ بلکہ کلیم کو ایک بار دگنا یعنی دس ہزار صلہ عطا ہوا۔ یہ دونوں سخن ور ایران سے آئے تھے۔ مگر ان کا ہمعصر شیدا اکبر آباد کے مضافات میں پیدا ہوا اور حق یہ ہے کہ کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے اس کا کلام ان دونوں سے کم تر نہ نکلے گا۔ لیکن شیدا وارستہ مزاج سا آدمی تھا قدسی پر اس کی خردہ گیری اور دوسرے شعرا سے مناظروں کا تذکرہ آتا

ہے ایک خمریہ قصیدے کا مطلع مشہور ہے جس پر علما نے کفر کا فتویٰ دے ڈالا تھا۔

چیست دانی بادۂ گل گوں بمصفا جو ہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

شاہ جہاں خارج البلد کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ ہارے شاعر نے ایک منظوم معذرت لکھ کر معافی حاصل کر لی۔ کہتے ہیں ایک لاکھ شعر لکھے مگر دیوان مرتب نہیں کیا۔ اس کے عذر میں بھی تعلی کرتا ہے۔

شعر برجستۂ شیدا ہمہ جا مشہور است
نیست حاجت کہ بہ دیوان مرتب نگرید

اکبرآباد ہی کا ایک اور صاحب دیوان شاعر شیخ محمد علی ماہر تھا۔ اسکا نعتیہ کلام خاصا مقبول اور جہاں آرا بیگم کی مدح میں مثنوی کا یہ شعر زبان زد ہو گیا تھا۔

بہ ذات او صفات کردگار است
کہ خود پنہان و فیضش آشکار است

مست ہاتھی کے مقابلے میں شہزادہ اورنگ زیب (لڑکپن میں) ڈٹ گیا تھا۔ اس کی سلامتی کا بادشاہ نے جشن کیا۔ بہادر بیٹے کو سونے میں تلوا کر پانچ ہزار اشرفیاں فقیروں میں تقسیم کرائیں۔ سعیدائے گیلانی نے ایک نفیس مثنوی لکھ کر سنائی اور حیاتی کاشی کی طرح (جس کے لئے قطعۂ تاریخ لکھا تھا) خود بھی ہم وزن روپیہ انعام پایا اسی دور میں شہزادہ دارا شکوہ کا میر منشی چندر بھان برہمن فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا اور حق یہ ہے کہ اس کے اشعار کی بیساختگی اہل زبان سے آنکھ ملاتی تھی۔ دیوان کا قلمی نسخہ لاہور کے سرکاری کتب خانے میں محفوظ ہے علیٰ ہٰذا کشمیر کا صاحب فکر سخن ور غنی تمثیلی شاعری

میں صائب کے مماثل اور حسن بیان کے اعتبار سے اور بھی بہتر
کہا جاتا ہے۔ سرمد کی شاعری کا بھی یہی زمانہ قرار دے سکتے
ہیں جس نے رباعیات میں چہار طرف نام پیدا کیا۔

عالمگیر اپنی مدح میں قصیدے لکھوانے پڑھوانے پسند
نہ کرتا تھا۔ درباری شاعروں کا شعبہ تخفیف میں آیا۔ لیکن اچھے
کلام کی شاہانہ قدر و انعام کی کئی نظیریں ملتی ہیں۔ دوسرے علامہ
آزاد بلگرامی کے بقول بادشاہ کی بے توجہی کے باوصف اس عہد
میں شعراء ابل پڑے تھے اور ہر کونے سے شاعر نکل آئے تھے مگر ان
کثیر التعداد زمزمہ سنجوں میں بھی ناصر علی سرہندی اور مرزا
عبدالقادر بیدل سب سے بلند و ممتاز ہیں۔ ناصر علی کی جوانی
رندی میں گذری پھر خواجہ محمد معصومؒ کے ہاتھ بیعت اور توبہ
انابت کی توفیق حاصل ہوئی۔ درگاہ خواجہؒ کا یہ شعر اسی سے
منسوب ہے۔

در فیض است منشیں از کشاکش ناامیداں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می رویدہ کلید ایں جا

ذوالفقار خان فاتح جنجی کی تعریف میں وہ مطلع جس کے
صلے میں ہاتھی اور تیس ہزار روپے ملے۔ ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔
شاعر زندگی ہی میں صاحب طرز اور مثنوی میں یگانہ عصر تسلیم کیا
گیا تھا۔ ۱۱۰۸ھ میں وفات پائی۔ مرزا عبدالقادر بیدل برلاس مغل ہیں
عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور جوانی میں عالمگیر کے منجھلے بیٹے کی سرکار
میں عہدہ دار تھے۔ شہزادے نے شاعری کی تعریف سن کر اپنی مدح
کی خواہش کی۔ مرزا نے نوکری سے استعفیٰ داخل کیا۔ اور باقی عمر
دہلی میں خانہ نشین رہے۔ لطافت افکار، کثرت اشعار، مترنم بحروں کے
انتخاب میں مرزا کا مثل پیش کرنا دشوار ہے۔ اور فلسفیانہ دقت
اور پیچ در پیچ مرکبات کی ایجاد کے باوجود حسن قبول کا یہ عالم کہ ابھی
تک خراسان و کابل میں خواجہ حافظ کی بجائے انکے دیوان سے لوگ
تفاؤل کرتے ہیں۔ شاید کوئی محفل سماع ہوتی ہوگی جس میں وہ نادر
روزگار غزل وہاں نہ گائی جاتی ہو جس کا مطلع ہے ۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

مرزا نے بڑی عمر میں انتقال کیا۔ (۱۱۳۳ھ) ایک زمانے تک
عارف کامل کی حیثیت سے ان کا سالانہ عرس ہوتا تھا۔

عالمگیری عہد کا ایک نثار و نظم نگار نعمت خان عالی تھا
کہ ہزل و ہجو میں پایہ بلند رکھتا ہے۔ وقائع میں گولکنڈہ کے
محاصرے کی خوب خوب تضحیک کرتا اور بادشاہ کو بائی بی پی کے
کوستا رہا۔ فتح کے بعد قطعۂ مبارک باد لکھ کر لایا جس میں شد فتح
بجنگ حیدرآباد تاریخ نکالی اور خلعت و انعام لیا۔ عالمگیر کے ایک
فاضل مداح عبدالجلیل بلگرامی تھے ایک رباعی کے صلے میں جو عمل
عالمگیری کی تعریف میں لکھی تھی طلائی ہون کے چار خریطے بادشاہ
نے عنایت کئے (ہون یا ہن دکن کا سکہ تھا تقریباً ۳ روپے رائج
کے معاول) میر نے فتح ستارہ کی تاریخ بھی بڑی خوبی سے بہم پہنچائی ہے۔ قطعہ

چو شہ ابہام زیر خنصر آورد
بہ وردِ اسم اعظم در شمارہ
قلاع کفر شد مفتوح فی الحال
ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ
ز انگشتاں شہ بر مدِ ابہام
برابر چار الف کردم نظارہ
بعینہ بود شکل سال ہجری
پئے تاریخ تسخیرِ ستارہ
(۱۱۱۱ھ)

نواب محسن الملک کی خدمت میں انجمن اسلامیہ اٹاوہ کا ایڈریس

مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری

نواب محسن الملک جس زمانے میں حیدر آباد دکن میں دولت آصفیہ میں پولیٹیکل اور فنانشل سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ اسی دوران میں اپنے وطن اٹاوہ تشریف لائے۔ انجمن اسلامیہ اٹاوہ کے ممبران نے ان کو (۱۸۸۹ء) میں جو ایڈریس پیش کیا تھا۔ اتفاق سے وہ ہمیں ہم دست ہو گیا۔ اس کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (محمد ایوب قادری)

— × —

بعالی خدمت نواب محسن الملک محسن الدولہ منیر نواز جنگ مولوی سید مہدی علی خاں صاحب بہادر پولیٹیکل و فنانشل سکریٹری، دولت آصفیہ حیدر آباد دکن۔

جناب والا! ہم ممبران انجمن اسلامیہ اٹاوہ آج کا دن اپنی زندگی میں نہایت مبارک سمجھتے ہیں کہ ایک ایسے بزرگ کے خیر مقدم کے لیے جمع ہوئے ہیں جس نے اپنی ذاتی قابلیت اور اعزاز سے اُن عالی دماغ مدبّران یورپ کا اپنے آپ کو ہم پلہ ثابت کر کے دکھایا ہے جن کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی اور جس کی ہمدانی کے یورپ کے لائق اور روشن ضمیر منتظمان سلطنت کے دلوں پر جم گئے ہیں اور جس نے اپنے اخلاق محمدی اور قومی ہمدردی کی وجہ سے قوم کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے اور جو ہماری بدبخت قوم کے نامور اسلاف کا نمونہ ہے وہ کون ہے؟

جناب والا ہم ممبران انجمن اسلامیہ اٹاوہ بہت خوش ہیں اور خود کو فخر و مباہات کرتے ہیں کہ جناب اٹاوہ کی سرزمین پہ پیدا ہوئے لیکن جناب کی عمدہ قابلیتوں کا پھریرا دکن اسٹیٹ کی قلمرو میں جا کر اڑا اور جناب کی ذاتی لیاقت فلاسفر لندن کی رایوں کی کسوٹی پر جا کر جانچی گئی۔ جناب کی عمدہ کارروائیوں کے نمونے جو ابتداً اٹاوہ میں ظاہر ہوئے جو اب تک روشن ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ یہ وسیع الفضا سڑکیں جو دست بخی سے زیادہ کشادہ نظر آتی ہیں جناب والا کی کارفرمائی کا نمونہ ہیں یہ رفیع الشان پل جو جابجا جمنا کے سیلاب و طوفان کو روک رہے ہیں جناب ہی کی دریا دلی کا سرچشمہ ہیں۔ ہیوم۔ گنج تحصیل بمنصفی کوتوالی۔ اور دار الشفا وغیرہ کی رفیع الشان اور خوش سواد عمارتیں اور ہائی اسکول کی یہ بے مثل عمارت جس میں آج کا مبارک جلسہ منعقد کیا گیا ہے جناب کی قابلیت اور جوہر لیاقت دکھا رہے ہیں۔ اٹاوہ کی سرزمین اور آبادی ایسی نہ تھی جس سے

صفحات تاریخ کو زینت دی جاتی لیکن یہ عمارتیں ایسی ہیں جن کا ذکر فخر سے کیا جائے گا اور اٹاوہ کے وقایع نگار کو جناب کی سرگزشت لکھنے میں ایک خاص مسرت حاصل ہوگی۔

لیکن ہم بات کے اظہار کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ اگرچہ سب باتیں ہمارے واسطے فخر کا باعث ہو سکتی ہیں لیکن درحقیقت ہماری دلی شکر گزاری کا ایک اور ہی سبب ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اور کسی عہدہ دار سرکاری نے بھی ایسی ہی عمارتیں تیار کرائی ہوں۔ انگلستان میں اتنی ہی یا اس سے کس قدر کم اوروں کی بھی عزت ہوئی جتنی جناب والا کی ہوئی لیکن ہم ممبران انجمن اسلامیہ کے دلوں میں حضور والا کی جو بے انتہا عزت و توقیر ہے وہ جناب کی قومی ہمدردی کے سبب ہے جو جناب کی طبیعت میں مشیت نے سب خصائل حمیدہ سے زیادہ پیدا کی ہے جن چند لوگوں نے ابتداً اپنی پر درد صداؤں سے سوتی ہوئی قوم کو بیدار کیا ان میں جناب کی اپنی ذات سب سے زیادہ پیش قدمی کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کو گو کہ ہی آنریبل سر سید احمد خان بہادر کی قابل قدر کوششوں سے بلند نامی حاصل ہوئی لیکن کوئی نہیں کیا جو اس کی بنیاد کا مستحکم سمجھا جائے گا اور مدرستہ العلوم کی رفیع الشان دیواریں جناب والا سے وہ فیض نہیں پہنچا جس کی رفعت سے وہ دیواریں آسمان فرسا ہو رہی ہیں۔

وزرائے انگلستان سے ملاقات حاصل کرنے کا اگرچہ اور ہندوستانیوں کو بھی شرف حاصل ہوا ہے لیکن بجز حضور والا کے کون دوسرا تھا جس نے مسٹر گلیڈاسٹون جیسے عالی مراتب رکن سلطنت کی قابل فخر ملاقات کے وقت اپنی بے کس قوم کا خیال رکھا ہو۔

جناب والا اگرچہ کسی وقت آپ کی قوم کی وہ عزت و شان تھی کہ ان کی فتحیابیوں کے معزز جھنڈے ہمالیہ پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر لہرا رہے تھے یورپ کے افق پر ان کے اقبال کا آفتاب چمکتا تھا۔ فارس اور یونان ان کی شجاعت کا لوہا مان گئے تھا سپین کی سرزمین کو ان ہی کے قدم سے ناز تھا زمانہ جب جہالت کی تاریکی میں ٹھوکریں کھا رہا تھا اس وقت جناب ہی کی قوم تھی جس نے علم کی مشعل جلا کر دنیا میں روشنی پھیلائی۔ افلاطون و ارسطو کی بیش بہا تصانیف جو تہہ خانوں میں مدفون تھیں وہ اسی قوم نے ڈھونڈ کر نکالیں۔ یورپ جیسے ذی علم خطے کی استادی کا فخر جسے حاصل ہوا وہ آپ کی قوم تھی مگر نیلگوں آسمان کی نیرنگیوں اور بوقلموں زمانے کے دور نے اب انھیں کسی کام کا نہ رکھا ان کی امیدوں کو جلا کر خاکستر ہی کر کے چھوڑا بلکہ اس راکھ کی ہوا میں اڑا کر گرد برد کر دیا ان کی آزادی پست ہو گئی ہمتیں کمزور ہو گئیں۔ جن مساجد کی تعمیر میں مسلمانوں کے خون کا پانی اور ان کی ہڈیوں کا چونا صرف ہوا تھا وہ مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کی طرح ٹوٹی پڑی ہیں جہاں صدائے تکبیر گونجتی تھی وہاں ابابیلوں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہیں آتی جن مسلمان بچوں کے کان میں پیدائش کے وقت کلمۂ شہادت پڑھا گیا تھا آج وہ والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہو کر قوم کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہیں اور جب کسی طرف سے امداد نہیں ملتی تو غیر قوموں کے دامن میں پناہ لیتے اور ایمان کھو کر پرورش پاتے ہیں جو علوم و فنون کے زندہ کرنے والے تھے آج ان کی اولاد جاہل ہے غرض کہ تمام قوم ایک عجیب حیرت میں ہے صرف بیت حمرا۔ غیر از دا صفہان کے در و دیوار کی

علامتیں سن سن کر بجھی ہوئی آگ کے دھوئیں کی طرح پڑی سلگ رہی ہے۔ لیکن جناب والا کی قابلیت اور روشن دماغی ثابت کرتی ہے کہ ہماری قوم گو تباہ ہوگئی لیکن اس میں مادہ قابلیت بے شک اس وقت تک موجود ہے صرف کمی ہے تو تعلیم کی اگر تعلیم سے ان کے طبیعتوں کی جلا کر دی جائے تو پھر سب کچھ موجود ہے اگرچہ گورنمنٹ نے ازراہ معدلت گستری جابجا مدارس جاری کیئے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کا طریقہ تعلیم کچھ اس وقت کا واقع ہوا ہے کہ سرکاری مدارس ان کی ضروریات کو رفع نہیں کر سکتے۔ اور لامحالہ ان کو زندگی کا ابتدائی حصہ زیادہ تر دیسی مکاتب میں صرف کرنا پڑتا ہے جہاں کی تعلیم میں سوائے تضیعِ اوقات کے کوئی فائدہ نہیں ہوتا چنانچہ اٹاوہ میں سب سے بڑھ کر یہ خرابی ہے کہ یہاں نہ کوئی انگریزی پڑھتا ہے اور نہ عربی لہٰذا یہ خرابیاں دیکھ کر ہم چند اشخاص نے انجمن اسلامیہ قائم کی ہے جس کی اغراض انجمن کی کتاب دستور العمل سے جو حضور کی میز پر موجود ہے معلوم ہونگی لیکن منجملہ دیگر اغراض کے انجمن کا سب سے اہم مقصد ایک اسلامیہ مدرسہ جاری کرنا ہے جس میں دینیات۔ عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم دلائی جائے گی اگرچہ ہم لوگوں نے کاسۂ دریوزہ گری کو لے کر دست شوق کی طرح بڑھ کر اس قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیئے بھیک مانگی ہے جس قوم کے واسطے ایک زمانے میں نظامیہ بغداد کا عظیم الشان مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ جس کے لیئے کوفہ کی درسگاہیں۔ بنائی گئی تھیں فاعتبروا یا اولی الابصار لیکن کیسے افسوس کی بات ہے کہ کافی سرمائے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت تک مدرسہ جاری نہ کر سکے مگر ہم ممبران انجمن اسلامیہ شوقِ انتظار میں دن گن رہے تھے کہ جب جناب والا تشریف لائیں تو مدرسہ کے اجرا کی تجویز پختہ کی جائے لہٰذا ہم اب نہایت ادب کے ساتھ حضور سے اس بات کی درخواست کرتے ہیں کہ جناب والا اس انجمن کی جو حضور کی قوم اور حضور کے وطن کی انجمن ہے سرپرستی منظور فرما کر انجمن کو ممتاز فرمائیں کیونکہ ہمیں امید ہے کہ جناب والا کی سرپرستی میں انجمن اسلامیہ مدرسے کے اجرا میں اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کریگی اگر حضور والا کی سرپرستی میں مدرسۂ اسلامیہ جاری ہو تو اس شہر میں جناب والا کی یہ یادگار دیگر یادگاروں سے (جن سے صرف شہر کی نمائش ہے) زیادہ دیرپا اور فیض رساں ہوگی جس میں حضور کی قوم اور حضور کے خاندان کے وہ بچے جو آج آوارہ پھرتے ہیں یا جن کی عمر مکتبوں میں صرف فارسی کی چند کتابوں کی تحصیل میں صرف ہوجاتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی دینی اور دنیاوی علوم کی تحصیل کر سکیں گے۔

آخر میں ہم جملہ ممبران اسلامیہ اٹاوہ اس دعا پر یہ ایڈریس ختم کرتے ہیں کہ جناب والا کی عزت اور اقبال دولت اور ناموری اور صحت میں روزافزوں ترقی ہو۔

فقر و فاقہ سے کب اثر لیتا ہوں
دامن کو گلِ صبر سے بھر لیتا ہوں
لجے جو نظر بلند پروازی سے
اپنی ہستی پہ غور کر لیتا ہوں

خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی مرحوم

سیّد احمد خاں شخصیت کے آئینے میں

(از مولانا نیاز فتحپوری)

سرسید احمد خاں کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اہل علم و ادب اور اکابر قوم کے کس گوشے میں انہیں جگہ دی جائے آسان نہیں، ان میں بیک وقت اتنی متعدد اہلیتیں مجتمع ہوگئی تھیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے لیکن جس حد تک ان کی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے ہم بلا پس و پیش ان کو ریفارمر یا مصلح کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کے تمام علمی و عملی مشاغل کا سرچشمہ صرف اصلاح قوم کا جذبہ تھا: اور اس جذبہ نے انھیں مصنف، مورخ، صحافی اور مفسر بنایا

یہ جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ عجیب و غریب برزخی دور تھا۔ ایک سلطنت مٹ رہی تھی دوسری بن رہی تھی مشرق کا تاج مغرب کے سر رکھا جا رہا تھا اور ہلال کی جگہ صلیب لیتی جا رہی تھی یہ بات ۱۸۱۷ء کی ہے جو سرسید کی سنہ ولادت ہے یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب سے ۴۰ سال قبل جس نے بزم تیموریہ کا آخری چراغ گل کرکے سلطنت مغلیہ کی بساط کو ہمیشہ کے لیئے الٹ کر رکھ دیا۔

اس پر آشوب دور میں جب کہ دہلی و نواح دہلی میں دار و گیر کا ہنگامہ برپا تھا دہلی سے باہر بھی ہر طرف قیامت صغریٰ قائم تھی اور مسلمانوں کے معاشرے کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ سرسید کی عمر ۴۰ سال کی تھی اس لیئے قدرتاً انھیں ان حالات سے بہت متاثر ہونا چاہیئے تھا لیکن ان کے تاثرات ذاتی یا انفرادی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق حاسۂ اجتماعی سے تھا، پورے ملک و قوم سے تھا ہر چند وہ خود اُن کا خاندان متوسلین حکومت میں شامل نہ تھا لیکن ۵۷ء کے بعد عام مسلمانوں پر انگریزی حکومت کا جو عتاب نازل ہو رہا تھا اس سے وہ یقیناً بہت متاثر تھے اور اس تاثر نے آگے چل کر ان کی غیر معمولی شخصیت کو ابھارا

ان کی زندگی کے دو حصے بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں اور عجیب بات ہے کہ ان میں ہر حصہ ۴۰ سال کی مدت پر مشتمل ہے پہلا حصہ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اور دوسرا ۵۷ء سے ۹۸ء تک جو ان کا سن وفات ہے لیکن ان دونوں زمانوں میں ان کی زندگی ایک بڑے انسان کی خصوصیات سے کبھی منفک نہیں رہی سرسید کے تعلیمی زمانے میں ہم کو کوئی خاص بات ایسی نظر نہیں آتی جس کے پیش نظر ان کے مستقبل پر کوئی حکم لگایا جا سکتا ان کی عربی فارسی کی

تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق درسیات کی مروجہ کتابوں کے مطابق شروع ہوئی اور دوران تعلیم میں کوئی خاص بات جودت و ذہانت کی ان کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ ایک محنتی طالب علم ضرور تھے لیکن ان کا کوئی شاندار علمی مستقبل ان کے زمانۂ طالب علمی میں متعین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جب ان کی عمر بیس سال کی ہو گئی تو ۱۸۳۸ء میں انھیں ملازمت کا خیال پیدا ہوا کیونکہ قلعہ کی تنخواہیں عرصہ ہوا بند ہو چکی تھیں، صرف ان کی والدہ کی قلیل سی تنخواہ رہ گئی تھی جو بالکل ناکافی تھی۔ بالاتفاق سے اس وقت ان کے خالو میاں مولوی خلیل اللہ خاں دلی کے صدر امین تھے اس لیئے یہ ان سے عدالت کا کام سیکھنے لگے اور ذاتی محنت سے بہت جلد اس وقت کے مروجہ قوانین سے واقفیت حاصل کر لی۔ اس کے دوسرے سال آگرہ کمشنری کے دفتر میں نائب میر منشی ہو گئے اور اسی وقت سے ان کی تصنیفی زندگی شروع ہوئی یہاں انھوں نے اپنی سب سے پہلی کتاب "جام جم" لکھی جس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام شاہان مغلیہ کے حالات درج تھے۔

اس کے بعد ۱۸۴۱ء میں وہ مین پوری کے منصف ہو گئے اور دوسرے سال فتح پور سیکری تبدیل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے تین کتابیں لکھیں رسول اللہ صلعم کے حالات "جلاء القلوب" اور ان کی بھی سب سے پہلی کتاب ہے جو ان کی مفکرانہ شخصیت کو سامنے لائی۔ اس وقت سیرۃ النبی کی جتنی کتابیں رائج تھیں وہ سب غیر معتبر روایات اور معجزات وغیرہ کے ذکر پر مشتمل تھیں۔ سر سید نے زمانے کے جدید میلانات کو سامنے رکھ کر صرف ان روایات کو سامنے رکھا جنھیں ہر زمانے کی عقل سلیم قبول کر سکتی ہے دوسری کتاب انھوں نے "تحفۂ حسن" لکھی جو تحفہ اثنا عشریہ کے دسویں اور بارھویں باب کا ترجمہ تھی۔ یہ بھی مذہبی چیز تھی تیسری کتاب "تسہیل فی الجر الثقیل" تھی اور یہ بھی اردو ترجمہ تھا۔ "ابو زیر یمنی" کے عربی رسالے کے فارسی ترجمہ کا جس میں جر ثقیل ([illegible]) کے بعض اصول بتائے گئے ہیں۔

اس کے چار سال بعد ان کا تبادلہ دلی ہو گیا تو یہاں انھیں اپنے تاریخی و علمی ذوق پورا کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ اور یہیں انھوں نے اپنی مشہور تاریخی کتاب "آثار الصنادید" لکھی جس کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا اور جس کو دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید کو اپنا آنریری فیلو مقرر کیا۔ اس کتاب کو انھوں نے جس شوق و محنت سے مرتب کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قطب صاحب کی لاٹ کے نقوش کا چربہ لینے کے لیئے وہ معلق چھینکے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ آثار الصنادید کے علاوہ انھوں نے چند علمی و مذہبی رسائل بھی تصنیف کیئے اور ایک تاریخی کتاب "سلسلۃ الملوک"

کے نام سے مرتب کی۔ جو تمام ان راجاؤں اور
بادشاہوں کی فہرست تھی جو دلی میں پانچ ہزار
سال تک فرمانروا رہ چکے تھے۔

جب ۱۸۵۵ء میں وہ صدر امین ہو کر
بجنور پہنچے تو یہاں انھوں نے تاریخ بجنور لکھی اور
آئین اکبری کو ایڈٹ کیا۔ اسی زمانے میں ۱۸۵۷ء
کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور سرسید کی زندگی
کا دوسرا دور شروع ہوا جو پہلے دور سے کہیں
زیادہ اہم تھا۔

۱۸۵۸ء میں جب وہ بجنور سے مراد آباد
صدر الصدور ہو کر گئے تو یہ وہ وقت تھا جب
انگریزی حکومت غدر کا ذمہ دار زیادہ تر
مسلمانوں کو سمجھتی تھی اور یہی سب سے زیادہ
دار و گیر کا نشانہ تھے۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا
کہ کوئی شخص نہ آزادی سے کچھ کہہ سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا۔ مارشل
لا جاری تھا اور چھانٹ چھانٹ کر مسلمان امرا
رؤسا اور علماء کو قتل، و قید کی سزائیں دی جا رہی
تھیں لیکن بایں ہمہ سرسید نے نہایت دلیری و
پامردی سے کام لے کر انگریزوں کو ان کی غلطی
پر متنبہ کیا اور "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر
اس بدگمانی کو دور کیا جو انگریزوں کو مسلمانوں
کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی

مراد آباد میں انھوں نے فارسی کا ایک
مدرسہ قائم کیا۔ ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی
کی تصحیح کی اور ایک یہودی سے عبرانی زبان سیکھ کر
مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کی مدد سے جو عربی و
عبرانی کے مشہور عالم تھے، ایک کتاب لکھنا شروع
کی جس میں یہودیت عیسویت اور اسلام کی الہامی
کتابوں کی تطبیق ظاہر کی گئی تھی اس کے بعد ۱۸۶۲ء
میں جب وہ غازی پور تبدیل ہو گئے تو انھیں یہ
خیال پیدا ہوا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام
نہ ہو گی ملک کبھی ترقی نہ کر سکے گا چنانچہ انگریزی کی
علمی کتابوں کا دیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے انھوں
نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی غازی پور میں قائم
کی اور ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی جس میں ہندو مسلمان
بچے دونوں تعلیم پاتے تھے جب ۱۸۶۴ء میں یہ
غازی پور سے علی گڑھ آئے تو سائنٹیفک سوسائٹی
کا دفتر بھی اپنے ساتھ لیتے آئے اور تاریخ کی کئی
کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کرنا شروع
کیں۔ اس کے ساتھ ایک اخبار جاری کیا جس میں
زیادہ تر انھیں کے علمی و اصلاحی مضامین شائع
ہوتے تھے اور اس اخبار کا نام بعد کو "علی گڑھ
انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ہو گیا اس وقت تک انھوں
نے جو کچھ کیا یا کر رہے تھے اس سے مقصود یہ تھا
کہ آئندہ کے لیے حکومت اور اہل ملک کے تعلقات
کو استوار کیا جائے اور اس کے ساتھ اپنے جائز مطالبات
حکومت سے تسلیم کرائے جائیں اور آخر کار تمام
ابتدائی تدابیر سوچنے کے بعد انھوں نے ۱۸۶۶ء میں
ہندو مسلمانوں کی ایک ملی جلی ایسوسی ایشن
"برٹش انڈیا ایسوسی ایشن" کے نام سے

قائم کر دی جس سے مقصود حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ ۱۸۶۷ء میں جج خفیفہ ہو کر بنارس چلے گئے اور نو سال تک یہاں رہے یہاں انہیں اپنی تدابیر کو بروئے کار لانے کا زیادہ موقع ملا اور آخر کار انھوں نے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک میموریل وائسرائے کو بھیجا جس میں ایک ورناکیولر یونیورسٹی قائم کرنے کی درخواست کی گئی تھی تاکہ تمام علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے حکومت ہند نے اس درخواست پر خاص توجہ کی اور کلکتہ یونیورسٹی کو فوراً ورناکیولر یونیورسٹی بنانے پر غور کرنے لگی لیکن سرسید نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس طرح انگریزی تعلیم کا معیار گھٹ جاتا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ طلبا ان علوم و فنون سے محروم رہیں جو انگریزی زبان ہی کے ذریعے سے حاصل کیے جا سکتے تھے اس لیے اب انھوں نے خود ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہا جو ملک کی ضروریات کو پورا کر سکے اور آخر کار مسئلہ تعلیم پر غور کرنے کے لیے انھوں نے اپنا مکان رہن رکھ کر ولایت جانے کی تیاری شروع کر دی۔

اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ سفر بہت کامیاب رہا۔ یہ وہاں کے اکابر علم و ادب سے ملے، وہاں کے طریق تعلیم پر غور کیا، کیمبرج یونیورسٹی کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا "ایتھنیم کلب" کی ممبری قبول کی اور اسی کے ساتھ "خطبات احمدیہ" لکھنا شروع کیا جس سے مقصود یہ تھا کہ مغربی اقوام کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے اور جو غلطیاں مغربی مصنفین سے اسلام و بانی اسلام کے سمجھنے میں ہوئی ہیں انہیں دور کیا جائے۔

تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد یہ ولایت سے بنارس واپس آئے تو انھوں نے اس بڑے کام کی طرف عملی توجہ شروع کر دی جس کے لیے انھوں نے ولایت کا سفر کیا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے زمین تیار کرنے کے لیے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس سے دو مقصد ان کے سامنے تھے، ایک یہ کہ مسلمانوں میں جو مذہبی روایت پرستی چلی آ رہی ہے اسے دور کر کے انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے کیونکہ اس زمانے میں انگریزی پڑھنا بھی قدامت پرستوں کی نگاہ میں کفر سے کم نہ تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی حقانیت کو عقلی دلائل سے ثابت کیا جائے۔ ہر چند اس رسالے کے اجرا سے یہ ضرور ہوا کہ ان پر کافر، ملحد، نیچری ہونے کا فتویٰ قائم ہونے لگا لیکن اس کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کو بعض روشن خیال رفیق کام کرنے کے لیے مل گئے اور انھوں نے ان رفقاء کی مدد سے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ۱۸۷۳ء میں قیام مدرسہ کی تحریک نے عملی صورت اختیار کرنا شروع کر دیا اور پہلی جون ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں اس کا افتتاح ہو گیا اور تعلیم شروع ہو گئی سرسید اور ان کے رفقاء کی محنت و کاوش کا اندازہ

اس سے ظاہر ہے کہ اس مدرسے نے دو سال کے اندر
ہی کالج کی شکل اختیار کر لی اور بعد کو وہ یونیورسٹی
بن گیا

ظاہر ہے کہ محض یونیورسٹی کا قیام کوئی معنی
نہ رکھتا تھا اگر اس کی افادیت کو عام مسلمانوں کے
ذہن نشین نہ کیا جائے اس لئے انھوں نے ۱۸۸۶ء
میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی اور
اس کے ذریعہ سے انھوں نے جتنی تعلیمی بیداری
مسلمانوں میں پیدا کی وہ محتاج بیان نہیں۔

اس دوران میں انھوں نے ایک اور کام
شروع کیا جو ان کی زندگی کا غالباً اہم ترین کارنامہ
ہے یعنی انھوں نے تفسیر قرآن لکھنا شروع کی یہ
گویا تکمیل تھی "تہذیب الاخلاق" کی اور اس میں
شک نہیں کہ سرسید کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے
کہ مذہبی و علمی دنیا اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی
یہ دیکھ کر ان کا دل بہت دکھتا تھا کہ زیادہ تر مسلمان
صحیح تعلیمات قرآنی سے دور ہوتے جا رہے ہیں
اور اس حقیقت کو سامنے رکھکر انھوں نے تفسیر
لکھنا شروع کی جس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا
کہ قرآن میں کوئی بات خلاف عقل و فطرت نہیں
ہے۔ ہر چند یہ بڑا مشکل کام تھا لیکن ان کی غیر
معمولی ذہنی صلاحیت اور عالمانہ سنجیدہ استدلال
نے ایک اچھی خاصی جماعت ریشنلسٹ RA-
TIONALIST مسلمانوں کی پیدا کر دی۔

ہر چند یہ دعویٰ کرنا کہ سرسید کی تفسیر القرآن
علمی و تاریخی تحقیق یا عقلی نقطۂ نظر سے حرف آخر
کی حیثیت رکھتی ہے درست نہیں ہے لیکن اس سے
انکار ممکن نہیں کہ ان کی یہ تصنیف اسلام کی بڑی
زبردست خدمت تھی جس نے انھیں علماء مصلحین
کی صف اول میں بھی نمایاں کر دیا۔

مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد وہ ۲۳ سال تک
زندہ رہے اور اس دوران میں علاوہ علمی خدمتوں
کے انھوں نے جو کچھ ملک و قوم کے لیئے کیا اس کی
تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

سرسید کے انتقال پر مسٹر بک نے
اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"گو سرسید کی لیاقت بہت بڑی تھی لیکن
ان کے اخلاق اس سے کہیں زیادہ بڑے تھے"

میں سمجھتا ہوں کہ سرسید کے متعلق اس سے
بہتر جامع تنقید کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اخلاق
سے مسٹر بک کی مراد وہ نہیں تھی جو عام طور پر
سمجھی جاتی ہے، بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا
کہ وہ بڑے بلند کیرکٹر کے انسان تھے اور وہ
اپنی بلندیٔ اخلاق کی ایسی یادگار اپنے بعد چھوڑ
گئے کہ دنیا کی تاریخ انھیں کبھی نظر انداز نہیں کر
سکتی۔

میں سرسید کی غیر معمولی اصلاحی خدمات کے لحاظ
سے صاحب ولایت سمجھتا ہوں مگر یہ ولایت ان
صوفیہ کی سی نہ تھی جو ایک گوشۂ عافیت میں
بیٹھ کر صبر و شکر اور توکل و قناعت کی جامد

زندگی بسر کرتے ہیں ۔ یہ ولایت ان شیوخ و علماء کی سی نہ تھی جن کی اخلاقی تاب و توانائی کا انحصار صرف معجزات و خوارق عادات کے اظہار پر ہوتا ہے بلکہ سرسید کی ولایت تھی ۔ پیہم سعی و عمل ، ایک مسلسل حرکت و اضطراب ، ایک ہمالیہ کا سا سنگین عزم ، ایک کبھی نہ خشک ہونے والی عرق آلود پیشانی اور ایک آگے بڑھ کر کبھی پیچھے نہ ہٹنے والا قدم ۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو کارزار حیات میں ایک انسان کو کامیاب بناتی ہیں اور انھیں خصوصیات نے سرسید کو بھی غیر معمولی کامیابی بخشی

حالی کو آج ہم سے کچھ سرگرانیاں ہیں

ناکارہ ہستیوں کی کیا زندگانیاں ہیں؟
کچھ کام کرنے والے جان جہانیاں ہیں
دنیا میں ہیں وہ شاداں ، دنیا ہے ان کی خواہاں
کاموں پہ جن کے نازاں خود کامرانیاں ہیں
کل تک تو سر گراں تھے حالی سے یار ان کے
حالی کو آج ہم سے کچھ سرگرانیاں ہیں
ہو کیوں نہ سرگرانی ، ہو کیوں نہ بدگمانی
غائب ترقیوں کی ساری نشانیاں ہیں
ہے جنس علم ارزاں سب کے لئے جہاں میں
قحط عمل سے لیکن ہم میں گرانیاں ہیں
اسباب ہیں میسر سامان ہیں فراہم
کم ہمتی کی پھر کیوں ریشہ دوانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو ! اٹھتی جوانیاں ہیں

انجمن ترقی اردو کی تاسیس
ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت سے

(از مولانا ہاشمی فریدآبادی مرحوم)

انگریزوں نے غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے بنگالے میں فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان بنالیا، بہت سے بنگالیوں کو اپنے کام کے لیے سدھا لیا تھا۔ یہ سب ہندو تھے مسلمانوں کو سرکاری ملازمت بلکہ عزت وخوش حالی کے اکثر وسائل سے محروم کیا کہ ہمارے زمانے تک "بنگالی" کے معنی ہی ہندو بنگالی سمجھے جاتے تھے۔ صوبے کی دفتری زبان بنگلا قرار دی گئی مگر اس میں سے اردو فارسی الفاظ خاص اہتمام سے خارج کیے گئے اور اس کا رسم الخط فقط سنسکرت کر دیا۔ سنسکرت کے الفاظ کثرت سے بھرے گئے کہ مسلمانوں کی نظر میں وہ بالکل ہندوانی زبان اور اس میں تعلیم دشوار ہوگئی۔ بہار کا صوبہ اس تجویز بالکل تفریق فرنگ سے بچا رہا تھا یہ کام سر جورج کیمبل نام گورنر بنگال نے انجام دیا۔ ۱۸۷۱ء میں اس کی منقلب بولی والی تقریر برطانوی بہن و تعصب کا شاہکار مانی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بہار میں کیتھی حروف اور "ہندی" بولی جبراً رائج کی گئی۔ انگریز کا فقرہ چل گیا۔ ہندو مسلمان میں تفرقے کا بیج پڑ گیا۔ یہی تحریک صوبہ متحدہ میں شروع ہوئی مگر یہاں کے تعلیم یافتہ ہنود آسانی سے سازش کا شکار نہیں ہوتے۔ سرسید نے ۱۸۶۷ء میں ایک بڑا جلسہ خاص الہ آباد میں منعقد کرایا اور زبان اردو کی حفاظت اور ناگری کی خواہی نخواہی ترویج روکنے کی غرض سے ایک مرکزی مجلس بنائی۔ جس کی تقریباً ہر ضلع میں شاخیں قائم کی گئیں۔ بہت سے معزز ہنود شریک انجمن تھے۔ سرسید صاحب کی مدلل تحریروں اور نستعلیق مراسلوں نے انگریز حکام کو بھی اپنے ارادے سے باز رکھا۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چوری سے کام کر رہے تھے، اور چور کا دل ہی کتنا؟ غرض صوبہ میں ناگری چلانے کی تجویز اس وقت، بلکہ سرسید کی زندگی تک منظور نہ ہوئی۔ البتہ حامیان ہندی کی ایک جماعت ضرور تیار ہوگئی اور اس نے ۱۸۷۸ء میں خاص سید صاحب کی راجدھانی یعنی علی گڑھ میں "بھاشا سمردھنی سبھا" جمائی۔ ہندی کی حمایت کے جوش میں نہ صرف اردو بلکہ مسلمانوں سے فرقہ واری مخالفت ہونے لگی۔ یہ لوگ ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن کے روبرو بھی فریادی گئے تھے مگر سید صاحب نے یہ کہہ کر یہ کوئی تعلیمی مسئلہ نہیں، منہ بند کرا دیا۔ سید صاحب کی دشمنی سے مگر ان ہی کی نقل میں ایک اور انجمن علی گڑھ میں "بھارت ورشا نیشنل ایسوسی ایشن" کے نام سے بنی تھی۔ اس کا نام بھی اب کسی کو یاد نہیں لیکن اس کا ایک مقصد ہندی زبان کو تالیف و تراجم کے ذریعے ترقی دینا تھا اور اس کی شاخ "ناگری پرچارنی سبھا" بتائی جاتی ہے جو آگے چل کر علی گڑھ میں نہ چل سکی۔ کاشی جی بنارس میں جم گئی۔ سبھا کی کامیابی کا سہرا میکڈونل صاحب کے

ہندی میں لکھا تھا۔ یہ شخص بھی اپنے سکاچ بھائی کیمبل کی طرح اردو کا سرگرم دشمن تھا۔ صوبہ متحدہ میں حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا گیا تو کہا جاتا ہے کہ ذہنیت پرست ہندو بہت خوش ہوئے بلکہ غالباً اسی کے اشارے سے ایک لمبی چوڑی عرضداشت لکھی اور کئی ہزار دستخطوں سے نئے لاٹ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ یہ اوائل ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے جب کہ سرسید نہایت بیمار بلکہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اس حال میں بھی اس مرد بزرگ نے ایک پر اثر مضمون لکھا جو ۱۹ مارچ کو ان کی وفات سے آٹھ دن پہلے شائع ہوا۔ الہ آباد کی انجمن کو بھی خط لکھ کر تاکید کی کہ نئے حملے کا جم کا مقابلہ کیا جائے۔ غرض سرسید کی زندگی میں تو میکڈونل کی ہمت نہ پڑی البتہ ان کے انتقال کے کوئی دو برس بعد اس نے عدالتوں میں ناگری رسم الخط اردو کے ساتھ لازمی کر دیا۔ شروع میں زبان ایک ہی رہی لیکن وہ خوب جانتا ہوگا کہ تفرقے کی یہ خلیج آئندہ زیادہ چوڑی ہوتی چلی جائیگی جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہندی بولی یا بولیوں کو مسلمانوں نے رسم الخط ہی کے وسیلے سے اپنایا تھا۔ انہیں ہندی سے بدکانے کی شاید اس سے زیادہ کارگر تدبیر دوسری نہ ہو سکتی تھی کہ خوش نما اور مختصر نستعلیق کی بجائے ناگری کے لمبے اور پیچ دار حروف لکھنے پڑیں جن میں خ، ز، غ، ف، ق تک مفرد اصوات موجود نہیں عربی حروف کا تو ذکر ہی کیا۔ حالانکہ صدہا اصطلاحی الفاظ کے علاوہ جو روزمرہ میں داخل ہیں، لاکھوں اسلامی نام ہی احمد، محمد، حسن، علی سے مرکب ہیں جنہیں عربی حروف کے بغیر صحیح نہیں لکھ سکتے۔

سید صاحب کے جانشین محسن الملک نے زبان سے اور مولوی بشیر الدین مدیر البشیر نے قلم سے میکڈونل کا مقابلہ شروع کیا تھا لکھنؤ میں ایک مجلس تحفظ اردو قائم ہوئی۔ ۸ اگست ۱۹۰۰ء کو اس کا جلسہ بہت شاندار رہا۔ دور دور سے چیدہ افراد شرکت کے لئے آئے۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور بعض عیسائیوں نے اردو کی حمایت میں تقریریں کیں خود محسن الملک اعلیٰ درجے کے مقرر تھے۔ جلسہ لکھنؤ کی تقریر نے حاضرین کو مسحور کر لیا اور اس کا چرچا پورے صوبے میں پھیل گیا مگر ساری جادو بیانی میں خوشامد کا سُر ملتا تھا۔ تجاویز، عاجزانہ معروضات کا پیرایہ رکھتی تھیں ایسے کم زور حریف کو دبانے میں انگریزوں کی بہادری مشہور ہے، میکڈونل خود علی گڑھ گیا اور کالج کے امینوں کو دھمکی دی کہ اگر ان کا سکریٹری سیاسی شورش میں حصہ لے گا تو کالج کو سرکاری امداد نہیں ملے گی محسن الملک مجلس تحفظ کے صدر منتخب ہوئے تھے اور تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ سکریٹری کالج کا عہدہ چھوڑنے پر تیار تھے مگر کارپردازان کالج کے کہنے سننے سے یہ عہدہ ترک نہیں کیا، تحفظ اردو کے کام سے دست کش ہو

(۱) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہ نے بعض تحریروں میں اس واقعے کو محسن الملک مرحوم کی بزدلی پر محمول کیا۔ حال میں شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی کتاب موج کوثر میں مرحوم کی طول طویل وکالت کی ہے کہ وہ سکریٹری کا عہدہ چھوڑنے کے لئے تیار تھے اہل کالج نے انہیں علیحدہ نہ ہونے دیا۔ . . . جناب شیخ صاحب نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ علی گڑھ کالج کے سکریٹری اور سرسید کی جانشینی کا منصب ہندوستان میں خاص وقعت کا حامل تھا، اگر محسن الملک اسے چھوڑ کر مجلس تحفظ اردو کی صدارت کرتے بھی تو اس میں کیا قوت رہ جاتی؟ کالج کے امنا کو بزدلی میں حصہ دار قرار دے سکتے ہیں لیکن اصل الزام یہ ہے کہ محسن الملک زبان کے معاملے میں اس فرنگی کی بھبکی سے ڈر گئے۔

ہم اس واقعے سے مسلمانوں کے ضعف اور بے چارگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیاسی اقتدار ضائع ہونے کے بعد ان کے برائے نام تہذیبی امتیازات کو مٹایا جا رہا ہے اور وہ اس تخریبی عمل کو روکنا تو ایک طرف، اتنی قوت بھی نہ رکھتے تھے کہ اسے نامنصفانہ اور بے جا تعصب قرار دیں۔ لکھنؤ کی مجلس تو صدر کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی بخواست ہوگئی البتہ علی گڑھ والوں نے دو ڈھائی سال بعد اپنی تعلیمی کانفرنس میں ایک شعبۂ علمیہ قائم کیا اور مقصد کی صراحت کے لیئے انجمن ترقی اردو نام رکھا۔ وہ دہلی کے اجلاس (جنوری ۱۹۰۳ء) میں بنائی گئی۔ پہلے صدر پروفیسر ٹامس آرنلڈ، اور سکریٹری مولانا شبلی نعمانی مرحوم منتخب ہوئے۔

علی گڑھ کا دور: ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۲ء

میک ڈونل کے جبر و قہر کا یہ انتہائی جواب تھا جو مسلمانوں کے سب سے ممتاز ادارے کی طرف سے دیا گیا۔ مطلب یہ کہ ہم علانیہ احتجاج و مزاحمت نہیں کر سکتے مگر دل سے زبان اردو کے حامی اور اس کی ترقی کے خواہاں ضرور ہیں۔ ممکن ہے کہ انگریز کے خوف ہی سے آرنلڈ صاحب کی صدارت کو سپر بنایا ہو۔ بہر حال ماننا چاہیئے کہ ایسی کم زور و خوف زدہ تحریک بھی خوابیدہ احساس کو جگانے کا کام دیتی اور مسلمانوں کو قومی معاملے کی طرف توجہ دلاتی تھی۔ اول اول ترقی اردو کی تحریک سے لوگوں میں خاصا جوش پیدا ہوگیا تھا۔ مولانا شبلی کی کوشش سے بہت سے اہل قلم انجمن کے رکن اور مدد پر آمادہ ہوگئے۔ یہ زیادہ تر مسلمان تھے اسی پر لکھنؤ کے اخبار ہندوستانی میں شکایت چھپی کہ انجمن ترقی اردو ہندؤں کو شریک نہیں کرتی۔ مولانا شبلی نے جواب میں لکھا کہ اعتراض خلاف واقعہ ہے "انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور عملی تردید اس خیال کی، یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی کتاب "پیغمبران ہند" جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں،" (۱)

علمی مقصد کے اعتبار سے نئی انجمن کو سرسید کی "سائنٹی فک سوسائٹی" کی صدائے بازگشت سمجھ سکتے ہیں مغربی سائنس اور فلسفے کے تراجم پر بار بار زور دیا جاتا تھا۔ زمانے کی نئی ضرورتیں اب کسی صاحب عقل سے چھپی ہوئی نہ رہی تھیں مگر اس بارے میں بہ ظاہر کوئی تفصیلی منصوبہ مرتب کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ سائنس کی چند ابتدائی کتابیں ترجمہ کرنی تجویز ہوئی تھی، ان کے جو نمونے وصول ہوئے وہ قابل قبول نہ تھے۔ مولانا شبلی کی ڈھائی تین سال کی ادارت میں صرف دو ترجمے شائع کیئے گئے (۱) فلسفۂ تعلیم اور (۲) ... نمایان ہند۔ انگریزی اور عربی فارسی سے ترجمہ کرنے کے لیئے آٹھ دس کتابیں او رانتخاب کی تھیں، ان میں سے ایک (تاریخ تمدن از بکل) چند سال بعد چھپی اسی طرح علم ہیئت میں رسالہ القمر کی تالیف کا

(۱) الندوہ بحوالہ علی گڑھ گزٹ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء کتاب مذکور بعد میں انجمن ترقی اردو نے "... نمایان ہند" کے نام سے (غالباً ... میں) شائع کی۔

ذکر شبلی مرحوم کی تجاویز میں آتا ہے مگر اشاعت اس وقت ہوئی جب کہ وہ انجمن کو چھوڑ چکے تھے۔ ان کے استعفیٰ کا اعلان اور ان کی جگہ مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی (رئیس حبیب گنج) کا انتخاب دسمبر ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ شروانی صاحب جنھیں کچھ مدت بعد ریاست حیدر آباد سے نواب صدر یار جنگ کا خطاب ملا نہایت خوش مزاج، علم دوست، صاحب قلم رئیس تھے مگر عملی محنت و مستعدی کی ان سے زیادہ توقع نہ ہو سکتی تھی۔ انجمن ترقی اردو کی کوئی مستقل آمدنی اور تنخواہ دار عملہ نہ تھا، لہٰذا سابقہ ارکین اور ہمدردوں سے مراسلت کا سلسلہ بھی جاری نہ رہا۔ دو سال بعد آپ نے کانفرنس کے اجلاس کراچی (دسمبر ۱۹۰۷ء) میں اپنے شعبے کی پہلی "کیفیت" پڑھ کر سنائی تھی، یہی ان کے، بلکہ علی گڑھ کے دور انجمن کی آخری کیفیت سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ آئندہ ۱۲ء تک اس شعبہ کانفرنس کا ذکر بہت کم تھا اور ضمناً چند سطور میں نظر آتا ہے۔ پیش کردہ کیفیت بجائے خود انجمن کے دور اول کا دلچسپ نقشہ دکھاتی ہے۔ ہم اس کا یہ اقتباس "انجمن کی کہانی" صفحہ ۱۰ سے نقل کرتے ہیں۔

(شروانی صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ) "میں نے بہ تعمیل ارشاد اس بوجھ کو اپنے سر لیا اور لطیفہ غیبی کا منتظر رہا یعنی اس انتظار میں رہا کہ دیکھئے کیا سرمایہ اس کام کو چلانے کے واسطے میرے سپرد ہوگا۔ آٹھ مہینے کی کوشش کے بعد جو راس المال ملا، وہ کاغذات کا ایک پلندہ تھا! صاحبو، اس میں کاغذ ایک بھی نہ تھا۔ رجسٹر تھے، خط و کتابت کے فائل تھے، کچھ رسالے تھے۔ یہ رجسٹر وغیرہ بوجہ ایک سال کی بے کاری کے تقویم پارینہ کے مصداق بن چکے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ سرمایہ میرے پاس پہنچا جو انجمن کی کل کائنات تھی۔ کاش میں اس تعداد کو ظاہر نہ کرتا، تا کہ نشا لیقین اعتراض کو مایوسی ہوتی۔ یہ راس المال کی تعداد ایک سو انتالیس روپے دس آنے چھ پائی تھی .... سال ڈیڑھ سال کے سکوت کے باعث انجمن کا تمام نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ صدر انجمن ہندوستان چھوڑ کر انگلستان چلے گئے تھے۔ ارکان انتظامی قریباً کل حیدر آباد میں تھے۔ حمایت اردو کا جوش جو اردو ناگری کے قصے سے پیدا ہوا، سرد ہو چکا تھا ..."

مولانا شبلی انجمن کے سکرٹری بنائے جانے سے وقت علی گڑھ کالج سے جا چکے تھے۔ پہلے حیدرآباد رہے پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں مصروف ہو گئے شروانی صاحب کے منقولہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کی انتظامی مجلس کے ارکان حیدرآباد میں تھے اور اس کا پہلا مستقر عملاً حیدرآباد دکن ہوگیا تھا لیکن کانفرنس کا شعبہ ہونے کے باعث انجمن کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت علی گڑھ ہی سے ہوتی تھی۔ پچھلی رودادوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے وقت انجمن کے علمی کاموں کے واسطے دو ایک مرتبہ چندہ بھی کیا گیا مگر اس کی مقدار تھوڑی تھی، علیٰ ہذا کانفرنس نے پانچ سو روپے سالانہ امداد کے طور پر دینا منظور کیا تھا یہ رقم باقاعدگی سے ادا نہیں ہوتی تھی۔ مدد کا ایک ذریعہ ایسے ارکان تھے جو پہلے سے اپنا نام مطبوعات انجمن کے خریداروں میں درج کرا دیتے تھے، یہ بہت اچھا کاروباری اصول تھا اور اگر ابتدا میں چند کتابوں کا اشتہار دیا گیا وہ حسب

دلخواہ مرتب ہو کر چھپ جاتیں اور کافی تعداد میں فروخت ہونے لگتیں تو ایک طرف زبان کی ترقی کا علمی مقصد انجام پاتا، دوسری طرف اس کے اخراجات کی ایک سبیل نکل آتی۔ ظاہر ہے کہ کسی بڑے پیمانے پر علمی اور اشاعتی کام، خالص تجارتی اصول پر چلائے جائیں تو بھی معقول سرمایہ کے بغیر اور ہی کون سی تجارت چلتی ہے جو یہ چلے گی، تاہم یہ آزمودہ بات ہے کہ کتابوں کی تجارت میں خسارہ نہیں ہوتا۔ بہرحال خریدار ارکان کا سلسلہ بھی جیسا کہ شروانی صاحب کی کیفیت سے پتہ چلتا ہے مولانا شبلی ہی کے زمانے سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ مشیر یا انتظامی مجلس کے پہلے صدر آرنلڈ تھے اور نائب صدر، مولانا حالی، شمس العلماء نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ جیسے نامی اہل قلم منتخب کیے گئے تھے۔ اسی طرح ارکان میں اس زمانے کے کئی ممتاز مصنف، ارباب سماعت وغیرہ حضرات شامل ہوئے لیکن ان کے جلسے یا اجتماع آسانی سے ممکن نہ تھے صرف خط و کتابت سے مشورہ لیا جاتا تھا، البتہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اس شعبے کا ایک جلسہ ضرور ہوتا اور اس میں سالانہ کیفیت سنانا سکرٹری کے فرائض میں داخل تھا۔ دس برس کی مدت میں یہ فرض بھی تین چار مرتبہ سے زیادہ ادا نہیں ہوا

اواخر [illegible] سے [illegible] تک شروانی صاحب انجمن کے سکریٹری رہے، انہیں بڑی مدد میر ولایت حسین مرحوم سے ملی جو علی گڑھ میں مدرسی سے بڑھ کر اقامت خانوں کی منتظمی کے باعث مشہور تھے۔ انھوں نے انجمن الفرض کی طرف سے کتابوں کی دکان کھلوائی تھی۔ درسی کتب اور کاغذ، کاپیاں، قلم دوات، غرض طالب علموں کی تعلیمی ضرورتوں کا سامان وہاں بکتا تھا اور انجمن الفرض کو خوب نفع ملتا تھا۔ شروع میں اس دکان سے کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کی مطبوعات فروخت ہوتی تھیں، میر صاحب نے شروانی صاحب کی پریشانی اور انجمن کی تہی دستی سن کر کتابیں چھپوانے کا بھی ذمہ لے لیا اور سکریٹری صاحب موصوف معترف ہیں کہ میر صاحب کی دستگیری سے نئی کتابیں تالیف و ترجمہ کرانے کا کام پھر چل نکلا۔ چنانچہ ان پانچ سال میں انجمن کی پانچ کتابیں اسی معاونت کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں جن میں ایک، نیولین کی سوانح پانچ جلدوں میں چھاپی گئی [1]

علمی کام شروانی صاحب مرحوم کے مذاق کے مطابق تھا مگر دردِ سر سے خالی نہ تھا ہاتھ میں سرمایہ اور مستقل آمدنی کی سبیل نہ ہونے سے دو ایک اچھی تجویزیں پڑی رہ گئیں سرمایہ جمع کرنا جس قسم کی سعی و تدبیر چاہتا ہے وہ رئیس حبیب گنج سے نہ ہو سکتی تھی آخر سنہ [illegible] میں وہ سکریٹری کے عہدے سے دست بردار ہو گئے اور ان کی بجائے مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اردو کے بہت اچھے ادیب تھے ریاست حیدرآباد میں بڑی بڑی سرکاری خدمات انجام دیں اور اسی سال [illegible] وہاں سے پنشن دے کر رخصت کیے گئے تھے۔ کالی داس کے ناٹک وکرم اروسی کا اردو ترجمہ ان کی ادبی یادگار ہے۔ انھوں نے اصلاحات علمیہ کے بنیادی کام پر خاص توجہ کی۔ تعلیمی کانفرنس کا یہ اجلاس جس میں وہ شعبہ ترقی اردو رنگون میں ہوا تھا

---

[1] مترجم مولوی معین الدین شاہجہان پوری

وہاں ایک تاجر حاجی احمد ۔۔ نے وعدہ کیا کہ اصطلاحات کے
ترجمے کے لئے تین ہزار روپے دیں گے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ
مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم ..... یہ کام بڑے پیمانے پر انجام
دینا چاہتے ہیں۔ ان کی ذاتی قابلیت اور وجاہت سے توقع تھی کہ
اسے بخوبی اتمام کو پہنچائیں گے لیکن انہی اوصاف کی بدولت مسلم
اہل الرائے نے انہیں سیاسیات کے میدان میں آنے کی ترغیب دی
صوبے کی حکومت نوزائیدہ "مسلم لیگ" کو علی گڑھ کی سیادت سے
نکالنے کے درپے تھی۔ لیگ کا صدر دفتر لکھنؤ میں قائم کیا گیا مولوی
عزیز مرزا کو اس تنظیم جدید کے لیے چنا گیا مگر اگلے ہی سال ان کا
انتقال ہوگیا اور ساری توقعات جو ان مرحوم سے وابستہ
کی گئی تھیں ختم ہوگئیں

۱۹۱۲ء میں برطانوی عہد کا دوسرا (اور آخری) دربار
دہلی منعقد ہوا جس میں پہلی مرتبہ ایک فرنگی بادشاہ ہندوستان
آیا اور شاہ جہاں کے دارالسلطنت میں اس کی رسم تاجپوشی
ادا کی گئی ۔ اس موقع پر علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس
بھی دہلی میں کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے سربراہ صاحبزادہ آفتاب احمد
خاں تھے' ترقی اردو کا شعبہ عزیز مرزا مرحوم کے بعد لاوارث
رہ گیا تھا۔ اس کا سکریٹری' صاحب زادہ مرحوم نے جناب
مولوی عبدالحق صاحب کو نامزد کیا حاضرین جلسہ نے بالاتفاق
منظوری دے دی مولوی صاحب موصوف انہی دنوں اورنگ آباد
دکن میں صدر مہتمم تعلیمات (= انسپکٹر آف اسکولز) مقرر ہوئے
تھے۔ علی گڑھ کالج کے ممتاز پرانے طالب علم اور ادبی حلقوں میں
پہلے سے روشناس تھے مگر صاحب زادہ مرحوم کے حسن انتخاب
کی تحسین کرتے وقت اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ان دنوں کانفرنس
کا یہ شعبہ بالکل نیم جان اور غیر اہم رہ گیا تھا' جیسا کہ غلام ربانی
صاحب نے انجمن کی کہانی میں جتایا ہے اس کے مقاصد بہت
بلند رکھے گئے تھے مگر ان تک پہنچنے کے ذرائع مفقود و مسدود
تھے ۔ یہ واقعہ اب ہماری ادبی تاریخ کا مشہور لطیفہ بن گیا ہے کہ
جب شعبہ ترقی اردو کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا
تو نئے سکریٹری کو:

"ایک پرانا صندوق ملا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسّی
سے کسا ہوا تھا اس میں ایک رجسٹر چند پرانے
اور غیر مرتب مسودات' ایک قلم دوات اور باقی ــ
اللہ کا نام! یہ تھی کُل کائنات انجمن ترقی اردو
کی جو اس نے اپنے معتمد چہارم کے حوالے کی۔ ایک
رجسٹر اور ایک قلم دوات کو ہاتھ میں لے کر ہندوستان
جیسے ملک میں کسی علمی کام کے لئے کھڑا ہونا مولوی
عبدالحق صاحب ہی کا کام تھا۔ آپ کے اس وقت
کے خیالات کا اندازہ کچھ آپ ہی کے الفاظ
میں بھلا معلوم ہو گا'

"میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بارگراں کو
اپنے ذمے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری
ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اردو زبان میں
علوم و فنون لانے کے لئے ایسے اصحاب کی
ضرورت ہے جو علوم مشرقی و مغربی دونوں
میں ماہر ہوں اور ایسے لوگ ہماری قوم
میں شاذو نادر ہیں۔ دوسری مشکل اس کام
میں کافی سرمایہ بہم پہنچانے کی ہے یہ کام میں

قدر بڑا، اس قدر وسیع اور ایسا اہم ہے کہ جب تک
ہزاروں نہیں لاکھوں کا سرمایہ نہ ہو اس کا خاطر
خواہ چلانا ممکن نہیں، تاہم چند مہینوں میں اپنی
بساط کے موافق جو کوشش اس بارے میں میں
نے کی ہے، اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر
اس شعبے کا کام استقلال اور ہمدردی سے
چلایا جائے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے
اور کچھ تعجب نہیں کہ چند سال کے بعد کانفرنس کا
یہ شعبہ سب سے زیادہ مفید اور کامیاب ثابت
ہو"

(کیفیت انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۱۳ء)

دورِ علی گڑھ کا علمی کام

انجمن ترقی اردو کا یہ ابتدائی دور تقریباً دس برس رہا۔ اس
مدت میں تین مدیر یا سکریٹری مقرر ہوئے مگر پہلے سکریٹری (مولانا
شبلی) کا قیام اس وقت علی گڑھ میں نہ تھا اور تیسرے سکریٹری (مولوی
عزیز مرزا) بھی لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔ شعبے کی جداگانہ انتظامی مجلس
بنائی گئی تھی مگر اس کے باقاعدہ اجلاس ہوئے ہوں تو بھی ان کی
روداد محفوظ نہیں رہی۔ بہت سے اہلِ علم و قلم "ارکانِ شوریٰ"
میں درج کیے گئے تھے مگر ان سے انتخاب کتب، تالیف و تراجم کے
بارے میں صرف تحریری مشورہ لیا جاتا تھا۔ انجمن کا سب انتظامی
کام سکریٹری کے ہاتھ میں تھا البتہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں
اسے اپنے شعبے کی کیفیت پیش کرنی ہوتی تھی۔ کانفرنس کی طرف
سے شعبے کو ۵۰۰ روپے سالانہ کی جو قمی امداد منظور کی گئی تھی، وہ بھی
معلوم ہوتا ہے پابندی سے ادا نہیں کی جاتی تھی۔ اسی طرح اہلِ ثروت
سے مدد لینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی نہ کوئی قابلِ ذکر
رقم وصول ہوئی اور نگ آباد منتقلی کے وقت دفترِ انجمن کا اثاثہ (یہ)
ٹوٹا ہوا صندوق تھا جو اوپر مذکور ہوا۔ مطبوعاتِ انجمن "ارمن والوں" کے پاس
تھیں۔ کتابوں کی فروخت سے جو نفع ہوتا تھا اس میں انجمن حصہ دار
ہوتی تھی مگر یہ قدر قلیل سرمایہ، بالفرض کہ بہی کھاتے میں درج ہوگا،
انجمن کے نئے سکریٹری کو نقد کچھ نہیں ملا۔

مگر انجمن کی انتظامی اور مالی حالت سے زیادہ لائق لحاظ اس
کا علمی کام ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس دہ سالہ مدت میں جس مقصد
کے لیے وہ قائم ہوئی تھی؟ اسے کہاں تک انجام دیا؟ دوسرے
مولوی عبدالحق صاحب کا سکریٹری منتخب ہونا اور دفتر کا اورنگ آباد
منتقل ہونا انجمن کی تاریخ میں نہایت اہم اور نئے دور کی ابتدا
ثابت ہوا۔ اسے شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اب تک جو
کچھ انجمن نے کیا تھا اس پر یکجائی تبصرہ کرلیا جائے۔

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء کے آخر تک سات
نئی کتابیں بہ ترتیب ذیل شائع کیں:۔

(۱) فلسفۂ تعلیم
(۲) القمر
(۳) القول الاظہر
(۴) رہ نمایانِ ہند
(۵) نپولین اعظم
(۶) امرائے ہنود
(۷) تاریخ تمدن (جلد اول)

ان میں سے پہلی ہربرٹ اسپینسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ
ہے۔ انیسویں صدی میں جدید سائنس کی ترقی نے یورپ کو علوم
تجربی کا بے حد گرویدہ و معتقد بنا دیا تھا۔ اسپینسر اسی
عہد کا انگریز فلسفی گذرا ہے کہ اخلاقیات و تمدن کی اقلیم میں بھی

سائنس کا حکم چلانا چاہتا تھا۔ پچاس ساٹھ برس قبل اس کی تصانیف ہندوستان کے انگریزی خوانوں میں کافی مقبول تھیں۔ بنائے انجمن کے بعد چند انگریزی کتابیں ترجمے کے لیے منتخب اور مشتہر کی گئیں۔ ان میں ایک اس کا یہ رسالہ "ایجوکیشن" بھی تھا۔ خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی ان دنوں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم سے منسلک تھے۔ ان کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے بہت پسند کیا گیا اور انجمن کی طرف سے شائع کیا گیا۔ رائے دینے والوں میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام بھی تحریر ہے جنہوں نے مترجم کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ ترجمے میں خود اسپین سر کی اصل تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔ کتاب کے مطالب کا خلاصہ اور مصنف کے حالات بطور دیباچہ فاضل مترجم نے اضافہ کیے اور کہیں کہیں ذیلی حاشیے لکھ دیئے ہیں۔ یہ کتاب تیسری بار ۱۹۳۲ء میں مطبع اورنگ آباد میں طبع ہوئی تھی اور ہنوز قابل مطالعہ ہے۔

۲۔ **القمر**۔ تالیف مولوی راحت حسین صاحب بی۔اے بھاگلپوری جس میں جدید علم حیات کے ضروری مبادی پر بھی بحث کی گئی ہے پھر نظام شمسی اور چاند کے متعلق ہرشل ایڈم وغیرہ کی تحقیقات صاف و شستہ اردو میں فراہم کردی ہیں۔ لائق مؤلف نے بعض نئی مصطلحات کا خود ہی ایسا اچھا ترجمہ کرلیا ہے کہ بالکل اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ رسالہ کی معلومات کسی قدر پرانی ہوگئی ہیں، ان میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہوگی مگر بجائے خود یہ رسالہ جدید سائنس کو اردو میں منتقل کرنے کا ایک نمونہ پیش کرسکتا ہے دوسری دفعہ ۱۹۱۷ء میں ۶۸ صفحات پر چھاپا گیا تھا۔

۳ ایسا ہی مختصر مگر اعلیٰ درجہ کا فلسفیانہ رسالہ "العقول الاطہر" امام ابن مشکویہ کے "فوز الاصغر" کا اردو ترجمہ ہے اس میں وجود باری تعالیٰ، نفس انسانی کے خواص نفس اور نبوت پر حکیمانہ دلائل دیئے گئے ہیں۔ آخری بحث میں ارتقا یا اسی قسم کے نظریات پیش کیے گئے ہیں جو آج کل جدید علمائے مغرب خصوصاً ڈارون سے منسوب کیئے جاتے ہیں

۴ **رہ نمایان ہند** ان۔ م۔ دت کی انگریزی "پرنس آف انڈیا" کا اردو ترجمہ جس میں سری کرشن اور مہاتما بدھ کی تعلیم کو تفصیل سے اور شنکر اچارج وغیرہ بعد کے مصلحین کا حال اجمالاً تحریر کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ بابو نرائن پرشاد ورما نے جو اردو کے اچھے شعرا میں شمار ہوتے ہیں فصیح و بلیغ زبان میں کیا اور خوب مقبول ہوا ۱۹۳۲ء تک انجمن اس کو چار دفعہ چھاپ چکی تھی۔

۵۔ **نپولین اعظم**۔ یہ فرانسیسی سپہ سالار گذشتہ صدی کے آخر تک اہل یورپ میں بڑا سورما سمجھا جاتا تھا حقیقت میں غیر معمولی عزم و جرأت کا سپاہی گزرا ہے انگریزی میں ایبٹ نے معتقدانہ سوانح عمری لکھی ہے۔ انجمن ترقی اردو پانچ ضخیم جلدوں میں ترجمہ شائع کیں، جو انجمن کے پہلے دور کی سب سے بڑی کتاب تھی۔

۶۔ **امرائے ہنود**۔ یہ کتاب سید احمد صاحب مارہروی نے انجمن کے لیے تالیف کی۔ شروع میں سلاطین ہند کی ہندو رعایا سے رواداری کا حال تاریخی شواہد سے مدلل کیا ہے پھر عہد مغلیہ کے ہندو امرا اور منصب داروں کا بہ ترتیب حروف تہجی تذکرہ لکھا ہے مفصل اور دلچسپ ہیں، مجمل تراجم کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے جنھیں ہم عصر فارسی تاریخوں اور بعد کی اردو انگریزی کتابوں سے جمع کیا گیا ہے۔ ان اکتالیس ماخذوں کی فہرست شامل کتاب کردی گئی ہے۔ مولف کی محنت قابل داد اور اہل اردو

پر ان کا احسان ہے کہ ایسی دلچسپ تاریخی معلومات فراہم کیں۔ تعجب ہے یہ صرف دوبار طبع ہوئی اور جس قدر چاہیے اتنی شہرت نہ حاصل کر سکی۔

۷ **تاریخ تمدن** ۔ ٹامس بکل کی کتاب "ہسٹری آف سوی لزیشن" کا اردو ترجمہ منشی احمد علی صاحب بی اے ایل ایل بی نے بڑے شوق وقابلیت سے کیا تھا مگر تھوڑا سا حصہ باقی تھا کہ انتقال کر گئے علی گڑھ کے دور میں ترجمے کا صرف پہلا حصہ چھاپا گیا۔ دوسرے حصے کی تکمیل مولوی عبدالحق صاحب نے مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی سے کرائی اور کچھ مدت بعد اورنگ آباد سے شائع کیا۔ اس زمانے میں اصل انگریزی کتاب کا بہت شہرہ تھا۔ مصنف نے یورپی اقوام خصوصاً اہل برطانیہ (اور ان کے تمدن) کی فضیلت علمی دلائل سے ثابت کی تھی کہ اکثر جدید تحقیقات سے غلط نکلیں بہرحال اردو ترجمہ بجائے خود اہل علم نے پسند کیا اور اس اعتبار سے بھی لائق افادہ ہے کہ تاریخ نویسی کے جدید اصول اور بلند معیار پیش کرتا ہے۔

کم وبیش دس برس کی مدت میں صرف سات کتابوں کا شائع کیا جانا انجمن ترقی اردو کا کچھ قابل تعریف کارنامہ نہیں معلوم ہوتا، اس سے زیادہ اور جدید علوم طبیعی کے اونچے درجے کی کتابیں اردو کالج دہلی، پھر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے ترجمہ کرادی تھیں البتہ زبان کے اعتبار سے یہ نئی کتابیں بہت بہتر اور منجھی ہوئی اردو کا نمونہ کہی جا سکتی ہیں اور ان سے خود زبان کی تیز ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سات میں مغربی سائنس کی صرف ایک کتاب اور وہ بھی مختصر رسالہ القمر مذکور ہے۔ اس عام کوتاہی کا بڑا سبب یہ تھا اور ابھی تک عارض ہے کہ اعلی تعلیم کی زبان انگریزی ہو گئی تھی، ہمارے معمولی تعلیم یافتہ جدید سائنس کے مسائل سے ناواقف ہیں۔ اردو خواں طبقہ کیمیا اور طبیعات کی مشکل کتابیں پڑھ نہیں سکتا تو لکھے کون؟ یہ مضامین ہماری جامعات میں بزبان انگریزی پڑھائے جاتے ہیں پڑھائے کیا جاتے ہیں رٹا دیئے جاتے ہیں اسی لئے سائنس کی کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ سائنس کی تعلیم عام ہونے نہیں پاتی۔ ساری قوم پس ماندہ اور یورپ کی دست نگر بنی ہوئی ہے۔

انجمن ترقی اردو کا مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم کے تفویض کیا جانا نہ صرف انجمن بلکہ زبان اردو کی تاریخ کا نہایت نتیجہ خیز اور معرکۃ الآرا واقعہ ہے۔ اس نے ہماری ادبیات کی رفتار پر جو اثر ڈالا وہ کسی صاحب خبر سے مخفی نہ ہوگا

(سہ ماہی "اردو" جوبلی نمبر ۱۹۳۵ء)

نئے علیگڑھ کے نام!

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور ... اس میں سوزِ عرب وحسنِ عجم یاد رہے
کارواں منزلِ نو کے لیئے ہو گرمِ سفر ... اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے
چمن علم وادب میں نئی کلیوں کے حضور ... میرؔ و غالبؔ کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے
محو ہوں عظمت شاہی کے حسین افسانے ... گر رہے یاد تو جمہور کا غم یاد رہے

درِ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے ... آل احمد سرورؔ

سرسید کا اثر ادبیاتِ اردو پر[1]

از جناب ڈاکٹر سید عبداللہ

"علیگڑھ تحریک کو عام طور پر محض تعلیمی یا سیاسی تحریک خیال کیا جاتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ اسکے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ایک لحاظ سے فکری، تہذیبی، علمی اور ادبی بھی ہے ...... ایک متعین مدت کے بعد علیگڑھ تحریک ایک ادبی مکتب اور علمی دبستان ہونے کے بجائے ایک خاص طرزِ زندگی اور ایک خاص اندازِ نظر بن گیا جس کے اوصاف میں خوش گفتاری، خوش باشی، خوش پوشی اور آداب و خیال کو نمایاں حیثیت حاصل تھی ...... علیگڑھ نے جتنا کچھ ادب پیدا کیا اور اس میں جو انداز اختیار کیا اس میں بھی عقل پسندی، سلیقہ، مادی اقدارِ زندگی اور دنیاوی ہوشمندی کے عناصر نمایاں ابھرے ہیں۔"

اردو ادب پر سرسید احمد خاں کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اثر اسلوب بیان پر بھی ہوا اور موضوع اور روحِ معانی پر بھی۔ سید صاحب کے اس اثر و تاثیر کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر عموماً اس تاثیر و اثر کی داستان یا حقیقت سید صاحب کے احسانات یا خدمات کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ اس طرح کی تشریح علمی یا فکری لحاظ سے بہت کم کی گئی ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ ہم عموماً ان بحثوں میں سید صاحب کی سیاسی شخصیت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور ان کی ادبی اہمیت کو ان کی سیاسی اہمیت کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اردو ادب میں سید صاحب کی خالص علمی اور ادبی اہمیت اور حیثیت کا جائزہ لیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ سید صاحب نے اردو ادب کو حقیقت میں کیا دیا؟ اور وہ کون سے خالص عناصر و مسائل ہیں جن کو ہم خاصتہً ان کا فیض سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ عناصر جن کو اردو کے ادیبوں نے ان کے زمانے میں یا ان کے بعد مستقل اقدار کی حیثیت سے قبول کر لیا یا جن کے خلاف شدید ردِ عمل کی ضرورت سمجھی گئی۔

اس بحث کی گرہیں اس وقت تک کھل نہیں سکیں جب تک ہم سب سے پہلے یہ نہ دیکھ لیں کہ سید صاحب کی اپنی تخلیقات یا علمی و ادبی کاوشوں کی قدر و قیمت کیا ہے؟ ہندوستان میں سرسید کے زمانے سے پہلے (شاعری کو چھوڑ کر) اردو ادبیات کا دائرہ مذہب، تصوف، تاریخ اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا۔ علوم عقلیہ کا مذاق بہت کم تھا۔ اور ریاضیات و فنون کی طرف توجہ کرنے والے بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مذہبیات میں عموماً منقولات و روایات سے مواد حاصل کیا جاتا تھا اور مذہب کی ان قدروں پر خاص زور دیا جاتا تھا جو زندگی کے اخلاقی اور مادی پہلوؤں سے دور لے جانے والی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی دینی تحریک میں اقتصاد (معاش) معاد اور قرب الی اللہ کے عناصر کا حیات بخش امتزاج پایا جاتا ہے مگر اس تحریک کی ترقی بہت مدھم اور اس کی رفتار بہت سست تھی۔ تاریخ میں سرسری واقعہ نگاری ہی کو مورخانہ کمال سمجھا جاتا ہے اور اجتماع انسانی کی تعلیم و تربیت کے اصول علی العموم مدِ نظر نہ رکھے جاتے تھے۔ تصوف جو عمل اور فکر دونوں سے عبارت ہے عموماً اپنی ساری اثباتیت کھو چکا تھا اور اس کے یہ

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا یہ موثر مقالہ کئی دفعہ شائع ہو چکا ہے مگر اسکی افادیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسکی بار بار اشاعت جاری رہے (مدیران)

دونوں پہلو منفیت مجہولیت اور انفعالیت کے کارندے دستیار بن گئے تھے۔ اردو میں (اور اس سے پہلے فارسی میں) تذکرہ نگاری کا بڑا چرچا تھا۔ اور بعض کامیاب تذکرے بھی لکھے گئے مگر اکثر تذکرے تنقیدی اور علمی بلندیوں تک پہنچنے سے قاصر رہے۔ اور جہاں تک اردو کی ادبی نثر کا تعلق ہے وہ ابھی ارتقاء کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اور اظہار و بیان کی ان سہولتوں کی تلاش میں تھی۔ جن کے طفیل وہ زندگی کے حقائق اور کائنات کے مسائل کی ترجمان بن سکتی ہے اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج کی سلیس نثر دہلی کالج کی علمی نثر اور مرزا غالب کی شخصی دلی نثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مگر ان سب کارناموں کا دائرہ اثر محدود اور دامن تنگ تھا۔ اردو ادب (خصوصاً) نثر کے اس جائزے کے بعد اس علمی اور ادبی سرمایہ پر نظر ڈالیے جو خاص سرسید کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے، سرسید کی تصانیف کی فہرست کو دیکھئے ان میں مضمون اور موضوعوں کا کتنا تنوع ہے۔ اور صرف تنوع ہی نہیں فکر کا انداز کتنا انوکھا اور نیا ہے اور ان دونوں باتوں کے باوجود بیان کا طریقہ اپنے پہلے دور سے کتنا مختلف ہے۔ غرض اردو کے اس ادبی سرمائے کو دیکھ کر فی الفور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایک الگ دور کا ادبی سرمایہ ہے۔

سرسید کے ادبی سرمائے کو جو چیزیں مستقل حیثیت سے امتیاز اور انفرادیت بخشتی ہیں ان کو مجموعی لحاظ سے تین چار جملوں میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں سرسید ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادی رائے اور آزاد خیالی کی رسم جاری کی۔ اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

کہنے کو تو چند معمولی الفاظ ہیں مگر ان ہی چند سادہ لفظوں میں اس زمانے کے مشرق و مغرب کی اکثر و بیشتر ذہنی آویزشوں اور کشمکشوں کی طویل سرگذشتیں پوشیدہ ہیں۔ انہی چند الفاظ میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کی سماجی اور ادبی تاریخ کے بڑے بڑے عقیدوں اور بڑے نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

سرسید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصر ترکیبی کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے بڑے بڑے عنوان ہوں گے۔ مادیت، عقلیت اجتماعیت اور حقائق نگاری۔ سرسید کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت ان ہی چاروں پر قائم ہے اور شاید یہی وہ نمایاں اور اہم رجحانات ہیں جو اردو ادبیات میں سرسید کا فیض خاص سمجھے جاسکتے ہیں۔ ان رجحانات سے اردو کا سارا ادب ان کے زمانے میں متاثر ہوا اور ایک معمولی سے ردعمل سے قطع نظر آج کا مجموعی ادبی اور فکری رجحان بھی اسی سلسلۂ فکر و عمل کی ارتقائی شکل ہے۔ چنانچہ جدید ترین زمانے کی ترقی پسند تحریک اپنی بیشتر خصوصیات کے لحاظ سے سرسید کی مادیت، عقلیت اور حقائق نگاری ہی کی ہم جنس اور اسی کی ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتی ہے۔

سرسید کے پیدا کردہ ادبی سرمایے میں مندرجہ بالا فکری اور ادبی عناصر تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔ ان کی مذہبی تصانیف میں، ان کی تاریخ میں، ان کی سیرۃ نگاری اور سوانح نویسی میں، ان کی مقالہ نگاری میں، غرض تحریر کے تقریباً ہر میدان میں انھوں نے مادے کو اصلی زندگی بلکہ اصل حقیقت قرار دیا ہے، جس میں کامیاب تصرف اور مؤثر تدبیر کا حقیقی اور واحد کارفرما اور منبع عقل ہی کو قرار دیا ہے، موجودات کے اس مادی مظاہر کو عقل و حکمت کی مدد سے دیکھنا اور ان سے معاشی اور اجتماعی فوائد حاصل کرنا ہی ان کے نزدیک عین ترقی ہے۔ اسی سے ان کی وہ مخصوص اجتماعیت نمودار ہوئی ہے جس کا منتہا قومی خوشحالی اور وہ طرز زندگی ہے جو دنیا کی خوشحالی اور ترقی یافتہ اقوام کے لیے باعث آسائش و آرام ہے اور جس کے فقدان کی وجہ سے بقول سرسید ان کی اپنی قوم محروم ہے۔

سرسید کی دینی تصانیف اور مضامین میں یہ خیال بار بار دہرایا گیا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے اور سچائی کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ تحقیق ہے۔

کر تقلید! انھوں نے ایک موقع پر لکھا تھا" دینی مسائل انجام کار ہر دلعزیز ہوتے ہیں جو بعد مباحثہ قائم رہتے ہیں" سرسید کا یہ ذوقِ تحقیق ان کی روایت شکنی کو پیدا کرتا ہے۔ آگے چل کر اسی رجحان سے وہ انقلابی خیالات پیدا ہوئے جن پر نئے دور کی ساری بغاوت قائم ہے مگر یہ غور طلب ہے کہ سرسید اپنے نصب العین اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے انقلابی نہ تھے، مصلح ہی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے سیاسی اور اجتماعی کاموں میں مصالحت اور اعتدال کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اور دینی اور بعض علمی امور میں وہ جس قدر روایت شکن معلوم ہوتے ہیں اتنے ہی بعض فکری اور علمی باتوں میں مقلد نظر آتے ہیں۔ سرسید کے ذہن کا یہ تضاد دراصل گذشتہ صدی کے مبہوت کر دینے والی فضا کا نتیجہ ہے۔ اور شاید اس بات کا بھی کہ ان حقائق فکری کی طرف سرسید کا اقدام علمی کم اور سیاسی زیادہ تھا۔

بہرحال یہ واضح ہے کہ انھوں نے آزادانہ سوچنے اور سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان پیدا کیا۔ ان کے اپنے عمل میں جتنا تضاد بھی کیوں نہ ہو انھوں نے اپنے زمانے کو ضرور آزاد خیالی سکھائی، اُن کے مکتب کے فیض یافتہ لوگ اور ان کے ادب سے اثر پذیر عام لوگ تقلیدی کم اور تحقیقی زیادہ ثابت ہوئے۔ سرسید نے فکر و ادب میں جو راستہ اختیار کیا اس کو نہ خالص رومانی کہا جا سکتا ہے اور نہ خالص کلاسیکی ———— اس میں رومانیت کی اگر کوئی ادا ہے تو صرف یہی کہ فکر و ادب میں انھوں نے پرانی روایات اور قدیم اسالیب کی پیروی کو ضروری خیال نہیں کیا۔ اس خاص بات کے علاوہ ان کے مزاج کی ساخت رومانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا سرِ دہ کلاسیکی مزاج اور اصول کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کلاسیکیت میں رومانیت کی خفیف جھلکیاں بھی ہیں اس لیے ہم ان کی روش کو "نو طرز کلاسیکیت" کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی یہ روش اس قدیم کلاسیکیت سے بالکل مختلف تھی جس کی کلاسیکی ضابطہ پسندی کی حدیں بھی بہت حد تک فرسودہ ہو چکی تھیں، سرسید نے ان سے انحراف کرتے ہوئے یہ نیا کلاسیکی مکتب پیدا کیا جس میں عقل، توازن، مصالحت، اعتدال اور اجتماعیت کو نمایاں اہمیت دی۔

سرسید کے ادب میں حقیقت زیادہ ہے اور افسانویت جو اعلیٰ ادب خصوصاً رومانی ادب میں موجود ہوتی ہے کم ہے ان کے ہاں ہر جگہ پر عقل کی کارفرمائی اور حکمرانی ہے جس کے بوجھ کے نیچے بیچارے جذبات تقریباً کچل دیئے گئے ہیں۔ ان کی اندرونی لہر فکر سے زیادہ عمل کی ترغیب دیتی ہے انھوں نے حاضر کو مرکز توجہ بنایا ہے۔

اس کے علاوہ سرسید ایک خاص تہذیب اور اجتماع کی ایک ایسی صورت اور نظام کے قائل ہیں۔ جس میں ہمواری، نظم، سلیقہ، توازن ترتیب اور اعتدال ہو مگر یہ ساری تہذیب کسی قدرتی ارتقاء سے وجود میں آئی ہوئی معلوم نہیں ہوتی، بلکہ ساختہ پرداختہ اور آوردہ معلوم ہوتی ہے جس کے خارجی اور مستعار عناصر ملکی اور قومی مزاج میں اچھی طرح جذب نہیں ہوئے، اس کو قبول صدی الاناوی آپ "اینگلو محمڈن کلچر" کہہ لیجئے یا "کلچر کی سنلمانی" شکل سمجھ لیجئے۔ مگر یہ تہذیب اجتماعی ارتقاء کے پچھلے سلسلوں سے الگ کوئی چیز ہے۔

سرسید نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے زمانے کے مصنفوں اور ادیبوں کو بہت سے خیالات دیئے ان کے ان فکری اور تنقیدی خیالات سے ان کا دور خاص متاثر ہوا، ان سے ان کے رفقائے خاص ہی اثر پذیر نہیں ہوئے بلکہ وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو ان کے دائرے سے باہر بلکہ ان کے مخالف تھے، ان کی تحریک کے خلاف ردِ عمل ہوا مگر یہ بھی سرسید کی فکری لہر کے سلسلۂ عمل ہی کا فکری نتیجہ تھا اس لیے یہ بھی انہی کے حساب میں درج ہونا چاہیئے۔ خالص ادب اور عام تصانیف دونوں میں زمانے نے ان سے کچھ سیکھا بلکہ بہت کچھ سیکھا اور بڑی بات یہ ہے کہ ادب میں جو کہنگی، فرسودگی، تعطل، جمود اور یک رُخا پن آ گیا تھا۔ اس کو سرسید کی زبردست تصنیفی سرگرمیوں نے

بالکل دور کردیا۔ انھوں نے ادب میں ایک نیا پن، ایک ہمہ گیری، ایک مقصد ایک سنجیدگی، ایک خاص قسم کی معقولیت پیدا کی، جس کے سبب اب ادب کو کوئی بے کاروں کا مشغلہ نہ کہہ سکتا تھا۔ انھوں نے ادب اور زندگی کو باہم پیوند نہیں ہونے دیا بلکہ ادب اور اجتماع کے درمیان رشتہ قائم کیا اور ادبیات ذہنی و فکری کاوشوں کو جمہور کی خدمت پر لگایا۔ انھوں نے ہم تبایا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ ادب صرف فرد کے دل کی سچی آواز ہی نہیں بلکہ جمہور، اجتماع اور قوم کے دل کی سچی آواز اور الٰہی آواز ہے جو اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے بلکہ جمہور کی اصلاح و ترقی اور تکمیل کے لیے اٹھائی جاتی ہے۔

ان ادبی نظریات میں سرسید کے رفقائے خاص ان سے اکثر باتوں میں ہم خیال اور ہم قدم ہیں۔ شبلی۔ حالی۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ۔ چراغ علی، محسن الملک ان کے ہم کار اور رفیقِ سفر ہیں۔ ان کی تحریروں میں سرسید کے افکار و خیالات کے نقوش قدرتی طور سے زیادہ ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر کے یہاں مزاج اور فکر کی انفرادیت بھی ملتی ہے جس کا تذکرہ سطور آئندہ میں ملے گا۔ اردو ادب کے ان جلیل القدر رہنماؤں کے نقشِ قدم پر چلنے والے بے شمار مصنفوں اور ادیبوں کے یہاں سرسید کے مکتب فکر کے واضح اثرات مل جاتے ہیں۔ جن کے اجتماعی عمل کو ہم انہی کی خاطر علیگڑھ تحریک کے نام سے یاد کرسکتے ہیں۔

علیگڑھ تحریک کو عام طور پر محض تعلیمی یا سیاسی تحریک خیال کیا جاتا ہے مگر یہ حق ہے کہ یہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ ایک لحاظ سے فکری، تہذیبی، علمی اور ادبی تحریک بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک معین مدت کے بعد علیگڈھ تحریک ایک ادبی مکتب اور علمی دبستان ہونے کے بجائے ایک خاص طرزِ زندگی اور ایک خاص اندازِ نظر بن گیا تھا جس کے اوصاف میں خوش گفتاری، خوش باشی، خوش پوشی اور آزاد خیالی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ لیکن علیگڈھ نے جتنا کچھ ادب پیدا کیا اور اس میں جو انداز اختیار کیا اس میں بھی عقل پسندی، سلیقہ، مادی اقدار زندگی اور دنیاوی ہوشمندی کے عناصر خاصے ابھرے ہیں۔

سرسید کے رفقائے خاص کے بعد علیگڈھ سے اثر پذیر اور وابستہ مصنفوں اور ادیبوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں چند نمایاں شخصیتوں کے نام یہ ہیں۔ مولانا وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک۔ مولانا عبدالحلیم شرر۔ نواب صدر یار جنگ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا سید طفیل احمد منگلوری۔ سجاد حیدر یلدرم۔ مولوی عزیز مرزا۔ مولوی عنایت اللہ۔ مولانا حسرت موہانی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریاآبادی، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین سید ہاشمی فریدآبادی۔ ڈاکٹر سر رضا علی۔ حکیم احمد شجاع۔ پروفیسر محمد مجیب۔ قاضی تلمذ حسین۔ الیاس برنی وغیرہ۔ یہ فہرست مکمل نہیں اور اس میں اضافہ ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اس فہرست میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جن کو علیگڈھ کی مخالف تحریکوں سے متعلق بھی سمجھا جا سکتا ہے مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو سرسید سے زیادہ شبلی کے مسلک فکر سے وابستہ ہیں۔ مگر جب خود شبلی کی تمام سنجیدہ اور باقاعدہ علمی سرگرمیوں کا مرکز و منبع علیگڈھ ہے۔ تو پھر شبلی والوں کو بالواسطہ علیگڈھ سے اثر پذیر اشخاص میں شامل رکھنے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں شبلی کے علمی کارناموں کو سرسید کے احسانات سے بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کے اس خیال سے کلیتہً اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ ہم شبلی کو علیگڈھ تحریک کا رکن خاص سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے تلامذہ بلکہ ان کے دارالمصنفین کو بھی اسی دریا کی ایک موج قرار دیتے ہیں (خواہ وہ اپنے انجام اور منتہا کے لحاظ سے اس سے الگ ہی کیوں معلوم نہ ہوتی ہو) اسی ضمن میں حیدرآباد کے ادب کا تذکرہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہا

جاسکتا ہے کہ خود دکن شمالی ہندوستان کے ان خاص اثرات سے بہت فیض یاب ہوا جن کا سرچشمہ علیگڈھ سے پھوٹا اور اردو ادب کی ساری فضا پر چھا گیا۔ جدید زمانے میں دکن کا بیشتر علمی کام ان لوگوں نے انجام دیا جن کا علیگڈھ سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا۔

سرسید کی تصانیف کا ممتاز ترین موضوع مذہب ہے۔ ان کی بڑی بڑی کتابیں تفسیر القرآن اور تبیین الکلام ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں دینی موضوعوں پر لکھے۔ ان سب کے مطالعے کے بعد سرسید کو اپنے زمانے کا بہت بڑا مذہبی مفکر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ تفسیر القرآن اور تبیین الکلام دونوں کے مطالب و مضامین سے شدید اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان تصانیف نے آنے والے دینی ادب پر گہرا اثر ڈالا۔

تفسیر القرآن سرسید کی آخری تصنیف ہے اس وجہ سے یہ ان کے پختہ خیالات اور راسخ عقائد کی ترجمان ہے اس تفسیر میں روایات (یا روائیت) سے سرسید کی بغاوت اپنی آخری حد تک پہونچی ہوئی معلوم ہوتی ہے اس کتاب میں ان کے افکار کا محور یہ ہے کہ دین میں صرف قرآن مجید یقینی ہے باقی جو کچھ ہے اصول دین میں شامل نہیں۔ انھوں نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ اسلام کا کوئی مسئلہ عقل اور اصول تمدن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس تفسیر میں علوم طبعی اور تاریخ جغرافیہ کی مدد سے بہت سے لاینحل مسائل قرآنی کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے غرض اس میں بھی عقل و فطرت (نیچر) اور اصول تمدن اور سائنٹفک طرز تحقیق اور سائنٹفک نقطۂ نظر کے استعمال پر بڑا اصرار کیا گیا ہے آگے چل کر اس تحریک کا مطالعۂ قرآن اور عام افکار دینی پر بڑا اثر ہوا۔ اگرچہ سرسید نے کسی خاص فرقے کی بنیاد نہیں رکھی مگر ان کا یہ دینی نظریہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف اسلامی فرقوں کے عقائد کا جزو بن گیا چنانچہ ان کے بہت سے خیالات جدید مدرسہ ہائے فکر خصوصاً احمدیت، اہل قرآن وغیرہ کے نظام میں جگہ پانے کے علاوہ جدید ترین زمانے کے اکثر تعلیم یافتہ حضرات کے عقائد بن چکے ہیں۔ سرسید کے خیالات کا خاص پرتو مولانا محمد علی کی تفسیر بیان القرآن، مولانا احمد کی تفسیر بیان الناس عنایت اللہ خاں المشرقی کا تذکرہ، حکیم احمد شجاع کی تفسیر لوحی میں خوب روشن ہے بلکہ خود مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر کا انسانیاتی نقطۂ نظر HUMANISTIC VIEW سرسید کے "مصالحتی طریق فکر" کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ فرق ملحوظ رہنا چاہیے کہ سرسید نے حقائق کے ادراک کیلئے عقل او سائنس کو جس انتہا تک متصرف مانا ہے مولانا ابوالکلام عقل کو ادراک حقائق کے معاملہ میں اتنا متصرف نہیں مانتے۔

تبیین الکلام کی فکری روح کے بھی تقریباً وہی خصائص ہیں جو سرسید کی دینی تصانیف کے ہیں۔ مگر اس میں مصالحتی رجحان تیز اور وسعت مشرب اور آزاد خیالی کی لہر کچھ زیادہ تند ہے۔ اس کتاب (نیز تہذیب الاخلاق کے متعدد مضامین) کے ذریعے مذہب کے حدود سے بلند ہو کر عالم انسانی رواداری اور بے تعصبی کے ذریعے وسیع انسانیت تک پہونچنے کا راستہ کھلا ہے۔ اور اس سے اس خیال کو تقویت ہوئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے خیالات و عقائد کا بھی ہمدردانہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے اچھے اور صالح عنصر کی قدر کی جا سکتی ہے۔ سرسید کے بعد یہ خیال ایک دوسرے میدان (یعنی ہندو مسلم اتحاد اور تمام مذاہب کی بنیادی وحدت کی صورت) میں بہت مقبول ہوا .... اور کانگریس اور خلافت کی تحریکوں میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔

سرسید نے جس دینی فکر کی بنیاد رکھی اس کی ترقی میں شبلی، چراغ علی، نذیر احمد اور محسن الملک نے برابر کا حصہ لیا۔ ان سب بزرگوں نے اہم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ سب سرسید کے

علم الکلام سے اثر پذیر ہوئے۔ ان میں سرسید کی فکر سے قریب ترین چراغ علی تھے۔ لیکن ان کی اکثر کتابیں انگریزی میں ہیں۔ وہ عربی کے علاوہ عبرانی اور سُریانی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ جس کی بدولت ان میں تحقیق وسعت نظر اور علمی جستجو کے آثار زیادہ ملتے ہیں۔ لسانیاتی مطالعے کا یہ ذوق بھی دراصل سرسید ہی کا پروردہ ہے۔ انھیں تبئین الکلام اور تفسیر القرآن لکھتے وقت عربی سے متجانس زبانوں کی واقفیت کی ضرورت کا احساس ہوا۔

اردو میں چراغ علی کے کچھ رسالے موجود ہیں مثلاً تعلیقات، اسلام کی دینی برکتیں، قدیم قوموں کی تاریخ، بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ اور تعلیق نیاز نامہ، تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار کی حیثیت سے بھی چراغ علی اردو کے مصنفوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ چراغ علی کا نقطۂ نظر سرسید سے کہیں زیادہ عقلی اور تمدنی ہے۔ وہ سرسید کے ان پُرجوش حامیوں میں سے ہیں۔ جو اختلافی مسائل ہیں۔ اپنے پیشوا سے بھی زیادہ انتہا پسند ہو جایا کرتے ہیں۔ مادی ترقی کی اہمیت سے بغاوت، ماضی سے زیادہ حال پر توجہ، نیچر اور عقل کی کامل رہنمائی، مذہب اور سیاست اور تمدن کا الگ الگ شعبۂ حیات ہونا۔ اجتہاد کی اہمیت اور جہاد کی نئی تاویل۔ ان سب مسائل میں چراغ علی کی آواز خاصی پُرجوش اور ان کا نقطۂ نظر خاصا انتہا پسندانہ ہے۔ وہ سرسید کے حقیقی مقلد تھے۔ چراغ علی کے بعد سرسید کے سب سے بڑے ہم فکر نواب محسن الملک تھے جنھیں سرسید محب و محبوب کے پیارے لقب سے ممتاز کرتے ہیں۔ اور ان سے اسی درجہ محبت کرتے ہیں کہ "لحمک لحمی" اور "دمک دمی" کی تلمیحات کے ذریعے اپنی قربت اور قرابت کا اظہار کرتے ہیں۔ محسن الملک نے صرف سیاسی امور میں بلکہ علمی کاموں میں بھی سرسید کی بہت مدد کی۔ سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ خطبات احمدیہ کی تالیف میں ہاتھ بٹایا اور تہذیب الاخلاق میں سرسید کے بعد شاید سب سے زیادہ مضامین انھوں نے ہی لکھے۔ وہ سرسید کے مشن کے سب سے بڑے اور سب سے موثر مبلغ اور موید تھے۔

نواب محسن الملک نے ایک خط میں لکھا "مجھ سے زیادہ سرسید کا جاننے والا۔ ان کی عزت کرنے والا۔ ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں۔ لیکن پھر بھی ۱۸۶۳ء سے ان کے آخر دم تک میرے اور مرحوم کے درمیان بحث و تکرار قائم رہی چنانچہ ان کی زندگی کے آخری دور میں بھی اختلافی مضامین کا سلسلہ عرصہ دراز تک بطور خط و کتابت کے جاری رہا۔" بیشک ان سے زیادہ سرسید کا جاننے والا۔ ان کی عزت کرنیوالا۔ ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ ادبی لحاظ سے حالی کو چھوڑ کر اور فکری میں چراغ علی کو چھوڑ کر سرسید کے سب سے زیادہ قریب محسن الملک ہی تھے۔

سرسید کے افکار کی اہم علمی اساس نیچر اور عقل کی ہمہ گیر اہمیت تھی۔ محسن الملک نے بھی اپنے پیر و مرشد سید صاحب کی طرح نیچر کی ہمہ گیری پر اصرار کیا ہے، سرسید بعض اوقات جوش کے عالم میں اپنا مقصد واضح نہ کر سکتے تھے۔ اور جذبات کی رو میں بہہ جاتے تھے ان کے بیانات کی بہترین اور واضح ترین تشریح محسن الملک نے ہی کی، تہذیب الاخلاق کے مضمون مذہب و علم میں انھوں نے نیچر کے متعلق سرسید کے نقطۂ نظر کی نہایت عمدہ توضیح کی ہے۔ "سرسید کے زمانے کے "نیچری لٹریچر" میں نیچر اور "لا آف نیچر" کی اصطلاحوں کی اگر کسی نے صحیح اور واضح تشریح و تعریف کی ہے تو وہ محسن الملک ہی تھے۔" یہاں تک کہ سید صاحب قبلہ نے بھی جنکی زبان پر ہر وقت نیچر کا مبارک لفظ رہتا ہے۔ اور جن کے قلم سے ہر دم نیچر نکلا رہتا ہے اور جن کی تفسیر کا مدار نیچر پر ہے اس لفظ کی ٹھیک ٹھیک تعریف" (محسن الملک کا مضمون مذہب و علم)

محسن الملک کے نزدیک نیچر سے مراد طبیعت اور طبائع موجودات ہے۔ اور قانون فطرت صرف اس باقاعدہ ترتیب کا اظہار ہے جو قدرتی اشیاء میں پائی جاتی ہیں۔ اور جس کو ارباب نظر کی ایک کافی تعداد نے دیکھا ہے۔ "نیچر کی بحث میں محسن الملک کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس مسئلے کی علمی

حیثیت کو واضح کیا۔ اس معاملے میں انھوں نے ابن خلدون کے مقدمے سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اور انکے خیالات سے بڑی مدد لی ہے۔ جو اجتماع انسانی اور نیچر کے روابط سے متعلق ہیں

نیچر کے متعلق سرسید کی تحریروں سے بڑے بڑے مغالطے پیدا ہوتے تھے۔ مثلاً ایک مغالطہ یہ پیدا ہوا کہ نیچر خود خدا کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کے مظاہر خدا کے فعل و عمل ہیں۔ عملاً شاید اس قسم کی تعریف پر کوئی اعتراض نہ ہو مگر نظری لحاظ سے اس عقیدے سے وجودیوں کے ہمہ اوستی خیال کا ترشح ہوتا ہے۔ جو توحید خالص کے نظریے سے ٹکراتا ہے۔ محسن الملک نے اپنے مضامین کے ذریعے ان سب مغالطوں کو دور کردیا۔ وہ سرسید کے مقابلے میں زیادہ تجریدی ہیں۔ الوہیت کو مادہ کی معمولی آلائش بھی گوارا نہیں۔ سرسید کی نظر اور خیال میں مادہ اس درجہ رچ بس گیا تھا کہ وہ الوہیت کو بھی مادی اضافات کی روشنی میں دیکھنے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ محسن الملک اس خیال کے حامی نہ تھے۔ بایں ہمہ نیچر کے اصول اور تخیل کو زیادہ مقبول بنانے والے اور اردو کے ادیبوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے والے سرسید اور محسن الملک ہی تھے۔ سرسید نے اس تصور کو پیش کیا۔ اور محسن الملک نے ذہن نشین بلکہ دل نشین بنایا۔ محسن الملک نے سرسید کے دوسرے اہم موضوعات کا بھی اثر قبول کیا اور اپنے واضح اور موثر طرز بیان سے ان کی الجھنوں کو دور کیا چنانچہ معقول و منقول کی تطبیق، دین اور اجتماعیت کا تعلق، تمدنی اور تہذیبی روابط کا اثر اور اس قسم کی بے شمار بحثوں کو اٹھایا۔ اور ان پر طویل مضامین لکھے۔ سرسید کی طرح محسن الملک بھی امام غزالی کے فلسفہ اخلاق اور علم کلام سے متاثر ہیں مگر ان کی نظر (سرسید کی طرح) امام غزالی کے تصورات کے وجدانی پہلوؤں سے زیادہ عقلی بنیادوں پر پڑتی ہے۔ انھوں نے غزالیؒ کے نظریات یا تجربات کو اپنی عقلیت کی تقویت کیلئے استعمال کیا۔ چنانچہ وہ ان کے اسی خیال کو کہ "تعجب ہے کہ ان لوگوں پر جو فقط تقلید پر چلتے ہیں۔ اور خود تحقیق کو دخل نہیں دیتے اور اپنی عقل کو بیکار کردیتے ہیں" آزادی رائے اور اجتہاد کے حق میں دلیل بناتے ہیں۔

غرض یہ کہ سرسید کے عقلی افکار کے اثرات قبول کرنیوالوں میں محسن الملک کو اولین مقام حاصل ہے، نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ اگر سرسید کو اس عقلی تحریک کا دل کہا جائے تو محسن الملک کو یقیناً اس کی "زبان" اور "دماغ" کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ انھوں نے سرسید کی عقلیت میں توازن پیدا کیا اور اس تحریک کو ایک ایسا ذہن عطا کیا جو قومی اور ملکی مزاج کیلیے قابل قبول اور تہذیبی اور دینی روایات کے عین مطابق تھا۔ انھوں نے سرسید سے انسلاک بھی کی جسکے ذریعے انھوں نے وجدان کا اقرار دوبارہ کیا ہے۔ اور اس طرح ایک ایسی معقول "عقلیت" کا راستہ صاف کیا۔ جس کو آنیوالے مصنفین اور ادبا اپنے افکار میں بآسانی جذب کرسکیں۔ میری رائے میں اس بنا پر انھیں ادبیات اردو میں بلند مرتبہ ملنا چاہئے کہ انھوں نے سرسید کی عقلیت میں توازن پیدا کیا۔ مذہب میں سرسید سے متاثر گروہ میں نذیر احمد اور شبلی بھی شامل ہیں۔ مگر اصولاً ان بزرگوں کو اس رجحان کا نمائندہ کہنا چاہئے جس کا اظہار محسن الملک کی عقل پسندانہ تحریروں میں ہوا۔ مذہب اور علم (سائنس) کے درمیان سرسید نے جو رشتہ قائم کیا تھا اس میں چراغ علی کا رُخ اس سمت میں تھا کہ مذہب اور سائنس کو بہرحال ایک ساتھ چلنا چاہیئے۔ یعنی مدار کار اور معیار سائنس ہے جس پر مذہب کو پورا اترنا چاہیئے۔ اس کے برعکس محسن الملک نے دعا اور اس کی قبولیت کی بحثوں کے ذریعے اس رجحان کی رہنمائی کی کہ حقیقت کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں۔ جن کا ادراک عقل نہیں کرسکتی۔ ان کا ادراک ایک اور حس باطنی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ جو ماوراء العقل ہے۔

یہ ہے حاسۂ مذہبی' وجدان یا الہام، نذیر احمد اور شبلی دونوں کا رخ اسی طرف ہے۔ دونوں سرسید اور چراغ علی کی حد سے بڑھتی ہوئی عقلیت سے قدرے منحرف اور اس مذہبی رجحان کے اولین نمائندہ تھے جس کی مکمل اور ترقی یافتہ صورت علامہ اقبال کے تصورات میں ملتی ہے۔

نذیر احمد کی دینی تصانیف میں ترجمہ قرآن مجید اور الحقوق والفرائض قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے ناولوں میں بھی دینی خیالات اور مذہبی بحثیں پائی جاتی ہیں۔ ان سب تصانیف میں وہ سرسید کے خیالات سے عموماً متفق معلوم ہوتے ہیں مثلاً تقدیر، توکل، خیر و شر، جہاد، اجتہاد وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات تقریباً وہی ہیں جو سرسید کے ہیں مگر ہر ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ نذیر احمد کو "نیچری" کا لقب یا طعنہ کسی طرح گوارا نہیں وہ اس الزام سے اپنے آپ کو بچانے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، وہ ترقی کے تصور کیلئے بڑے مبلغ، مذہب اور فطرت کے مطابق ہونے کے مؤید، ترک دنیا کے مخالف اور عقل کی اہمیت کے قائل ہیں۔ مگر ان کی تحریروں میں اعتدال اور مصلحت اندیشی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے الحقوق والفرائض میں جہاد کا باب تک قائم نہیں کیا۔ یہ ان کی سیاسی مصلحت اندیشی تھی مگر ان کی اعتقادی مصلحت اندیشی یہ تھی کہ انھوں نے سرسید کی انتہا پسندانہ عقلیت سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس سے کھلا اختلاف نہیں کیا۔ انھوں نے اگر کیا بھی تو ابن الوقت اور رویائے صادقہ وغیرہ کے پردے میں مخالفت کا اظہار کیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ راستہ خلوص اور صاف گوئی سے الگ ہے۔

تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ان کی مذہبی کتابوں سے زیادہ ان کے ناولوں نے معتدل عقل پسندی کی تحریک کو تقویت دی اور احساس دینی کے اس احیاء میں مدد دی جو کچھ دیر بعد ایک شدید رومانی ردعمل کی صورت میں ظاہر ہو کر الکلام وغیرہ کی صورت میں سامنے آیا۔ نذیر احمد نے سرسید سے بغاوت کی مگر دین سے زیادہ معاشرت میں رفقائے سرسید میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض تصورات کا سب سے بڑا باغی بھی ہے۔ یعنی شبلی۔ شبلی کا درجہ عقل پسندی کی تحریک میں وہی ہے۔ جو معتزلہ اور متکلمین میں امام ابوالحسن الاشعری کا ہے۔ شبلی نے سرسید کی ہمہ گیر عقل پسندی کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور عقل و وجدان کے درمیان ایک معقول رابطہ پیدا کرنے کی سعی کی۔ سرسید اگر امام غزالی کے افکار کی تجدید تک منحصر رہتے تو شاید ان کے اور شبلی کے درمیان فکری اختلاف کی خلیج وسیع نہ ہوتی۔ مگر ہوا یہ کہ جتنے سرسید امام غزالی سے دور ہو کر مغرب کی ارتیابی اور متشککانہ تحریکوں سے قریب ہوتے گئے اتنے ہی شبلی امام غزالی کے موقف سے الگ ہو کر امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کے مطمح نظر کی طرف بڑھتے گئے۔ شبلی کے تصورات میں ان دونوں بزرگوں کے افکار کا اجتماع نظر آتا ہے۔

ان سب باتوں کے باوصف شبلی کے ذہنی ارتقاء میں سرسید کا گہرا اثر اور نمایاں حصہ ہے، اس حد تک کہ اگر شبلی سرسید کے اثر سے بے نیاز ہو کر چلتے تو یہ تو ممکن تھا کہ مولانا فاروق (چریاکوٹی) یا مولانا فیض الحسن بن جاتے مگر شبلی شاید کبھی نہ بنتے۔ ان کو شبلی بنانے والے سرسید ہی تھے۔ شبلی کا وہ رنگ تصنیف جس نے ان کو اردو ادب کا عظیم رکن بنایا ہے۔ وہ سرسید کی رفاقت اور ہم نشینی کا اثر ہے۔ یہ درست ہے کہ مولانا فاروق کے زیر اثر شبلی کو معقولات کا ذوق مل گیا تھا۔ مگر عقلیت کے نئے طلسمات و عجائبات کی دنیا سے انھیں سرسید ہی نے متعارف کرایا۔ علوم جدیدہ کی اہمیت، فلسفہ اور علوم طبعی کی ضرورت مذہب اور تمدن کا رابطہ، اجتماعیت کے مخصوص افکار و مسائل ــــ ان سب میں شبلی نے سرسید سے استفادہ کیا۔ معجزات (شبلی کے نزدیک) ناممکنات کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایسے واقعات کا نام ہے۔ جن کے اسباب ہم نہیں جانتے (ان کے اسباب ہوتے ضرور ہیں) معاملات کے وقوع سے انکار کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں۔

"حاشا ہم ان کے امکان کا دعویٰ نہیں کرتے"۔ (الکلام ص ۱۳۰)

یہ بھی دراصل سرسید کے خیالات کی ایک معتدل صورت ہے۔
ہمارے نزدیک شبلی کی بات سرسید کی بات سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔

مضمون کا فرق کم ہے۔ لب و لہجہ کا فرق زیادہ ہے۔ شبلی کی نظر اور طرز بیان عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔ وہی بات جو سرسید کی زبان سے ادا ہو کر مخاطبوں کو متوحش کر دیتی ہے، جب شبلی کے منہ سے نکلتی ہے تو نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ذمہ دار زیادہ تر شبلی کا طرز تحریر اور لب و لہجہ ہے البتہ یہ ضرور ہے (اور اس فرق کو بنیادی فرق قرار دیا جا سکتا ہے) کہ شبلی قدیم روایات کے امین اور قومی مزاج کے شناسا ہیں۔ وہ بھی سرسید کی طرح نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر ان کا اصول یہ ہے کہ "بزرگان سلف کے تصور کردہ اصول کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے (علم الکلام ص ۲) سرسید کے یہاں روایات قدیم سے کھلی بغاوت کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ شبلی نے اس طرح کی بغاوت نہیں کی۔

ان سب باتوں کے باوجود شبلی کی عقل پسندی مسلّم ہے اور یہ وہ عقل پسندی ہے جسے ہم سرسید کی عقلیت کی ایک معتدل شکل کہہ سکتے ہیں۔ اس معاملے میں سرسید اور شبلی کے اختلافات اتنے نہیں جتنے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کے نمایاں اختلافات اگر کہیں ہیں تو ان کو ہم دو مزاجوں کا اختلاف کہہ سکتے ہیں ——— یا پھر سب سے نمایاں اختلاف سیاسی نقطۂ نظر میں ظاہر ہوا ہے۔ جس کو ہم سرسید کے مسلک کی عین ضد قرار دے سکتے ہیں۔ شبلی کے اجتماعی تصورات (قومیت۔ فرد۔ اجتماع آزادی رائے۔ اجتماعی اخلاق وغیرہ وغیرہ) بھی ان کے سیاسی خیالات کے تابع ہیں۔ شبلی سرسید کی طرح جمہوری نظریات کے بڑے دلدادہ ہیں۔ مگر ان کی جمہوریت میں سرسید کا سکون و اعتدال نہیں۔ ان کی تحریروں میں اشتعال اور ترقی پسندانہ عناصر کے اولین آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی تحریک بھی سرسید کے نظریہ ترقی سے ہوئی ہے۔

مذہب میں عقل پسندی کی یہ تحریک اس کے بعد دو مختلف صورتوں میں متوازی طور پر آگے بڑھی، سرسید کی مجرّد عقلیت اور شبلی کی معتدل عقلیت جس میں سیاسی اثباتیت اور مذہبی جذبات نے بھی راہ پائی، سرسید کے دینی خیالات کے خلاف مولانا حقانی اور مرزا حیرت وغیرہ نے پہلے سے ہی ایک تردیدی تحریک شروع کر رکھی تھی شبلی کے ردّ عمل نے اس کو اور بھی تقویت دی۔ ندوۃ العلماء کی تعلیمی تحریک دراصل سید صاحب کی مجرّد عقلیت کے خلاف ایک علمی اور معقول بغاوت تھی۔ اس دوران میں ملک کے سیاسی حالات بھی بدل چکے تھے۔ اور سید صاحب کے سیاسی مسلک سے اختلاف کی رو بھی آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۳ء تک ان کے دینی خیالات سے علیحدگی کا اظہار جدید طبقے میں بھی عام ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک اردو کے دینیاتی ادب پر شبلی کی معتدل عقلیت کا دور دورہ رہا جس میں سب سے زیادہ حصہ دار المصنفین نے لیا۔ اس گروہ کے بڑے بڑے رہنما، مولانا ابو السلام، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد، مولانا عبد الباری وغیرہ تھے جنکی تحریروں میں شبلی کا یہ قائم کردہ اصول جاری و ساری رہا کہ جدید علوم کی مدد سے مذہب کی حفاظت کی جائے مگر "بزرگان سلف کے مقرر کردہ اصول کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جانے پائے"۔ بعد میں علامہ اقبال نے بھی اسی طریق کار سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کا آغاز کیا جو اپنی بعض جزوئیات کے اعتبار سے سرسید کے قریب ہو تو ہو اصول اور بنیاد کے لحاظ سے اس کو شبلی کے نقطۂ نظر کا معاون ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

کچھ دیر تک شبلی کے مکتب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور آج بھی اس خیال کی لہر خاصی تیز ہے مگر سب سے بڑا سوال پھر یہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ندوہ اور دار المصنفین اگر شبلی کے بنا کردہ ادارے ہیں تو کیا یہ درست نہیں کہ یہ بھی ایک لحاظ سے سرسید ہی کا فیضان ہے۔ کیونکہ شبلی کا ذہن بھی تو سرسید کی ذہنی تجلیات سے روشن ہوا تھا۔ اس لحاظ سے ان کو دو مکتب نہیں سمجھنا چاہئیے۔ بلکہ ایک ہی مکتب کے دو مدرسے کہنا چاہئیے۔ البتہ دیوبند کا مکتب اس سے جدا اور بالکل جدا ہے۔

سر سید کے دینیاتی افکار آج (خود علوم طبعی کے موقف کے بدل جانے کی وجہ سے) اگرچہ اپنا اثر بہت کچھ کھو چکے ہیں، مگر دینی تصورات میں عقلی تجزیہ کی تحریک آج بھی جاری ہے۔ اور اس میں سر سید کے شعوری یا غیر شعوری اثرات آج بھی نظر آتے ہیں بلکہ نیاز فتحپوری اور غلام احمد پرویز وغیرہ بعض عقائد میں سر سید سے بھی کچھ قدم آگے ہیں۔ قیام پاکستان کی بنیاد اگرچہ دینی ہے۔ مگر مذہب کے مادی اور دنیاوی رخ کی اہمیت (جس پر سر سید نے بہت زور دیا تھا)۔ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ غرض یہ کرنیں بھی اسی سورج سے نکلیں۔

دینیات کے بعد سر سید کے دو بڑے تصنیفی میدان اور ہیں، یعنی انکی تاریخی اور تحقیقی کتابیں اور مقالہ نگاری۔ سر سید کے رفقائے تاریخ اور سوانح نگاری میں بڑی دلچسپی لی۔ اور یہ ذوق و شغف بھی سر سید کی بعض علمی سرگرمیوں سے پیدا ہوا۔ ان کیلئے تاریخ کا ذوق ایک موروثی چیز تھی۔ ان کے اسلاف قلعۂ معلّی سے وابستہ تھے اور اسی سبب سے درباری مذاق کی اکثر چیزوں سے (جن میں تاریخی مذاق بھی شامل ہے) ان کا نگار خاندانی روایت کے زیر اثر تھا۔ اس تعلق کی یادگار "جام جم" نام کا ایک رسالہ ہے۔

سید صاحب کو تاریخ سے اس وقت تک دلچسپی رہی جب تک ان کی زندگی میں "جدید سیاسی دینیت" کا رنگ کچھ زیادہ گہرا نہ ہوا اگرچہ سید صاحب نے بعد میں دوسرے اشغال کے سبب تاریخ سے توجہ کو ہٹا لیا۔ مگر ان کا ذہن تاریخ نگاری کے لیے حد درجہ موزوں تھا۔ تحقیق کا ذوق اور ماضی پر بے لاگ تبصرہ ـــــــ اس کے لیے ان کی صلاحیتیں ہر طرح سازگار تھیں۔ انھوں نے گبن کی کتاب "زوال سلطنت روما" کا اردو ترجمہ کرایا (اس سے شبلی نے بھی استفادہ کیا تھا۔) اپنی مورخانہ صلاحیتوں میں سے انھوں نے خطبات احمدیہ اور تبیین الکلام کے تاریخی حصوں میں بڑا کام لیا۔ آثار الصنادید بھی جو آثار و عمارات پر ایک عظیم کتاب ہے ان کے تحقیقی شغف کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ انھوں نے پرانی تاریخی کتابوں کی تصحیح و اشاعت پر بھی توجہ صرف کی آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی اس کی مثالیں ہیں۔

اس سلسلے میں یہ واضح ہے کہ رفتہ رفتہ سید صاحب کے نظریۂ تاریخ میں تغیر آتا گیا انھوں نے جب علمی شوق سے مجبور ہو کر آثار الصنادید مرتب کی تھی لیکن اس کی صورتیں بہت کچھ بدل گئیں۔ اور تاریخ بھی ان کی مقصدیت اور افادیت کے تابع ہو گئی۔ المامون شبلی کی اشاعت ثانی (۱۸۸۹ء) کے وقت ان کا حال یہ تھا کہ تاریخ کو احیائے قومی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ مگر انھوں نے یہ بھی لکھا کہ "بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے"۔ تاریخ کے برے پھل سے مراد یہ ہے کہ لوگ اسلاف کی عظمت پر قانع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے اس لیے ماضی میں یوں محصور رہنا (ان کے نزدیک) تاریخ کا برا پھل ہے، ان کا یہ خیال ان کی روایت شکنی کے عین مطابق ہے۔ تاریخ کے متعلق سید صاحب کے خیالات بعد میں اور بھی بدل گئے تھے۔ وہ عملی ضرورتوں اور جدید اجتماعی مسائل کو اتنی اہمیت دینے لگے تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک خط میں یہ لکھا کہ "ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں"۔ اس سلسلے میں ان کے اور نواب عماد الملک کے درمیان طویل خط و کتابت بھی ہوئی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید کے نزدیک تاریخ کے بعض برے پھل ایسے بھی ہیں جو تعمیر جدید کے حق میں زہریلے ثابت ہو سکتے ہیں۔ سر سید کی نظر دراصل ماضی سے زیادہ حال اور مستقبل پر پڑتی تھی۔ وہ تاریخ کے بجائے ترقی پر اصرار کرتے تھے۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جگہ آگے کی طرف دیکھنے بلکہ آگے کی طرف قدم بڑھانے پر مصر تھے۔ اور اس معاملے میں اتنی انتہا پر تھے کہ روایات کے تسلسل سے قومی زندگی کی جو تعمیر ممکن ہے۔ اس سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ ـــــــ باوجود ان سب باتوں کے سر سید نے اردو میں تاریخ نگاری کو متاثر کیا چنانچہ اردو کے

وہ سب سے بڑے مورخ شبلی اور ذکاء اللہ ان کے رفقائے کار تھے۔ انھوں نے خود تاریخی کتابیں کم لکھیں ان کے ان احباب نے زیادہ لکھیں، مگر ان بڑے مورخوں کو تاریخ لکھنے کا ڈھنگ انھوں نے ہی بتایا۔ المامون (اشاعت ثانی) کے دیباچے میں انھوں نے لکھا کہ پرانی تاریخ کو ازسرنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سے تاریخ کی تدوین جدید یا مطالعہ جدید کی داغ بیل پڑی۔ انھوں نے تاریخ کو اجتماعیات کی روشنی میں سمجھنے اور پیش کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے شبلی کے اس طریق کار کی تحسین کی کہ واقعات تاریخ کے اسباب دریافت کیے جائیں گر فلسفۂ تاریخ کی طرف کبھی اپنے موجودہ کو توجہ دلائی۔ اس سے کہیں زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ سرسید نے تاریخ نگاری کے لیے ایک خاص طرز بیان کی ضرورت کا احساس دلایا۔ انھوں نے لکھا کہ "ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔" سرسید کے خیال میں میکالے کی تاریخ نگاری کا طرز پسندیدہ نہ تھا کیونکہ یہ طرز ادا شاعرانہ تھا۔ تاریخ لکھنے میں سادگی کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اسلوب میں سادگی ان کا عام طرز ادا ہے۔ مگر تاریخ کی بیانیہ نثر کیلئے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

تاریخ کے معاملے میں سرسید کو سب سے زیادہ ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رہی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا انھوں نے ابوالفضل کی آئین اکبری کی تصحیح کی اور اس پر حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی (مصنفہ ضیاء برنی) کے صحیح ایڈیشن شائع کیے۔ انھوں نے تاریخ بجنور کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ مگر وہ غدر میں ضائع ہو گئی۔ اس کے علاوہ تاریخ سرکشی بجنور پر بھی ایک رسالہ لکھا۔ ان سب کتابوں سے ان کے ذوق تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان کی ان کتابوں میں واقعہ نگاری اور بیانیہ نگاری کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ آثار الصنادید

میں ۔ ۔ ۔ ۔ جزئیات ۔ ۔ ۔ کی فراہمی اور ان کی ترتیب میں ــــــ جس فنی صلاحیت ــــ کا ــــ ثبوت دیا ہے۔ وہ ان کی ذہن کی کشادگی حوصلہ مندی اور ہمہ گیری پرہاں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو تاریخ نگاری پر سرسید کا اثر بظاہر کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ میدان بعض سیاسی اور ملکی واقعات کی بنا پر ان کے ہاتھ سے نکل کر رفقائے شبلی کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ جنھوں نے تاریخ نگاری میں عقلیت کی بجائے ایک خاص احساساتی عنصر کو داخل کر دیا تھا مگر گہری نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ دولت شبلی کی تاریخ نگاری کی اصل تحریک بھی سرسید کے ماحول سے ہی پیدا ہوئی۔ اور جہاں تک خود شبلی کا تعلق ہے ان تمام تاریخی تحریروں میں (اور باتوں کے علاوہ) چند باتیں ایسی ہیں جن کو ہم خاص سرسید کا اثر قرار دے سکتے ہیں۔

شبلی نے سیرۃ النبی کے مقدمے میں اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ تاریخ میں کوئی بات "محسوسات۔ اصول مسلمہ اور عقل مشاہدہ کے خلاف نہ ہو" اور یہ وہ اصول ہے جس کی جڑیں سرسید کی تحریروں سے ابھر کر باہر پھیلی ہیں۔ سرسید نے اپنے تمام نظام استدلال میں مادیات اور محسوسات کو جتنی اہمیت دی ہے۔ اس کا تذکرہ گذشتہ سطور میں کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے۔ انسانی تاریخ انسانی زندگی کے تسلسل کی داستان ہے۔ جس کا مختلف ادوار میں ایک مادی وجود تھا۔ تاریخ جب اپنے مادی وجود سے منقطع کر دی جاتی ہے۔ تو اس میں ایک افسانویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یوں بگڑ بگڑا کر علم الاساطیر اور علم الاصنام کی خیالی سرگذشت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ تاریخ کے مادی وجود کا اقرار و اعتراف ہر باشعور مورخ کا پہلا فرض ہے۔ زمانۂ قدیم کے بلند پایہ مسلمان مورخ اس اصول سے باخبر تھے۔ مگر مرور زمانہ سے تاریخ کا مادی ــــ اور عقلی شعور فراموش ہو تا گیا۔ فن تاریخ میں عقل اور مادیت و محسوسات

کا اعتراف سر سید کی عقلیت کا فیض خاص ہے۔ کم از کم ہندوستان میں اس کا احساس انھوں نے ہی پیدا کیا۔ سر سید کے احباب میں محسن الملک نے کوئی مورخانہ کارنامہ پیش نہیں کیا۔ مگر انھوں نے تاریخ اور مطالعۂ تاریخ سے دلچسپی ضرور لی۔ اس کا ثبوت ان کے مضامین میں موجود ہے۔ نے مقدمہ ابن خلدون پر دو ریویو لکھے۔ جس میں مقدمے کے ان اصولوں کو نمایاں کیا جن میں تاریخ اور عقل و فطرت کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کی بحث کو اس اصول سے واضح کیا ہے کہ "اگر فقط نقل و روایت پر اعتبار کر لیا جائے اور عادت اور سیاست، اور دنیا کی طبیعت (نیچر) اور انسان کی سوسائٹی کے مستحکم اصول پیش نظر نہ رکھے جائیں اور غائب کو حاضر پر اور گذشتہ کو حال پر قیاس نہ کیا جائے تو کچھ شک نہیں کہ انسان لغزش سے کبھی نہ بچے گا۔

تاریخ (اخبارات کی تنقیح) کیلئے موجودات کے طبائع (نیچر) سے واقف ہونا ضروری ہے۔ تاریخ فنون حکمت کی ایک شاخ ہے۔ اسلئے اس میں حقائق اشیاء اور طبع کائنات کا جاننا ضروری ہے۔ جس طرح مظاہر زندگی پیچیدہ ہیں اسی طرح قوانین زندگی اور ان کا علم بھی پیچیدہ ہے" یہ سب خیالات ابن خلدون کے سہی، مگر ان کی اہمیت کا احساس مولانا سر سید اور رفقائے سر سید کی خصوصیت ہے جس میں موجودات کی طبیعت (نیچر) اور ان کے عوارض ذاتی کی تحقیق و تشریح کو ضروری سمجھا گیا۔ محسن الملک نے ابن خلدون کی اجتماعیات اور تہذیب و تمدن اور ترقی کے نظریات کو بھی پھیلا کر بیان کیا ہے۔ جس سے آنے والے مورخوں نے بہت کچھ سیکھا۔

سر سید کے رفقا میں شبلی کے بعد اگر کوئی شخص مورخانہ امتیاز کا مالک ہے۔ تو وہ مولوی ذکاء اللہ ہیں ان کا بڑا کارنامہ تاریخ ہندوستان ہے۔ اس کے مقدمے میں سر سید کے ان خیالات کے واضح اثرات موجود ہیں جن کا سطور بالا میں تذکرہ ہوا۔ ذکاء اللہ کے نزدیک "تاریخ کی علی قدر منزلت یہ ہے کہ اس میں علم معاشرت و تمدن کو بہ توضیح و تفصیل بیان کیا ہو۔ اور قوموں کی سوانح عمری اس طرح بیان کرے کہ ان کی تمدنی معاشرت کے باہمی مقابلے کا سامان بہم پہنچ سکے۔ تاکہ آئندہ زمانے کے لئے ان قطعی قوانین کا تصفیہ ہو جائے جن کے مطابق تمدنی واقعات پیش آتے ہیں" تاریخ کی اس تمدنی اساس کے علاوہ ذکاء اللہ نے تاریخ کیلئے عقل و نیچر کے قوانین کا اسی طرح اعتراف کیا ہے جس طرح دیگر رفقائے سر سید نے کیا ہے مگر عجیب اتفاق ہے کہ ان مورخوں میں سے شاید کسی نے بھی "تاریخ کے برے پھل" کا ذکر نہیں کیا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان میں سے شاید کوئی بھی ماضی سے اتنا منقطع نہیں تھا جتنا سر سید نے خود کو کر لیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک مطالعۂ تاریخ کے سبھی پھل میٹھے تھے۔

سر سید کے دائرہ خاص میں تاریخی مطالعہ کی حد شاید یہی تھی۔ ان کے عام تصورات نے ان کو تاریخ کے بجائے تصور ترقی کا نمائندہ بنا دیا ہے۔ جس طرح وہ ترقی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں اسی طرح شبلی تاریخ کے ترجمان مانے جاتے ہیں۔ شبلی کے بعد شبلی کے شاگرد بھی تاریخ نگار تھے۔ اور اس میدان پر دار المصنفین نے کچھ اس طرح قبضہ جمایا کہ تاریخ ان کی ملکیت خاص سمجھی گئی۔ یہاں تک کہ دار المصنفین سے باہر اگر کسی نے تاریخ کو ہاتھ لگایا بھی تو رنگ انہی کا قائم رکھا کیونکہ اس کے بغیر عامۃ الناس میں قبول پانا ذرا مشکل تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کا رنگ بے شک جدا ہے۔ مگر تاریخ میں ان کے انداز کو سر سید کے تصورات کا نقیض کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تاریخ میں تخیل سے کام لینا سر سید کے اصول واقعہ نگاری کے منافی تھا۔ اور یہی آزاد کا طرز تھا۔ عبدالرزاق کانپوری اور شرر، اور کچھ دیر بعد اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اور اسلم جیراجپوری نے بھی تاریخ . . . لکھی مگر ان پر سر سید سے زیادہ شبلی کے اثرات معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالرزاق کی بنیادی حیثیت سوانح نگار کی ہے۔ اس میں شبلی ہی ان کے رہنما ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ البرامکہ) شرر پر سر سید کا اثر زیادہ ہے اور شبلی کا کم۔

یورن شرر (سرسید کے خیال کے برعکس) شبلی کی طرح ماضی کے مدح خواں بلکہ مرثیہ خواں ہیں۔ ان کے تاریخی ناول اسی مرثیہ خوانی کے اجزائے خاص ہیں۔

سیرت اور سوانح عمری کے میدان میں رفقائے سرسید کے کارناموں سے کون واقف نہیں۔ شبلی۔ حالی۔ شرر اور عبدالرزاق کانپوری وغیرہ سبھی نے سوانح عمری کی صنف کو ترقی دی۔ اتنی ترقی دی کہ آج تک اس صنف خاص میں ان سے کوئی بڑھ نہ سکا۔ مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ ادبیات کا یہ شعبہ سرسید کے اثر خاص سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ سبب اس کا یہ کہ سرسید طبعاً اشخاص سے زیادہ تحریکوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ عہد ماضی کی تہذیب اور تمدن کے مطالعے کی تحریک کی حوصلہ افزائی کرسکتے ہیں۔ مگر بعض خاص اشخاص کی محدود زندگی اور محدود تر سرگرمیوں میں شاید ان کے لیے کچھ زیادہ لطف و مسرت کا پہلو موجود نہ تھا۔ المامون کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی درست اور بجا، مگر اس توجہ کو ہم مستثنیات میں شمار کرسکتے ہیں۔ اور یہ بھی دراصل تاریخ پہلے ہے اور سوانح عمری بعد میں۔

سرسید دراصل اثرات جدید کے ماتحت افراد سے زیادہ اجتماع اور اس کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ رجال اور ابطال کو اتنی اہمیت دینے کیلئے تیار نہ تھے۔ کہ لوگ ان کی پرستش کرنے لگیں۔ یا ان کی باتوں کو سند قطعی قرار دے کر یا ان کی زندگیوں کو اسوہ کامل سمجھ کر روایات سے چمٹ جائیں۔ سرسید کا یہ ذہنی رجحان علم کلام کی تدریجی لنزکی منزلوں کے سیر و سفر کے سبب ترقی پذیر ہوا۔ اور تمام شعبہ ہائے علم کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو متاثر کر گیا۔ سرسید کو اگر موقع ملتا یا اگر وہ اس کو ضروری خیال کرتے تو امام غزالی کی زندگی لکھتے۔ مگر امام غزالی کا منطق سے فلسفہ اور پھر تصوف کی طرف رجعت کے لیے سرسید کے اپنے فلسفۂ زندگی کے مطابق نہ تھی اس لیے ان کی سوانح عمری لکھنے کیلئے کوئی جذباتی تحریک پیدا نہ ہوئی۔ اسی طرح ہندوستانی بادشاہوں میں سے وہ اگر کسی کی حیات پر طبع آزمائی کرتے تو فیروز شاہ تغلق یا اکبر یا شاید جہانگیر ان کے مذاق کے بادشاہ ہوسکتے تھے مگر یہ بھی بوجوہ ان کی تصوری یا مثالی سوانح عمری کے لائق نہ تھے۔

سوانح عمری کا فن جن جذباتی اور شخصی خصائص سے ابھر کر پاتا ہے ان کی سرسید میں شاید کمی تھی یا دراصل اس فن کی تربیت کسی فرد سے الفت و انس کے جذبے سے ہوتی ہے، اس لیے سخت گیر آدمی سوانح نگار نہیں بن سکتا۔ سرسید بھی ایک سخت گیر آدمی تھے۔ ان کا ذہن کڑی ضابطہ پسندی کا عادی تھا۔ وہ سخت منطق کی چابک سے ہانکنے والے شخص تھے۔ ان کی اس طبیعت نے ان کو سوانح نگاری کے میدان میں اترنے نہ دیا۔ اس معاملے میں ہم خود سوانح نگار شبلی کو کوئی آئیڈیل سوانح نگار قرار نہیں دیتے۔ وہ بھی طبعاً ادیب ہی تھے اس کے بعد وہ مورخ تھے۔ سوانح عمری کو تو انھوں نے خواہ مخواہ مجروح کیا یعنی سوانح عمری کو تاریخ یا بعض دوسرے مطالب و معلومات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسی لیے ان کی سوانح عمری میں "شخصیت" کے سوا سب کچھ ہے۔

ان باتوں کے باوجود اردو کی سوانح عمری عرصے تک سرسید کی تحریک سے متاثر رہی۔ یہ اس طرح کہ اس دور کی ساری سوانح نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قوم کی ترقی سرسید کی تحریک کا اصول اولین تھا۔ جسکے تحت اس زمانے کا سارا ادب مقصدی اور منفعتی بن کر اجتماعی مقاصد کا آلۂ کار بنا رہا۔ مولانا حالی کی اولین سوانح عمریاں سادہ اور ادبی سوانح عمریاں ہیں۔ مگر ان دونوں میں بھی قومی خدمت کا جذبہ پیش پیش ہے۔ ان میں انھوں نے قوم کیلئے خوش طبعی ظرافت اور زندہ دلی کے عمدہ نمونے تیار کیے ہیں۔ مگر ایسی طور کہ اس سے

اجتماعی اخلاق کی اصلاح ہو ـــــــــــ شبلی کی طرح شرر نے
بھی اسلاف میں سے برگزیدہ اشخاص کو منتخب کر کے ان کی سیرتوں کو
مشعل راہ بنانے کی اپیل کی ہے۔ شبلی نے جہاں غیر معمولی ہستیوں کی مکمل
زندگیوں کو پیش کیا ہے۔ وہاں شرر نے محض دلچسپ (اگر قابل توجہ)
شخصیتوں کی ہمہ رنگ سیرتوں کے صرف چند پہلوؤں کے نقاطے پیش کیے
ہیں۔ مگر اس غرض سے کہ قوم کو ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔
غرض قومی ترقی اور اصلاح ان سب کے پیش نظر رہی۔ اور یہ رنگ
نہیں تھا جو سر سید کا دیا ہوا تھا۔ سر سید نے اردو سوانح نگاری کو
اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو انھوں نے یہ اندازِ نظر سوانح عمری کو یقیناً ضرور دیا۔
جس کے سبب اردو سوانح نگاری ادب کی دوسری شاخوں کی طرح
قوم اور اجتماع کی خادم بنی رہی۔

اردو میں صحیفہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کی ابتدا میں
ہو چکا تھا۔ اردو اخبار (۱۸۲۶ء) اردو کا پہلا سالم اخبار تھا۔ شمس
الاخبار (۱۸۲۳ء) ملا جلا اردو فارسی کا اخبار تھا۔ خالص اردو کا دوسرا
اخبار سید الاخبار (۱۸۳۷ء) تھا جو سر سید کے بھائی سید محمد خاں کی
ادارت میں نکلتا تھا۔ اس اخبار میں سر سید بھی لکھا کرتے تھے۔ سر سید
کے لیے یہ ابتدائی تجربہ بے حد مفید ثابت ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بعد میں بہت
سے مفید صحافتی کارنامے انجام دیئے۔ غازی پور میں انھوں نے جو سائنٹفک
سوسائٹی قائم کی تھی۔ اس کے نام سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی بھی جاری
کیا۔ علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی اس کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ اس
گزٹ میں ایک زمانے میں پراگرس اخبار بھی مدغم ہو کر چھپتا رہا۔ مگر ان
سب کوششوں میں اہم اور نمایاں درجہ تہذیب الاخلاق کو حاصل ہوا
چونکہ اس میں اخباریت کم اور علمیت زیادہ تھی۔ اس کے مضامین طویل
اور مسلسل ہوتے تھے۔ اور عام اور سطحی اخباری دلچسپی سے زیادہ قوم کا گہرے

ذہنی انقلاب کا مقصد پیش نظر تھا۔ یہ اخبار کم اور مجلہ زیادہ تھا (اور
مجلہ سے میری مراد علمی رسالہ ہے)

سر سید کے صحافت کی اہم بات علم اور صحافت کا پیوند ہے
صحافت میں ان کی دلچسپی ثانوی حیثیت رکھتی ہے، تذکیر و دعوت
اور تلقین و اصلاح کو اولین درجہ حاصل ہے۔ ان کی صحافت کی روح اس
عنوان میں جلوہ گر ہے۔ جو علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ کی پیشانی پر درج ہوتا ہے
اس میں ان کا مطمح نظر یہ بیان کیا گیا ہے جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا ہے
کام ایک دانا گورنمنٹ کا۔ اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک
آزاد رعیت کا " ان الفاظ میں اس عزم اور اس اعلیٰ اصول صحافت
کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جو ایک صدی کے بعد ہمارے زمانے میں تو
قابل تعجب نہیں مگر اس زمانے کی پرخوف فضا میں ضرور تعجب خیز
معلوم ہوتی ہے۔

سر سید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی
رکھتی ہیں۔ اول ان کے صحائف کی دیدہ زیبی، ٹائپ کا حسن اور کاغذ
کی عمدگی ـــــ اس لحاظ سے ان کے اخبار موجودہ ترقی یافتہ یورپ
کے اعلیٰ اخباروں اور رسالوں سے کسی طرح کم نہیں۔ دوم ان اخبارات
کی معقولیت۔ اخبارات میں واقعات و معاملات پر بے لاگ رائے
جس میں بڑی عاقبت بینی، وسعت معلومات اور تعمیری نقطۂ نظر
جھلکتا ہے۔ یہی ان کے تبصروں کی خصوصیت ہے۔ اور مضامین علمی
میں سر سید کی مخصوص معقولاتی اسپرٹ اور حیات قومی کی تشکیل جدید
اور زندگی کی تمدنی اساس کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ معقولیت
اور تجزیاتی اصول صحافت سر سید کی اخبار نویسی کے خاتمے کے بعد آج
تک اردو اخبار نویسی میں پیدا نہ ہو سکا۔

سر سید کے انتقال کے بعد بقول سید رضا علی علیگڑھ میں
علمی مذاق کی بڑی بے قدری ہو گئی تھی (اعمال نامہ ص ۷۵) تاہم سر سید کے

اثرات کچھ دیر تک باقی رہے۔ علیگڈھ کے معارف، مولانا عبدالحلیم شرر کے دل گداز وغیرہ نے سرسید کی صحافتی رسوم و تیور کی بعض باتوں کو قائم رکھا۔ مگر زمانہ بہت بدل چکا تھا۔ ملک کی سیاست بدل رہی تھی۔ اور بیرونی حوادث سے جذبات اس درجہ مشتعل ہو رہے تھے کہ ٹھنڈی معقولیت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ خصوصاً بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو صحافت اور مجلہ نگاری کی عمارت سراپا جذبات پر آ کر کھڑی ہو گئی اور سیاسی کشمکش نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ نہ دانا گورنمنٹ چھاپے کی آزادی کو قائم رکھ سکی اور نہ آزاد رعیت اس آزادی کو برقرار رکھ سکی۔"

اس فضا میں اخبار نویسی نے جو بڑے بڑے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ان میں الہلال، زمیندار اور ہمدرد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ الہلال ہماری جذباتی صحیفہ نگاری کا لاثانی شاہکار ہے الہلال کی گہری جذباتیت اور احساساتی نفاست قطع نظر دیدہ زیبی اور دلکشی کے اہتمام کے اعتبار سے اس کو سرسید کے اخبارات کے پہلو میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ الہلال میں، یہ بات مستزاد تھی کہ اس میں ایک خاص قسم کی ادبیت پائی جاتی تھی، نظمیں، انشائیے، کہانیاں، دلنشیں ظرافت اور پھر تصاویر......... اور رومانیت کا رنگ لیے عنوانات ..... ان چیزوں نے سرسید کے ان صحافتی کارناموں کو کچھ دیر نظروں سے بالکل اوجھل کر دیا ـــ مگر واقعات پر بحث اور چھان بین اور جذبات سے الگ ہو کر عقلی توجہ۔ یہ بات سرسید کے بعد بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر اگر صرف اخبار نویس رہتے تو شاید وہ سرسید کے انداز کی کچھ اخبار نویسی کرنے میں کامیاب ہو جاتے.... مگر سیاست کے پُرخروش ہنگاموں نے ان کی اخبار نویسی کو بھی متاثر کیا...... میری رائے میں سرسید کا صحافتی انداز ہمارے زمانے میں کسی نے اختیار کیا تو وہ مولانا مہر مدیر انقلاب ہیں.... یہ مسلّم ہے کہ

سرسید احمد خان نے مندرجہ بالا علوم و فنون کی طرح خالص ادب کو بھی متاثر کیا۔ اردو ادب میں نثر اور اس کے اسلوب پر گہرا اور ہمہ گیر اثر ڈالا۔ یہ بھی تسلیم شدہ امر ہے کہ شاعری کے نقطۂ نظر اور نصب العین میں ان کی تنقیدی تصریحات کے زیر اثر خاص تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ہر چند ڈراما ان کے دائرہ عمل اور دلچسپی کے مرکزوں سے کچھ خاص مناسبت نہ رکھتا تھا مگر وہ بھی ان کی توجہ سے کلیتہً محروم نہ رہا۔ سرسید کے خود رفقائے کار نے یوں تو ڈراما اور اسٹیج کی طرف توجہ نہیں کی مگر "قومی تھیٹر" کے نام سے ۱۶ فروری ۱۸۹۴ء کو انھوں نے مدرسۃ العلوم کیلئے چندہ جمع کرنے کے لیے اس رسم کی ابتدا بھی کر دی تھی اگرچہ اس کو انھوں نے مسخرگی اور مسطری قرار دیا مگر سنجیدہ انداز سے انھوں نے اور ان کے رفقا نے یہ تماشا دکھایا اس سے یہ سند ضرور مل گئی کہ ڈراما اور تھیٹر شاعری اور ادب کی دوسری اصناف کی طرح اجتماعی مسائل کا ترجمان اور حیات قومی کا مصلح ہو سکتا ہے۔ اسی طرح فن افسانہ سرسید کیلیے جاذب نظر نہ ہوا مگر ان کے رفقاء کا اس کو اپنا لینا اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ وہ اس صنف ادب کی صلاحیتوں سے یقیناً بیگانہ نہ ہوں گے۔ باقی رہی ادبی تنقید سو اس کے اصول ان کی تحریروں میں متفرق طور پر مل جاتے ہیں۔ جن سے ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کا اچھا خاصا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے زیر اثر جو تنقیدی ادب پیدا ہوا اس پر ان کے فیض خاص کا گہرا نقش معلوم ہوتا ہے۔

ادب کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ سرسید نے ادب کی ماہیت اور اس کے نصب العین کے متعلق پرانے نقطۂ نظر کی اصلاح کی۔ انھوں نے یہ بتایا کہ ادب کی ساخت اور تخلیق میں دل کی اہمیت پر یہ اصرار ادب کی تقدیس کی پہلی بلند آواز تھی، جو اردو ادب میں اٹھائی گئی۔ پھر شاید یہ بھی پہلی مرتبہ ہی احساس ہوا کہ ادب کی تخلیق میں قاری کا وجود بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔" جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ سرسید کے اس تصور میں قاری کو اتنی ہی

اہمیت نصیب ہوئی جتنی خود ادب کو حاصل ہے۔ اس لحاظ سے سرسید نے بتایا کہ ادب ایک انفرادی مظاہرہ ہی نہیں بلکہ اجتماعی مجاہدہ و ریاضت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو کچھ لطف مضمون میں ہو اسکے ادا کرنے کا لطف تب ہی ہوگا جب خود مضمون میں "دل" کا عنصر موجود ہوگا۔ سرسید نے یہ سب باتیں نثر کے سلسلے میں لکھی ہیں مگر شاعری پر بھی یہ حاوی ہوتی ہیں۔

خالص شاعری کے متعلق بھی سرسید کا نقطۂ نظر اجتماعی اور افادی ہے۔ سرسید نے شاعری کو تہذیب اور شائستگی کا لازمہ [illegible] خیال کیا ہے۔ انھوں نے پرانی شاعری کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہماری شاعری بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں۔ (تہذیب الاخلاق ج ۲ ص ۴۵۱) پرانی شاعری کی بڑی کمزوری سرسید کے نزدیک یہ تھی کہ اس میں فطری جذبات کی کمی تھی، اسکے علاوہ یہ بھی کہ اس سے تعجب تو پیدا ہوتا ہے مگر اثر نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شاعری انسان کی طبیعت اور نیچر کا قدرتی اظہار ہے "پیراڈائز لاسٹ کچھ چیز نہیں کہ انسان کی طبیعت کی حالت کی تصویر ہو" تہذیب ج ۲ ص ۴۵۱ طبیعت کو بیان کیا ہے جو نہایت موثر انسان کی طبیعت پر ہے" (ایضاً ص ۴۵۲) یہ سب خیالات بنیادی ہیں ان سے آنے والے دور کی ساری شاعری متاثر ہوئی۔

مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری تقریباً انھیں خیالات کی زیادہ منظم اور مربوط تفسیر ہے۔ طرز ادا میں سادگی کی اہمیت، بے تکلفی اور مدعا نگاری کی ضرورت، شاعری کا اجتماع کے لیے مفید ہونا اور اس کی افادی اور تعمیری صلاحیت یہ سب امور سرسید کے ارشادات کی صدائے بازگشت ہیں۔ شبلی کے تنقیدی خیالات میں بظاہر مجددانہ اور مجتہدانہ رنگ نظر آتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی تصریحات میں بھی روح سرسید ہی جلوہ گر ہے۔ ہمارے جدید دور ترقی میں تنقیدی ادب کا مطالعہ زیادہ وسیع اور گہرا ہو گیا ہے۔ مگر اسلوب میں سادگی اور سلاست کی روشنی کا نشان اول تہذیب الاخلاق ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعر و ادب کے متعلق کچھ اسی قسم کے خیالات سرسید سے پہلے محمد حسین آزاد نے بھی ظاہر کیے تھے مگر اردو ادب کی رفتار پر آزاد کے خیالات نے بہت کم تاثر کیا ہے۔ سرسید کے خیالات ایک بڑی تحریک کا حصہ تھے۔ اس لیے وہ تحریک کی طرح ہر طرف چھا گئے۔ ان خیالات کے زیر اثر شاعری میں سب سے بڑا اور نمایاں نمونہ حالی نے قائم کیا جنکی شاعری خصوصاً مسدس گویا تہذیب الاخلاق کی منظوم شرح ہے۔ اور حالی کو اس کا اقرار بھی ہے۔ یہ شاعری ہی نہیں ایک تہذیب کی واردات اور ایک نئی تہذیب کی دعوت بھی ہے اس میں وہ سب کچھ ہے جو سرسید کو مطلوب تھا۔

شبلی کی قومی اور سیاسی شاعری بھی سرسید کی قومی روح کی تربیت یافتہ ہے بعد کے اکثر قومی شاعروں نے انہی بنیادوں پر بہتر اور عالیشان عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ اکبر سرسید کے تجدد کے لاکھ مخالف تھے مگر ان کے ذہن کو سرسید کی تحریک ہی سے جلا اور روشنی حاصل ہوئی۔ سرسید کی مخالفت سے انہوں نے اپنی شاعری کی دکان چمکائی ہے مگر ساز و سامان انھیں علیگڑھ سے ہی ملا ہے۔ مخزن میں لکھنے والے اکثر شاعروں کے کلام میں سرسید کی روح جلوہ گر ہے۔ آگے چل کر اقبال اگرچہ سرسید کی کلاسیکیت کے خلاف ایک شدید رومانی احتجاج کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر وہ بھی سرسید کے اثر سے بے نیاز نہیں۔ سرسید نے اپنے تصورات میں نیچر کو جو اہمیت دی ہے اسکا اثر انجمن پنجاب نیچر پرستی سے زیادہ دیرپا اور مستقل ہے۔ سرسید نے شاعرانہ طور پر ہی نہیں بلکہ علمی اور دینی بنیادوں پر نیچر کے تصور کو پھیلایا ہے۔ "اگر قرآن خدا کا قول ہے تو نیچر خدا کا فعل ہے" یہ دینی احساس خالص علمی احساس سے بھی زیادہ اثر انگیز ثابت ہوئی چنانچہ نیچر سے سرسید کے سب رفقا نے بڑے لگاؤ کا اظہار کیا۔ شاعری میں سے اسمعیل میرٹھی نے نیچر کے مظاہر

کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا گویا ان کی شاعری سرسید کے مندرجہ بالا قول
کا منظوم حاشیہ ہے اور اس کے بعد اردو شاعری میں نیچر کا جو عنصر ملتا ہے وہ
کچھ تو براہِ راست مغربی ادب سے ماخوذ ہے۔ مگر مغربی ادب کے لیے
ذہن و فکر کو آمادہ کرنے میں سرسید نے جو حصہ لیا اس سے انکار ممکن نہیں۔

اردو میں مضمون نگاری کی تحریک بھی عملاً سرسید نے ہی اٹھائی۔
مضمون سے میری مراد وہ صنف ہے جسے انگریزی میں ایسے کہا جاتا ہے۔
تہذیب الاخلاق کے ذریعے انھوں نے مضمون لکھنے کی وہ روش عام کی جو ان
کے بعد ترقی پا کر لطیف، عمدہ، فرحت بخش اور خوشگوار ادبی مضمون
کی صورت میں متشکل ہوئی۔ سرسید کے سب مضامین پر ایسے کی شرائط
پوری نہیں ہوتیں مگر انھوں نے متعدد مضامین ایسے لکھے جن کو ہم اس
صنف کا مناسب نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق کو سٹیل اور ایڈیسن کے مشہور رسائل
سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے نمونے پر ڈھالنا چاہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان کے
بعض مضامین کا ترجمہ بھی اتارا۔ مگر ان میں اور سرسید کے مطمحِ نظر اور
طریقِ کار میں یہ واضح فرق پایا جاتا ہے کہ جہاں ان انگریز انشا پردازوں نے
مذہبی مناقشات اور فرقہ و جماعت کی بحثوں سے اجتناب کیا ہے وہاں سرسید
کا مضمون خاص یہی ہے۔ اس کا انھیں خود بھی احساس تھا۔ اردو مضمون
نگاری پر سرسید کے جہاں بڑے بڑے احسانات ہیں وہاں یہ خاص بات
نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ان کے اس مناظرانہ انداز نے اس دور کے اکثر
مضمون نگاروں کو بلند پایہ مضمون نگار نہ بننے دیا۔ ان سب کے رفقاء
ایک جامد اور خشک نقطۂ نظر کے ترجمان تھے۔ ان کی مضمون نگاری
احقاقِ حق اور تردیدِ باطل کے لیے تھی۔ ان سب کا عقیدہ یہی تھا کہ "دینی
مسائل انجام کو ہر دلعزیز ہوتے ہیں جو بعد مباحثہ قائم رہتے ہیں۔" (سرسید
تہذیب الاخلاق) چنانچہ ان سب کے مضامین میں مباحثہ و مجادلہ کی یہ

فضا قائم ہے۔ سرسید کے بعد ان کے سب سے بڑے مضمون نگار دوست شبلی
کا تو سرمایہ ہی ایک ادبی یا علمی مجادلہ ہے جس میں اپنے دعوے کو تسلیم کرانا اور
اور بزور تسلیم کرانا مضمون نگار کا مقصدِ وحید معلوم ہوتا ہے۔
پڑھنے والے کو وہ تفریح، دل نشینی اور خواب آور سرور جو کسی
عمدہ مضمون کا ثمرِ خاص ہے۔ بہت کم میسر آتا ہے۔ محسن الملک کے طویل
مضامین، ذکاء اللہ کی طویل نویسی، چراغ علی کی معقولات اور معذرتی
تحریریں معلومات افزا ہوں تو ہوں مگر مسرت بخش اور سرور انگیز ہرگز نہیں۔
البتہ حالی اچھے مضمون نگار ہو سکتے تھے مگر انھوں نے مضمون کم لکھے۔ آگے
چل کر شرر نے کچھ خوش رنگ پھول پیش کیے مگر ان کے مضامین خاکے
اور مرقعے ہیں۔ ان کے میدانِ کمال بہت سے ہیں۔ وہ اس صنف کے پرستار
خاص نہ بن سکے۔ وحید الدین سلیم اچھے مضمون لکھ سکتے ہیں مگر ان کی علمی
نکتہ آفرینی اور فلسفیانہ تجزیہ پسندی ان کی راہ میں حائل ہوئی۔

اردو مضمون نگاری کی تاریخ کا یہ پہلو تعجب انگیز ہے کہ ابتدا
میں اس فن کو جس علیگڑھ کی منطقی اور "کلاسیکی" روح سے نقصان پہنچا
آگے چل کر اسی علیگڑھ کے نئے ماحول اور نئی پرمسرت زندگی کی رومانیت
پرور فضاؤں سے اس کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع بھی ملا۔ چنانچہ
اردو کا اولین اور غالباً عظیم ترین مضمون نگار علیگڑھ کی خاک سے ہی
پیدا ہوا۔ وہ سجاد حیدر یلدرم تھا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا جب علیگڑھ کے
قلم کاروں کے سامنے صرف سرسید کے نمونے ہی نہ تھے۔ بلکہ مغربی خصوصاً
انگریزی ESSAY کے بڑے بڑے نادر شاہکار نظر افروز اور دلفریب
ثابت ہو رہے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم نہ صرف انگریزی ادب سے بہرہ ور
تھے انھیں ترکی ادب سے بھی واقفیت اور دلچسپی تھی۔ ان سب ماخذوں
سے انھوں نے پھول چنے اور خیالستان کے گلستان اور گل و گلزار کھلائے۔
یہ پھول اگرچہ دوسرے دیس کا رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں۔ مگر [illegible]
سرسید ہی کے گھرانے کا ایک فرد ہے اس لیے ان گلدستوں کے لیے بھی اردو [illegible]

اسی باغبان عنصر کے مرہونِ احسان ہیں ...... طنزیہ مقالہ نگاری جن خطوط پر چلی اور ترقی کرتی رہی وہ ایک ایسا باب ہے جسے اس داستان سے الگ ہی رکھا جائے تو مناسب ہے! مگر یہ کہنا بے محل نہیں کہ رفقائے سرسید کی علمی کاوشوں سے قطع نظر ادب کے جس میدان پر فرزندانِ علیگڑھ تقریباً بلا شرکت غیرے اب تک قابض ہیں وہ مضمون نگاری ہی کا میدان ہے چنانچہ اس صنف میں بڑے بڑے نام انھیں لوگوں کے ہیں جو کسی نہ کسی طرح علیگڑھ سے وابستہ ہیں یا وابستہ رہ چکے ہیں۔ اردو میں مزاح نگاری کی ابتدا آغاز کار سرسید کی مخالفت کے ماحول میں ہوئی اور اودھ پنچ اور اکبر کی نظمیں سید صاحب کی مخالفت کے لیے وقف ہو گئیں۔ مگر اسی فضا میں طنز و مزاح کو بڑی ترقی ہوئی اسے بھی بالواسطہ سرسید کا فیضان کہا جا سکتا ہے۔

یہ مختصر جائزہ ہے اردو ادبیات پر سرسید کے اثرات کا! ہمارے خیال میں سرسید کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کیا۔ انھوں نے بقول علامہ سردار جعفری جمہوری ادب کی بنیاد رکھی اور سائنسی عقل پسندی کو اپنی مخصوص کمزوریوں کے باوجود عام کیا چنانچہ اردو میں لکھنے پڑھنے کی تمام تحریکیں سرسید کے ان رجحانات کا عکس لیے ہوئے ہیں۔ اور مہدی الافادی کے اس خیال سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نئی نسل تمام تر تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے .... ادب میں بھی اور زندگی میں بھی! جدید زمانے میں کسی فرد واحد نے اردو ادب اور عام زندگی کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا تنہا سرسید نے کیا۔ جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشاپرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمراں ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔ (شبلی نعمانی)

سیّد کا ایثار

گو ناوکِ ظلم کا ہدف تھا — وہ شیفتہ پھر بھی سر بکف تھا
منظور جو قوم کا تھا اعزاز — ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
دشنام کو وہ دعا ہی سمجھا — وہ درد کو بھی دوا ہی سمجھا
جور اس نے سہے کرم کے بدلے — لطف اس نے کیے ستم کے بدلے
ہمت تھی جو شمع راہ اس کی — خالی نہ گئی وہ آہ اس کی

ہونی تھی کہ قوم کے پھریں دن
نالے نہ رہے اثر کیے بن

شبلی نعمانیؔ

بچت...

دفاع، تعلیم، مکانات، صاف ستھرے شہر، خوش حال دیہات، یہ سب عظیم مقاصد ہیں۔ سب اِن کے بارے میں سوچتے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے تجویزیں بناتے ہیں۔ لیکن اِن سب کے لئے روپیہ چاہیئے۔ بچت وقت کی پکار ہے۔ افراطِ زر پر قابو پانے کے لئے قومی تعاون درکار ہے۔ معیشت کو مضبوط بنانا ہے۔ آج زیادہ خرچ سے ہاتھ روکنا ہے تاکہ مستقبل کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ ان سب پر توجہ آپ ہی کو کرنی ہے۔ مستقبل آپ ہی کا ہے۔

نیشنل بینک اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ قوم کے مستقبل میں ہم بھی شریک ہیں۔ ہم جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا میں کام کرتے ہیں۔ محض روپے پیسے، کاغذوں اور نوٹوں کی دنیا میں نہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہر وہ تجویز جو قوم کے لئے مفید ہے افراد کیلئے بھی مفید ہے۔

نیشنل بینک ہر صورت حال کے مطابق بچت کی اسکیم پیش کرتا ہے: سیونگ بینک اکاؤنٹ (منافع ۸½ فیصد تک)، اسپیشل نوٹس اکاؤنٹ (منافع ۹½ فیصد تک)، فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ (منافع ۱۱ فیصد تک) کیومولیٹو ڈپازٹ اسکیم (جس میں جمع کی ہوئی رقم پندرہ سال میں پانچ گنا ہو جاتی ہے)

ایک پرانی کہاوت ہے۔ "دانہ دانہ ذخیرہ بن جاتا ہے"۔ نیشنل بینک کو موقع دیجئے کہ آپ کیلئے آپ کے بچوں اور قوم کے لئے ایک پائیدار اور مستحکم مستقبل کی تعمیر میں آپ کا ہاتھ بٹائے۔

قومی بینکاری میں آج بھی آگے

نیشنل بینک آف پاکستان

BHQ (81) PID

R S LINTAS NBP 7.193 75 UD

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

کی

لائبریری۔ ریڈنگ روم اور میوزیم

جس طرح علی گڑھ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی ۱۸۸۶ء میں بنا کردہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا ایک شاندار کتب خانہ تھا اسی طرح اپریل ۱۹۵۱ء میں جب اس ادارہ کا کراچی میں "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے احیا ہوا تو اجرائے سہ ماہی مجلہ "العلم" انعقاد مجالس و مذاکرات علمی و تعلیمی۔ قیام سرسید گرلس کالج اور شعبہ تصنیف و تالیف کے ماسوا اس کے صدر دفتر بمقام سندھ مدرسہ (اپریل ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۶ء سعیدہ منزل رضویہ کالونی (جون ۱۹۵۶ء تا دسمبر ۱۹۷۱ء) اور اب ذاتی عمارت واقع بی۔ روڈ — ناظم آباد کراچی میں جنوری ۱۹۷۲ء سے "یوسف میموریل لائبریری" کے نام سے ایک فری پبلک لائبریری قائم ہے جس میں سال بسال جملہ علوم و فنون پر کثیر تعداد میں کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور ان کی تعداد پندرہ ہزار سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بڑی تعداد میں انگریزی، اردو و دیگر زبانوں کے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہر موسم میں آرام دہ خوبصورت ہال اور نفیس فرنیچر اس پر مستزاد ہے۔ جس کے نتیجہ میں لائبریری کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ دور دور سے طالبانِ علم اور علمائے تحقیق جوق در جوق مطالعہ کے لئے آتے ہیں۔

اوقاتِ دفتر کانفرنس کے بعد ۴½ بجے شام سے ۹ بجے شب تک لائبریری ریڈنگ روم اور میوزیم کھلا رہتا ہے جن خواتین حضرات کو اب تک علم نہ ہو تشریف لاکر استفادہ فرمائیں۔

ع۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

سید الطاف علی بریلوی
سکریٹری

الطاف حسین حالی

مدرسۃ العلوم

اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں آ کر یہ چمن دیکھیں
ریاض قوم کا فصل خزاں میں بانکپن دیکھیں

وطن کو جو سمجھتے ہیں کہ ہے ترجیح غربت پر
وہ آ کر شام غربت بہتر از صبح وطن دیکھیں

ہوئے ہیں جمع یاں جو نونہال اطراف سے آ کر
بہم سب کو شریک شادی و رنج و محن دیکھیں

اگر غیبت میں پوچھیں ایک کا حال ایک سے آکر
تو ہر طفل و جوان میں حفظِ غیب و حسنِ ظن دیکھیں

تواضع منعموں کی دیکھیں اور غیرت غریبوں کی
ادب بچوں کا دیکھیں نوجوانوں کا چلن دیکھیں

قبائل برائے میں دیکھیں تو دیکھیں کام میں پھرتی
لڑائی فیلڈ میں دیکھیں کلب میں یونین دیکھیں

نہ یوان میں غلامی کی نہ بے باکی کی خوان میں
ادب اور معتدل آزادگی ان کا چلن دیکھیں

سلف پر فخر دیکھیں اور تاسف اپنی حالت پر
لگن اسلام کی اور قوم کی دل میں چبھن دیکھیں

نمازوں کی تقلید دیکھیں اور روزوں کی پابندی
اجازت نیک کرداری کی اور ہر کام کی پابندی
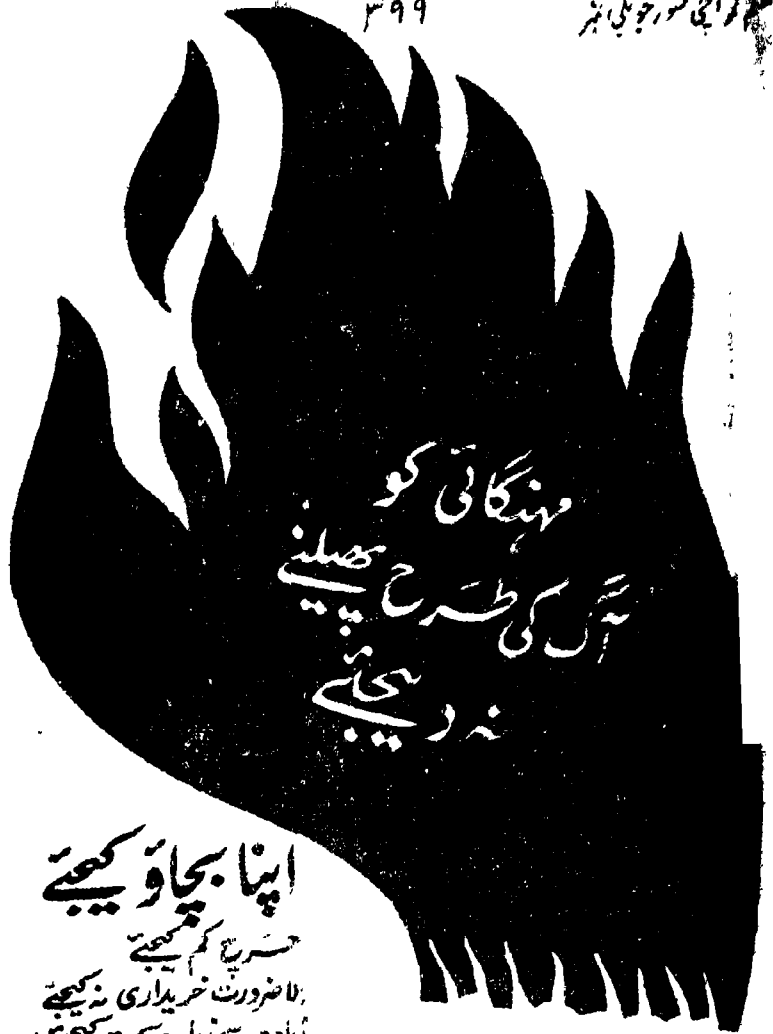
از خوشی محمد خاں ناظر

سید مرحوم امت کا بھلا کرتا رہا !
ہم جفا کرتے رہے اور وہ وفا کرتا رہا

فکر قوم از ابتدا تا انتہا کرتا رہا
سال و ماہ و روز و شب صبح و مسا کرتا رہا

جو فلاح قوم کی آئی سمجھ میں اس کی بات
برملا کہتا رہا اور برملا کرتا رہا

تھی اسے پروائے تحسین اور نہ کچھ نفریں کا ڈر
اس کو جو کرنا تھا بے روے و ریا کرتا رہا

ناسزا سنتا رہا اور مرحبا کہتا رہا
کفر کے فتووں میں کام اسلام کا کرتا رہا

اپنے دل پر سینکڑوں سہتا رہا رنج و الم
درد دل کی قوم کے لیکن دوا کرتا رہا

کاسۂ دریوزہ سے ڈالی بنائے قصر و کاخ
کام جو شاہوں کا تھا سو یہ گدا کرتا رہا

ہمدمو رو یا کریں گے اس کی کس کس بات کو
ہائے کیا کہتا رہا وائے کیا کرتا رہا

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان کاشکے
شود روزے گلستان کاشکے

ہائے بزم قوم میں اب جلوہ فرمائے گا کون
ماہ کی مانند ہالے میں نظر آئے گا کون

اے مسیحا قوم کے تجھ بن عظامِ خستہ کو
قم باذنی کہہ کے اب جنبش میں پھر لائے گا کون

دیکھ کر چتون کو تیری خون میں آیا تھا جوش
اس نگاہ گرم سے اب دل کو گرمائے گا کون

تفرقے باقی ہزاروں ہیں جماعت میں تری
ہائے تجھ بن ان کے یہ الجھاؤ سلجھائے گا کون

گیرۂ دار دہر مثلِ عرصۂ شطرنج ہے
یار شاطر تجھ سا اس کی چال بتلائے گا کون

جوگیوں کا روپ بھر کر قوم کے اسٹیج پر
تا نمیخواہم ننگ و نام را ،، گائے گا کون

روٹھ کر جاتا ہے سید آؤ لیں اس کو منا
ورنہ اتنی مشکلیں آسان فرمائے گا کون

دفن کرنا مسجد کالج میں سرسید کی لاش
اس خلیل اللہ سے کعبہ کو چھڑوائے گا کون

اے حریفان آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
جرعہ خیر اشک خوں در جام ما باقی نماند